JULY 2011

خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ

کہنی سُننی، مدیر 14
کرن کرن روشنی، ادارہ 15
ہمارے نام، نادرہ خاتون 27

آپ سے کیا پردہ

شاعری کی قدر نہیں، انشائیہ 20

خاتون کی ڈائری

میری ڈائری سے، امت الصبور 270

مجھ سے ملیے

باتیں نیہا سے، شاہین رشید 278

انٹرویو

سائرہ یوسف، شاہین رشید 22

ناول

چراغِ آخرِ شب، رفعت ناہید 36

مکمل ناول

مُصحف، نمرہ احمد 184
حساب باقی ہے، آسیہ رزاقی 108

ناولٹ

سفال گر، بشریٰ سعید 232
خالی ہاتھ، صائمہ اکرم 72
تلاش میں ہے، فیضیہ عامر 160

صَفد، سلویٰ بٹ 55
نہیں چاہیے، عفیفہ محمد بیگ 60
طلب، رمشا خالد 68
محبت کر، نعیمہ ناز 102
قسمت، سدرہ سحر عمران 229

نظمیں غزلیں

غزل، فراق گورکھپوری 264
غزل، رمزی آثم 265
نظم، امجد اسلام امجد 264
نظم، فاطمہ نجیب 265

کارِ بے سلسلہ، شگفتہ جاہ 266
بیریں ویریں، غزل ثوبان 274
روشن حرف، سورٹھ ساند 277

میری بیاض سے

آپ کی بیاض سے، خالدہ جیلانی 272

پکوان

آپ کا باورچی خانہ، کرن بشیر 282
موسم کے پکوان، خالدہ جیلانی 284

نفسیات

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں، عدنان 288

بیوٹی بکس

بیوٹی بکس کے مشورے، امت الصبور 290

جولائی 2011
جلد 39 شمارہ 3
قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: khawateendigest@hotmail.com , info@khawateendigest.com

خواتین ڈائجسٹ کا جولائی کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

کتنے ہی مسائل کے بوجھ تلے دبی زندگی میں عدم تحفظ کا روز افزوں بڑھتا احساس ذہنوں کو شدید ذہنی اذیت سے دوچار کیے ہوئے ہے۔ حالات کی اس سنگینی میں اہلِ اقتدار کی لاتعلقی اور بے حسی مایوسی کی کیفیت میں مزید اضافہ کر رہی ہے۔

ہم نے کوشش کی ہے کہ ہمارا انتخاب آپ کو تھوڑی دیر کے لیے حالات کی تلخیوں اور موسم کی شدتوں سے دور لے جائے اور آپ کے ذہنوں میں خوشگوار تاثر پیدا ہو۔

ہماری ہمیشہ یہی کوشش رہی ہے کہ خواتین ڈائجسٹ میں ایسی تحریریں شائع کی جائیں، جو مایوسی کے اندھیروں کو دور کر کے دلوں میں خوش امیدی کو جنم دیں۔ زندگی کو یکسر تبدیل نہیں کیا جا سکتا لیکن زاویہ نظر کی تبدیلی سے کچھ خوشگواری ضرور لائی جا سکتی ہے۔

ہماری مصنفین سے بھی یہی درخواست ہے کہ زندگی کے تلخ حقائق کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا لیکن خوابوں کو ضرور زندہ رکھیں کیونکہ یہ ہمارے خواب ہی تو ہیں جنہیں تعبیر دینے کے لیے ہم کوشش، محنت اور جدوجہد کرتے ہیں۔

اپنی تحریروں میں زندگی کے روشن پہلو سامنے لائیں۔ کبھی کبھی مایوسی میں گھرے انسان کے لیے روشنی کی چھوٹی سی کرن بھی زندگی کا پیغام بن جاتی ہے۔

ناولٹ نمبر،

اگست کا شمارہ حسبِ روایت ناولٹ نمبر ہوگا۔ مصنفین سے درخواست ہے، اپنی تحریریں جلد از جلد بھجوا دیں تاکہ شامل ہو سکیں۔

اس شمارے میں،

- آسیہ رزاقی کا مکمل ناول ۔ حساب ابھی باقی ہے،
- نمرہ احمد کا مکمل ناول ۔ مصحف،
- بشریٰ سعید کا ناولٹ ۔ سفال گر،
- صائمہ اکرم چوہدری اور فیصبہ عامر کے ناولٹ،
- رمشہ خالد خان، عنیقہ محمد بیگ، سلویٰ علی بٹ، نعیمہ ناز سلطان اور سدرہ سحر عمران کے افسانے،
- ٹی وی فنکارہ سائرہ یوسف سے ملاقات،
- کرن کرن روشنی ۔ احادیثِ نبویؐ کا سلسلہ،
- نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور عدنان کے مشورے شامل ہیں۔

خواتین ڈائجسٹ کا یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ آپ ہمیں ضرور بتلائیے گا، آپ کی رائے، مشورے ہمارے لیے بہت اہم ہیں۔

قرآنِ پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دینِ اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امتِ مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگانِ دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

ذخیرہ اندوزی

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"بازار میں مال لانے والے کو رزق ملتا ہے اور ذخیرہ اندوزی کرنے والا ملعون ہے۔"

گناہ گار

حضرت معمر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"گناہ گار ہی ذخیرہ اندوزی کرتا ہے۔"

فوائد و مسائل : ذخیرہ اندوزی کا مطلب یہ ہے کہ جب عوام کو کسی چیز کی زیادہ ضرورت ہو، تاجر اس وقت اپنا مال روک لے تاکہ قیمت اور بڑھ جائے۔ اس میں لالچ اور خود غرضی پائی جاتی ہے۔ ایسے شخص کے دل میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ عوام مصیبت میں مبتلا ہوں تاکہ وہ دولت جمع کر سکے۔ اس قسم کی خواہشات ایک مسلمان کی شان کے لائق نہیں۔

ذخیرہ اندوزی شرعاً ممنوع ہے اور ممنوع کام کے ارتکاب سے روزی میں حرام شامل ہو جاتا ہے۔

گناہ گار کے لفظ میں یہ اشارہ ہے کہ ایسا غلط کام وہی کر سکتا ہے جو گناہوں کا عادی ہو چکا ہو۔ جس سے کبھی کبھار کوئی گناہ کا کام ہو جاتا ہے وہ اتنے بڑے جرم کا ارتکاب نہیں کر سکتا۔

اپنی ذاتی ضروریات کے لیے مناسب مقدار میں چیز خرید کر رکھ لینا ذخیرہ اندوزی میں شامل نہیں، مثلاً اگر کوئی شخص اپنے گھر میں استعمال کے لیے سال بھر کی ضروریات کے مطابق فصل کے موسم میں غلہ خرید لیتا ہے تو وہ مجرم نہیں۔

افلاس

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔ "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا۔

"جو مسلمانوں سے کھانے پینے کی چیزوں کی ذخیرہ اندوزی کرے گا' اللہ تعالیٰ اسے جذام اور افلاس میں مبتلا کرے گا۔"

دم کرنے والے کا اجرت لینا

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم تیس سواروں کو ایک فوجی مہم پر بھیجا۔ (راستے میں) ہم کچھ لوگوں کے ہاں (ان کی بستی میں) ٹھہرے۔ ہم نے ان سے کھانا مانگا۔ انہوں نے (ہماری مہمانی کرنے سے) انکار کر دیا۔ (پھر ایسا ہوا کہ) ان کے سردار کو بچھو نے کاٹ لیا' چنانچہ وہ لوگ ہمارے پاس آئے اور کہا۔

"کیا تم میں سے کوئی شخص بچھو کاٹے کا دم کر سکتا ہے؟" میں نے کہا۔ "ہاں' میں (کر سکتا ہوں) لیکن جب تک تم ہمیں بکریاں نہیں دو گے میں اسے دم نہیں کروں گا۔"

انہوں نے کہا۔ "ہم تمہیں تیس بکریاں دیں گے (تم دم کر دو) ہم نے ان کی یہ پیش کش قبول کر لی۔

میں نے سات بار سورۃ فاتحہ پڑھ کر اس (مریض) پر دم کیا تو وہ صحت یاب ہو گیا اور ہم نے بکریاں وصول کر لیں' پھر ہمارے دل میں شک پیدا ہوا۔ (معلوم نہیں' یہ بکریاں لینا جائز تھا یا نہیں) ہم نے کہا۔

"جلدی نہ کرو حتیٰ کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو جائیں۔ جب ہم لوگ حاضر خدمت ہوئے تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا کہ میں نے یہ کام کیا ہے۔ آپ نے فرمایا۔

"کیا تجھے معلوم نہ تھا کہ یہ (سورت) دم ہے؟ بکریاں تقسیم کر لو اور میرا بھی حصہ رکھو۔"

دوسری دو سندوں سے بھی یہ روایت حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے اسی طرح مروی ہے۔

جائز رزق

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"انسان کے دل کی ایک ایک شاخ ہر وادی میں ہوتی ہے (وہ دنیوی مفاد کے لیے ہر راستے پر چلنے کے لیے تیار ہوتا ہے۔) جس شخص کا دل ہر وادی کے پیچھے پڑ جاتا ہے (دنیا کے لیے ہر مشغولیت میں گرفتار ہو جاتا ہے) اللہ کو اس کی پروا نہیں ہوتی کہ اسے کس وادی میں تباہ کر دے اور جو اللہ پر توکل کرتا ہے (اللہ کی طرف توجہ رکھتے ہوئے یقین کرتا ہے کہ جائز رزق اس کے لیے کافی ہو گا) اسے اللہ تعالیٰ انتشار سے بچا لیتا ہے (اور وہ اطمینان کی زندگی گزارتا ہے۔"

اچھا گمان

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ہر شخص کو اس حال میں موت آنی چاہیے کہ وہ اللہ کے بارے میں اچھا گمان رکھتا ہو۔"

فوائد و مسائل:

1۔ انسان کو اللہ کی رحمت کی امید اور اس کی ناراضی کا خوف' دونوں کی ضرورت ہے۔ امید اسے نیکیوں کی رغبت دلاتی ہے اور خوف اسے گناہ سے باز رکھتا ہے۔

2۔ زندگی میں امید پر خوف کا غلبہ رہنا چاہیے لیکن وفات کے وقت امید کا پہلو غالب ہونا چاہیے۔

3۔ اللہ سے حسن ظن کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے بارے میں یہ امید رکھے کہ اس کی توفیق سے زندگی میں جو نیک کام ہوئے ہیں' اللہ تعالیٰ انہیں قبول فرمائے گا اور کوتاہیوں سے درگزر فرمائے گا۔

4۔ امید کا یہ مطلب نہیں کہ زندگی میں اللہ کی نافرمانی کی عادت ہو اور نیکیوں کی طرف رغبت نہ ہو۔ جب نصیحت کی جائے تو کہہ دے۔ اللہ بہت رحم کرنے والا ہے۔ یہ امید کا غلط تصور ہے۔

ایثار

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہیں بھوک کا سامنا کرنا پڑا جب کہ وہ سات افراد تھے۔ وہ فرماتے ہیں۔

"مجھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سات کھجوریں عنایت فرمائیں۔ ہر آدمی کے لیے ایک کھجور۔"

فوائد و مسائل: 1۔ معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھی ان کی ضرورت کی خوراک نہیں تھی' اس کے باوجود جو چند کھجوریں موجود تھیں' وہی دے دیں۔

2۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم' صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دیتے تھے۔ قائد کو اپنے ساتھیوں کا اسی طرح خیال رکھنا چاہیے۔

3۔ تھوڑی چیز تقسیم کرتے وقت بھی انصاف اسی طرح ضروری ہے' جس طرح زیادہ مال کی تقسیم میں۔

4۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کا صبر و ایثار بے مثال ہے کہ ایک ایک کھجور ملی تو اسی پر اکتفا کر لیا' کسی نے زیادہ حصہ لینے کی خواہش ظاہر نہیں کی۔

روز قیامت

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اپنے والد حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں انہوں نے کہا' جب یہ آیت نازل ہوئی۔

ثم لتسئلن یومئذ عن النعیم۔

ترجمہ۔ پھر اس دن تم سے نعمتوں کے بارے میں ضرور سوال ہو گا۔"

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا۔

"ہم سے کون سی نعمتوں کے بارے میں سوال ہو گا؟

ہمیں تو صرف پانی اور کھجوریں ہی میسر ہیں۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "آگاہ رہو! یہ (سوال) ضرور ہو گا۔"

فوائد و مسائل: 1۔ جو نعمتیں ہماری نظر میں معمولی ہیں' غور کیا جائے تو وہ بھی بڑی نعمتیں ہیں' لہٰذا ان کا شکر کرنا ضروری ہے۔

2۔ معمولی سے معمولی غذا بھی بھوکا رہنے کے مقابلے میں بہت بڑی نعمت ہے۔

3۔ "آگاہ رہو! یہ ضرور ہو گا۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں' ایک یہ کہ اگر آج تمہارے پاس نعمتوں کی فراوانی نہیں ہے تو عن قریب یہ ہو جائے گی' یعنی فتوحات ہوں گی اور تمہیں وافر مقدار میں غنیمتیں حاصل ہوں گی' لہٰذا تمہیں بہت سی نعمتیں میسر ہوں گی۔ دوسرا مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ ہر ایک انسان کو دنیا میں تھوڑا بہت مال و متاع ملا ہی ہے' یعنی کسی کو کم' کسی کو زیادہ' لہٰذا قیامت کے دن ہر شخص سے' اس کو دی جانے والی ہر نعمت کے بارے میں سوال ہو گا' ہماری رائے میں دوسرا مفہوم راجح ہے۔ واللہ اعلم۔

میت پر رونے کا بیان

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک جنازے میں شریک تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک خاتون کو دیکھا (جو رو رہی تھی) تو اسے بلند آواز سے منع کیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "عمر! اسے رونے دو' آنکھوں سے آنسو بہتے ہیں' دل کو غم پہنچا ہے اور وقت زیادہ نہیں گزرا (غم تازہ ہے)۔"

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبیلہ بنو عبدالاشہل کی عورتوں کے پاس سے گزرے وہ جنگ احد میں ہلاک ہونے والے اپنے اقارب پر رو رہی تھیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"لیکن حمزہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) پر رونے والیاں کوئی نہیں۔" (یہ سن کر انصار کی خواتین آ کر حضرت

حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر رونے لگیں۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیدار ہوئے تو فرمایا۔
"افسوس! یہ ابھی واپس نہیں گئیں۔ انہیں حکم دو کہ واپس چلی جائیں اور آج کے بعد کسی مرنے والے پر نہ روئیں۔"

فوائد و مسائل : حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جنگ احد میں شہید ہوگئے۔ ان کے گھرانے کی خواتین ابھی ہجرت کرکے مدینے نہیں آئی تھیں' اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اظہار ترحم کے لیے فرمایا "حمزہ پر رونے والا کوئی نہیں۔" اس کا مقصد رونے والیوں کے عمل کی تعریف کرنا نہیں تھا بلکہ ان کی بے کسی کا اظہار تھا کہ اس موقع پر ان کے اہل خانہ بھی موجود نہیں ہیں جن کو فطری طور پر سب سے زیادہ صدمہ ہوتا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اشاروں پر فدا ہونے والے تھے۔ یہ ان کی محبت کا کمال تھا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی بات فرمائی جس سے انہیں محسوس ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے ہیں کہ حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے رویا جائے تو انصار کی خواتین فوراً تیار ہو کر آگئیں کیونکہ ان کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا دل گیر ہونا اپنے غم و حزن سے زیادہ تکلیف دہ تھا' اس لیے انہوں نے اس غم کی وجہ سے آواز سے رونا شروع کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح فرمایا کہ میرا مقصد یہ نہیں تھا' اس لیے ان خواتین کو واپس چلے جانے کا حکم دے دیا۔ میت کے گھر جمع ہو کر رونا پیٹنا اور نوحہ کرنا منع ہے بلکہ نوحہ کے بغیر بھی میت والوں کے گھر جمع ہونا منع ہے۔ دیکھیے (سنن ابن ماجہ' حدیث ۱۶۱۲) جو شخص تعزیت کے لیے آئے تو وہ تعزیت کر کے چلا جائے۔

حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔
"اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مرثیہ گوئی سے منع فرمایا۔"

نوحہ کرنے سے میت کو عذاب ہوتا ہے

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"میت پر نوحہ کیا جائے تو اس کی وجہ سے میت کو عذاب ہوتا ہے۔"

فوائد و مسائل : اگر مرنے والے نے یہ وصیت کی ہو کہ میرے مرنے پر نوحہ کیا جائے تو وہ نوحہ کرنے والیوں کے گناہ میں شریک ہے' اس لیے سزا کا مستحق ہے۔ اسی طرح اگر اس کے خاندان میں بین کرنے' بال نوچنے' گریبان چاک کرنے اور اس طرح کی حرکات کا رواج ہو اور وہ انہیں منع نہ کرے بلکہ اپنے قول و فعل سے اس کی حوصلہ افزائی کرے' تب بھی زندوں کے نوحہ کرنے کی وجہ سے اس مردے کو عذاب ہوگا' البتہ اگر فوت ہونے والا شخص ان کا عمل پسند نہیں کرتا تھا نہ اس کی حوصلہ افزائی کرتا تھا بلکہ منع کیا کرتا تھا تو اب دوسروں کے اعمال کی ذمہ داری اس پر نہیں' اس لیے اسے عذاب نہیں ہوگا۔ ممکن ہے حدیث کا یہ مطلب ہو کہ نوحہ کرنے سے میت کو تکلیف ہوتی ہے' اسے اس بات پر دکھ ہوتا ہے کہ اس کی وفات پر ناجائز کام کیے جا رہے ہیں۔

حضرت اسید بن ابو اسید رحمتہ اللہ نے حضرت موسیٰ بن ابو موسیٰ اشعری سے' انہوں نے اپنے والد (حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ) سے روایت کی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"زندہ کے رونے سے فوت شدہ کو عذاب ہوتا ہے' جب وہ (رونے والے) کہتے ہیں ہائے میرا بازو! ہائے مجھے لباس دینے والا! ہائے میری مدد کرنے والا! ہائے وہ پہاڑ (جیسی عظیم شخصیت) اور اس طرح کے الفاظ کہتے ہیں تو اسے جھڑکا اور جھنجھوڑا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے۔ "کیا تو (واقعی) ایسا ہی ہے؟ کیا تو ایسا ہی ہے؟"

حضرت اسید رحمتہ اللہ نے فرمایا۔" میں نے کہا سبحان اللہ! اللہ تعالیٰ نے تو فرمایا ہے۔ ولا تزر وازرۃ وزر

اخری" کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔"

حضرت موسیٰ رحمتہ اللہ نے فرمایا "تیرا بھلا ہو! میں تو تجھے یہ بتا رہا ہوں کہ ابو موسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مجھے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث سنائی ہے (لیکن تجھے یقین نہیں آتا) کیا تیرا خیال ہے کہ ابو موسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھا ہے؟ یا تیرا یہ خیال ہے کہ میں نے ابو موسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر جھوٹ باندھا ہے؟"

فوائد و مسائل : اس حدیث سے اس عذاب کی وضاحت ہو گئی ہے جو رونے والوں کے رونے کی وجہ سے مرنے والے کو ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اس حدیث میں رونے سے مراد محض آنسو بہانا نہیں بلکہ زبان سے نامناسب الفاظ ادا کرنا میت کے عذاب کا باعث بنتا ہے۔ حضرت موسیٰ رحمتہ اللہ نے اپنے شاگرد کے اشکال کے جواب میں سند کی صحت کی طرف توجہ دلائی' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحیح حدیث کبھی قرآن مجید کے خلاف نہیں ہوتی' البتہ بعض اوقات ظاہری طور پر اختلاف محسوس ہوتا ہے۔ ایسے موقع پر آیت اور حدیث میں اسی طرح موافقت پیدا کی جاتی ہے جس طرح قرآن مجید کی دو آیات اگر باہم متعارض محسوس ہوں تو علمائے کرام ان کی اس انداز سے وضاحت فرما دیتے ہیں کہ دونوں میں اختلاف نہیں رہتا۔ قرآن مجید کی آیت کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو اس بات پر گھمنڈ نہیں کرنا چاہیے کہ میرے آباء و اجداد میں سے فلاں صاحب بہت بزرگ اور نیک تھے' لہٰذا قیامت میں مجھے بھی نجات مل جائے گی اور نہ کسی کو اس وجہ سے حقیر سمجھنا چاہیے کہ اس کے باپ دادا نیک نہیں تھے بلکہ جو شخص نیک اعمال کرتا ہے' اسے ثواب ملے گا اور جو گناہ کرتا ہے' اسے عذاب ہوگا۔ جو شخص کسی کو نیکی کی طرف بلاتا ہے' تو نیکی کرنے والے کے برابر اسے بھی ثواب ملتا ہے۔ یہ ایک شخص کے عمل کا ثواب کسی دوسرے کو نہیں ملا بلکہ یہ خود اس کے اپنے عمل کا ثواب ہے' جو کہ اس نے نیکی کی ترغیب دی تھی۔ اس ترغیب کا ثواب دوسرے کے عمل کرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اسی طرح گناہ کی ترغیب دینے کی وجہ سے سزا میں بھی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ قرآن مجید کی آیت اس حقیقت کی تردید نہیں کرتی۔

مصیبت پر صبر کرنے کا بیان

حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"صبر ابتدائے صدمہ کے وقت ہی ہوتا ہے۔"

فائدہ : وہ صبر جو شرعاً مطلوب ہے' یہ ہے کہ جب مصیبت آئے یا غم پہنچے اس وقت اپنے آپ کو غلط حرکات و اقوال سے بچائے کیونکہ جذبات غم کی شدت کے موقع پر اپنے آپ پر قابو رکھنا اور جائز و ناجائز کے فرق کا خیال کرنا بہت مشکل ہے۔ جو شخص اس موقع پر احکام شریعت کو ملحوظ رکھتا ہے' اصل صبر اسی کا ہے جس پر اسے وہ تمام انعامات خداوندی حاصل ہوں گے جن کا قرآن و حدیث میں وعدہ کیا گیا ہے۔ بعد میں جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے' خود بخود صبر آنا شروع ہو جاتا ہے۔ یہ صبر کوئی ایسی چیز نہیں جس پر کسی کی تعریف کی جائے یا اسے ثواب کی امید ہو۔

حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اللہ سبحانہ و تعالیٰ فرماتا ہے۔
"اے آدم کے بیٹے! اگر ابتدائے صدمہ کے وقت تو صبر کرے اور حصول ثواب کی نیت کرے تو میں تیرے لیے جنت سے کم ثواب پسند نہیں کروں گا۔"

شاعری کی کہیں بھی قدر نہیں

انشاء جی

ایک اخبار کے ایک مضمون سے یہ معلوم کرکے بہت خوشی ہوئی کہ جناب جوش ملیح آبادی کی پوتی کو شاعری سے کوئی دلچسپی نہیں بلکہ وہ ستار بجاتی ہیں۔ ہماری خوشی یا اطمینان کا باعث یہ نہیں کہ خدانخواستہ ہم جوش مدظلہ کے مداح یا قدر شناس نہیں، بلکہ یہ ہے کہ ہم اپنے بھتیجے بابر میاں سے آزردہ تھے جس کا رویہ ہماری نظم و نثر کے بارے میں کچھ اسی قسم کا ہے۔ ہم نے اس عزیز مکرم کو کئی بار اپنی آزاد نظمیں سنائیں۔ افلاطون کی مابعد الطبیعات پر لیکچر دیا۔ علم عروض اور زحافات کے نکات سمجھانے کی کوشش کی۔ افراط زر کی بحث میں الجھانے کی سعی بھی کی حتیٰ کہ ایک بار یورپ کی مشترکہ منڈی اور اس کے دور رس اثرات کو بھی موضوع بحث بنایا۔ لیکن اس نے ہمیشہ جماہی لے کر ٹالا اور اپنا گلی ڈنڈا اٹھا کر گلی میں بھاگ گیا، حالانکہ وہ اب کوئی بچہ نہیں، اگلی ستمبر میں پورے دس سال کا ہو جائے گا۔

لیکن لوگوں نے اس صورت حال سے ایک نہایت غلط رائے بھی قائم کی اور وہ یہ کہ عزیز مذکور کی ادب عالیہ اور دقیق معاشی مسائل سے عدم دلچسپی بلکہ پڑھنے لکھنے سے گریز کی وجہ ہم خود ہیں، نہ ہم اس کو ان مسائل میں الجھا کر اور بڑی بڑی اصطلاحیں بول کر ڈراتے نہ وہ گلی ڈنڈے سے اتنی شیفتگی کا اظہار کرتا۔ ایسے نکتہ چینوں سے کسی کو پناہ نہیں۔ کیا عجب وہ کل جوش صاحب سے بھی یہی کہیں کہ جناب اگر آپ زبان کو لغت ہائے حجازی سے اتنا گرانبلہ نہ بناتے۔ سیدھی زبان میں شعر کہتے اور اک رنگ کا مضمون سو ڈھنگ سے باندھنے پر اصرار نہ کرتے، تو آج آپ کی پوتی ادب سے اتنی دور نہ ہوتیں کہ ستار لے بیٹھتیں۔

اب رہی یہ دلیل کہ ستار بجانا کوئی بری بات نہیں، ایک بڑا محترم آرٹ ہے اور جوش صاحب خضوع و خشوع سے بیٹھ کر پوتی کا الاپ سنتے ہیں تو ہم بھی انصاف کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے ہوئے عرض کریں گے کہ گلی ڈنڈا بھی اسپورٹس کے زمرے میں آتا ہے اور جب ہمارا لائق بھتیجا ڈنڈے سے مزے کا ٹل لگاتا ہے (ٹل کی اصطلاح جوش صاحب کیا سمجھیں گے یہ ستار یا علم موسیقی نہ باشد) تو ہم بھی واہ وا کرتے ہیں اور جب کیچ ہوتے ہیں تو اتنے لوگ اسپورٹس کے دیکھنے کو جمع ہوتے ہیں کہ ستار نوازی کی کسی محفل کو بھی نصیب نہیں ہو سکتے۔ اس موقع پر ہم اس امر سے بے خبر نہیں کہ بعض لوگ گلی ڈنڈے کو اسپورٹس میں شمار نہیں کرتے، لیکن لوگوں کا کیا ہے، وہ تو بیر کو بھی پھل نہیں گنتے۔

ان مثالوں سے اس راز پر سے بھی پردہ اٹھ جائے گا کہ بڑے بڑے علما فضلا کے لڑکے ڈاکٹر یا انجینئر کیوں بنتے ہیں اور بڑے بڑے نغز گو شعرا یعنی تلامیذ الرحمٰن کے صاحبزادگان کیوں تمباکو، صابون، ٹکٹ بیچتے نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان حضرات کو جب بیرون در کوئی سامع نہیں ملتا اور غزل لکھی رکھی ہے، لیکن کوئی مشاعرہ ہونے کی خبر نہیں، تو وہ گھر سے خیرات شروع کرنے کا اصول برتنا شروع کر دیتے ہیں۔ بس یہیں سے خرابی کا آغاز ہو جاتا ہے۔ علم کوئی ایسا بار تو نہیں کہ ہر کوئی اس کا متحمل ہو سکے۔ ہمارے ایک بزرگ دیوانہ ناگپوری اپنے ایک فرزند سے اپنے اشعار کی تقطیع کرایا کرتے تھے اور اپنی غزل اور قصیدے پر داد طلب کیا کرتے تھے۔ وہ گھر سے ایسا بھاگا کہ پھر واپس نہ آیا۔ دیوانہ صاحب ہمارے مشورے پر کئی بار اشتہار بھی دے چکے ہیں کہ عزیزم واپس آجاؤ۔ اب تمہیں کوئی غزل نہ سنائی جائے گی، لیکن کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اس کا راز حال میں کھلا۔ صاحب زادے کراچی کے ایک مشہور سینما میں گیٹ کیپر ہیں اور کتاب تو ایک طرف اخبار دیکھ کر کانپنے لگتے ہیں کہ اس میں کہیں ابا میاں کی غزل نہ چھپی ہو۔

ہماری نثر تو آپ لوگوں کے سامنے آتی ہی ہے لیکن اگر ادارہ خواتین ڈائجسٹ ہماری غزلیں چھاپنے سے صاف انکار نہ کرتا تو قارئین حضرات دیکھتے کہ شاعری میں ہمارا کیا مقام ہے۔ یہ قدر ناشناسی خواتین ڈائجسٹ والوں تک محدود نہیں، کئی بار ایسا ہوا کہ کوئی آل پاکستان مشاعرہ ہوا اور منتظمین نے ہمارا نام شاعروں کی فہرست میں دے دیا۔ اشتہار کے چھپنے کا فوری اثر ہم نے یہ دیکھا کہ مشاعرے کے ٹکٹ بکنا بند ہو گئے اور جن لوگوں نے پہلے خرید رکھے تھے انہوں نے اپنی رقم کی واپسی کا تقاضا شروع کر دیا۔

ہمیں اس صورت حال پر ہمیشہ ملال ہوتا تھا۔ لیکن ہمارے ایک ناصح مشفق نے کہا کہ بڑے آدمی کی قدر اس کے اپنے ملک میں کبھی نہیں ہوتی، کسی اور ملک میں جا کر کوشش کرو۔ ہمارا چین جانا ایک طرح سے اسی پلان کے تحت تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے سب ہی مقولے ہمیشہ ٹھیک ثابت نہیں ہوتے۔ پیکنگ میں ڈاکٹر عالیہ امام نے ایک روز ایک محفل کا بندوبست کیا جس میں پاکستانی سفارت خانے کے کچھ افسر اور ان کی بیگمات بھی تھیں۔ ہم نے اپنی طرف سے اپنی بہترین غزل نکال کر پڑھی، کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ تھوتھا سا منہ بنا کر بیٹھے دیکھتے رہے۔ عالیہ بیگم نے ضرور بے دلی سے ایک بار واہ واہ کی۔ اب ہم نے ایک اور غزل عرض کی۔ اس کا نتیجہ بھی یہی نکلا۔ غزلیں تو ہم اپنی جیب میں حسب عادت بارہ چودہ لے کر گئے تھے۔ لیکن یہ رنگ محفل دیکھ کر معذرت کر دی کہ اب کچھ یاد نہیں۔ کچھ صاحبان نے اس پر اطمینان کا سانس لیا۔ البتہ ہمارے بالکل قریب جو بیگم صاحبہ بیٹھی تھیں ان کو کچھ ہمارا خیال ہوا اور ہمارے کان کے پاس منہ لا کر پوچھنے لگیں۔

”غزلیں جو آپ نے پڑھیں کیا آپ کی اپنی لکھی ہوئی تھیں، آپ شاعر ہیں کیا؟“

ہمارا خیال ہے ہم کچھ دیر اور بیٹھتے تو لوگ ہم سے جگر یا شکیل بدایونی کا کلام خوش الحانی سے پڑھنے کی فرمائش کرتے بلکہ کیا عجب ہمیں حاضرین کے پرزور اصرار پر کسی تازہ پاکستانی فلم کے گانے بھی سنانے پڑتے۔

☆

ڈرامہ سیریل "میرا نصیب" کی نازیہ

سائرہ یوسف سے ملاقات

شاہین رشید

شوبز کی لڑکیوں کو عام طور پر بہت بولڈ اور تیز طرار سمجھا جاتا ہے لیکن سب لڑکیاں ایسی نہیں ہوتیں.... سائرہ یوسف اگرچہ پروگراموں میں بہت بولڈ نظر آتی ہے لیکن درحقیقت وہ ایسی نہیں ہے۔ وہ بات کرتی ہے تو انتہائی دھیمے اور شرمیلے لہجے میں۔ بہت ادب اور تمیز کے ساتھ۔

آج کل آپ سائرہ یوسف کو ڈرامہ سیریل "میرا نصیب" میں نازیہ کے روپ میں دیکھ رہے ہیں۔

"کیسی ہو سائرہ.... کتنے عرصے سے میں چاہ رہی تھی کہ تمہارا انٹرویو کروں مگر ہو ہی نہیں پا رہا تھا۔"

"جی میں جانتی ہوں۔ آئی ایم سوری۔ کچھ مصروفیات ہی اتنی زیادہ تھیں کہ ٹائم ہی نہیں ملتا تھا۔"

"میرا نصیب" میں بہت اچھا پرفارم کر رہی ہو اور بہت خوب صورت بھی نظر آ رہی ہو.... تمہاری بہنیں بھی تو اس فیلڈ میں ہیں ان کے بارے میں بتاؤ۔"

"جی مجھ سے بڑی بہن علشبہ (Alishba) ہیں جو کہ ڈراما سیریل "میں عبدالقادر ہوں" میں زرین کا رول کر چکی ہیں اور جو مجھ سے چھوٹی ہے وہ پلوشہ ہے وہ ہوسٹنگ کرتی ہے۔"

"کتنے بہن بھائی ہو تم لوگ اور تمہارا نمبر کون سا ہے؟"

"میرا نمبر تیسرا ہے اور ہم چار بہنیں ہیں۔ بھائی کوئی نہیں ہے۔"

"بھائی کی کمی محسوس ہوتی ہے؟ لوگ کہتے ہیں کہ بھائی ضرور ہونا چاہیے کہ بہنیں کنٹرول میں رہتی ہیں۔"

"میری خواہش اس سینس میں ہے کہ اگر ہمارا بھائی ہوتا تو کیسا ہوتا اور یہ احساس اس وقت ہوتا ہے جب میں اپنی دوستوں کے بھائیوں کو دیکھتی ہوں لیکن جہاں تک کنٹرول کی بات ہے تو ہم تو اپنے امی ابو کی بات مانتے ہیں اور ان کا ہم پر کافی کنٹرول ہے۔ انہوں نے ہماری تربیت بہت اچھے انداز میں کی ہے۔"

"میرا نصیب" میں جو کردار تم کر رہی ہو اس کے لیے تمہارا انتخاب ہوا تھا یا کسی اور رول کے لیے ہوا اور پھر یہ رول ملا؟"

"میرا انتخاب اسی رول کے لیے ہوا تھا اور مجھے مومنہ درید صاحبہ نے فون کیا تھا.... اور اس سیریل سے قبل انہوں نے مجھے سیریل "داستان" کرنے کے لیے بھی کہا تھا مگر کچھ وجوہات کی بنا پر میں وہ سیریل کر نہیں پائی تھی پھر اب انہوں نے مجھے "میرا نصیب" کے لیے فون کیا.... تو میں نے کہا کہ ٹھیک ہے میں کروں گی۔ پھر ہماری ان کے ساتھ میٹنگ ہوئی تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ اس سیریل میں "نازیہ" کا ایک کردار ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ وہ تم کرو.... میں نے ہاں کر لی۔ کیونکہ میں نے سوچا کہ ایک معصوم لڑکی کا کردار ہے تو آسانی سے ہو جائے گا۔ لیکن میں تو یہی کہوں گی کہ اداکاری اداکاری ہی ہوتی ہے اور پھر ویسے بھی میرا یہ پہلا سیریل تھا۔"

"تو کیا اداکاری مشکل لگ رہی ہے؟"

"میرا خیال تھا کہ مجھے کوئی مشکل نہیں ہو گی۔ لیکن جب ڈائیلاگ ڈیلیوری کے ساتھ ایکسپریشن دینا اور سین کا جو جذباتی ماحول ہوتا ہے اس کو دیکھنا ہوتا ہے تو سب چیزوں کو ایک ساتھ کرنا مشکل ہو جاتا ہے تو میں تو یہی کہوں گی کہ اداکاری کرنا مشکل ہے۔"

"ظاہر ہے کہ چاروں طرف کیمرے، پھر لوگ، پھر بار بار ری ٹیکس پریشانی تو ہوتی ہی ہو گی؟"

"کیمروں کی تو مجھے عادت ہے کیونکہ میں ہوسٹنگ بہت کر چکی ہوں جہاں تک سین کی بات ہے تو بہت کم سین ایسے ہوتے تھے جن پر ہم اٹک جاتے تھے اگر آپ کی کیمسٹری آپ کے ساتھی فنکار کے ساتھ اچھی ہو تو پھر ایکسپریشن خود بخود آ جاتے ہیں۔ ہاں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آپ بہت سیریس سین کر رہے ہوں اور آپ کو ہنسی آ جائے تو پھر اس کو کنٹرول کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔"

"کوئی سین جس کو کرتے وقت بہت ہنسی آئی ہو؟"

"میں اور میری ساتھی جو شازیہ کا رول کر رہی ہے، اس کے ساتھ سنجیدہ سین کرتے وقت تو ضرور ہی ہنسی آ جاتی تھی۔ مثلاً" ایک سین میں وہ میرے پاس آتی ہے بہت سنجیدہ شکل بنا کر اور کہتی ہے کہ میرے شوہر نے تو تمہیں پسند کر لیا ہے" اس سین میں ہم دونوں کو ہی بہت ہنسی آئی۔ حالانکہ وہ بہت سنجیدہ سین تھا۔"

"ہوسٹنگ، اداکاری، ماڈلنگ.... تینوں مشکل کام ہیں" انجوائے کہاں کرتی ہو؟"

"جب میں نے ہوسٹنگ شروع کی تو مجھے بالکل بھی آسان نہیں لگی کیونکہ مجھے کیمرے سے بہت جھجک ہوتی تھی مجھ میں خود اعتمادی بھی نہیں تھی لیکن جب آہستہ آہستہ آپ کیمرے کے عادی ہو جاتے ہیں تو پھر خود اعتمادی بھی آ جاتی ہے اور تب پھر آپ کی شخصیت میں چھپی صلاحیتیں باہر آنا شروع ہو جاتی ہیں۔

کمرشل کرنا سب سے آسان ہوتا ہے کیونکہ اس

میں ڈائریکٹر آپ کی بہت مدد کرتا ہے بس آپ کو ایک سین بتایا جاتا ہے اور وہ آپ کو کرنا ہوتا ہے۔ کبھی کبھار ہی مشکل پیش آتی ہے ورنہ تو آسانی سے ہو جاتا ہے۔"

"تم نے اے لیول تک تعلیم حاصل کی ہے۔ اب اس فیلڈ میں قدم جمانے ہیں یا مزید تعلیم حاصل کرنا ہے؟"

"جی اس فیلڈ میں بھی قدم جمانے ہیں اور مجھے ان شاء اللہ شیف chef بننا ہے کیونکہ مجھے کوکنگ کا بہت شوق ہے اور میری خواہش ہے کہ میں شیف بن کے اپنا ریسٹورنٹ کھولوں ... یا پھر جہاں سے پڑھ کر آؤں پہلے وہاں چھ مہینے کام کروں، تجربہ حاصل کروں، اور پھر پاکستان میں اپنا ریسٹورنٹ کھولوں۔"

"اس فیلڈ میں کیسے آئیں؟ گھر والوں نے آسانی سے اجازت دے دی؟"

"ابو کو تو بالکل بھی اچھا نہیں لگتا تھا کہ ہم بہنیں اس فیلڈ میں آئیں۔ وہ تو ہمیشہ سے شوبز کے خلاف تھے۔ جب علیشبہ چھوٹی تھی تو اسے کام کی آفر آئی تھی تو جن لوگوں نے آفر دی انہوں نے میری دادی کو کنوینس کیا اور جب میری دادی کنوینس ہو جاتی تھیں تو پھر ابو کو کنوینس کرنا مشکل نہیں ہوتا تھا ... اس کے بعد ہم پشاور چلے گئے۔ تین سال کے بعد واپس کراچی آئے تو علیشبہ کو پھر آفر آئی۔ تو میں بھی ان کے ساتھ آڈیشن پہ چلی گئی، میرا کوئی ارادہ نہیں تھا آڈیشن دینے کا لیکن ان لوگوں نے پکڑ کر کرا کے مجھ سے ایکٹنگ کروالی اور پھر فوراً ہی ایک پروجیکٹ مل گیا مجھے۔"

"کیا تھا پہلا پروجیکٹ۔ پہچان کس نے دی؟"

"پہلا پروجیکٹ ایک آئس کریم کا کمرشل تھا۔ آج تک لوگ مجھے اسی کمرشل سے ہی پہچانتے ہیں۔ وہ کمرشل بہت زیادہ چلا تھا آج بھی لوگ مجھے ملتے ہیں تو اسی کمرشل کا ذکر کرتے ہیں۔ بس اسی کے بعد تو مجھے کمرشل پہ کمرشل ملتے ہی چلے گئے اور سب ہی اچھے برانڈ کے تھے۔ اس کے بعد یعنی دو سال کمرشلز کرنے کے بعد مجھے ایک پروگرام کی ہوسٹنگ کرنے کو ملی۔ پروگرام کا نام تھا "بیچیہ فرائی" اس سے مجھے بہت شہرت ملی۔ اس کے بعد "موسٹ وانٹڈ" کرتی تھی جو کہ لائیو شو ہوتا تھا اس نے مجھے کافی پہچان دی۔"

"بے شک تم پہلے سے ہی جانی پہچانی شخصیت تھیں۔ لیکن کیا یہ صحیح نہیں کہ تمہیں ڈرامے سے زیادہ شہرت ملی ہے۔"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں ... جو شہرت ڈرامے سے ملتی ہے وہ بالکل مختلف ہوتی ہے، کیونکہ ڈرامے ہر کوئی دیکھتا ہے۔"

"تمہاری شکل بہت معصوم ہے اور "میرا نصیب" میں بھی رول بہت معصوم ہے اگر کبھی نگیٹو رول کرنا پڑے تو؟"

"جب انسان ایکٹنگ میں آجاتا ہے تو پھر اس کا دل چاہتا ہے کہ وہ ہر طرح کے رول کرے۔ اگر مجھے نگیٹو رول ملا تو میں یہ دیکھوں گی کہ وہ بولڈ نہ ہو کیونکہ مجھے اندازہ ہے کہ اگر میں بولڈ اداکاری کروں گی تو میرے امی ابو کو بھی پرابلم ہوگی اور مجھے خود بھی اچھا نہیں لگے گا۔ سو بولڈ کردار میں نہیں لیتی، نگیٹو رول میں مجھے کوئی پرابلم نہیں ہے۔ ایگریسو رول ہو۔ مجھے کوئی پرابلم نہیں ہے۔"

"بولڈ کردار سے کیا مراد ہے۔ ڈریسنگ کے معاملے میں یا ڈائیلاگ کے معاملے میں یا شوخ و چنچل لڑکی کے معاملے میں؟"

"تینوں معاملات میں، میری امی کی خاص ہدایت ہے کہ تم سیلولیس نہیں پہنو گی یا بہت زیادہ ڈیپ گلے نہیں پہنو گی ... کیونکہ میں عام لائف میں بھی بغیر آستین کے کپڑے بہت کم پہنتی ہوں اس لیے ایسے کردار لینے سے پرہیز کرتی ہوں جو لباس کے معاملے میں اور ڈائیلاگ کے معاملے میں بولڈ ہوں۔ ٹی وی ایک ایسا میڈیا ہے جہاں فیملی کے لوگ ایک ساتھ بیٹھ کر پروگرام دیکھتے ہیں اور میں کوئی ایسا کردار نہیں کرنا چاہتی کہ مجھے فیملی کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔"

"کیا زندگی کسی ایک شخص کی وجہ سے بدل سکتی ہے؟"

"نہیں، میرا نہیں خیال کیونکہ آپ زندگی میں بہت سے لوگوں سے ملتے ہیں اور بہت سے لوگوں کا مشاہدہ کرتے ہیں تو مختلف لوگوں کی وجہ سے تو زندگی میں چینج آسکتا ہے مگر کسی ایک کی وجہ سے نہیں۔"

"گڈ ... کچھ پرسنل لائف کے بارے میں بھی بات ہو جائے۔ کچھ فیملی بیک گراؤنڈ بتاؤ؟"

"جی میں 20 اپریل 1988ء کو کراچی میں پیدا ہوئی۔ ہمارا تعلق افغانستان سے ہے۔ امی افغانستان میں پیدا ہوئیں، ابو کوئٹہ میں اور ابو کے آباؤ اجداد کا تعلق بھی افغانستان سے ہے۔ ابو کا اپنا ایک چھوٹا سا بزنس ہے۔ آج کل طبیعت کچھ ٹھیک نہیں رہتی تو زیادہ تر گھر پر ہی ہوتے ہیں اور بہنوں کے بارے میں تو میں آپ کو بتا ہی چکی ہوں۔"

"غلطی کر کے غلطی کا احساس ہوتا ہے؟ یا شرمندگی ہوتی ہے؟"

"میں پوری کوشش کرتی ہوں کہ میں کوئی ایسی غلطی نہ کروں کہ جس کی وجہ سے مجھے بعد میں شرمندگی ہو، کیونکہ وہ شرمندگی پھر مجھے بہت بے چین رکھتی ہے تو اللہ کا شکر ہے کہ میں نے ابھی تک نہ کسی کو کوئی دکھ پہنچایا ہے کہ مجھے شرمندگی ہو یا احساس ہو کہ میں نے برا کیا ہے اور نہ ہی میں نے کسی کو اپ سیٹ کیا ہے۔ بس کبھی کبھی امی کے ساتھ دلائل دینے میں میرا لہجہ سخت ہو جاتا ہے تو پھر اس کا احساس مجھے دیر تک رہتا ہے۔"

"اپنے ڈرامے دیکھتی ہو یا انڈین؟"

"میری امی پہلے انڈین ڈرامے شوق سے دیکھا کرتی تھیں تو پھر میں بھی ان کے ساتھ بیٹھ کر دیکھ لیا کرتی تھی اور میں سمجھتی ہوں کہ پہلے تو کچھ بہتر ہوتے تھے

انڈین ڈرامے مگر اب بہت خراب ہو گئے ہیں اب ہمارے ڈرامے بہت اچھے ہو گئے ہیں تو اب امی بھی اپنے پاکستانی ڈرامے زیادہ شوق سے دیکھتی ہیں۔"

"دل چاہتا ہے کہ تم ایک انڈین فنکارہ ہوتیں؟"

"جی نہیں ہرگز نہیں، ہمارا ملک پاکستان ہے یہ ہماری پہچان ہے اور ویسے مجھے لوگ کہتے رہتے ہیں، "تمہاری شکل فلاں سے ملتی ہے، فلاں سے ملتی ہے، میں کہتی ہوں ہاں ٹھیک ہے سب سے ملتی ہے میری شکل۔"

"تم بتا رہی ہو کہ امی سے کبھی لہجہ تھوڑا سخت ہو جاتا ہے تو کیا غصے کی تیز ہو تم؟"

"بہت بہت تیز ہوا کرتی تھی ... اب تو میں کچھ بہتر ہو گئی ہوں۔ کافی حد تک میرا غصہ کم ہو گیا ہے۔ پھر بھی اگر غصہ آجائے تو کنٹرول کرنا مشکل ہو جاتا ہے ... اور ری ایکشن یہ ہوتا ہے کہ نہ چاہتے ہوئے بھی میں تھوڑی روڈ (Rude) ہو جاتی ہوں اور جو منہ میں آتا ہے کہہ دیتی ہوں۔"

"اپنے فیوچر کے بارے میں کیا امیدیں ہیں؟"

"فیوچر تو اپنا برائٹ ہی دیکھتی ہوں۔ ویسے تو جو اللہ

کو منظور ہو گا وہ ہی ہو گا' انسان کے اختیار میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

"جھوٹ بولتی ہو کیا؟"

"سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے جھوٹ بولنے والے لوگ بہت برے لگتے ہیں۔ اس لیے میں بھی کوشش کرتی ہوں کہ جھوٹ نہ بولوں' کیونکہ پھر مجھے بھی لوگ پسند نہیں کریں گے' کسی کو بچانے کے لیے' کرانسس سے نکالنے کے لیے جھوٹ بولنا پڑے تو ضرور بولتی ہوں۔"

"انسان جہاں کام کرتا ہے' وہ فیلڈ بھی اچھی لگ رہی ہوتی ہے اور ماحول بھی' تم نے اس فیلڈ میں کوئی برائی دیکھی؟"

"ہاں جی۔۔۔ وہ یہ کہ آپ کو بہت بری نظر سے دیکھا جاتا ہے کہ پتا نہیں یہ کون ہیں' اور۔۔۔"

"شہرت پا کر مزا آرہا ہے؟ لوگ ملتے ہیں تو کیا کہتے ہیں؟"

"جی شہرت پا کر بہت اچھا لگ رہا ہے' لوگ پہچان لیتے ہیں' میرے کام کی تعریف کرتے ہیں تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔"

"اپنی کوئی اچھی اور بری عادت بتاؤ۔"

"اچھی عادت تو یہ ہے کہ کسی کی برائی نہیں کرتی اور بااخلاق ہوں اور بری عادت یہ ہے کہ منہ پھٹ ہوں۔ جو منہ میں آتا ہے بول دیتی ہوں۔ کوئی بات دل میں نہیں رکھتی۔"

"فضول خرچ ہو؟"

"اگر خرچ بھی کرتی ہوں تو اپنی فیملی پہ خرچ کرتی ہوں اور اگر کوئی فضول خرچی کی بھی ہے تو اپنے پیسوں سے اپنے لیے گاڑی خریدی ہے۔"

"اس فیلڈ میں آنے کے بعد زندگی میں کوئی تبدیلی آئی۔"

"مجھے نہیں لگتا کہ مجھ میں کوئی چینج آیا ہے اور اگر آیا بھی ہو گا تو بہت معمولی اور وہ بھی اس حد تک کہ اب مجھے اس بات کا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ مجھے اپنے گھر کو کتنا وقت دینا ہے۔ اپنے کام کو کتنا وقت دینا ہے' اور جب میرے پاس وقت ہوتا ہے تو میں گھر میں اپنی فیملی کے ساتھ ہی رہتی ہوں۔ اس لحاظ سے اپنے آپ کو مختلف سمجھتی ہوں کہ عام لڑکیاں جو اس فیلڈ میں نہیں ہیں انہیں زیادہ پرابلمز فیس نہیں کرنے پڑتے۔"

"ملک سے باہر جاتی ہو' دنیا دیکھتی ہو' اپنے ملک کے بارے میں کیا سوچتی ہو؟"

"باہر جا کر دنیا کی ترقی دیکھ کر بہت رشک آتا ہے' اپنا ملک ہے' فکرمند تو ہوتی ہوں' مگر سچ پوچھیں تو پاکستان کا فیوچر برائٹ نظر نہیں آتا۔"

"نوجوانوں کی سوچ بہت مختلف ہوتی ہے' اگر تم پاور میں آجاؤ تو کیا کرو گی اس ملک کے لیے؟"

"سب سے پہلے تو میں ایجوکیشن پہ کام کروں گی' کیونکہ ہمارے یہاں لٹریسی ریٹ بہت کم ہے۔ اگر لوگ پڑھے لکھے ہوں گے تو یہ جو آئے دن ہنگامے ہوتے ہیں' کم سے کم یہ نہیں ہوں گے۔"

"ہاں یہ تو ہے' تم نے اے لیول کیا ہے اور اے لیول کرنے والوں کی اردو اتنی اچھی نہیں ہوتی اور پھر تم افغانی بھی ہو تو گھر میں کون سی زبان بولتی ہو؟"

"جی۔۔۔ گھر میں ہم لوگ فارسی بولتے ہیں اور میری اردو بہت اچھی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو کو میں نے کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ اسکول میں بھی اردو بہت شوق سے پڑھتی تھی اور پھر اے لیول میں بھی میں نے اردو لی تھی۔ اے لیول کی تو اردو بھی بہت مشکل ہوتی ہے اس لیے اردو اچھی ہے۔"

"اسکرپٹ آسانی سے یاد ہو جاتا ہے۔"

"جی بالکل۔۔۔ بہت آسانی سے یاد ہو جاتا ہے۔"

اور پھر ہم نے سائرہ یوسف سے اجازت چاہی۔

خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com

صغرا۔ شہدادپور

[illegible]

[illegible] وفا ہیں' مگر پوری طرح سے نہیں کیونکہ [illegible] اداکاریاں بہر نہیں۔ نمل نے شاید آزر کو اس لیے [illegible] کہیں اس کو آزر ہی نہ چھوڑ دے' شاید وہ نور کے ساتھ ہونے والے حسن کے سلوک سے ڈر چکی تھی۔

[illegible] اس بات کا ہے کہ حسن نے جو چاہا اس کو ملا' مگر کوئی [illegible] نہیں ملی' آمنہ جی حسن کو کوئی سزا تو دیتیں' وہ بہت [illegible] ہو گیا تھا۔ رمشا خالد خان کیا نئی رائٹر ہیں؟

"دل کی راہ گزر پر" ایک بہترین کاوش تھی۔ خاص کر اس کا اک جملہ "حیا ہماری آنکھ میں ہوتی ہے' لازمی نہیں کہ ہمیں دیکھنے والی آنکھ بھی حیا سے لبریز ہو' ورنہ خود ہی سوچو اگر آنکھ کی حیا کافی ہوتی تو اسلام میں حیا کے ساتھ ساتھ پردے کا حکم کیوں ملتا۔" ویل ڈن رمشا جی بہت خوب۔ "بھرم" بہت دلکش افسانہ تھا۔ حنا نے تھوڑا صبر کر کے ارم سے بنائے رکھی۔ سچ بھی یہ ہی ہے' صبر کا پھل [illegible] ہوتا ہے۔

"[illegible]" میں خالہ کوثر کا فیصلہ بہت پسند آیا۔ کام چور اور [illegible] گرل بھی اچھے افسانے تھے۔ (مصحف) نمرہ احمد کی ایک بہترین کاوش۔

نمرہ جی سچ پوچھیے تو میں نے کور میں لپٹے قرآن مجید کو دیکھا تو میری آنکھیں شرم سے جھک گئیں۔ مجھے شرم آئی کہ میں مسلمان ہوں۔ دل میں اک ٹیس اٹھی کہ نہ جانے کتنا وقت میں نے ضائع کر دیا ہے اپنی زندگی کا' ہم بھول [illegible] کو ایک رہنما کتاب سے نوازا ہے' [illegible] میں ہر بات کا حل ہے۔ یقین کریں نمرہ جی اگر میں نے اتنے عرصے کے بعد قرآن مجید کو چھوا ہے تو بس آپ کی اسٹوری پڑھ کر۔ اب جب میں قرآن پڑھتی ہوں تو میری سمجھ میں نہیں آتا' نظر قرآن مجید میں ہوتی ہے' ذہن بھٹک رہا ہوتا ہے۔ تفسیر بھی پلے نہیں پڑتی۔

ج۔ صغرا! حسن اور نمل کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جن کی زندگی میں ظاہری اور مادی چیزیں اہمیت رکھتی ہیں۔ وہ زندگی میں بہترین کا انتخاب کرتے ہیں۔ اور اس کے لیے عذر' جواز تراش لیتے ہیں۔ حسن جب کچھ نہیں تھا تو اس کے لیے سب کچھ نور ہی تھی' جب اسے احساس ہوا کہ اسے ایک ڈھلتی عمر کی عورت کے بجائے کم عمر لڑکی مل سکتی ہے تو اس نے فوراً" راستہ بدل لیا۔ نمل کا مسئلہ پیسہ تھا۔ مرد کی بے وفائی کا راگ تو وہ بلاوجہ ہی الاپتی تھی۔ آزر کا انتخاب بھی اس نے پیسے کی بنا پر کیا تھا' اسے مجبور کر کے سی اے کروایا' لیکن جب اس کی جاب اور جائیداد نہ رہی تو اس نے فوراً" فیصلہ بدل لیا' بے وفائی دراصل نفس پرست' خود غرض اور بے حس انسانوں کی سرشت میں

شامل ہوتی ہے' وہ صرف اپنی خواہشات کو مدنظر رکھتے ہیں۔ جواز تو کوئی بھی بنایا جا سکتا ہے۔

نفیسہ ارم۔۔۔ چک نمبر 338 ج ب ٹوبہ ٹیک سنگھ

مدت سے خواتین' شعاع اور کرن پڑھتی آرہی ہوں۔ لیکن کسی بھی تحریر نے اتنا متاثر نہیں کیا جتنا اس ماہ ام طیفور کے افسانے کی جیٰ جنج نے۔ اتنا پیارا افسانہ اتنی اچھی اور اہم بات اتنے اچھے انداز میں بیان کیا کہ دل خوش کردیا۔ اس ماہ پورا خواتین ہی روح افزا کا کام دے رہا ہے۔ راحت جبیں کا ناول تم سے مل کے' آمنہ ریاض کا "مرگ وفا" رمشا خالد کا افسانہ سب کچھ ہی بہترین ہے۔ آمنہ ریاض آپ کا ناول بہت اچھا ہے' مگر جس طرح حسن کی خود غرضی اور نوری کا ایثار دکھایا ہے۔ اگر اینڈ میں آپ تھوڑا سا یہ بھی دکھائیں کہ کسی کا دل دکھانا خدا کو بھی پسند نہیں تو آپ کی تحریر پڑھ کر بچیاں اپنے دل سے محبت اور ایثار کو ختم نہ ہونے دیتیں۔

میں آپ لوگوں کی بہت قدر کرتی ہوں جو آپ ہمیں اس گھٹن زدہ مسائل کے انبار جیسے حالات میں ایسی تحریریں پڑھنے کا موقع دیتے ہیں۔ چراغ آخر شب کہانی نہیں لگتی بلکہ ایسا لگتا ہے جیسے مصنفہ کو چند عنوان دیے جن پر وہ ہر صفحے پر ایک ایک مضمون لکھ رہی ہیں پورا سین گزر جاتا ہے مگر پتا نہیں چلتا یہ کس کردار کے بارے میں ہے۔

ج: پیاری نفیسہ! چراغ آخر شب روایتی انداز کے ناولوں سے ہٹ کر ہے اس میں پاکستان کی تاریخ کے مختلف ادوار سامنے آتے ہیں' اس لیے آپ کو ایسا محسوس ہوا' یہ ناول سرسری انداز سے پڑھنے کے بجائے قدرے یکسوئی اور توجہ کا متقاضی ہے۔

خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

جویریہ ابراہیم۔۔۔ ای میل

نمرہ احمد کا ناول "مصحف" پڑھنے کے لیے خوشی خوشی کھولا تو رونے کو دل چاہ رہا ہے۔ "چراغ آخر شب" دو مرتبہ شامل ہے "سفال گر" کے چند صفحات ہیں۔ اب میں کیا کروں؟ پاکستان میں تو نہیں ہوں کہ دوسرا رسالہ خرید لوں۔

ج: پیاری جویریہ! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ بائنڈنگ کی غلطی سے آپ اپنی پسندیدہ تحریریں نہ پڑھ سکیں۔ آپ اپنا ایڈریس بتادیں۔ ہم کوشش کریں گے کہ جون کا شمارہ آپ کو پوسٹ کردیں۔

نمرہ۔۔۔ گڑھی یاسین ضلع شکارپور

نمرہ احمد جی نے خط لکھنے پر مجبور کردیا' اتنی بہترین کہ تعریف کروں تو الفاظ کم پڑ جائیں' بہت ہی بہترین طریقہ سے آپ نے قرآن پاک کو سمجھایا ہے۔ "سفال گر" کی پہلی قسط پڑھی تو بہت بور ہوئی' کیونکہ تب کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا' پر اب میری پسندیدہ کہانیوں میں سے ہے "تم سے مل کے" بھی بہت اچھی لگی پڑھ کر مزا آیا۔ "مرگ وفا" بھی اچھی رہی پر ایک بات سمجھ نہیں آئی کہ جب نوری اور حسن ملے تو آپ نے ان کو آدم اور حوا کیسے کہا؟ دل کی راہ گزر بھی اچھی رہی افسانے سب ہی اچھے تھے عفت سحر جی تو کہیں گی کہ ذمیرٹ اور رو بجانے کے ساتھ جلد حاضر ہو جائیں ہو مخمل کی معنی بتادیں۔

ج: نمرہ خواتین کی محفل میں خوش آمدید او دعائیں۔ نوری اور حسن کو آدم اور حوا اس حوالے سے کہا گیا تھا کہ ہم سب آدم اور حوا ہی کی اولاد ہیں۔

مخمل کا مطلب آپ نے خط لکھا' ہمیں بہت اچھا لگا' اب باقاعدگی سے لکھتی رہیے گا۔

نسیم ناز کھوکھر۔۔۔ دادو مہیڑ

بڑی مشکل سے جون کا شمارہ میرے ہاتھوں میں آیا۔ پہلے "مصحف" کی طرف دوڑ لگائی' بڑی حیرت اور خوشی ہوئی کہ فرشتے اور مخمل بہنیں نکلیں' آغا جان پہ بڑا غصہ آیا۔ نمرہ جی مخمل کو اتنا نہ مروایا کریں' دکھ ہوتا ہے۔

پھر آئی راحت جبیں جی تک علی کا کردار دلچسپ تھا۔

"آمنہ ریاض" جی کیا خوب لکھا آپ نے۔ میں مخمل! کی بات سے سو فیصد متفق ہوں' مرد اول درجہ کے بے وفا ہوتے ہیں۔

"ام طیفور" جی بہت اچھا لکھا آپ نے بھی۔ خالہ کوثر کا کردار بھی زبردست تھا۔ ان کی بہن کا سن کر مجھے تو واقعی رونا آگیا جی۔

"سلویٰ بٹ" جی نے بھی خوب لکھا۔ راحت نذیر اور رابعہ فیاض جی نے اچھا لکھا۔ اور ہاں! نایاب جیلانی آسیہ رزاقی اور نعیمہ جی کہاں ہیں؟

ج: پیاری نسیم! معذرت کہ آپ کے پچھلے خطوط شامل نہ ہو سکے۔ نایاب جیلانی ان شاء اللہ آئندہ ماہ شامل ہوں گی۔

آسیہ رزاقی اور نعیمہ ناز اس ماہ شامل ہیں۔

یہ بتائیے کہ آپ کو جون کا شمارہ مشکل سے کیوں ہاتھ آیا۔ کیا آپ کے شہر میں پرچہ آسانی سے دستیاب نہیں ہے؟

آمنہ زرین۔۔۔ گکھڑ منڈی

لاہور سے اسلام آباد براستہ جرنیلی سڑک جاتے ہوئے آپ گکھڑ سے نہ گزریں یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ گکھڑ منڈی سرکاری طور پر قصبہ ہے۔ آپ حیران مت ہوں کہ یہ غیر سرکاری قصبہ کیوں بنا ہوا ہے۔ قصہ کچھ یوں ہے کہ میرے پیارے قصبے کے بڑے بوڑھے لوگ اس کو زبردستی شہر کہلوانا چاہتے ہیں۔ ان کے خیال میں جی ٹی روڈ کے اطراف میں رنگ برنگی عمارتیں' ایک آدھ اسپتال اور سڑکوں پر لہریں بہریں ہونے کی وجہ سے گکھڑ کے ساتھ منڈی کا الحاق ناگزیر ہے' بلکہ گکھڑ کی جدت پسندی کے منافی بھی۔

کم از کم مجھے اپنی بنیادوں سے خواہ مخواہ جان چھڑانے کا سودا نہیں ہے۔ قانون سازی کے بغیر اس قسم کی ترامیم کی حقیقت ہو بھی کیا سکتی ہے؟

خیر۔۔۔ یہ وہی گکھڑ ہے' جس کا ذکر مستنصر حسین تارڑ اپنے انٹرویو میں بچپن کا تذکرہ کرتے ہوئے ضرور کرتے ہیں' جس کی غلہ منڈی کی اجناس اپنی عمدگی کی بنا پر دور دور تک مشہور ہیں۔ کاشت کاری کے بعد دوسرا اہم پیشہ جس سے زیادہ تر لوگ وابستہ ہیں' پولٹری کا ہے' جو علاقہ بھر کی مانگ کا بڑا حصہ فراہم کرتی ہے۔

اور خاص الخاص۔۔۔ کی پہچان دری سازی کی صنعت ہے۔ کھڈی جو ہر چوتھی گلی میں چلتی ہے۔ جہاں' ہنرمند کاری گروں کا ہنر دری کی صورت پورے پاکستان میں جانا جاتا ہے اور اپنے علاقے کا دل آویز پیارا تعارف ہے۔

اس چھوٹے سے قصبے میں' سڑک کے دونوں اطراف دریوں کی قدیم دکانیں موجود ہیں' جو پہلے کی نسبت کچھ کم ہیں' لیکن پھر بھی کافی ہیں۔

خود میرے خاندان کا آبائی کاروبار یہی رہا' مگر بزرگ اور تجربہ کار افراد کی رحلت اور نئی نسل کی عدم دلچسپی کی بنا پر ہماری خاندانی روایت ختم ہو چکی ہے۔

اس چھوٹے سے قصبے میں وسیع رقبے کی قدیم سرکاری عمارتیں' اس کی شان بڑھاتی ہیں' جن میں لڑکوں کے دو ہائی اسکول جو ڈی سی اسکول اور نارمل اسکول کے نام سے معروف ہیں اور ایک لڑکیوں کا ہائی اسکول خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ چند قدموں کے فاصلے پر موجود انہی عمارتوں کی ایک ہمسایہ عمارت "بلدیہ گکھڑ ہے" جو ضلعی نظام کی غلط سلط اصطلاحات متعارف ہونے سے قبل لوگوں کے لیے معروف بھی تھی اور آسانی کا ذریعہ بھی۔

ہرے بھرے درختوں کے عقب سے جھانکتی بلدیہ کی عمارت اور اس کے عقب سے جھانکتی پانی کی ٹنکی میری آنکھوں کے لیے مانوس اور محب اس لیے بھی ہے کہ اس عمارت کی راہ داریوں پر مجھے اپنے ابو کے نقش قدم ہمیشہ نظر آتے ہیں' جو اس بلدیہ کے چیئرمین تھے اور میں ان کے ساتھ دفتر جایا کرتی تھی۔

مذہبی درس گاہوں اور جید علما کے ذکر کے بغیر بھی گکھڑ ادھورا ہے۔ یہاں ہر مکتبہ فکر کے لوگ' مدرسے موجود ہیں' مگر خدا کا کرم ہے کہ فرقہ واریت کے زہر سے محفوظ ہیں۔ اپنی مدد آپ کے تحت گکھڑ منڈی میں بہت سی فلاحی تنظیمیں موثر انداز میں علاقے کے لوگوں کی فلاح بہبود کے لیے کام کررہی ہیں جو یگانگت اور اخوت کے احساس کو تقویت دیتی ہیں۔

بار بار چھوٹا سا قصبہ سن کر آپ کو شاید حیرت ہو' مگر حقیت تو یہ ہی ہے کہ ایک ضلع اور تحصیل کے درمیان موجود ہمارا قصبہ اپنی زرخیزی' مردم خیزی' سیاسی سطح پر متحرک اور پرامن علاقہ ہونے کی وجہ سے ایک خاص طرہ امتیاز رکھتا ہے۔ یہ تعارف مختصر تو ہے' مگر مکمل بھی۔ امید ہے آپ جب بھی کبھی یہاں سے گزریں گی' گکھڑ آپ کو اجنبی نہیں لگے گا۔

جی۔۔۔ تو اب رسالہ پہ ایک نظر۔

عرفانہ بتول۔۔۔ چکوال

ہم ہر پل آپ کے مشوروں، آرا، تخلیقی صلاحیتوں کے معترف رہتے ہیں۔ یہ محبت بہت پرانی اور گہری ہو چکی ہے، مگر ہر بار ہم اسے بتانا چاہتے ہیں۔ ڈائجسٹ پڑھنا اس وقت شروع کیا تھا جب عمیرہ احمد کا پہلا ناول "زندگی گلزار ہے" شائع ہوا تھا۔ اور اب نایاب جیلانی جو کہ ہر دفعہ مختلف موضوع لے کر آتی ہیں۔ میرے خط لکھنے کی وجہ نمرہ احمد کا "مصحف" اور بشریٰ سعید کا "سفال گر" ہے۔ اتنی بھرپور تحقیق، بہت منفرد طرز تحریر ہمارے دلوں کو چھو کر گزر گیا ہے۔ مگر یہ دل میں بہت کہیں گہرا اتر چکا ہے۔

ج: خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ ہمیں بھی آپ کی تائید تازہ کی ضرورت ہمیشہ رہتی ہے کہ محبت کی فطرت میں قدرت نے واقعی بچپنا رکھا ہے۔

صائمہ بشیر۔۔۔ گجرات

"چراغ آخر شب" کے لیے قارئین سے صرف اتنا کہوں گی، جن کو یہ کہانی شکل میں سمجھ نہیں آتا وہ اسے تاریخ کا مضمون سمجھ کر پڑھ لیا کریں۔ تاریخ کے ان واقعات سے پردہ اٹھایا جا رہا ہے جن کو آج تک کہانی سمجھ کر میڈیا میں کم بیان کیا گیا اور اس نسل کو کافی حد تک لاعلم رکھا گیا۔ 71ء کے سانحہ کے متعلق ایک تجزیہ نگار نے کہا، "جو ہوا بہتر ہوا" اس بات کی پروا کیے بغیر کہ آج بھی آدھے سے زیادہ بنگلہ دیشی خود کو پاکستانی کہتے ہیں۔ خیر بس یہ درخواست تھی کہ بعض اوقات پتا نہیں چلتا کہ کس کے احساسات کی بات ہو رہی ہے۔ لہٰذا کردار کا نام ضرور لکھا کریں۔ افسانے سارے زبردست تھے۔ خاص طور پر "نکی جی جنج" "پروڈکٹ گرل" "سلویٰ علی بٹ" کا تعلق کس شہر سے ہے؟

آمنہ ریاض! پلیز تنزیلہ ریاض کو بھی واپس لائیں۔ کم از کم ان کے آئیڈیاز کو آپ ہی تحریری شکل میں لے آئیں۔ انیسہ سلیم! آپ خود ہی یاد کر کے بتادیں کہ آپ نے آخری مرتبہ "ترک رسوم" پر کب لکھا تھا؟

ج: صائمہ جی! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آمنہ ریاض اور تنزیلہ تک آپ کا پیغام ان سطور کے ذریعے پہنچایا جا رہا ہے۔ سلویٰ علی بٹ کا تعلق فیصل آباد کے قریبی قصبہ سے ہے۔

ہنی ملک۔۔۔ ای میل

جون اپنی تمام تر تمازت اور دھوپ بھری لمبی دوپہروں کے ساتھ دبے پاؤں گزر رہا ہے۔ بچپن میں دن بہت لمبے لگا کرتے تھے۔ ایسی ہی ایک دھوپ بھری دوپہر تھی، جب میں نے اپنی بہن سے چھپ کر خواتین پڑھا۔ بہت بار خط لکھنے کا سوچا مگر ہمت نہ ہوئی۔ یہ میری پہلی میل ہے۔

"مصحف" کے علاوہ اس ماہ آمنہ ریاض اور راحت جبیں نے بہت اچھا لکھا۔ کیا میں خواتین میں کہانی بھجوا سکتی ہوں۔

ج: ہنی! کہانی بھجوانے کے لیے پوچھنے کی قطعاً ضرورت نہیں لیکن بذریعہ ای میل نہیں۔ ڈاک سے بھجوائیں۔ [illegible]

خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

سیما۔۔۔ کراچی

پچھلے 20 سال سے ڈائجسٹ پڑھنے والی کو نہ کبھی تعریف کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی نہ تنقید کرنے کا حوصلہ۔ کیونکہ میرا خیال ہے کہ ڈائجسٹ میں وہ ہی چھپتا ہے جو ہر لحاظ سے بہترین تحریر میں شامل ہو سکے۔

مگر رفعت [illegible] نے [illegible] پر مجبور کر دیا۔ ایسا [illegible] دل اور دماغ کے تمام سوالات رفعت نے لفظوں میں منتقل کر دیے۔ رفعت کی کہانی اس امید پر بار بار پڑھتی ہوں کہ شاید جواب بھی کبھی مل جائیں گے۔ کیا ہوا، کیوں ہوا اور کیسے ہوا ان سوالوں کے جواب تو رفعت کی تحریر میں دھیرے دھیرے ملتے جا رہے ہیں۔ مگر اب کیا کرنا ہے اور کیسے یہ ابھی باقی ہے۔ اگر ممکن ہو تو کبھی بانو قدسیہ کی کوئی تحریر بھی شامل کریں۔ نمرہ جی کیا کہوں آپ کو صرف اتنا ہی کہہ سکتی ہوں کہ قرآن سے، جس طرح آپ انسپج منٹ پیدا کر رہی ہیں وہ تو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا جا سکتا تھا۔

"کیا کوئی شخص ڈگریوں کا پلندہ لے کر آپ کے سامنے آئے اور کوسب سے بڑا مذہبی اسکالر بتائے تو آپ اس کی بات بطور دلیل مان لیں گے۔ کیا آپ کو پہلے دن ہی نہیں بتایا تھا کہ دلیل صرف قرآن یا حدیث ہوتی ہے کسی عالم کی بات دلیل نہیں ہوتی۔"

اس پر صرف اتنا ہی کہہ سکتی ہو جزاک اللہ۔

ج: سیما جی! نمرہ کی کہانی کا مقصد اور مفہوم آپ نے بالکل صحیح سمجھا اور لکھا۔ جب ہم کچھ کہنا چاہتے ہیں اور وہ بالکل صحیح مفہوم کے ساتھ پڑھنے والوں کے ذہنوں تک منتقل ہو جاتا ہے تو ہمیں بے حد خوشی ہوتی ہے۔ مسلمان قرآن و حدیث کو اپنا رہنما بنا لیں تو دین و دنیا میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

اتنی طویل خاموشی کے بعد آپ نے خط لکھا، بہت خوشی ہوئی۔ اب باقاعدگی سے شرکت کرتی رہیے گا۔

پارس بلوچ۔۔۔ ڈھرکی

[illegible] کہانی [illegible] سے پہلے [illegible] پڑھا۔ نہایت تیزی سے کہانی آگے بڑھ رہی ہے۔ بشریٰ سعید صاحبہ منظر نگاری ان غضب کی کرتی ہیں کہ بے اختیار انہیں داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ محبت کی مٹی سے گندھا ملنسار [illegible]

لیے ہر ایک کے لیے چھتر چھاؤں بنی ہوئی حکیم بیگم کا کردار مجھے بے تحاشا پسند ہے۔ ایسے لوگ شاید اب تک ناپید نہیں ہوئے تب ہی تو یہ کائنات یہ جہاں اب تک چل رہا ہے۔ احمر پر غصہ بھی آیا اور اس کی اب کی حالت پر رحم بھی۔ تقدیر کا اندھا وار انسان کو کیسے منہ کے بل گراتا ہے اس کے بعد آمنہ ریاض صاحبہ کا مکمل ناول "مرگ وفا" پڑھا۔ خودغرض لوگوں کے سوچوں کی عکاسی کرتی ہوئی کافی اچھی تحریر تھی۔

رمشا خالد کی یہ دوسری تحریر ہے جو ہم نے پڑھی۔ "دل کی راہ گزر" نہایت سادہ اور رواں انداز تحریر زبردست [illegible] ہی دلکش اسٹوری تھی۔ افسانوں میں سب [illegible] سلویٰ علی بٹ کو پڑھا۔ "نکی جی جنج" اُم [illegible] ایک اچھی کاوش تھی۔

ہم نے اپنی سویٹ سی راحت آپی کی تحریر "تم [illegible]" ہی۔ تسی گریٹ ہو راحت [illegible] ایک بار بھی مسکراہٹ ہونٹوں سے جدا نہ ہوئی۔

ج: پارس! آپ نے خط لکھا، تفصیلی تبصرہ پڑھ کر خوشی ہوئی۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

رضیہ اسماعیل۔۔۔ یزمان

میرے خط لکھنے کی وجہ آمنہ ریاض کا مکمل ناول "مرگ وفا" ہے۔ یقین کریں گی آپ آنٹی! جب یہ ناول میں نے پڑھا تو اس وقت بھی مجھ پر کچھ عجیب سی کیفیت طاری تھی اور اس کو مکمل کر کے فارغ ہوئی ہوں تو بے انتہا ڈسٹرب ہوں۔ بھلا کوئی ایسے بھی کرتا ہے جیسے حسن نے نور سے کیا اور نمل نے آذر سے کیا۔ بہرحال آمنہ ریاض ویل ڈن! آپ بھی میری ہارٹ فیورٹ رائٹرز کی لسٹ میں شامل ہو چکی ہیں۔ خواتین میں پہلی شرکت ہے میری اور آپ سے یہ بھی پوچھنا ہے کہ کہانی لکھنے کے لیے کاپی کا صفحہ استعمال کر سکتے ہیں؟ آپ کو یہ بھی بتانا ہے کہ میرے بھائی جان بھی ان رسائل کو شوق سے پڑھنا شروع ہو گئے ہیں اور اب بھی میرے کہنے پر آمنہ ریاض صاحبہ کو پڑھ رہے ہیں۔ ام طیفور ایک اچھا اضافہ ہیں اور ہم ان کو جلد ہی پھر سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ "کام چور" بہت ہی اچھی تحریر تھی۔ سلویٰ علی بٹ آپ نے "پروڈکٹ گرل" لکھ کر کمال ہی تو کر دیا۔

ج: رضیہ! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ کہانی آپ کسی بھی سائز کے کاغذ پر لکھی جا سکتی ہے کاپی کے صفحہ پر بھی لکھ سکتی ہیں۔

کرن احسان۔۔۔ ہارون آباد

نمرہ احمد نے قلم اٹھانے پر مجبور کیا ہے۔ واہ نمرہ کمال کر دیا۔ آمنہ ریاض زبردست۔ موضوع ہلکا پھلکا تھا۔ مگر ایک ہی نشست میں ناول ختم کیا اور کہیں بھی بوریت محسوس نہیں ہوئی۔ راحت جبیں سے بھی گزارش ہے اپنی ہمشیرہ ماں جائی کے آگے ہاتھ جوڑ کر کہیں لکھ دیں۔ محترمہ فاخرہ مجھے یاد نہیں میں نے آپ کی آخری بار تحریر کب پڑھی۔ راحت کی ہلکی پھلکی تحریر نے موڈ کو خوش گوار کر دیا اور یاد آگئیں اپنی فائزہ افتخار، بشریٰ سعید بھی کمال کا لکھ رہی ہیں۔ رمشا کا ناولٹ بھی چند لمحوں کے

لیے پریشانیوں سے دور لے گیا۔ افسانے سارے اچھے تھے۔

ج: کرن جی! بہت شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔

حبہ علی۔۔۔ فیصل آباد

اتنے سالوں بعد جس چیز نے مجھے لکھنے پہ مجبور کیا۔وہ جون کے شمارے میں آمنہ ریاض صاحبہ کا ناول "مرگ وفا" ہے۔

حسن نے جو نور کے ساتھ کیا وہ پڑھ کر تو میں کتنی ہی دیر ساکت بیٹھی رہ گئی۔ کیا کوئی مرد اپنی تیرہ سال کی منتظر محبت کو بھی نظرانداز کرسکتا ہے؟

نور کو اتنے سال صبر کرنے کا پھل آزر جیسے مخلص انسان کے ساتھ کی صورت ملا۔ بے شک اللہ بہتر انصاف کرنے والا ہے۔ جبیں آپی کا ناول ان کا کھٹا میٹھا ناول اس جلا دالی گرمی میں ایک خوش گوار جھونکے کی مانند لگا۔

ناولٹ میں رمشا خالد کا ناولٹ بہت پسند آیا۔ ایسی ہلکی پھلکی سی تحریریں انسان کو اس ٹینشن زدہ ماحول سے کچھ دیر چھٹکارا پانے کا سبب بنتی ہیں۔

بشریٰ آپی کی تحریر کے تعریف کے لیے تو میرے پاس الفاظ ہی نہیں ہیں۔ نمرہ احمد کا ناول ہمارے لیے مشعل راہ ہے۔ افسانوں میں پروڈکٹ گرل بھرے گیا۔

نبی! آپ آئیے ہمارے مانچسٹر میں یقین کریں مانچسٹر اب پہلے سے کافی خوب صورت ہوگیا ہے۔

ہم آپ کو امین پور بازار کی حلوہ پوری، الکوثر کا ربڑی دودھ، ہزارہ کی دال، اور تابش کی بریانی کھلائیں گے۔ وہ بھی ڈھیر ساری اور میری اماں کے ہاتھ کا اچار بھی۔ یقین کریں کہ میری اماں بہت اچھا اچار ڈالتی ہیں کہ کھانے والا انگلیاں چاٹتا رہ جاتا ہے۔ (اپنی انگلیاں اماں کی نہیں۔)

ج: پیاری حبہ! آپ کی امی کے ہاتھوں کے اچار کا سن کر تو ہمارے منہ میں پانی آگیا۔ آم کا اچار تو ہمیں بے حد پسند ہے۔ کبھی زندگی نے موقع دیا تو پاکستان کے مانچسٹر میں ضرور آئیں گے اور ان تمام مزے دار چیزوں سے لطف اندوز ہوں گے۔

تفصیلی خط اچھا لگا، اگرچہ صفحات کی مجبوری کی بنا پر شامل نہ کرسکے۔

مسرت شاہین۔۔۔ لاہور

اس ماہ کے تبصرے پر اگر آئیں تو آپ کی تمام تحاریر میں سبقت لے گیا مکمل ناول "مرگ وفا" جو ستارہ شام کی مصنفہ آمنہ ریاض کے قلم کا شاہکار تھا۔

نمرہ احمد کا مصحف مجھے حقیقت میں احساس ہوتا ہے کہ ہم لوگ رہنمائی کے لیے پیروں، فقیروں کے در کی خاک چھانتے ہیں۔ مگر گھروں میں موجود طاق پر سجے رہنما کو بھول [illegible]

[illegible]

اب آتی ہوں اپنے شکوے پر۔ میں نے بارہا مرتبہ ڈاک پر پیسے خرچ کرکے چار ناولٹ اور ایک افسانہ بھجوایا لیکن آپ نے جواب تو در کنار ذکر تک نہ کیا کہ قابل اشاعت نہیں ہے۔

ج: پیاری مسرت! خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آپ کی تحریریں ابھی پڑھی نہیں گئیں پڑھ کر ہی بتا سکتے ہیں۔

سرورق کی شخصیت	
ماڈل	نازیہ
ٹرانسپرنسی	موسیٰ رضا
میک اپ	روز بیوٹی پارلر

"کیا اب ایسا نہیں ہے تنویر؟" اس نے وہیں تکیے سے ٹیک لگائے آسان سے پوچھا۔ "دن کی بے چینی اور رات کا جاگنا دونوں ختم ہو گئے کیا؟"

"نہیں۔ شاید بے چینی تو ختم نہیں ہوئی لیکن دن اور رات کا تصور ختم ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر مجھے پتا نہیں کس قسم کی دوائیں دے رہے ہیں۔ میں دن بھر سوتی ہوں۔ رات آتی ہے تو جاگ جاتی ہوں۔ مجھے شاید یہ دوائیں نہیں لینا چاہئیں۔ میری ساس میڈیسن کے بارے میں بہت جانتی ہیں۔ وہ ہوتیں تو بہتر بتا سکتی تھیں۔" وہ خود سے بڑبڑائی۔

"میں بتا رہی تھی میرے دن اور رات نے ایک دوسرے سے جگہ بدل لی ہے اور میری وجہ سے تم سب لوگ بھی تنگ ہوتے ہو۔"

"ہم سب لوگ تنویر؟ ہم "لوگ" نہیں ہیں ہم تمہارے اپنے ہیں۔ ہمیں تمہاری خوشی پر خوشی ہوتی ہے، دکھ پر غم ہوتا ہے لیکن تنگی کسی بات سے نہیں ہوتی۔"

"ایک فرق تو بڑا ہے نا عبیر! پہلے میں بھی "ہم" میں تھی "اب تم" ہو گئی ہوں۔ ہم سے ہم لوگ "اور "تم" کا یہ فاصلہ میں نے نوکیلے پتھروں پر چل کر طے کیا ہے۔ تم اعتبار نہیں کرو گی لیکن وہ واقعی اتنا برا آدمی نہیں تھا اور اتنا برا آدمی کب بن گیا، مجھے پتا ہی نہیں چل سکا۔ دور سے تو اچھا لگتا تھا لیکن کسی کا اصل دیکھنے کے لیے اس کے نزدیک آنا پڑتا ہے اور ایک کے نزدیک جانے کے شوق میں آپ سب سے دور ہو جاتے ہیں، اتنی دور کہ واپسی کے راستے ہی کھو جاتے ہیں۔"

"تم نے اچھا کیا تنویر!" عبیر نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے۔

"غلط راستوں پر دیر تک چلتے رہنے سے وہ درست نہیں ہو جاتے واپس تو آنا پڑتا ہے جتنا آگے نکل جاؤ واپسی کا سفر اتنا ہی دور ہو جاتا ہے۔"

"مجھے بہت جھٹکے لگے ہیں عبیر! اس نے بہت شوق سے مجھ سے شادی کی لیکن اسی ذوق و شوق سے نفرت بھی کی۔ ایسا ہوتا ہے عبیر! تمہیں کسی کی نفرت سہنے کا تجربہ نہیں ہے اس لیے تمہیں پتا نہیں چلے گا کہ نفرت کرنا لوگوں کا مشغلہ ہوتا ہے۔ ہوتے ہیں نا مشغلے، کوئی ٹکٹ جمع کرتا ہے، کوئی سکے، کسی کو باغبانی کا شوق ہوتا ہے، کچھ لوگ ہوتے ہیں نفرت کرنا جن کی ہابی ہوتی ہے۔ ان کے لیے آپ سونا بن جائیں، جل کر کندن ہو جائیں ان کی نفرت ختم نہیں ہوتی، پھر پتا ہے کیا ہوتا ہے ایک دن آپ کو بھی ان سے نفرت ہو جاتی ہے تب وہ پریشان ہو جاتے ہیں۔ ایک آسان ٹارگٹ ان کے ہاتھ سے نکل گیا، پھر وہ اس کے پیچھے پڑتے ہیں، پچھتا کر نہیں ضد میں۔" "لیکن میں اس کی فطرت کے کالے پن سے اچھی طرح آگاہ ہوں۔ وہ ابا کو چھوڑے گا نہ میری بیٹی کو۔ اس نے ابا پر جو الزامات لگائے انہیں بھول نہیں جائے گا۔ وہ اتنا کمینہ خصلت ہے کہ اس آخری دن تک ڈٹا رہے گا جب تک اپنے عزائم میں کامیاب نہ ہو جائے۔ اسی طرح وہ ایک دن میری بیٹی، میرے ہی صحن سے کھیلتے ہوئے اٹھا کر لے جائے گا اور ہم سب منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔"

"ابا کو تو اب کوئی نہیں لے جا سکتا۔" اس نے بچوں جیسے مان لیکن یقین سے کہا۔

"اور گڑیا کو وہ ہاتھ لگا کر دیکھے..." حمیرا نے اوندھے پڑے پڑے نصف دھڑ اوپر کر کے کہا "آئے گا وہ اپنی شہری گاڑی میں، واپسی ایمبولینس میں ہوگی۔"

اس کی مزاحیہ فلموں جیسی انٹری اور دھمکی بھرے فقروں کے باوجود اس نے بے اعتباری سے عبیر ہی کی طرف دیکھا تھا۔

"یہ بات بتاؤ، کبھی کسی کے بارے میں تمہارے اندازے غلط ثابت ہوئے ہیں؟"

"ہاں، کیوں نہیں۔ کئی مرتبہ بلکہ اکثر لیکن تنویر اگر کوئی غلط آدمی ہے اور میں نے اس کو اچھا سمجھا تھا تو اس میں میرا قصور ہے نا کہ میں نے غلط اندازہ لگایا تھا سزا اس کو ملنا چاہیے جو غلط ہے، مجھے کس بات کی سزا؟"

"اس کو کوئی سزا نہیں دے سکتا۔ اس کی پشت پناہی کرنے والے معمولی لوگ نہیں۔ ایک بے کار سے اردو اخبار سے چل کر کرنٹ افیئرز کے اینکر تک اس کی ترقی اس کی قابلیت کی بنیاد پر نہیں ہوئی۔ اس کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔"

اس نے بیڈ سے پاؤں نیچے کر کے چپل پیروں میں ڈالی "تم دیکھ لینا اسے کبھی کوئی نہیں پکڑ سکے گا بلکہ اس کی بجائے بے گناہ لوگ پکڑے جائیں گے... بلکہ وہ جس جس طرف انگلی اٹھا دے گا، وہ سب دھر لیے جائیں گے۔"

وہ اٹھنے کے ارادے سے چلی تو تھی لیکن وہیں پاؤں لٹکائے کتنی دیر جیسے خود سے الجھتی رہی۔

"مجھے تم سے ڈر لگتا ہے عبیر! تم قابل بھی ہو اور انا پرست بھی لیکن جو مٹ کر بھی اپنی انا سربلند رکھتا ہے وہ اس کو سانپ کے سر کی طرح کچل دیتے ہیں۔"

☆ ☆ ☆

صبح رات جتنی تاریک نہیں لیکن سوگوار اسی قدر تھی اور آج کے دن کی آنکھ بھی آملیٹ اور پیاز کے تلنے کی خوشبو سے نہیں کھلی تھی۔ آج ناشتا تیار ہی نہیں ہوا۔ کریم بی رت جگے کے بعد صبح تک اپنے وظیفے میں مصروف تھیں۔ عبید کو نیند اس وقت آئی جب مڑ کر اٹھ جانے کا وقت تھا۔ باورچی خانے میں اماں اور حمیرا جلدی جلدی ناشتہ نمٹا رہی تھیں۔ توسرت چلا گلیں مارتے باہر آتے براؤن ٹوسٹ اور مکھن کی ٹکیا۔ عثمان ناشتے کے انتظار میں اک اسٹول پر بیٹھا تھا۔ وہ چپ چاپ اس کے برابر والے اسٹول پر جا بیٹھی۔ ہر مصروف آدمی اپنی ذات میں گم تھا۔ کیسا وحشت ناک سناٹا تھا۔ لوگ ایک دوسرے سے بات کرتے اور آنکھیں ملاتے ہچکچا رہے تھے۔

کھولتا ہوا پانی چائے دانی میں گراتی حمیرا...... بے دردی سے گرم ٹوسٹ پر چھری سے مکھن کی باریک تہہ جماتی ماں ـــ اور کہیں بھی نہ دیکھتا عثمان۔

"آپ کیوں فکر مند ہیں اماں؟ یہ 1977ء نہیں ہے۔"

"بدلا کیا ہے عثمان' سن اور تاریخیں۔" ان کے لہجے میں ان کے مزاج کے بالکل برعکس تلخی سی تھی۔

"میں تم سے 25 سال پہلے سے اس دنیا کو دیکھ رہی ہوں' ابھی تک کچھ نہیں بدلا۔ پہلے نظام نہیں بدلتا تھا' چہرے بدل جاتے تھے' اب تو چہرے بھی نہیں بدلتے' نظام کیا بدلے گا۔"

"اماں!" اس نے اٹھ کر ان کے کپ میں بالائی ڈال دی' "وہ وقت گزر گیا ہے۔ 1977ء اور 1958ء میں ایک تقریر پر گرفتاری ہوتی تھی اب لوگ کھلم کھلا بولتے ہیں' گرفتار نہیں ہوتے۔"

"ابھی کل ہی وہ اپنے آدمی اٹھا اٹھا کر امریکیوں کو بیچ رہا تھا جو نہ 1977ء تھا' نہ 1958ء۔ گرفتار تو اب بھی تقریر پر ہوتے ہیں' الزام زیورات کی چوری کا لگتا ہے۔"

"ایک تکلیف دہ وقت ہے اماں! گزر جائے گا۔ ابا کے طالب علم ہیں' جو ان سے عشق کرتے ہیں' ان کے گرد اور بہت سے مداحین ہیں۔ پہلے ایسا نہیں تھا۔ اسی لیے تو کہتا ہوں' کچھ بدلا ضرور ہے۔"

اس نے وہیں کھڑے کھڑے چائے کا ایک گھونٹ بھرا۔

"آپ فاروق کو جانتی ہیں؟"

"کون فاروق؟"

"ملا تو تھا آپ سے' رضا کا دوست ہے' اس دن تھا' آیا تھا۔"

"تو اس کا کیا ذکر۔" اماں نے اکتاہٹ سے پوچھا۔

"اتفاق سے صبح صبح اس کی کال آئی اور باتوں باتوں میں ذکر چلا تو وہ کہہ رہا تھا' میری طرف سے اماں کو تسلی دینا' اتنی لٹ نہیں پڑی۔"

یہ دوسرا حسن اتفاق تھا کہ عین اس وقت حمیرا نے چائے کی پیالی اٹھاتے ہوئے' جب بجرا کے تاثرات بڑی تیزی سے اس کے چہرے پر آ اور جا رہے تھے۔ حمیرا نے لمحے بھر کے لیے دنگ ہو کر اسے دیکھا' یہ چہرہ یا کوتا تھا' جیسے بچوں کی طرح وہ مٹھی میں کچھ چھپائے بیٹھی تھی کیا؟ یہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا' لیکن یہ اس چہرے سے مختلف تھا جو عمر بھر اس کے سامنے کھلی کتاب کی طرح بکھرا رہتا تھا۔ وہ کبھی اس کی زبان سمجھنے سے قاصر تو نہیں رہی تھی۔

✵ ✵ ✵

نعیم ملک نے اداکاروں کی طرح راتوں رات شہرت پائی تھی یا شہرت کو ترتیب ہی اس طرح دیا گیا تھا کہ وہ اس کے قدموں میں بچھتی چلی جائے' وہ محفلوں میں شعلہ بیان تھا' دشمنوں کو علی الاعلان للکارتا' وطن کا درد دل میں لیے ایک ایسا اردو اخبار نکالتا تھا جس کی اشاعت سینکڑوں نہیں تو مشکل سے ہزار کا ابتدائی ہندسہ پار کرتی تھی۔ اخبار کے ماتھے پر اشاعت کی تعداد کا تعین کرنے والے ستارے اور اشاعت آپس میں میچ ہی نہیں کرتے تھے۔ اس کے اداریے بعض اوقات آدھے آدھے صفحے پر مشتمل ہوتے اور کچھ کچھ نصیحت آمیز تقریر کا رنگ لیے۔

وہ محفلوں میں بیٹھتا تو اپنی حق گوئی کے قصیدے پڑھتا کہ وہ میدان صحافت کا مجاہد تھا' غازی تھا اور بھری محفلوں میں صحافت کے نام پر شہید ہو جانے کی دھمکیاں بھی دیا کرتا تھا۔ کرنٹ افیئرز کے ٹی وی پروگرام یا کبھی کبھی کسی ریڈیو ٹاک میں سنائی دیتا۔

اور بات بھی تب' وہ پرنٹ میڈیا میں تھا' اپنے باقی ماندہ ساتھیوں کے مقابلے میں خوش حال تھا۔ ان دنوں اس کے اخبار میں گورا رنگ کرنے والی کریمیں اور گرتے بالوں کو گنج سے بچانے کے لوشن اور کریموں کے چھوٹے چھوٹے اشتہاروں' کپڑوں پر صابن رگڑتی کم نام سی بے ڈول ماڈل والے مختصر سے اشتہارات کے سوا اخبار میں اول نمبر کی خبر نہیں ہوتی تھی۔ ہاں البتہ چھوٹے چھوٹے شہروں کے بے حساب اسکینڈل' کریم آباد کی ایک استانی کسی ڈرائیور کے ساتھ فرار ہو گئی' فلاں محکمے میں کروڑوں کی خرد برد' فلاں ہوٹل میں حفظان صحت کے اصولوں کے برخلاف زہریلا کھانا' سینکڑوں افراد کی حالت مخدوش۔

بسا اوقات متاثرین کی تعداد اس علاقے کی کل آبادی سے دگنی بتائی جاتی تھی۔ بار بار وزیر اعلا کو نوٹس لینے کی اپیل کی جاتی' لفافہ ہاتھ میں پکڑے وہ ثقافہ ظلم کے خلاف جہاد میں شریک ہو جاتا۔ اگلے دن اس کا محور کوئی اور ہوتا اور پتا بھی نہ چلتا کہ جو زہر خورانی کا شکار سینکڑوں مریض تھے' ان کا کیا بنا؟ وہ کون لوگ تھے اور کس نے نوٹس لیا' لیکن اگر کوئی خبر لگتی' دن بھی اسی شد و مد سے لگتی تو یہ یقینی بات تھی کہ لفافہ نہیں پہنچا۔

اس نے کبھی بڑے بڑے اداروں پر ہاتھ نہیں ڈالا تھا۔ گاؤں کے کسی دور دراز کے پرائمری اسکول کی استانی جو غریب پہلے ہی میلوں کا سفر طے کر کے اپنے گھر والوں کے رزق کی خاطر خوار ہوتی تھی یا وہ بیاہتا وزیٹر جو پیدل چلتے چلتے نڈھال حالت میں مریض تک پہنچتی' کم آمدنی' کم تنخواہوں والے نچلے درجے کے ملازمین کو لوٹنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ اس کا یہ اخبار بڑی باقاعدگی سے ان کے گھر بھی آتا تھا۔

پھر کرنا خدا کا ایسا ہوا کہ ملک میں مزاج اور مذاق دونوں بدل گئے' پرائیویٹ چینلز وجود میں آ گئے' علاقائی زبانوں کے ڈرامے' گانے' بجانے' غزلیں سناتے' گانے لگاتے' انڈین فلمیں دکھاتے' ریموٹ ہاتھ میں پکڑ کر ذرا میں ہاتھ کا انگوٹھا ایک بٹن کو دبا رہتا اور چینلز تھے کہ ان کی گنتی ختم ہونے میں نہیں آتی تھی' جو بیس گھنٹے کی نشریات' نیوز' بریکنگ نیوز' ایک ایک گھنٹے میں تقسیم ہوا وقت' کچھ بھیڑیں تھیں' کچھ پر صرف بھیڑوں کی کھال تھی' ہیجان' انتشار' سنسنی خیزی کے مسلسل لمحوں میں ایک گھنٹہ اس کے بھی ہاتھ لگا تھا۔

وہ اپنے ہم عمر ساتھیوں کی طرح چلا چلا کر تیز آواز میں بولتا' ہیجان سے بھرا لہجہ جیسے اچانک قیامت کی گھڑی کا اعلان ہو گیا ہو' اسی کم وقت میں زیادہ سے زیادہ نمٹا کر گزرنا ہے۔

وہ واقعے کی لمبی تفصیل سناتا' جو خود ٹی وی کئی گھنٹوں سے دہرا رہا تھا' وہ کہتا "ناظرین ہم ایک بار پھر بتا دیں۔" بعض اوقات دہرانے میں رنگ آمیزی بھی آ جاتی۔ پھر وہ سوال کرتا۔

"یہ جو آج واقعہ پیش آیا جس میں ـــ" (وہ اسی خبر کو پانچ منٹ کے دورانیے میں چھٹی دفعہ دہراتا۔)

آپ اس سلسلے میں کیا کہیں گے۔ یہ کوئی سوچی سمجھی اسکیم ہے کہ سازش ہے؟ اس میں کوئی غیر ملکی ملوث ہے یا یہ ہمارے اپنے لوگوں کی کارستانی ہے۔ ہم بغیر کسی ثبوت کے ہمسایہ ملکوں پر الزام لگانے کے عادی ہو گئے ہیں۔ کیا ہمیں اپنے گریبانوں میں نہیں جھانکنا چاہیے؟ کیا یہ ذاتی مفاد کی جنگ ہے؟ حکومت کہاں ہے؟ کیا وہ خاموش تماشائی بنی رہے گی؟ اتنے بڑے بڑے واقعات ہو جاتے ہیں اور اس پر کوئی جوں نہیں رینگتی۔

آپ کا کیا خیال ہے یہ حکومت کی کمزوری نہیں؟ ان کو حکومت چھوڑ نہیں دینا چاہیے؟"

جوش خطابت' بلند آواز۔

"اینکرز عجیب قسم کے سوال کرتے ہیں۔"

حمیرا نے بے زاری سے کہا۔ "جیسے ہمارے پرچے میں MCQ کا پارٹ ہوتا ہے' سارے Options خود ہی دے ڈالتے ہیں۔"

جواب دینے والا جواب دینے کی یا اپنی رائے کا اظہار کرنے کی کوشش کرتا ہے' ڈھونڈتا ہے سوال کہاں ہے۔

اینکر تو اپنا جواب اس کے منہ میں ٹھونسنے کی کوشش کر رہا ہے۔ آخر وہ کس کا جواب دے؟

چینلز کی بھی کیٹگریز تھیں' بڑے چینل' چھوٹے چینل' مقبول چینل' آزاد چینل' آزادی کہاں ختم ہوتی ہے اور ذمہ داری کہاں شروع ہوتی ہے' اس کا فیصلہ ہونا باقی تھا البتہ نعیم ملک ٹی وی اسکرین تک پہنچتے ہی اسٹار بن چکا تھا۔

پھر اس دن چینل سرفنگ کے دوران اس کی نظر نعیم ملک پر پڑی۔ وہ اسی جوش و خروش میں مبتلا تھا جو اس کی ذات سے منسوب اس کا خاصہ بن چکا تھا۔

واہگہ اٹاری بارڈر (پھول پتیوں اور رنگ برنگی جھنڈیوں سے سجا ہوا تھا) آج یہاں سے کسی معزز شخصیت کو گزر کر جانا تھا کہ چینل اور بارڈر دونوں پر ولیمہ کے سے جشن کا سماں تھا۔ نعیم ملک وقفے وقفے سے اعلان کرتا' کسی ایک کو فون کال بند کرنے اور دوسرے کے لائن پر آنے کا مژدہ سناتا۔

"ٹھہریے ناظرین' ہمارا رابطہ ان کی بیوی سے ہو گیا ہے۔"

بڑا اسکوپ ہاتھ لگا تھا۔ نعیم ملک کا چہرہ فخر سے تمتما رہا تھا۔

"آپ یہ بتایئے' آج وہ اتنے دن بعد واپس آ رہے ہیں' آپ کے جذبات کیا ہیں؟ آپ کو خوشی ہو رہی ہے یا کیا ہو رہا ہے۔ آپ کے گھر میں تو آج جشن کا سماں ہوگا۔ آپ کے گھر میں سب عزیز و اقارب جمع ہوں گے؟ یہ بتایئے آپ نے ان کے لیے مزے مزے کے کھانے پکائے ہیں؟ آپ کچھ ایسا پکا رہی ہوں گی جو وہ بہت شوق سے کھاتے ہیں۔ آخر وہ اتنا عرصہ آپ سے اور وطن سے دور رہے ہیں۔ اب وہ آ رہے ہیں' آپ کی خوشی تو دیکھنے کے قابل ہوگی۔ آپ کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانہ نہیں ہوگا' ہونا بھی ایسا ہی چاہیے۔ آپ ان کی آمد کے انتظار میں گھڑیاں گن رہی ہیں۔"

"ہاں جی۔" فون سے مختصر سا جواب موصول ہوا۔

"ہاں بتایئے۔"

ٹوں... ٹوں "ہمیں افسوس ہے ناظرین' ہمارا رابطہ منقطع ہو گیا ہے۔ ہم پھر لائن ملانے کی کوشش کریں گے۔"

"آپ نے سنا' وہ بتا رہی تھیں' ان کے گھر میں جشن کا سماں ہے' وہاں استقبال کی تیاریاں جوش و خروش سے جاری ہیں۔ ان کی آمد کے انتظار میں گھڑیاں گنی جا رہی ہیں۔"

"ناظرین! ہم بتاتے چلیں آج کشمیر سنگھ کئی سال بعد پاکستان کی جیل سے رہا ہو کر وطن واپس جا رہے ہیں۔ ان پر جاسوسی کا الزام لگایا گیا تھا۔ برسوں سے جیل میں بند تھے۔ ہم آپ کو بتا دیں' وہ پاکستان کی جیل میں بند تھے۔"

کتنی دیر تک ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آیا' کشمیر سنگھ پاکستان سے جا رہا تھا یا پاکستان آ رہا تھا۔ اگر انڈیا جا رہا تھا تو اینکر پرسن کا چہرہ اس خوشی کی حدت سے کیوں لال ہوا جاتا تھا کہ اس کے لفظ اس کے قابو سے باہر ہو رہے تھے۔

اس نے گھڑی دیکھی' پچپن منٹ کا بغیر کسی اشتہار اور بریک کے مسلسل دورانیہ تھا۔

"آیئے۔ اب ہم فلاں سے سوال کرتے ہیں۔ یہ بتایئے کشمیر سنگھ اکیلے تھے یا پاکستان کی جیلوں میں ایسے اور بھی ہندوستانی قید ہیں؟"

نعیم ملک نے یہ سوال کسی سے نہیں پوچھا کہ کیا انڈیا میں بھی پاکستانی قید ہیں اور کیا ان کی رہائی کے لیے بھی انڈین چینلز اسی شدت سے بے تاب ہیں؛ کیا اس کو انڈیا سے پکڑ کر لایا گیا تھا یا پاکستان میں گرفتار ہوا تھا؟
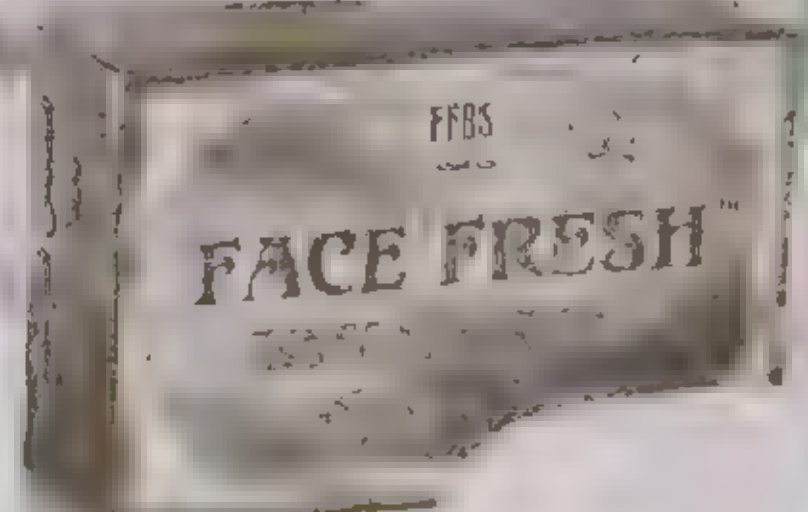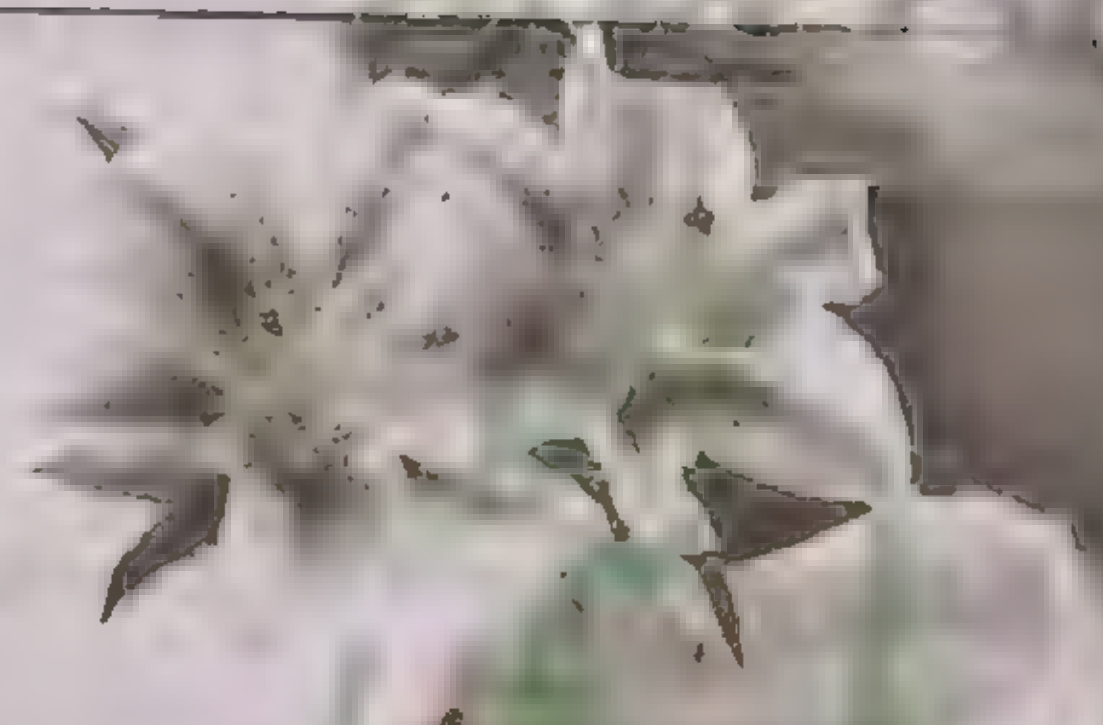
کیا وہ پاکستان میں آزادانہ دندناتا پھر سکتا ہے؟ کیا پاکستانیوں کو بھی ان کے ملک میں یوں ہی گھومتے پھرنے کی آزادی حاصل ہے؟

لیکن ہوا یوں کہ جب اس پر چاروں طرف سے گلاب کی پتیوں کی بارش کی جا رہی تھی اور وہ ہیرو کی سی شان سے سر اٹھا کر خوشی منانے والوں کی طرف دیکھے بغیر سیدھا چلتا جا رہا تھا تو عبیر نے پوچھا۔

"ہم نے اس کو گارڈ آف آنر کیوں نہیں دیا؟"

"پتا نہیں..." حمیرا نے کہا۔

"کیا ہمارے ہاں ہیروز کا اتنا فقدان ہو گیا ہے کہ ہمیں انڈیا سے ہیرو امپورٹ کرنا پڑا ہے؟"

وہ سکون سے پاکستان میں تہلکہ خیز جشن منا کر ادھر سے ادھر ہو گیا۔

اسی شام وہ اپنے ٹی وی پر بیٹھا کہہ رہا تھا۔

"مجھے فخر ہے کہ میں پاکستان میں بھارت کا جاسوس تھا۔ یہ تو عمر تھی اگر پاکستان کے خلاف مجھے زندگی بھی دینا پڑتی تو رنج نہیں تھا۔"

نعیم ملک اور اس کے ساتھیوں نے بغیر کسی شرمندگی کے یہ خبر بھی چلا دی اور اس کے بیان کے لیے انہیں کسی غیر معمولی دورانیے کی نشریات کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ ایک دو چینلز نے دبا دبا سا احتجاج بھی کیا لیکن تحفظ حقوق انسانی کا گروپ چن چن کر پاکستانی جیلوں سے بھارتیوں کو رہا کراتا رہا۔

"یہ اس کا ذاتی فعل تھا۔" نعیم ملک کسی اور دن اسی طرح اپنے کسی پروگرام میں کہہ رہا تھا۔ "ہمارا اپنا کردار ہے اور ان کا اپنا۔ ہمیں اپنا بڑھایا ہوا دوستی کا ہاتھ واپس نہیں کھینچنا [illegible]" معلوم نہیں اس کی بیوی انڈیا سے بھی بدتر دشمن تھی لہٰذا اس کی طرف اس کا ہاتھ [illegible] ضرور۔

وطن کی محبت میں سرشار کالی بھیڑوں اور ان کے کمائے کالے پیسے کی نشان دہی کرتا نعیم ملک کبھی اپنے الفاظ کی تفصیل بتا سکا نہ ذریعہ۔ ہر مرتبہ پاکستان ہی مجرم کے کٹہرے میں کھڑا ملتا ہے اور وہ فلمی وکیل استغاثہ کی طرح چیخ چیخ کر اس پر الزام عائد کرتا جاتا ہے۔

[illegible] کے پاس رک گئیں۔ عادتاً "اپنے [illegible] سے باؤں کا جوڑا بنایا، کھولا، پھر بنایا۔

"اس چینل کو دیکھ کر مجھے حمیرا کا بچپن یاد آ جاتا ہے۔ یہ کہیں بھی کسی کے ہاتھ سے گر کر کوئی چیز ٹوٹ جائے اور کوئی پوچھے کہ کس نے توڑی ہے تو ہمیشہ کہتی تھی... میں نے۔" ان کا ایک بے ساختہ سا مخصوص قہقہہ فضا میں گونجا۔

"اصل میں اس کو یقین ہوتا تھا، جو نقصان ہوتا ہے، اسی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ یہ نعیم ملک بھی ہر چیز کے نقصان کی ذمہ داری پاکستان کے کندھوں پر ڈال دیتا ہے۔ جہاں دنیا میں کسی کا نقصان ہوتا ہے "ہم کرتے ہیں۔"

نعیم ملک اور اس کے بہت سے دانشور ساتھی دس مرلے کے گھروں سے فارم ہاؤس میں شفٹ ہوئے، جوتیاں چٹخاتے پھرتے مرسیڈیز میں آ گئے، رولکس گولڈ باندھے تحریک آزادی پاکستان کے مجاہدوں اور اسلامی تاریخ کے خلاف بک بک کرتے ہیں۔ انڈیا بڑے فخر سے ان کے پروگرام یوٹیوب پر اپ لوڈ کرتا ہے۔

☆ ☆ ☆

سڑک ملائم اور ہموار تھی۔ موٹے ٹائروں والی کار چابک دستی سے رواں تھی جیسے چکنے پھسلواں فرش پر بیلے ڈانسر دور تک بہتی نکل جاتی ہے۔ کار کے شیشے کے پیچھے زندگی، ہر لحظہ بدلتا ایک منظر ہے۔ وہ جب سے شیشے سے [illegible] اک تواتر سے کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی جیسے بچہ پہلے پہل ریل میں سفر کرتا ہو۔ شیشوں کے عقب [illegible] میں ڈوبے زمین و آسمان پیچھے کی طرف بھاگتے درخت کیو اور مالٹوں کی ریڑھی لگانے والے، [illegible] سگریٹ کے خوانچے والے، مونگ پھلی کے ٹھیلے اور ادکاڑہ پیچھے رہ گیا تھا۔ جی ٹی روڈ تیزی سے بھاگ رہی تھی۔ اس کی گود میں لبنی کے پہلو میں کھڑی رنگ برنگی پھولوں کی دو کانوں سے خریدا اک تازہ گل دستہ دھرا تھا جس میں سے پانی رس رس کر اس کی قمیص کے دامن میں جذب ہو رہا تھا لیکن وہ بے نیاز تھی کہ سفر اس کو مبہوت کر [illegible] ہیں۔

کار پیدل پار کرنے والے تیز سبز رنگ کے پل کے نیچے سے گزر رہی تھی۔ لوگوں نے جنگلے اکھاڑ کر پار ہونے کے مختصر راستے تراش لیے تھے۔ اکا دکا معزز شہریوں کے سوا قاعدے ضابطے سے کسی کو دلچسپی نہیں تھی۔ شیشے کے اس طرف زندگی متحرک تھی۔ آباد بازاروں کی چہل پہل، زندگی کرنے کی جدوجہد کرتی مخلوق کھڑکی کے اندر اس کی ساتھی نہایت سکون سے گود میں ہاتھ دھرے ایک اچھے گائیڈ کی طرح سڑک کے کنارے کنارے بھاگنے والی چیزوں سے اس کا تعارف کراتی آ رہی تھی۔ یہ انڈسٹری کس کی ہے؟ وہ کس چینل سے تعلق رکھتا ہے؟ کہاں سے کہاں تک کی بارانی زمین کس کی ملکیت تھی؟ کون کون سے علاقوں کی ابھی نئی حد بندیاں ہونا تھیں؟ کہاں کہاں تنازعہ تھا؟

اس کی معلومات ہمیشہ قابل رشک رہی تھیں۔

"[illegible] ایک دن [illegible] مل جاؤ گی میں نے سوچا ہی نہیں تھا، میں کتنی خوش ہوں۔"

وہ [illegible] پتا نہیں کون سی دفعہ بول رہی تھی۔ واقعی! جب سیاہ شیشوں والی کالی گاڑی اس کے نزدیک آ کر [illegible] اور سیاہ [illegible] عبیر کا عکس ڈولا، پھر شیشے آہستگی سے نیچے ہوئے۔ اس کے ڈولتے [illegible] اور عین اس جگہ سے نمودار ہوئی تھی، یہ توقع اس نے بھی نہیں کی تھی کہ وہ کسی دن یوں اچانک [illegible] ملے گی۔ وہ اس کے اس قدر قریب نہ ہوتی اور اس نے مارے مسرت کے اس کو چلا کر آواز نہ دی ہوتی تو اس کو کبھی نہ پتا چلتا وہ زیب ہے۔

اس کی تیاری، اس کے ذاتی مزاج سے مختلف، بیگماتی انداز کی تھی۔ جہاں جہاں نظر جاتی تھی وہاں وہاں وہ زیورات سے لدی پھندی تھی۔

"مجھے پتا ہی نہیں تھا کہ تم اس شہر میں ہو۔"

"مجھے بھی کہاں پتا تھا۔" وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ "کیسے ہو تم سب لوگ؟ میری شادی پر نہیں آئے [illegible] نے خاص طور پر بلایا تھا، میں انتظار کرتی رہی۔ میرا خیال تھا تم یا حمیرا کوئی تو آئے گا۔"

"تم کیسی ہو؟" وہ اس گلے کا کیا جواب دیتی۔

"میں خوش ہوں۔" یہ اندازہ لگانا آسان نہیں ہوتا۔ میں خوش ہوں کہنے والا واقعی خوش ہوتا ہے یا نہیں کہہ [illegible] ہے۔ وہ اب بھی پرفارمنگ آرٹ کے زمانے کی طرح ہاتھ ہلا ہلا کر بات کرتی تھی، صرف اس فرق کے ساتھ کہ [illegible] سے کہنیوں تک لدی چوڑیوں اور کڑوں کی کھن کھن اس میں اضافی تھی۔ وہ بات کرتی تو انگلی میں چوڑی [illegible] سائز کی انگوٹھی چھپک مارتی۔ کیا یہ سب عثمان اسے دے سکتا تھا؟ خوشی کی اس کی بس یہی معراج تھی؟ اگر اس کی خوشی اس قدر آسان تھی تو اس کا حصول اتنا مشکل کیوں ہوا؟

[illegible] کے پیچھے کیا سوچ کے چلی تھی؟ اگر اس کے سوا اس کی کوئی اور خواہش تھی اور وہ اس کو حاصل نہیں [illegible] تو اس نے اپنی خوشی کے بارے میں اس قدر غلط بیان کیوں دیا۔

[illegible] فلم بنانا یا مہیش بھٹ کی فلم میں کام کرنا اور آرٹ کی کوئی سرحد نہیں ہوتی، وہ سب کہاں گیا؟ معلوم

نہیں۔

"میں چناب ہاؤس میں ٹھہری ہوئی تھی۔ ابھی ابھی اکرام نے یہاں گھر بنایا تو ہے لیکن ہمارے اب گاؤں میں ہی ٹھہرا جاتا ہے۔ گاؤں میں بھی تنگی تو کوئی نہیں۔ اب تو دور دراز کے دیہاتوں میں بھی سب سہولتیں آ گئی ہیں۔ چلو میرے ساتھ، میرا گھر دیکھو، میرا گاؤں دیکھو۔ تم نے کبھی دیہات نہیں دیکھے نا۔ تم پاکستان کا 80% سمجھے بغیر پاکستان کو جاننے کا دعویٰ کیسے کر سکتی ہو۔"

"ہاں چلوں گی کسی دن۔"

"کسی دن کیوں؟ ابھی کیوں نہیں۔"

"تمہیں مجھے اچانک دیکھ کر کچھ بھی نہیں ہوا میں اتنی غیر اہم تو نہیں تھی عبیر! مشکل سے دو گھنٹے کی ڈرائیو ہے یا اس سے کم۔ میں تمہیں خود واپس چھوڑنے آؤں گی۔"

اس نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی تک ویسی ہی تھی مگر انجام کار۔۔۔ اس کی خاک اس جگہ پہنچ گئی جہاں اسے پہنچنا ہی تھا۔ پزل کا ایک ٹکڑا ٹکڑا جیسے رضا اسے کہا کرتا تھا۔ وہ واقعی اپنی جگہ فکس ہو کر مکمل تصویر بنا رہی تھی۔

"میرے لیے اس طرح اتنا آسان نہیں۔ گھر والوں کی اجازت۔۔۔"

"اجازت تم نے کب سے لینی شروع کر دی، تم تو صرف اطلاع دیتی آئی ہو۔ اور منع کون کرتا ہے سوائے اس کے کہ تمہارا دل نہیں چاہ رہا۔"

اس نے اس کی آنکھوں کو ہلکا سا چبھتا محسوس کیا۔ ایک مدت [illegible] کا حصہ رہی تھی [illegible] بری گھڑی میں ان کا ساتھ دیتی تو وہ اس کی ہمات سے اتفاق کرتے [illegible] ان حرکتوں سے [illegible] کوئی نہیں جانتا۔ وہ پلو چھڑا کر بھاگ گئی تھی [illegible] وہ اس سے [illegible] آیا وہ کس کو اطلاع دے کر نکلے، اماں کو تو ثریا بھی ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ عثمان سے کہنا تھا [illegible] ہو گی اور ابا کو اس بھری دوپہر میں جب وہ اپنی کتاب میں مگن ہوں گے یا صوفے پر بیٹھ کر دوپہر کی اونگھ لے رہے ہوں گے یا اس جرمنی عدالتی کاغذ پر غور کر رہے ہوں گے کیسے ڈسٹرب کرے۔ اس نے پی ٹی سی ایل کا نمبر ملایا، فون کریم بی نے لیا۔

"کریم بی! اماں ہیں آس پاس، ذرا ان کو بتائیے گا اتفاق سے بازار میں ثریا مل گئی وہ مجھے اپنے گاؤں لے جانے پر اصرار کر رہی ہے۔ رات ہو جائے تو پریشان نہ ہوں، وہ خود مجھے واپس چھوڑنے آئے گی۔"

"اے لو۔ وہ وہ کہیں کھو گئی تھیں اب اچانک کہاں سے مل گئیں۔"

"کریم بی! فون میں اتنا بیلنس نہیں کہ یہ طویل کہانی یہاں پر ہی سنا سکوں۔"

"اچھا۔" انہوں نے بیزاری سے کہا "ابھی تو آرام کر رہی ہیں۔ شام ہوگی تو بتا دوں گی۔"

وہ اس کو انکار کیوں نہیں کر سکی اور وہ اس کے پیچھے اس بری طرح کیوں پڑ گئی تھی۔ اس کا یوں اچانک مل کر خوش ہو جانا اس کو نیا لگا اور کون جانے جو زیادتی ہماری طرف سے ہوئی۔ کبھی کبھی وسیع القلبی کا دعویٰ کرنے کے باوجود کسی کسی معاملے میں ہم کیسے تنگ نظر ہو جاتے ہیں۔ اس وقت کار ہیملز کے بانات سے گزر رہی تھی۔

کار کے اندر کا ماحول اجنبی اجنبی تھا۔ ثریا اسی اپنے پن سے بول رہی تھی جیسے درمیان کا وقت اور وجہ آئی نہیں تھی۔

بہت دیر تک جی ٹی روڈ پر چلتے اب کار نے ایک نیم پختہ اینٹوں سے بنی سڑک پر موڑ لیا تھا۔

ایک اور جنرل نو سال قوم کی تقدیر سے کھیل کر گارڈ آف آنر لے کر رخصت ہوا۔ اب ووٹ، الیکشن اور

[illegible] ووٹوں کا دور دورہ تھا۔ سڑک پر مزدور کام کر رہے تھے، ثریا کا میاں الیکشن جیت کر آیا اور اسمبلی میں بیٹھا تھا، لہٰذا وہ راستہ جو جی ٹی روڈ سے اس کے گھر تک جاتا تھا، پکی اور چوڑی سڑک میں تبدیل ہو رہا تھا۔ یہ سب بھی اسے ثریا نے ہی بتایا تھا۔

"جمہوری حکومت کے آنے کے بعد دن رات کام ہو رہے ہیں۔ اب اس سڑک کو ہی لے لو۔ دس دن کی [illegible] مدت میں مکمل کی جا رہی ہے۔ ہر طرف کام ہو رہا ہے لوگوں کو نظر ہی نہیں آتا۔ ہاں مہنگائی ہے۔ لوڈ شیڈنگ ہے، آٹا، چینی کم ہو جاتا ہے، بم دھماکے میں آئے دن کا جانی نقصان، لیکن جمہوریت کے لیے اتنی قربانی تو [illegible] پڑتی ہے۔"

وہ ہمیشہ جن کے خلاف بولتی تھی اب ان کی طرف سے بول رہی تھی۔ عوام سے حکمرانی تک کا مختصر سفر لہجہ اور [illegible] ذہن بدل ڈالتا ہے۔

سفر ختم ہو گیا تھا۔

"یہیں ٹھہرو!" اس نے کسی کو مخاطب کیے بنا کہا۔ "ہم ذرا گاؤں کی سیر کر کے واپس آتے ہیں۔"

اندر کی مصنوعی خوشبو اور غیر معمولی خنکی سے تازہ ہوا میں نکلتے ہی اس نے گہرا سانس لیا۔

گوبر کی کھاد اور مردہ پتوں کی باس میں رچا گاؤں، دھوپ ابھی مکمل طور پر ڈھلی نہیں تھی لیکن گھروں میں کام کاج شروع ہو گئے تھے۔ لکڑیوں اور اپلوں کے جلنے کی خوشبو پھیل کر بستی کی موجودگی کا پتا دیتی تھی۔ صحنوں سے [illegible] سرمئی دھواں آسمان کی طرف بلند ہو رہا تھا۔ پتا نہیں ان گھروں میں کیا ہو تا ہو گا، کسی لینڈ اسکیپ کو پینٹنگ کی طرح دیکھنا اور اس پینٹنگ کے اندر بس جانا دو مختلف ذہنی کیفیتیں ہیں۔

وہ وہیں کھڑے کھڑے بستی کا تعارف کرانے لگی۔

"برگد کا یہ درخت سو سال پرانا ہے۔ ایک مرتبہ بائی ڈپارٹمنٹ والے کوئی سروے کر رہے تھے، سو سالہ پرانے درختوں پر، تو اس کی چھال اتار کر لے گئے۔ یہاں ہمارے علاقے میں مشہور ہے کہ اس درخت پر جن رہتا ہے۔ اس کی حکومت صرف اسی درخت پر ہے لہٰذا گاؤں والوں کے مطابق جب بائی ڈپارٹمنٹ اس کا بارک اتار کر لے چلے تو ابھی ڈی ٹی روڈ سے پار نہیں ہوئے تھے کہ ان کی گاڑی بند ہو گئی اور تب تک نہیں چلی جب تک انہوں نے درخت کی چھال واپس بستی میں نہ رکھ دی۔ ایسے ایسے یہاں بہت قصے مشہور ہیں۔ اس پر ان کا ایمان [illegible] ہے کہ آپ نے یقین نہ کیا تو آپ دائرہ اسلام سے خارج۔۔۔ وہ جن ایک دفعہ پروں والے گھوڑے کی شکل [illegible] نظر آیا جو درخت کے سب سے اوپر والی نرم شاخوں پر بیٹھا تھا جس پر طوطے بھی بیٹھیں تو لہرا جاتی ہے۔"

برگد کے نیچے بیٹھی سخت ہاتھوں والی محنت کش عورت اپنی بیٹی کے بالوں سے جوئیں چنتی رہی، بیٹی کا باپ پاس [illegible] سگریٹ کے سوٹے کھینچ رہا تھا، شوخ قسم کے کپڑوں والی ساس شلجموں کے ڈھیر سے گلے سڑے پتے الگ کرتی رہی۔ وہ ان کے پاس سے گزرے لیکن کنبہ اپنے اپنے مشاغل میں مصروف ان سے بے پروا زندگی کی گاڑی کھینچتا رہا۔

"سلام صاحب!"

"تم ٹھیک کہتی تھیں لیکن گاؤں دیکھنے سے بھی گاؤں کی تاریخ سمجھ میں نہیں آتی۔ تم تو یہاں رہ کر بھی ان کو وہاں سے دیکھ رہی ہو۔"

خزاں رسیدہ پتے پاؤں تلے روندتے اب وہ مسجد کے پاس سے گزر رہے تھے۔

"یہ اس گاؤں کی مسجد ہے۔ اب اکرام کا خیال ہے وہ اس کو پکا کرا دیں گے۔ دو کروڑ کا پراجیکٹ ہے۔ حال ہی [illegible] امام مسجد فوت ہو گئے ہیں۔ نئے امام کا بندوبست بھی کرنا ہے۔ پچھلے امام صاحب ریٹائرڈ سرکاری ملازم

سفارش اور ہنر میں کوئی مقابلہ نہیں ہوتا۔ میں نے جو کچھ سیکھا تھا' سب کچھ اپنایا۔ تو میں ان قدیم' دقیانوسی خیالات کے ساتھ کہاں تک چلوں' کون کون کیا کہتا تھا۔" لگتا تھا وہ ٹھیٹھی لوگوں کی باتوں کی جگالی کرتی رہتی ہے۔

"میں جب تم لوگوں کے ساتھ رہتی تھی' مجھے تم لوگ عجیب اکھڑے لگتے تھے' غیر ذمہ دار' آپس میں باتیں کرتے' ہنستے' نہ مستقبل کی پروا' نہ کل کی فکر' نہ کوئی سوشل سرکل' نہ اس بات کا دھیان کہ لوگ آپ کے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔ اب میں پلٹ کر دیکھتی ہوں تو وہ سب کچھ کتنا غیر اہم ہوتا ہے۔"

"یہ ہماری حویلی ہے۔" وہ ماضی سے یک لخت حال میں پلٹ آئی۔ اب وہ ایک طویل چار دیواری والے احاطے کے پاس سے گزر رہی تھی جس میں کہیں دور کوٹھڑیاں سی جھانک رہی تھیں۔ "یہ کس قسم کی حویلی ہے۔"

"کیا اس علاقے میں حویلی اس کو نہیں کہتے جو پنجابی فلموں میں ہوتی ہے؟ اونچا سا تین چار منزلہ محل' شطرنج بورڈ جیسا فرش' دیواروں پر بارہ سنگھے کے سر اور زمین پر بچھی غریب جانوروں کی کھالیں۔"

"یہاں ہم اپنے مویشی رکھتے ہیں اور ان کی دیکھ بھال کرنے والوں کے کوارٹر اندر ہیں۔ تالاب ہے' اس میں گندا پڑا ہوتا ہے اور جانوروں کے پینے کا پانی۔"

"یہ جو تمہارے پیچھے پیچھے آرہے ہیں' گارڈ ہیں تمہارے میاں کے؟"

"نہیں اس کو تو اسپیشل سیکیورٹی دی جاتی ہے۔ یہ ملازم ہیں ہماری حویلی کے۔"

"وہاں جہاں جانور باندھے جاتے ہیں؟"

"نہیں' یہ میں رہائشی حویلی کی بات کر رہی ہوں۔"

رہائشی حویلی بستی کے آخری کونے میں کھڑی نظر آرہی تھی اور اس سے برابر' بر شہری طرز کے دار زندہ مکان۔ بستی کے آخری سرے پر تالاب کے پار گاؤں کی واحد دکان تھی۔ بے کھڑکی' بے روشن دان کی ایک کوٹھڑی جس میں چھت کے قریب سوراخ میں کھڑکا کر ہوا اور روشنی کو اندر آنے کا راستہ دیا گیا تھا۔ دکان ٹین کے ڈبوں' بیلیوں اور پلاسٹک کے کھلے منہ کے برتنوں پر مشتمل تھی جس میں عارضی ضرورت کی ہر وہ چیز تھی جس کی گاؤں والوں کو فوری طلب ہو سکتی تھی۔

دکاندار کڑھائی میں تڑتڑاتے تیل میں بڑے کڑچھے کے ساتھ بے رنگی تلی ہوئی جلیبیاں نکال نکال کر گڑ کے شیرے میں ڈبو رہا تھا۔ ایک ہاتھ سے مکھیاں اڑاتا جو شیرے والی پرات کے کنارے لالچ میں آبیٹھی تھیں اور اب گڑ کے پانی میں لت پت اڑنے سے معذور تھیں۔

اس نے گھر کے اندر قدم رکھا اور ایک نئے جہاں میں داخل ہو گئی۔

وہ کسی اسٹوڈیو کا سیٹ لگا ہوا تھا' اس کے قدموں میں ماربل کا جھلملاتا فرش تھا جس پر باہر کی دھول مٹی کا شائبہ بھی نہیں تھا جیسے زمین پر شطرنج کی بڑی سی بساط بچھی تھی۔ دیوار پر چاروں طرف بارہ سنگھوں اور مارخور کے سر مع سینگوں کے اونچی دیوار سے چپکے اپنی بٹنے والی آنکھوں سے دیکھ کر بھی کچھ نہیں دیکھ رہے تھے۔ دروازے سے ذرا آگے بڑے بڑے پودوں والے گملوں سے پرے ایک صحت مند مضبوط ہرن کی کھال ہاتھ پیر پسارے فرش پر آرام فرما رہی تھی' اس کی کھال کے فر میں اب بھی وہ آب و تاب باقی تھی جو اس وقت رہی ہوگی' جب وہ اپنے گوشت پر اس کو چڑھائے چوکڑیاں بھرتا پھرتا تھا۔ وہ گوشت جو بھون کر کھایا جا چکا تھا۔ یہ ویسا ہی گھر تھا' جیسا اس نے فلمی قرار دے کے انکار کر دیا تھا' پھر اس نے راہداریوں سے مڑتے سیڑھیاں چڑھتے ایک کھلے دروازے کا رخ کیا۔ کمرے میں اس کے پیچھے پیچھے قدم رکھتے لمحے بھر کے لیے حیرت سے اس کے پیر ڈگمگائے۔

یہ ایک بہت بڑے ہال جتنا کمرہ تھا جو ہر قسم کے سامان سے اٹا ہوا تھا۔ صوفے' کرسیاں' میزیں' لیمپ' چھوٹے بڑے قادر آبادی' ایرانی حتیٰ کہ چینی قالین۔۔۔ کمرہ ہر قسم اور ہر نسل کی چیز سے ٹھونسا ہوا تھا۔ بہت دور جہازی سائز

بیڈ پر بستر کے بیڈ سے ٹیک لگائے ایک ڈھیلے دار خاتون بیٹھی تھیں جن کے اوپری ہونٹ کے اوپر ایک موٹا مسہ تھا جس میں سے سخت بالوں کے سرے جھانک رہے تھے۔ مہندی سے رنگے بال اور عجیب تام جھام ۔۔ کانوں' بازوؤں اور ہاتھوں میں لٹکے زیورات۔ سونا سب سے اہم ہے۔

"یہ آپا ہیں۔" ثریا نے مرعوبیت سے تعارف کرایا "اور آپا یہ میری دوست ہے عبیر' ہم لاہور میں ساتھ ۔۔تے تھے۔"

"یہ کون سا والا ہے۔" آپا نے اس کے کان کی لو چھو کر تین منزل نیچے لٹکتے زیور کو پرکھا۔۔۔ پھر وہ اس کی دوست کی طرف متوجہ ہوئیں۔ "آؤ بیٹھو جی آیاں نوں۔"

آپا نے ذرا سا سمٹ کر مہمان کے لیے جگہ بنائی۔

حالانکہ یہاں سے وہاں تک جگہ ہی جگہ تھی۔ چاہے تو وہ کمرے میں اڑنیاں لگاتی پھرتی لیکن اس کو آپا کے پاس بیٹھنا پڑا کیونکہ ثریا ایسا چاہتی تھی۔ آپا میں سے لہسن' دہی' مکھن' سب کی ملی جلی عجیب ناگوار سی ہمک اٹھ رہی تھی۔ بیٹھنے سے پہلے اس نے دیکھا۔ کھڑکی کے عقب سے نظر آتی درخت کی آخری پھننگ شیشے سے ذرا دور تھی۔ جزیٹر چلنے کی گھرگھر میں اس نے ایک اچٹتی نظر ڈالی۔ بستی تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ پھر وہ آپا کے پاس چپ چاپ بیٹھ گئی۔ آپا کا موٹاپا تھا یا سانس کا مرض ان کا سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔

"اپنی آپا ٹھیک سے خاطر کرنا۔" عبیر کی سمجھ میں نہیں آیا۔۔۔ لیکن ثریا نے پیغام فوراً ڈی کوڈ کر لیا تھا "جی اب آپ تشریف لے جا سکتی ہیں۔" وہ اس طرح کھڑی ہوئی جیسے کچھ دیر اور ٹھہری تو وہ پھرکی ہو جائے گی۔

عبیر اس کے پیچھے اس تیزی سے کہ کہیں وہ اسے آپا کے پاس چھوڑ کر تو نہیں چلی جاتی۔

"کھانا لگا دو۔" اس نے کسی کو مخاطب کیے بغیر اسی رعونت بھرے لہجے میں کہا۔ "ڈرائیور سے کہنا ہم کھاتے ہی نکل جائیں گے۔"

وہ اندر جتنی دم بخود اور گھٹی گھٹی بیٹھی تھی' کمرے سے باہر آجانے پر جیسے اس کا طنطنہ واپس آ گیا۔

"یہ آپا کون ہیں؟ تمہاری نند ہیں یا جٹھانی؟"

ثریا نے ہال کھڑکی کی محراب میں جڑے تکونی شکل کے رنگ برنگے شیشوں کی طرف دیکھتے' بے توجہی سے کہا۔ "میری سوکن ہیں۔" اس کا لہجہ بے حد پرسکون اور ٹھہرا ہوا تھا۔ "آرام سے' بڑی بیگم ہیں گھر کی اصل یہ۔" بے جگہ بکھرے قالینوں میں عبیر کا پیر الجھا' اسے ٹھوکر لگی' وہ گرتے گرتے بچی لیکن ثریا متوجہ نہیں تھی۔

"ہم الگ الگ حکمران ہیں۔ لاہور ہوں تو ملکیت میری' اختیار میرا' میں بیوی ہوں۔ گاؤں آئیں تو آپا کا حکم چلتا ہے اس فرق کے ساتھ کہ گاؤں آنا میرے فرائض منصبی میں شامل ہے اور آپا شہر نہیں آتیں' اس لیے ان پر حکمرانی کی میری خواہش پوری نہیں ہو سکی۔ انٹرنیشنل ٹور پر' سرکاری وفد میں' میں بیوی کی حیثیت رکھتی ہوں جہاں پبلک ریلیشننگ ہو وہاں میں ہوں۔ کلب میں ساتھ جاتی ہوں۔ جب کوئی ڈیلی گیشن آتا ہے تو ان کی بیویوں سے انگریزی بولنے کو میں ہوں۔ تم سمجھ رہی ہو نا سرکاری بیوی۔"

"تو اگر سرکار ہی نہ رہی تو سرکاری بیوی کیا کرے گی۔"

عبیر کو پتا بھی نہیں چلا اس کے منہ سے یہ دل آزار فقرہ کیوں پھسلا تھا جس نے ثریا کا رنگ اڑا دیا۔

وہ جواب دینے کی زحمت سے محفوظ رہی۔ کھانا لگنے کی اطلاع آ گئی تھی۔

پتا نہیں وہ اس شدت کے اصرار سے اس کو یہاں کیا دکھانے لائی تھی' اپنے سکھ یا اپنے دکھ' لیکن اس کے چہرے سے نہ دکھ جھلکتا تھا نہ سکھ۔ کتنی دیر عبیر اپنی پلیٹ میں پڑی چیزوں کو کانٹے سے ادھر ادھر سرکاتی الجھتی رہی۔ اس نے تنگ آ کر کانٹا رکھ دیا اور نیپکن کا گولا بنا کر میز پر پھینک دیا۔

"یہ سب کیا ہے ثریا؟" اس نے جھنجلا کر پوچھا تھا۔ "اس سارے قصے میں کیا ہے تمہارا؟ وہ لمبے لمبے دعوے' بڑی بڑی باتیں' پرفارمنگ آرٹ کی تمہاری ڈگری' کیا پایا یہ سب [illegible]"

"یہ کاروبار ہے۔" اس نے نہایت اطمینان سے اس کی آنکھوں کی طرف دیکھتے کہا۔ جیسے [illegible] تے تا عبیر! یہ کاروبار ہے۔ میرے والد کی ساکھ تباہ ہو گئی تھی' تو جڑی کیس اور [illegible] (جنگ) کے بعد جو کچھ ہاتھ آیا' اللہ تلے بھی ختم ہو گئے سو میرے فادر ان لا نے پاپا کو مرکز میں ٹکٹ دلوایا۔ لیکن تو ہار گئے لیکن [illegible] کے بعد ضمنی انتخاب میں انہیں جتوا کے وزارت مل گئی۔ اب یوں ہمارے پاس تین سیٹیں ہیں' دو مرکز میں اور ایک صوبے میں۔ تینوں مختلف پارٹیوں کے ٹکٹ پر۔ سرکار بدل گئی تو ہم بھی وفاداری بدل لیں گے۔ ہمارا نام رہنا ہو' پالیٹی یا مگ' وزارت' سرکیٹ ہماری ہے اور ہمیں کسی کی پروا نہیں ہوتی۔ کبھی کسی نے ہم سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ وہ جو سیٹ خالی کروائی تھی وہ ازلی گولی صرف اسی کے سر میں کیوں لگی تھی۔"

"لیکن اس سے تمہیں کیا فائدہ ہوا ثریا مجھے اس کا مقصد بتاؤ۔"

"مجھے کیا فرق پڑا۔ مجھے اور کرنا بھی کیا تھا۔ کوئی اور تو مجھے میرے پاپا کی شرطوں پر قبول کو تیار بھی نہیں تھا' کوئی فیصلہ تو کرنا تھا۔"

"تم خوش ہو ثریا؟" اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس سوال کی کوئی تک بھی بنتی تھی۔

"عورت کے لیے ذاتی خوشی بالکل غیر اہم ہے۔ وہ باپ کے گھر ہو بھائی کے' شوہر کے یا اپنے بیٹے کے ہم سمجھتے ہیں اس کا فرض خوشیاں تقسیم کرنا ہے' مانگنا اس کا حق نہیں ہے۔"

"تم خوش ہو ثریا؟" اس کی آواز قدرے تیز اور جھنجلائی ہوئی تھی۔

"نہیں۔" اس نے رسان سے کہا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

سلویٰ علی بٹ
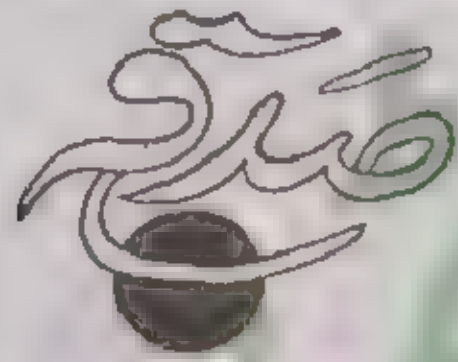
"اے کڑی (لڑکی) کہاں؟ تھلے (نیچے) اتر تجھے کتنی واری منہ سے منع کیا ہے' اب جوان اولاد پہ ہتھ اٹھاتے بھی شرم آتی ہے۔"

ثریا نے اپنی ماں کی اس کرخت پکار پہ سہم کر اپنا ہاتھ [illegible] سے سیڑھی کے ڈنڈے پہ جما دیا۔ ماں کے [illegible] تیوروں سے جھٹکے کی امید نہیں تھی وہ ٹانگ [illegible] تک زمین پہ [illegible]۔

"ہاں وہ..... میں۔" خوف سے لب اور آنکھوں میں [illegible] آئی۔

دوسرے ہاتھ میں پکڑی چھوٹی سی کٹوری بائیں [illegible] کے پیچھے چھپائی' جسے دیکھ کر ہی حاجراں نے [illegible] شروع کیا تھا۔

"تیری مت ماری گئی ہے۔ ہم نے ان منحوسوں کو [illegible] ڈالنا' اپنے لیے تو گھر میں کچھ ہے نہیں' ماں [illegible] لوکاں کے گھروں سے چھینی کھوٹنے کے لیے [illegible] مرچیں نے اور تو سیایا کر ان چڑیوں [illegible] وہ اس کی آخری سیڑھی اترنے تک خاموش [illegible] تھی۔ اس کا بس چلتا بھی اس مسٹنڈی ثریا کو [illegible] کے رکھ دیتی۔

"اماں! ہم پہلے بھی ان بے زبانوں کو دانہ ڈالا [illegible] تھے' تب کیا ابا کے مربعے تھے۔" کٹوری [illegible] ذرا پرے دھرے وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

حاجراں نے اسے کئی روز سے سختی سے منع کر رکھا [illegible] ان چڑیوں کو کچھ نہیں ڈالنا مگر آج اسے ماں کا [illegible] پڑا کا تھا۔

[illegible] نہیں تھی مجھے اسی لیے ان کا جھگڑا کر لیتی تھی۔" وہ زمین پر گھٹنے دہرے کر کے خود بھی کبڑی ہو کے چارپائی کے نیچے سے جوتا نکالنے لگی۔

"پر اب جب سے پتا لگا ہے ناں کہ یہ ہی ہیں ہمارے ویران اور بھوکے گھر کی جڑ' اب کچھ بھی نہیں ڈالنا' چاہے جو مرضی ہو جاوے۔"

وہ جوتا نکال کے کھڑی ہو گئی' گھٹنوں سے پنڈلیوں تک شلوار سے مٹی جھاڑی اور جوتا پیروں میں احتیاط سے پھنسا لیا' باہر جانے کے لیے سیاہ میلی چادر اچھی طرح لپیٹ لی۔

"میں نے تو صرف....."

"دیکھ ثریا! میرا دماغ نہ چاٹ' میں پہلے بہت پریشان ہوں۔" حاجراں نے غصے سے اسے ٹوک دیا۔

"اب پھر کبھی یہ چوری چھپے والی حرکت کی تو یہ جو میری ٹوٹی جوتی ہے ناں' باقی کی تجھ پر توڑ دوں گی۔" اب لہجہ اور انداز دونوں قطعی تھے۔

اب مزید سوال یا تکرار کی گنجائش نہیں تھی کیونکہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ ماں عمل کے معاملے میں

تاخیر کی قائل نہیں۔

اس نے ایک خفا نظر ماں اور دوسری غصیلی نظر اس آدھ ٹوٹے جوتے پہ ڈالی جسے وہ کافی دنوں سے گانٹھنے کا سوچتی آ رہی تھی۔

"اب کھڑی میرا منہ نہ دیکھ۔ جا، جا کے ڈرم میں سے بچا کھچا آٹا گوندھ، میں تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔ ابھی شاماں کی فکر بھی کرنی ہے، ہم چٹنی کھالیں گے، شاماں نوں دو دیسی انڈے نوں تڑکا لگا کے۔"

وہ مینیو ترتیب دے کے زیر لب بڑبڑا کے خدا سے بہتری کی دعا مانگتی باہر نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

حاجراں کی دو بیٹیاں اور بیٹا تھا۔ پانچ مرلے کا کچا مکان تین بچوں اور دو میاں بیوی کے لیے کافی تھا۔ اکرم (حاجراں کا شوہر) راج مزدور آدمی تھا۔ تھوڑے پیسوں اور بیوی کی عقل مندی سے گزر بسر اچھی ہو جاتی تھی مگر پچھلے سال جب وہ نوٹ کی چھت سے کام کرتے ہوئے گر گیا تو اس کی کمر میں شدید چوٹ آئی جس کی وجہ سے وہ وزنی اینٹیں یا گارے کا تسلہ اٹھا کے دیہاڑی لگانے کے قابل نہ رہا۔ گھر کی گاڑی کھینچنے کے لیے پہلے اس نے سبزی منڈی سے آڑھتیوں کے پھینکے ہوئے گلے سڑے پھل اکٹھا کر کے ٹھیلہ لگا لیا لیکن جاننے والوں اور محلے داروں کا لحاظ رکھنے اور ادھار کھاتہ کھولنے سے جلد مندی پڑ گئی۔ پھر وہ ایک پراپرٹی ڈیلر کے پاس کاغذات آگے پیچھے کرنے پر لگ گیا۔ ابھی حالات میں بہتری آئی تھی کہ پراپرٹی ڈیلر کو فراڈ کیس میں پولیس نے پکڑ لیا۔ اس طرح ایک بار پھر اکرم کو روزی روٹی کے لالے پڑ گئے۔ بھاری کام وہ کر نہیں سکتا تھا۔

حاجراں بڑی صبر و برداشت والی عورت تھی۔ وہ چلا چلا کر شوہر کو اپنی افلاس اور اس کی کم مائیگی کا احساس نہیں دلاتی تھی۔ تینوں بچے بھی بڑے سادے تھے۔ ویسے بھی غریب کے بچے فرمائشی ضد کے عادی نہیں ہوتے۔

حاجراں نے اپنی بے روزگاری کا رونا سامنے والی دودھ کو پانی بنا کے بیچنے والی ستارہ رانی سے کیا۔

"رزق کیسے ہو، سارا وقت تو تیرے صحن میں چڑیاں چہکتی رہتی ہیں اور جدھر یہ منحوس بولیاں بولیں، وہاں رزق کی تھوڑ کبھی پوری نہیں ہوتی۔"

اس کا ان جاہلوں کے قبیلے سے تعلق تھا جو گئی سنائی پہ یقین رکھتے تھے۔ حاجراں کو اس کی اس انوکھی پھڑ (گپ) پہ کوئی وسوسہ نہیں ہوا تھا۔

اس نے کبھی سوکھی بچی کچی روٹیاں چھان ٹکر میں نہیں بیچی تھیں۔ روٹیوں کو بیچنا اس کے نزدیک آٹے کی بے حرمتی اور ناپسندیدہ فعل تھا۔ وہ تو روٹیاں پکاتے ہوئے اپنے چولہے کے آگے زمین پہ بورا بچھا لیتی تھی اور اس بورے پہ رات دھر کے چڑے بناتی تاکہ ذرا سا بھی [illegible] کے بچھان تلے [illegible] [illegible] دی کچی ہانڈی میں جھکڑ دیتی [illegible] ہونے پہ اچھی طرح [illegible] کے [illegible] سے برابر کے کھلے صحن میں لگے نیم اور دریک کے درختوں کے سائے میں رکھ دیتی۔ مگر شوہر کو روز خالی ہاتھ لوٹتا دیکھ اس کا دل ستارہ رانی کی گپ پہ بے ایمان ہونے لگا۔ نہ وہ کوئی توہم پرست عورت نہیں تھی۔ نماز روزے کی پابند، سویرے منہ اندھیرے تلاوت کلام بھی کرتی تھی پھر بھی دین کی شدبد ادھوری سی تھی۔ ستارہ رانی کے کہنے پہ یقین کرتے اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ یہ چڑیں تو اس گھر کی ساوں سے بیٹھی ہیں۔ اب تو وہ اس قدر عادی ہو چکی تھی کہ سویرے سے ہی شور مچانے لگتیں۔

حاجراں تو اب اڑ ہی گئی تھی جبکہ اس کی بڑی بیٹی ثریا ماں سے سخت ناراں تھی۔ وہ تو انہیں اپنی سکھیاں سمجھتی تھی۔ اسے جب بھی موقع ملتا ماں سے نظر بچا کر کچھ نہ کچھ ڈال ہی دیتی۔ اب حاجراں اس پہ کڑی نظر رکھنے لگی تھی۔ ادھر اس نے سیڑھی کے ڈنڈے پر پیر دھرا ادھر اس کی صلواتیں شروع۔

ثریا کا بس چلتا اس ستارہ رانی کا منہ نوچ لیتی جس نے ماں کو یہ پٹی پڑھائی تھی۔

"بھلا ان معصوموں سے کون سی نحوست ٹپک رہی ہے، ہم کون سا انہیں مرغ اور نورے بھون کر کھلاتے ہیں، ایویں خوامخواہ۔" اس قسم کے خیالات وہ باآواز بلند نشر کرتی تھی۔

☼ ☼ ☼

"میں سوچ رہی تھی کہ تم تینوں وڈے مامے کے پاس چلے جاؤ۔" کسی کے دوپٹے پہ ٹانکا کاڑھتے ہوئے اس نے بڑے کڑے دل سے کہا۔

ماں سے بچوں کی ایک پل کی دوری برداشت نہیں ہوتی۔

اکرم روز شرمندہ سا خالی ہاتھ لوٹتا۔ اب روز روز لوگوں سے پودینہ، دھنیا اور ہری مرچیں بھی نہیں مانگی جا سکتی تھیں۔ مرغیاں پالی ہوئی تھیں، پراٹھہ تلنے کے لیے سب سے [illegible] ضروری اور مہنگا گھی ہوتا ہے جو [illegible] نے [illegible] بار مانگنے پہ صاف انکار کر دیا تھا۔ محلے کی پرانی ہٹی (دکان) پہ اوقات سے زیادہ ادھار چڑھ گیا تھا۔ اب دکان دار کی بھی بے مروتی عروج پر تھی۔ جیسے ہی حاجراں مسکین سی صورت لیے ہٹی کی دو سیڑھیاں چڑھتی وہ فوراً خالی ٹین کے ڈبے کے اسٹول سے کھڑا ہو جاتا۔

"لاؤ بی بی! پیسے بسم اللہ کراؤ۔"

جس کا صاف مطلب تھا۔ اب میں مزید اپنی دکان داری تم لوگوں کے بھوکے پیٹوں میں نہیں جھونک سکتا۔ اسے اپنا دیوالیہ نکلوانا تھا؟

"کیوں جائیں ہم؟ مامے نے کوئی راشن کی بوریاں اسٹاک کی ہیں۔" چھوٹی رضیہ کو ماں کی سوچ ذرا نہ بھائی تھی۔ ذرا اسٹنک کر "اسٹاک" پہ خاصا زور دے کے بولی۔

"رجو! تجھے تمیز۔"

"یہ میں نہیں، مامی کہتی ہے وہ بھی بہانے بہانے سے۔" اس نے ماں کو کاٹ کر فوراً اپنے کہے کی وضاحت کر دی۔

"لو بھلا، میرے بچے مامے پہ بھاری ہیں؟ وہ تو تم تینوں سے اتنا پیار کرتا ہے۔" کتنا کچھ لاتا ہے کھانے کے لیے۔"

بیٹی کی کھری بات سن کر اس کا دل کھٹا سا پڑ گیا۔ بھائی کی طرف داری بھی ضروری تھی۔

"یاد ہے، پچھلی واری ماما سیب لایا تھا جس میں سے کیڑا نکلا تھا۔" رضیہ نے آہستہ سے پرانی یاد تازہ کی۔

"ہاں، جب تم نے مامی سے کیڑے کا کہا تو ان کے بیٹے ذیشان نے کہا تھا کہ اور کیا۔ سیب میں سے موٹر سائیکل نکلتا؟"

قریب بیٹھا ساجد اس کی سرگوشی سن چکا تھا، باقی کا اضافہ اس نے کر دیا۔

"کیا کانا پھوسی کر رہے ہو، مجھے بھی بتاؤ۔" حاجراں بھی کڑھائی چھوڑ متوجہ ہو گئی۔

"کچھ نہیں اماں! ایویں بک بک کر رہے ہیں۔" اس نے اپنے بڑے ہونے کا رعب جھاڑا۔

"ہم تیرا خون اماں، تیرے چنگے، برے وقت کے ساتھی سا تھی، تجھے کدں (اکیلا) چھوڑ کے جا سکتے ہیں؟ مامے کے گھر کی تر روٹی، تیرے بغیر ہمارے حلق سے کیسے اترے گی؟ تو فکر نہ پال، ہم اک ٹیم (ٹائم) کا فاقہ کر لیا کریں گے، پر تجھ سے وچھڑیں گے نئیں، ہاں اماں!"

وہ ماں کو دلاسہ دیتے رونے لگی تھی۔

"میں بدنصیب کوئی جی سے تھوڑی کہہ رہی ہوں، بس رب چنگیاں (بہتر) کرے۔"

گلوگیر لہجے میں کہتے اس نے بیٹی کو سینے سے لگا لیا۔

☼ ☼ ☼

حاجراں ایک گھنٹے سے ملکوں کے گھر درس پر گئی ہوئی تھی۔ وہ ہر مہینے درس منعقد کرواتے تھے۔ گاؤں کی ساری عورتیں اکٹھی ہوتیں۔ حویلی کے بڑے سے زنان خانے میں دریوں کے اوپر سفید چادریں بچھائی جاتیں۔ شہر کی بڑی عالم و فاضل ملانی جی کو لایا جاتا تھا جو گاؤ تکیے والی نشست پہ بیٹھا کرتی تھی۔ ملکوں کی ذاتی نوکرانیوں کے علاوہ گاؤں کی نیم مذہبی بیبیاں بھی اس محفل کے آغاز سے اختتام تک مختلف کاموں میں مشغول رہتیں۔

حاجراں بھی ہر بار اس درس میں شرکت کرتی تھی۔ اس دفعہ وہ بطور خاص اس لیے بھی گئی تھی کہ ملانی جی سے بے روزگاری کے سدباب کے لیے کوئی وظیفہ وغیرہ پوچھنا تھا' اسی لیے گھنٹہ بھر قبل ہی جا پہنچی۔ رضیہ بھی ماں کے ہمراہ تھی۔

اس کے جاتے ہی ثریا نے دروازے پہ لوہے کا کنڈا چڑھایا۔ عموماً" ان کے دروازے کے آگے بوری کا جوڑا گیا پردہ ہی پڑا رہتا تھا۔ اس نے چھپا کے بھگوئی ہوئی روٹیاں نکالیں اور انہیں چھوٹے ٹکڑوں میں مسل کے دھریک کے نیچے پھینک دیا۔ مٹی کی ٹوٹی ہانڈی پانی سے لبالب بھر کے قریب دھر دی۔

خود ذرا فاصلے پہ بیٹھ کے چڑیوں کو چگتا دیکھنے لگی۔ جانے کیوں آج دل کہہ رہا تھا کہ ابا کو کام مل جائے گا کیونکہ عرصہ بعد ہی بے زبانوں کی دعائیں سمیٹی تھیں۔

وہ ان ہی سوچوں میں گم کافی دیر بیٹھی رہی' جب باہر کا دروازہ کھڑکا۔۔۔ دروازے کو بجانے والے زور دار ہاتھ اماں کے آنے کا پتا دے رہے تھے۔ ابھی وہ پریشان سی کھڑی سوچ رہی تھی کہ کم از کم پانی کی ہانڈی کو چھپا دے تاکہ اماں کو شک نہ پڑے۔ دھوپ میں بیٹھے تھیلی کی پتنگ بناتے ساجد نے بھاگ کر کنڈا گرا دیا۔ وہ اپنی جگہ چور سی بن گئی۔ اسے یقین تھا اب وہ اتنی بے بہا گالیاں نکالے گی کہ پورا محلہ اس کے "ادبی ذوق" سے لطف اندوز ہو گا۔ اس کا بنڈا حاجراں کے بھاری ہتھڑ کھانے سے پہلے ہی تپنے لگا تھا لیکن اس نے ایک نظر اس کی رونی صورت اور جھکے ہوئے سر کو دیکھا اور پھر دھریک کے نیچے چڑیوں کے ٹولے کو۔ چند پل چپ چاپ اسے تکتی رہی پھر سست روی کی چال چلتی اندر بڑھ گئی۔

اس شام۔۔۔ اکرم اپنے مخصوص وقت پر گھر نہ پہنچا۔ شام رات میں ڈھلنے لگی حاجراں نے چھوٹے ساجد کا بازو پکڑا اور پکی سڑک کے بس اسٹاپ پہ جا کھڑی ہوئی۔ اس بس اسٹاپ پر لاری رکتی اور گاؤں کی سواریاں چڑھتیں' اترتیں اکرم نے کبھی اتنا وقت نہیں لگایا تھا' وہ منہ اندھیرے روزی کی تلاش میں نکلتا اور شام ڈھلے ہی خجل خوار لوٹ آتا۔

جب آنے والوں کی تعداد صرف اکا دکا رہ گئی تو وہ بھی نڈھال سی مڑ آئی۔ اس کا دل ڈوب ڈوب جا رہا تھا۔ مصلہ بچھا کر اس کی سلامتی کی دعائیں مانگنے لگی۔

رات گئے اکرم لوٹا تو اس کے ہاتھ میں آموں کا تھیلا تھا۔

"کتھے (کہاں) چلا گیا تھا کرامے؟ ہم تجھے اڈیک اڈیک (انتظار) کے رونے والے ہو گئے تھے۔" ماں بیٹیوں نے فوراً" اسے لپک لیا۔

"ارے جانا کہاں تھا؟ کام ڈھونڈنے گیا تھا' ذرا پانی پی کے سانس تو لینے دے۔" وہ جھلنگا سی چارپائی پہ ڈھے گیا۔

[illegible]

"اے پھڑ (پکڑ) دھو کر کھاؤ۔" اس نے آموں کا تھیلا رضیہ کو تھما دیا۔

"آم کدھر سے لیے ابا؟" ساری پریشانی اب حیرانی سے بدل گئی کیونکہ وہ جب صبح گھر سے نکلا تھا تو اس کی جیب میں بمشکل چند روپے تھے۔ وہ بھی تانگے کے واسطے اور جلد لوٹنے کا وعدہ کر کے لیے تھے۔

"او شہر وچ اک افسر کی کوٹھی تے پکی نوکری لگ گئی اے' میں نے اپنی (اپنی) مجبوریاں سنائیں تو اس نے اعتبار کر کے دو ہزار دے دتا (دیا) سوہنے رب کا شکر ہے کام دی پورا (بھاری) نہیں' بڑا ہی اللہ لوک تھا۔" اس نے جیب میں سے پیسے نکال کر دکھائے۔

ان سب کی باچھیں کھل گئیں۔ خود کرامے کے چہرے پہ تھکن کے ساتھ خوشی کے تاثرات بھی نمایاں تھے۔

☆ ☆ ☆

آج کا سویرا حاجراں کے لیے بڑا سوہنا تھا۔ تنگی صبر و شکر سے کٹ گئی تھی۔ رضیہ اور ساجد دونوں اسکول گئے تھے ورنہ ٹیچروں نے مہینہ بھر سے فیس نہ دینے پر اٹھوا دیے تھے۔ عرصہ بعد انہوں نے پراٹھے اور چائے کا ناشتہ کیا تھا۔ دوپہر کے لیے انڈا' اچار نہیں بلکہ سبزی پکی تھی۔

ثریا نے کچے صحن میں پیتل کے جگ میں پانی بھر کے چھڑکاؤ کیا۔ مٹی نم ہو جانے پہ بانس کی جھاڑو سارے صحن میں پھیر دی۔ گھڑونچی کھڑے میں نلکے کی ہتھی چلا کے اس میں پانی بھر رہی تھی حاجراں نے اسے آواز دے لی۔ گھڑونچی کو تائر میں رکھ کے وہ ماں کے پاس چلی آئی۔

"بیٹھ جا' تجھ سے گل کرنی ہے۔"

اس کی آنکھوں اور لہجے میں عجیب سی اداسی تھی۔ وہ چارپائی سے نیچے ٹانگیں لٹکانے کی بجائے اوپر چڑھا کے بیٹھ گئی۔

"کی گل اے اماں؟" اس کا جی کہہ رہا تھا کچھ خاص ہے اب کا ... رہ گئی ہیں۔

"کل درس ختم ہونے کے بعد ملانی صاحبہ سے اپنی (اپنی) مصیبتوں کا ذکر کیا تھا' میں نے کہنے لگیں صدقہ و خیرات کرو' سو بلاؤں کو ٹالتا ہے' میں نے کہا سارے کار (گھر) روٹی کے لالے پڑے ہیں' صدقے کدھر سے دیں تو انہوں نے بتایا۔"

حاجراں تھوڑا جھجکا کے رک گئی اور ایک اچٹتی سی نظر بیٹی پہ ڈالی جو پوری توجہ سے ماں کو سن رہی تھی۔

"کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ مسلمان (مومن) جو بیج دی (کچھ بھی) درخت لگائے یا کھیتی بوتا ہے تو اس میں سے کوئی پرندہ' چوپایہ یا انسان کچھ کھا لے تو یہ کھایا اس کے لیے صدقہ ہے۔" آنکھوں میں آئے آنسوؤں کی وجہ سے اس کی آواز بھی دھیمی سی ہو گئی تھی۔ بیٹی سے آنسوؤں چھپانے کے لیے سر جھکا لیا۔

"... غلط نہیں تھی۔" ثریا بھی مغموم سی ہو گئی مگر ماں کے سیدھا راستہ پکڑنے کی خوشی بھی ہو رہی تھی۔

"... والی گل ہی انہوں نے سمجھائی کہ اگر اور نہیں تو اپنے کھائے پیے میں سے بچا کھچا ہی ان بے زبانوں کے پیٹ میں چلا جائے' یہ بھی صدقہ ہے۔"

حاجراں اپنے کیے پہ بہت ہی شرمندگی محسوس کر رہی تھی۔ "پھر یہ دعائیں دیتے ہیں۔"

اس نے مسکرا کر ماں کے دونوں ہاتھ تھام لیے جس کے ہر ہر انداز سے ندامت جھلک رہی تھی۔

"ہاں شاید ان ہی کی دعاؤں کی وجہ سے ہماری سیدھیاں پے گئیاں۔ مجھے رب معاف کر دے۔" اس نے اپنے بہتے آنسو پونچھ لیے۔ سچائی کے اعتراف نے اسے کافی ہلکا پھلکا کر دیا تھا۔

"ابھی زیادہ وقت نہیں ہوا اماں! پھر اس کے گھر دیر سویر کوئی نہیں ہوتی' گناہ کر کے پلٹنے والوں کو معاف کر دیتا ہے' سچی نیت والوں کو نوازتا ہے' بوہت وڈا (بڑا) جگرا ہے اس کا۔" اس نے بڑے پیار سے مزید سمجھایا۔

"بیڑا غرق ہو اس ستارہ رانی کا جس نے مجھے یہ پٹی پڑھائی۔" حاجراں غصے میں سر ہلاتے اسے کوسنے دینے لگی۔

"اور ہاں اماں! اچھی بات کہنا بھی صدقہ ہے۔"

حاجراں بے اختیار منہ پر ہاتھ رکھ کے چپ ہو گئی' ثریا کی ہنسی نکل گئی۔

"چل ہٹ پرے' میں ابھی آتی ہوں۔"

وہ بیٹی کو پرے کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کدھر اماں! ستارہ رانی سے دو دو ہاتھ کرنے؟" اس نے جان بوجھ کر چھیڑا۔

"چولہے میں جھونکوں اس ستارہ رانی کو' خود نحوست ماری' میں تو اپنی بیلیوں (سہیلیوں) کو روٹی کھلانے جا رہی ہوں' سن نہیں رہی کیسے بھوک سے بولیاں بول رہی ہیں۔" وہ اونچی اونچی کہتی باہر نکل گئی۔

ثریا بھی اٹھنے لگی۔ اسے بھی وہ دانہ ڈالنا تھا جو اس نے مرغیوں کے ڈربے میں حاجراں سے چھپا کے رکھا ہوا تھا جب کہ اس کے ہونٹوں پہ ایک آسودہ اور پرسکون مسکراہٹ تھی جیسے بہت بھاری بوجھ سے آزادی مل گئی ہو۔

☆

عتیقہ محمد بیگ

اپنی بڑی بہن شائستہ کی بات سن کر اس کے قدموں تلے زمین نکل گئی۔۔۔ جب وہ اپنے گونگے دیور عاصم کے لیے اس کا رشتہ لائی۔

فریدہ خفگی سے بولیں۔۔۔ "شائستہ! کچھ تو سوچ سمجھ کر بول۔۔۔ ہما تیری چھوٹی بہن ہے۔۔۔ کوئی پرائی تو نہیں ہے۔"

فریدہ کو اپنی بڑی بیٹی شائستہ کی بات بہت بری لگی کہ ان کی چھوٹی بیٹی ہما کے لیے اس کے سسرال والوں نے عاصم ہی کو کیوں چنا ہے جبکہ شائستہ کا چھوٹا دیور فیضان بھی تو تھا۔۔۔ جو نارمل تھا اور دبئی میں اچھی ملازمت کر رہا تھا۔

"اماں مجھے ہما کی فکر ہے۔۔۔ سوچ سمجھ کر رشتہ لے کر آئی ہوں۔" شائستہ نے ماں کو اداس دیکھا تو ماں کا ہاتھ تھام کر تسلی دی۔

"بس تو اپنی ساس کو منع کر دے، میں اس رشتے کے لیے رضامند نہیں ہوں۔" فریدہ نے خفگی سے انکار کیا اور بیٹی کے ہاتھوں سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

شائستہ نے افسردگی سے کہا۔۔۔ "اماں سوچ کر جواب دیں۔"

"نہیں۔۔۔ نہیں، اس میں سوچنا کیسا؟ میری چھوٹی گونگے کے ساتھ۔۔۔ ہرگز نہیں، میری چھوٹی کے لیے اور رشتے آ جائیں گے۔۔۔ تو بس آج ہی جا کر منع کر دینا۔" فریدہ نے غصے سے بات ختم کی۔

شائستہ خفا ہو گئی "اماں! آپ نے کیا چھوٹی چھوٹی کی رٹ لگا رکھی ہے۔۔۔ ہما پورے بتیس سال کی ہو رہی ہے۔۔۔ اور دو سال سے تو میں بھی دیکھ رہی ہوں۔۔۔ کون سا اچھا رشتہ آپ کو ملا ہے۔۔۔ صرف ایک منان کا رشتہ آیا تھا اور اس کی چھان بین کی تو وہ نشے کا عادی نکلا۔ اگر ہم سے غلطی ہو جاتی تو ہما روتی ہی رہتی ہم جیسے بوریوں میں بھر بھر کر دیتے تو بھی اس کی زندگی میں سکھ نہ آتا۔" وہ ماں کے انکار کرنے پر بولتی چلی [illegible]

ہما ذرا دور کھڑی اداس چہرے دروازے کی آڑ میں کھڑی ماں بہن کی باتیں سن رہی تھی۔۔۔ اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ اپنی بڑھتی عمر پر بہن کا طعنہ اس سے برداشت نہ ہوا۔۔۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

فریدہ کی آنکھیں بھی پُرنم ہو گئیں۔ ان کے آنسو دیکھ کر شائستہ خاموش ہو گئی۔ اس نے اپنا بیگ سنبھالا اور جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کچھ دیر ٹھہر جاؤ۔۔۔ کھانا کھا کر جانا۔" فریدہ نے پیار سے کہا۔ وہ بڑی بیٹی کو بھی ناراض نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

وہ آہ بھر کر بولی۔۔۔ "ماں! ہما میری بھی بہن ہے۔۔۔ میں اس کی دشمن نہیں ہوں۔ میں نے سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔۔۔ آپ بھی اطمینان سے سوچ لیں۔۔۔ اور فون کر کے بتا دیجیے گا۔" یہ کہہ کر وہ دکھی دل کے ساتھ چلی گئی۔۔۔ ہما اور فریدہ کو پھر آنسوؤں نے گھیر لیا۔

"ہما کیا ہوا۔۔۔ کیوں رو رہی ہو؟" فاطمہ دوپہر میں اپنی سلائی کے کام سے روزانہ ہما کے گھر پر آتی تھی، اس نے ہما کو روتے دیکھا تو فکرمند ہو گئی۔ فاطمہ اس کی بچپن کی ہم جولی تھی۔۔۔ اس کے ہر دکھ سکھ کی ساتھی تھی۔

ہما نے لرزتی آواز میں کہا۔ "اپنے نصیب کو رو رہی ہوں۔"

فاطمہ اس کی بات سن کر افسردہ ہو گئی۔ اس نے ہما کا ہاتھ تھام لیا اور سنجیدگی سے بولی۔

"میرا بھی تو نصیب جلا ہوا ہے۔۔۔ تو کیوں دل کو روگ لگا رہی ہے۔۔۔ رشتے اور آ جائیں گے۔"

فاطمہ نے اس کے رونے کا سبب یہ سمجھا کہ کسی نے مار پھر انکار کی مہر لگا دی ہے۔ فاطمہ کے چھوٹے قد [illegible] آنسو بہاتی تھی۔ فاطمہ بھی ہما کی ہم عمر تھی اور اس کی طرح ابھی تک والدین کے گھر بیٹھی تھی۔ اس کے چار بھائی شادی شدہ تھے۔ چاروں بھابھیوں نے اس کی زندگی میں طعنوں کی بوچھاڑ کی ہوئی تھی، جو وہ سہہ رہی تھی۔

"نہیں۔۔۔ کوئی ایسا رشتہ نہیں آیا جو انکاری ہو اور جو آیا ہے۔۔۔" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی اور رو پڑی۔

فاطمہ نے اس کے آنسو پونچھے اور پوری بات جاننا چاہی۔ ہما لرزتی آواز میں بولی۔

"شائستہ آپی اپنے دیور کا رشتہ لے کر آئی ہیں۔"

"اچھا۔۔۔ یہ تو بڑی اچھی خبر ہے۔۔۔ اپنے دیور فیضان کا لے کر آئی ہوں گی۔ یار! تم دبئی چلی جاؤ گی۔۔۔ وہاں سے مجھے تحفے تو بھیجو گی ناں؟" وہ گرم جوشی سے بولتی چلی گئی۔ ہما کو اس پر غصہ آ گیا اس نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

"اوہو... کیا ہوا؟ کیا میں نے کچھ غلط کہہ دیا؟" وہ حیرت زدہ تھی کہ وہ اپنی بہن کے لائے ہوئے اتنے اچھے رشتے پر کیوں رو رہی ہے۔

"تم خالہ فریدہ کے متعلق سوچ رہی ہو نا کہ تمہارے بیاہ کے بعد وہ اکیلی رہ جائیں گی؟" اس نے فوراً قیاس کیا۔ ہما پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ فاطمہ گھبرا گئی۔

"یار! کچھ تو بتاؤ کیا ہوا؟ میں نجومی تھوڑی ہوں۔"

ہما نے روتے روتے فیضان کے بجائے عاصم کا نام لیا تو فاطمہ کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ وہ بوکھلا گئی۔

"کیا... کیا یہ سچ ہے؟... تو سچ کہہ رہی ہے؟" اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ ایک بہن اپنی دوسری بہن کے لیے ایسا رشتہ لا سکتی ہے۔

"ہاں... ہاں... میں نے خود اپنے کانوں سے سنا ہے، میں ان کے لیے شربت لے کر اماں کے کمرے میں جا رہی تھی تو یہ بات سن کر میرے قدم منجمد ہو گئے۔ مجھ میں اتنی سکت نہ رہی کہ میں اسی وقت شائستہ آپی سے پوچھتی... کہ وہ میرے لیے کیا سوچ کر گونگے کا رشتہ لائی ہیں۔" اس نے خفگی ظاہر کی۔

"مجھے شائستہ آپی سے یہ امید نہ تھی۔" فاطمہ جو اپنے لیے فکر مند رہتی تھی، ہما کی بات پر اس کی آس بالکل دم توڑ گئی کیونکہ ہما اس سے کافی خوش شکل تھی۔ فاطمہ نے چونک کر پوچھا تھا۔

"تمہاری اماں کا کیا فیصلہ ہے؟" اس کے رونے پر وہ سمجھی، شاید خالہ فریدہ نے اس رشتے کے لیے ہاں کر دی ہے۔

"اماں نے نہ کر دی ہے... اس کے باوجود شائستہ آپی انہیں سوچنے کا وقت دے گئیں۔" اس نے فاطمہ کو اپنا دکھ سنایا۔

دونوں فکر مند بیٹھی تھیں کہ ماہ نور بھی وہاں آپہنچی۔ ماہ نور بھی ہما کے پاس سلائی سیکھنے کے لیے آتی تھی۔ وہ ایم اے کا امتحان دے کر اب سلائی سیکھ رہی تھی۔ بقول اس کی ماں کے لڑکیوں کو سلائی آنا چاہیے ورنہ سسرال میں باتیں سننے کو ملتی ہیں۔ ماہ نور چوبیس سال کی تھی۔ وہ ہمیشہ فاطمہ اور ہما کو دلاسا دیتی، ہما اس کی ہمدردی مثبت لیتی تھی مگر فاطمہ منفی... شاید اس کی وجہ فاطمہ کی بھابھیاں تھیں، جو فاطمہ کے منہ پر اس کی ہمدرد بنتیں اور پیٹھ پیچھے اس کی ذات میں کیڑے نکالتیں۔

دونوں کے مرجھائے چہروں سے ماہ نور کو اندازہ ہو گیا کہ کوئی پریشانی والی بات ہے۔ وہ ان کے پاس آبیٹھی۔ ماہ نور نے اپنے کپڑے والے شاپر میں سے تین آم نکالے اور ہنس کر بولی "پہلے آم کھا لیتے ہیں... پھر غم کھاتے ہیں۔"

اس کی بات پر فاطمہ کے لبوں پر پھیکی مسکراہٹ [illegible] ماہ [illegible] آم [illegible] بولی۔ "میرا پیٹ غم سے بھر گیا... میں یہ آم رات کو کھاؤں گی... جب رات کو دشمنوں کی فوج مجھے آجکڑے گی تو یہ آم کی طاقت اس سے مقابلہ کر کے مجھے سُلا دے گی۔"

اس نے آم کا بغور جائزہ لیا جو سائز میں کافی وزنی تھا۔ ماہ نور نے ایک آم ہما کو بھی دیا۔ اس نے پلٹ کر اس کی جھولی میں واپس پھینک دیا۔

"رزق پر غصہ کیوں... غصہ کرو اس پر جس نے [illegible] دیا ہے... لیکن پہلے مجھے بھی تو کچھ بتاؤ۔" اس نے آم چوستے ہوئے کہا... وہ آموں کی بے حد شوقین تھی۔

فاطمہ افسردگی سے بولی "ہما کے لیے رشتہ آیا ہے... مگر!"

اس نے بات ادھوری چھوڑ دی اور ہما کو دیکھنے لگی کہ آیا وہ ماہ نور کو اس بات سے آگاہ کرنا چاہتی بھی ہے یا نہیں۔

ماہ نور نے ہما کا ہاتھ پیار سے تھام لیا "ہما! تمہیں مجھ پر اعتبار ہے... تو بتاؤ... ورنہ پردہ ہی رکھو۔" وہ اس کی خاموشی پر بولی۔

ہما نے آہ بھری "ماہ نور! مجھے تم پر اعتبار ہے... میں تو اپنی قسمت پر خاموش ہوں... شائستہ آپی میرے لیے اپنے گونگے دیور کا رشتہ لائی ہیں۔" اس نے پرنم آنکھوں کے ساتھ بتایا جیسے اس رشتے نے اسے مکمل توڑ دیا ہو۔

"اوہو... تو اس میں رونے کی کیا بات ہے... ان لوگوں نے رشتہ تم سے پوچھ کر طے کرنا ہے... تم صاف انکار کر دینا۔" ماہ نور نے اس کے آنسو پونچھ کر تسلی دی۔

"تمہارے نزدیک کچھ نہیں ہے... تم ابھی چوبیس سال کی ہو نا... ہم سے پوچھو کہ ہم پر ہر روز کیا کیا بجلیاں گرتی ہیں۔" اس کی تسلی پر فاطمہ نے فوراً [illegible] وہ ابھی تک ہما اور اپنی دوستی میں اسے [illegible]

[illegible] اس میں رونے کی کیا بات ہے... ہما! کیوں رو رہی ہو... اس بات پر کہ تمہارے لیے گونگے کا رشتہ آیا ہے... یا پھر اس پر کہ تمہاری بہن یہ رشتہ لائی ہے؟" ماہ نور نے اس کا ہاتھ تھام کر سنجیدگی سے پوچھا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کس بات پر رو رہی ہے۔

"شاید اس وجہ سے زیادہ تکلیف ہو رہی ہے کہ شائستہ آپی میرے لیے یہ رشتہ لائی ہیں۔ ان کے نزدیک میری کوئی اہمیت نہیں رہی۔" وہ شائستہ کی جلی [illegible] یاد کر کے بولی تھی جو وہ اس کی عمر پر کہہ گئی تھیں۔

"مجھے تو نہیں لگتا کہ ان کے نزدیک تمہاری کوئی اہمیت نہیں رہی۔" ماہ نور کسی خیال کے تحت بولی۔

"وہ کیوں... تمہیں کیوں نہیں لگتا... ایسے حالات میں اپنے بھی پرائے ہوتے ہیں، مجھے دیکھ لو! ہر وقت بوجھ ہونے کا طعنہ ملتا ہے... اماں ابا سر پر ہیں تو دو وقت کا کھانا نصیب بھی ہو رہا ہے ورنہ بھائیوں نے کب کے میری طرف سے ہاتھ کھینچ لیے ہوتے۔" [illegible] نم آنکھیں لیے پھٹ پڑی۔

[illegible] نے سنجیدگی سے کہا "یار! شائستہ آپی بہت [illegible] دل رکھتی ہیں۔ اس لیے مجھے نہیں لگتا کہ وہ غلط ہیں۔"

"ضروری تو نہیں کہ جو لوگ اپنے لیے حساس ہوتے ہیں... وہ دوسروں کے لیے بھی ہوں۔" فاطمہ غصے سے بولی۔

"فاطمہ! مجھے تو یوں لگتا ہے... کہ شائستہ آپی کے نزدیک شاید ہما بہت عظیم ہو اور وہ یہ سوچ رہی ہوں کہ ہما اس گونگے کی زبان بن سکتی ہے۔ اس کو سہارا دے سکتی ہے۔" ماہ نور نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

فاطمہ پھر خاموش ہو گئی۔ ہما روتے روتے بولی "میں اتنی عظیم نہیں ہوں... اماں نے منع بھی کر دیا مگر پھر بھی شائستہ آپی نے وقت دے دیا، نہ جانے وہ میرے لیے کون سا سکھ دیکھ رہی ہیں۔"

"اس بات کا جواب تو تمہاری شائستہ آپی ہی دے سکتی ہیں۔" اس نے ہما کو دوبارہ آم پکڑا دیا اور اپنی ماں کی آواز پر اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ شام کو پھر آنے کا کہہ کر چلی گئی۔

"ماہ نور ہمارا درد کہاں سمجھ سکتی ہے... اس کے لیے ایسا رشتہ آئے تو اس کی حالت دیکھنا۔" فاطمہ، ماہ نور سے خفا ہو گئی تھی کیونکہ وہ فاطمہ کی سوچ کو رد کر گئی تھی، مگر ماہ نور کی یہ بات ہما کے ذہن میں بیٹھ گئی کہ اس کی شائستہ آپی نے کبھی اس کا برا نہیں سوچا تو... اسے ان سے بات کرنا چاہیے۔

ہما کو ساری رات سوچوں نے گھیرے رکھا مگر اس نے اپنی ماں پر ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ اس بات سے واقف ہے۔ فریدہ بھی صبح اس کو سر پر دوپٹہ باندھے ملیں۔ وہ سر درد کی شکایت کر رہی تھیں۔ وہ پریشان تھیں کہ وہ کیا فیصلہ کریں۔ شائستہ کی باتیں ان کو کڑوی ضرور لگیں مگر پھر انہوں نے سوچا کہ ان کی بیٹی سچ ہی تو کہہ رہی ہے، دو سال سے کسی رشتے نے ان کے دروازے پر دستک نہ دی تھی اور آگے بھی یوں ہی رہا تو ان کی ہما کا کیا ہو گا... باپ کا سایہ تو بچپن سے اس کے سر سے اٹھ گیا تھا بھائی جیسی نعمت کا سہارا ابھی تو نہ تھا۔

فریدہ کو یہ سوچ بے حال کیے دے رہی تھی کہ ان کے مرنے کے بعد ہما کا سہارا کون بنے گا۔

ہما نے رات بھر سوچنے کے بعد فیصلہ کرلیا کہ وہ شائستہ آپی سے خود بات کرے گی۔ اس نے ماں سے اجازت لی اور شائستہ کے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔ فریدہ نے یہ سوچ کر اجازت دے دی کہ اچھا ہے شائستہ ہما سے خود اس رشتے کے متعلق بات کرلے کیونکہ عاصم کے متعلق سوچتے ہوئے انہیں محسوس ہوا کہ وہ اتنا برا بھی نہیں ہے۔۔۔ اور یہ کمی تو خدا کی طرف سے ہے۔۔۔ اس بیچارے کا کیا قصور۔۔۔ عاصم اپنا ایک جنرل اسٹور چلا رہا تھا۔ وہ بی اے پاس تھا لہٰذا کاغذ پر لکھ کر بات کرلیتا تھا۔ فریدہ ان پڑھ تھیں وہ ہمیشہ اس کی ڈائری کے لکھے کو پڑھ نہ پاتیں اور بولتیں کہ "تمہاری پڑھائی مجھے گونگا کر دیتی ہے۔" تو وہ مسکرا کر کانوں کو ہاتھ لگاتا۔۔۔ وہ اپنی ڈائری کے ذریعے سب سے کھلے دل سے باتیں کرلیتا۔ ڈائری اور قلم اس کے ساتھی تھے۔۔۔ خدا کا شاید اس پر یہ کرم رہ گیا کہ وہ بہرا نہیں تھا ورنہ شاید وہ کبھی بھی اپنوں کی بات سمجھ نہ پاتا۔

☆ ☆ ☆

وہ دل پر پتھر رکھ کر شائستہ کے گھر کی طرف جا رہی تھی کہ اسے راستے میں عاصم مل گیا۔ وہ گھبرائی مگر عاصم اسے دیکھ کر مسکرایا۔۔۔ اس نے اپنی جیب سے قلم اور ڈائری نکالی اور مسکراتے ہوئے اس پر کچھ لکھا اور ہما کی طرف بڑھا دی، ہما پڑھنے لگی اس نے لکھا تھا۔ "اچھا ہوا آپ مجھے مل گئیں، میں آپ سے ملنے کا خواہشمند تھا۔" وہ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ ہما حیران ہوئی "کیوں؟"

وہ مسکرایا۔۔۔ اور اس نے پھر لکھ کر ہما کو ڈائری پکڑائی، جس میں لکھا تھا۔۔۔ "میں آپ کی فکر کم کرنا چاہتا تھا۔"

"کیسی فکر؟" وہ بوکھلا گئی۔۔۔ وہ اس کے لیے ساری رات روتی رہی تھی۔ وہ چور سی ہو گئی کہ یہ کیسے اس کے زخمی دل سے واقف ہے۔

عاصم نے سنجیدگی سے لکھا "وہ فکر جو آپ کے چہرے سے جھلک رہی ہے۔ میں آپ سے شادی نہیں کر رہا، میں آپ کی بہن کو منع کر دوں گا۔"

وہ جو ہما سے شادی کرنے سے پہلے بات چیت کرنا چاہتا تھا، مگر ہما کے رویے سے جان چکا تھا کہ وہ اس کو قبول نہیں کرنا چاہتی۔ وہ شرمندہ سی ہو گئی۔۔۔ عاصم نے پھر ڈائری پر لکھا کہ "وہ ان کی اس ملاقات کا تذکرہ کسی سے نہیں کرے گا۔۔۔ وہ بے فکر ہو جائے۔"

غالباً اس کے ڈرے سہمے چہرے کو دیکھ کر اس نے تسلی دی تھی۔ ہما پڑھ کر حیرت سے اسے تکنے لگی۔ عاصم سے مل کر اسے اندازہ ہوا کہ وہ کتنا اچھا انسان ہے، جو کسی کی زندگی کو اپنی کمزوری کی وجہ سے اذیت میں نہیں رکھنا چاہتا۔ عاصم نے پھر مسکرا کر لکھا۔۔۔

"میرا قلم اور ڈائری ہی میری زبان ہے، جو ہر وقت میرے ساتھ رہتے ہیں۔۔۔ اور میری ڈائری گم ہو گئی ہے، مجھے دکان پر جانا ہو گا۔" عاصم نے آخری صفحے پر لکھ کر اسے پڑھایا۔۔۔ پھر وہ دوسرے راستے پر چل پڑا۔

وہ اس کے بارے میں سوچنے لگی کہ وہ خود غرض انسان نہیں ہے ورنہ وہ اس کی بہن کو مجبور کرکے بھی تو یہ شادی کر سکتا تھا۔ اس کے دل میں عاصم کے لیے احترام بھر گیا۔ وہ اسی سوچ میں گم شائستہ کے گھر پر پہنچی۔ اس نے بیل بجانے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اسے اپنے بہنوئی ناصر کی غصیلی آواز سنائی دی۔

"ہزار دفعہ تمہیں کہہ چکا ہوں۔۔۔ دروازہ پوچھ کر کھولو، مگر تمہیں میری عزت کی کوئی پرواہ ہی نہیں ہے۔ تم بس یہ ہی چاہتی ہو کہ میں اپنے دوستوں میں ذلیل ہوتا رہوں۔۔۔ وہ مجھے تمہاری وجہ سے چھیڑتے ہیں کہ تمہاری بیوی، بیوی کم ماں زیادہ لگتی ہے۔۔۔ دیکھو! اپنے چہرے کا حال دیکھو۔۔۔ چھائیوں سے بھرا ہوا ہے، چالیس کے بجائے پچاس کی لگتی ہو۔"

وہ اس پر چیخ رہا تھا اور ہما یہ سب سن کر بھی یقین نہیں کر پا رہی تھی کیونکہ شائستہ آپی ہمیشہ یہ کہتی پھرتی تھیں کہ وہ اپنی شادی شدہ زندگی سے مطمئن ہیں۔ شائستہ کی لرزتی آواز ابھری۔۔۔ "آپ مجھے اس ظلم کی سزا دے دیں۔ طلاق دے دیں۔۔۔ اگر میں آپ کے لیے انسلٹ بن چکی ہوں۔"

"تم دو بچوں کی ماں ہو۔۔۔ مگر یوں لگتا ہے۔۔۔ جیسے تم سو برس کی کوئی بڑھیا ہو۔" آج دراصل پھر ناصر کے دوست سلطان نے شائستہ کو دیکھ لیا تھا۔ وہ ناصر سے ملنے آیا تھا تو اس نے دروازہ کھول دیا۔۔۔ بس پھر تو ناصر نے سارا غصہ شائستہ پر نکالا تھا۔ اس کا ہر دوست شائستہ کو دیکھ کر ناصر سے افسوس کرتا کہ ناصر شائستہ سے زیادہ جوان لگتا ہے۔ دوستوں کی ان ہی باتوں نے اسے مزید جوان کر دیا تھا۔

شائستہ بھی غصہ ہو گئی "آپ بھی تو میرے ہم عمر ہیں۔۔۔ پھر مجھے کیوں طعنے دیتے رہتے ہیں؟" اس نے ناصر کو اس کی عمر کا حوالہ دیا۔۔۔ مگر شاید مرد کبھی بوڑھا نہیں ہوتا اور غالباً ناصر کے دماغ میں یہ ہی فلسفہ چل رہا تھا۔۔۔ اپنے دوست خرم کی بیوی نورین کو دیکھ کر اس کے طعنے مزید بڑھ گئے تھے، جو خرم سے پندرہ سال چھوٹی تھی۔۔۔ اب شائستہ بے چاری نورین اور اپنی عمر کا یہ تضاد تو نہیں مٹا سکتی تھی۔۔۔ اور نہ ہی اس جیسی شوخ طبیعت اپنا سکتی تھی۔

"اچھا اچھا۔۔۔ زیادہ منہ مت کھولو۔۔۔ اور جلدی سے کھانا دو۔۔۔ مجھے باہر بھی جانا ہے۔" اس نے اکڑ کر کہا، جیسے وہ اس کی بیوی نہیں ملازمہ ہو۔

شائستہ اس کے بچوں کی ملازمہ ہی رہ گئی تھی۔ ناصر اور اس کے درمیان خلا پیدا ہو گیا تھا، جس کا درد وہ اپنے سینے میں چھپائے بیٹھی تھی۔ شائستہ کی آواز پھر ہما کے کانوں میں پڑی، جو روتے روتے بولی تھی۔

"عاصم کی جگہ کاش آپ گونگے ہوتے تو یوں مجھے بڑھاپے کے طعنے روز روز سننے کو نہ ملتے۔" اس کی بات پر ناصر نے اس کو پیٹنا شروع کر دیا۔

ہما کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ وہاں سے بھاگ نکلی۔

شائستہ کی شادی تیس سال کی عمر میں ہوئی تھی۔ نہ جانے جیسے دکھ کا مقابلہ کرکے وہ یہاں پہنچی تھی اور اب بڑھتی عمر کے طعنوں کا مقابلہ کر رہی تھی۔۔۔ ہما کے آنسو بہنے لگے۔۔۔ دل جیسے پھٹنے لگا، اسے اپنی بہن کا فیصلہ سمجھ میں آ گیا تھا، وہ جس آگ میں جھلس رہی تھی، اپنی بہن کو اس سے دور رکھنا چاہتی تھی۔۔۔ وہ رو رہی تھی کہ اچانک عاصم اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔۔۔ وہ فکرمند تھا کہ وہ کیوں رو رہی ہے۔۔۔ دکان سے اسے ڈائری نہیں ملی تھی جس پر لکھ کر وہ اس سے پوچھ سکتا۔۔۔ وہ اشاروں سے پوچھنے لگا کہ وہ کیوں رو رہی ہے۔

ہما کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر وہ شائستہ کی جگہ ہوتی تو روز روز اس طرح کے طعنوں پر ایک دن بھی نہ گزار پاتی۔۔۔ ہما کو اپنی بہن کے دکھ کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اس نے عاصم کی جیب سے اس کا قلم اتارا اور اس کی ہتھیلی پر لکھا۔۔۔ "تم مجھ سے شادی اس لیے نہیں کر رہے ہو کہ تم گونگے ہو۔۔۔ بلکہ میں تم سے شادی اس لیے کرنا چاہتی ہوں کہ مجھے معاشرے کی زبان سے بچنا ہے۔۔۔ مجھے تمہارے سہارے کی ضرورت ہے، تمہیں نہیں۔"

وہ پڑھ کر حیرت سے اسے تکنے لگا۔ اس کے آنسو جاری تھے۔ وہ روتے روتے پھر بولی۔۔۔ "مجھے معاشرے کے طعنوں سے بچنا ہے۔۔۔ مجھے ہر اس طعنے سے بچنا ہے، جس سے میری ذات کھوکھلی ہو سکتی ہے۔۔۔ پلیز مجھے جواب دو کیا تم مجھ سے شادی کرکے میرا سہارا بن سکتے ہو؟" ہما نے اس کو قلم دے کر جواب مانگا۔

اس نے سنجیدگی سے اپنا قلم جیب میں واپس رکھ لیا۔ وہ گھبرا سی گئی کہ اس کی طرف سے انکار ہے۔۔۔ اس نے اپنا سر جھکا لیا تو عاصم نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ہما کو یوں لگا، جیسے اس کے کان عاصم کے دل کی آواز سن رہے ہیں۔۔۔ جو یہ کہہ رہا ہو۔۔۔ کہ "میری خاموش محبت تمہیں ہمیشہ خوشیاں ہی دے گی۔۔۔ میں ہمیشہ تمہارا سہارا بن کر رہوں گا۔۔۔ جیسے کہ تم میرا سہارا بن رہی ہو۔"

ہما نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔۔۔ وہ اس کے نہ لکھنے پر بھی اس کے دل کی بات سمجھ گئی تھی کیونکہ ہما نے دل سے اسے اپنایا تھا۔ ☆

رمشہ خالد جان

طلب
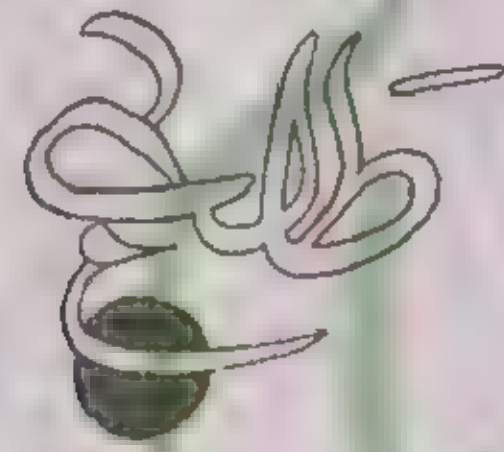
حرا آفس سے لوٹی بہت تھک چکی تھی۔ اسکارف کی گرفت سے سر کو آزاد کر کے پرس صوفے پر اچھالا اور گرنے کے انداز میں بیڈ پر لیٹ گئی۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹایا۔ آنے والی انا تھی۔ اسے نظر انداز کر کے سیدھی دیوار گیر آئینے کے سامنے جا کر خود کو ہر زاویے سے دیکھنے لگی۔ ضروریز ر سے لوٹی تھی، حرا کی طرف اس کی پشت تھی، وہ کہنی کے بل سر اٹھا کر سامنے آئینے میں اس کا عکس دیکھنے لگی۔ بہت گہرے گلے والی سیاہ فل سلیوز (آستین) لانگ شرٹ میں اس کا فیگر کسی سانچے میں ڈھلا لگ رہا تھا، پنسل ہیل اس کی قامت کو غضب ناک بنا رہی تھی، اونچا جوڑا جس کی وجہ سے گہرے گلے سے جھلکتا جسم مزید نمایاں ہو رہا تھا، اسموکی میک اپ، کانوں میں لٹکتے لمبے لمبے آویزے اور گلے میں جھولتا سیاہ پتھر جو سانس کے زیر و بم کے ساتھ اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر انا مسکرائی۔

"کیوں لگ رہی ہوں ناں ہاٹ؟" hot leady کی پوری شیشی خود پر انڈیلنے کے بعد اسٹائل سے کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ نگاہیں بدستور آئینے پر مرکوز تھیں جس کی سطح پر اس کے شعلہ جوالا نے سراپے کے علاوہ ایک اور بھی عکس تھا۔ ٹھنڈا، میٹھا، چاندنی جیسا۔ یہ سامنے والی دیوار پر آویزاں اس کی دو سال پرانی تصویر کا عکس تھا۔

ایک ہی شخصیت کے ہونے کے باوجود دونوں عکسوں میں بے حد فرق تھا، زمین آسمان کا سا، مگر یہ فرق کیا تھا؟ حرا تلاشنے لگی۔ اس کی زیرک نظروں نے ذرا سے غور کے بعد تلاش کر لیا کہ اس کی تصویر [illegible] "حیا" [illegible] تھا، وہ پیش اس کے اطوار سے جھلکتی بے حیائی تھی۔

وہ طویل سانس لیتے ہوئے سیدھی ہوئی۔ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔

وہ سمجھانے کی حدود سے نکل چکی تھی پھر بھی اس نے ایک کوشش کرنا چاہی۔

"کیوں کر رہی ہو تم ایسا، وہ تمہارا کلاس فیلو رہ چکا ہے، تمہیں پسند کرتا تھا اب جب کہ تم اس کے آفس میں کام کرتی ہو، ہو سکتا تھا دن بھر کا ساتھ اس کی پسندیدگی کو محبت میں بدل دیتا۔"

"محبت" اس نے قہقہہ لگایا "محبت دیومالائی کہانی کا نام ہے۔ میں اکیسویں صدی کی لڑکی ہوں، فرسودہ چیزوں پر یقین نہیں رکھتی۔"

"محبت ایک زندہ حقیقت ہے۔ زمانہ خواہ کتنا ہی ترقی یافتہ کیوں نہ ہو جائے، محبت کبھی فرسودہ نہیں ہوتی۔ محبت کرنے والے ختم ہو جاتے ہیں، ان کا نام و نشان مٹ جاتا ہے، جسم مٹی میں مل کر مٹی ہو جاتے ہیں، ہڈیاں بوسیدہ ہو جاتی ہیں مگر دلوں میں دھڑکتی محبت ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔ اس کا تعلق جسم سے نہیں، روح سے ہوتا ہے۔ جانتی ہو محبت ہر صدی کے پاس دوسری صدی کی امانت ہوتی ہے جسے ادا کیے بغیر وہ ختم نہیں ہوتی۔ دن، ہفتے، مہینے، سال، صدیاں، یہ وقت ناپنے کے بے جان پیمانے ہیں، یہ محبت ہی ہے جو انہیں زندہ رکھتی ہے۔"

وہ وجد کے عالم میں بول رہی تھی۔ اس کے چہرے پر، آنکھوں میں، لہجے میں صرف محبت ہی محبت تھی۔ انا کو اس لمحے اس پر رشک آیا۔ مگر صرف ایک پل کو۔

"تمہیں کیا ملا محبت کر کے؟" اس نے تمسخر بھری نگاہ اس پر ڈالی مگر وہ پرسکون رہی۔

"یہ پوچھو کیا نہیں ملا۔" خوبصورت مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر ابھری۔ محبت کے سرور سے پلکیں بوجھل ہوئیں۔ "جب میں تھکن سے چور ہوتی ہوں، یہ محبت [illegible] جو میری ساری تھکن سمیٹ لیتی ہے۔ رات کی تنہائیوں میں سکون بن کر میرے اندر اترتی ہے۔ میرے قدم بھٹکنے نہیں دیتی۔ یہ محبت ہی ہے جو مجھے زندہ رکھتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ محبت کر کے مجھے محبت ملی ہے اور تم کہتی ہو کیا ملا؟"

"ہونہہ، فلسفیانہ باتیں۔" اس کے لہجے میں حقارت تھی۔ اس نے سر جھٹکا۔ "اگر محبت میں اتنی ہی طاقت ہوتی تو وہ کب کا تمہیں اپنا چکا ہوتا۔"

"محبت، محبت ہوتی ہے۔ جدائی، ملن، کھونا، پانا، یہ سب قسمت ہے۔ محبت کا ان سے کوئی واسطہ نہیں، محبت یا تو ہوتی ہے یا نہیں ہوتی اور بس اس میں کسی تیسری بات کی گنجائش نہیں ہوتی۔" اس کا لہجہ بہت مضبوط تھا۔

"یہ سب کتابی باتیں ہیں۔ مجھے بلخ شیر کی محبت نہیں بلخ شیر چاہیے۔ وہ رسم و رواج کا قیدی ہے، مجھ سے محبت کرنے بھی لگا تو اسے دل میں سنبھال کر تمہاری طرح چین سے رہ لے گا، اس لیے میں اس کی محبت نہیں، طلب بننا چاہتی ہوں۔ ایسی طلب جسے پورا کیے بغیر اس سے سانس تک لینا دشوار ہو جائے۔" اپنے آویزے سے کھیلتے ہوئے اس کی آنکھوں میں عجیب چمک تھی۔ حرا کو اس سے خوف آیا۔

"اور جب طلب پوری ہو گئی تو؟" اس کے سوال پر اس کے بڑھتے قدم ٹھٹکے، دل پوری شدت سے لرزا،

مگر صرف ایک پل کو۔ اگلے ہی پل اس نے نخوت سے سر جھٹک کر "تو" کا بوجھ دور پھینکا۔

"دیکھا جائے گا" بے تاثر لہجے میں کہتی تیزی سے باہر نکل گئی۔ حرا تاسف سے اس کی ایڑی کی ٹک ٹک سنتی رہی۔

☆ ☆ ☆

بلخ شیر سمندر کے کنارے اوپن ریسٹورنٹ میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ مقررہ وقت سے آدھا گھنٹہ پہلے آگیا تھا۔ دور سمندر میں کشتیوں کی روشنی جگنوؤں کی مانند چمک رہی تھی' ایسا لگ رہا تھا جیسے جگنوؤں نے سمندر میں بسیرا ڈالا ہوا ہو اور اب لہروں پر جھولا جھول رہے ہوں' مگر اس خوبصورت منظر سے بے نیاز اس کی نظریں اس طرف جمی ہوئی تھیں' جہاں سے انا کو آنا تھا۔ بے چینی اس کے ہر عمل سے عیاں تھی۔ اس کے بغیر لمحہ لمحہ طویل ہو کر کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ ایک گھنٹے کے صبر آزما انتظار کے بعد وہ آئی۔ اس کے لباس سے پھوٹتی تیز مدہوش کن خوشبو بلخ شیر کے حواسوں پر چھا کر جذبات میں ہیجان پیدا کرنے لگی۔ اس کے وجود کی حرارت میں اسے اپنا آپ تپتا محسوس ہوا' مگر اس تپش میں بڑا سکون تھا۔ جاڑے میں کھلے آسمان تلے دہکتی آگ تاپنے جیسا سکون۔ اس کا دل اس آگ کو اوڑھ کر بھسم ہونے کو مچلنے لگا۔ اس نے پانی کا گلاس منہ سے لگایا اور پیتا چلا گیا۔ ٹشو اٹھانے کو بڑھا ہاتھ بے اختیار میز پر دھرے اس کے مخروطی ہاتھ پر اترا تو اس نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ انگلیاں اس کی ہتھیلی سے مس ہو کر نکلتی چلی گئیں۔

"کہاں کھو گئے؟" اپنے لمس کے زیر اثر اس کی کیفیت دیکھ کر انا کا قہقہہ بہت جان دار تھا۔

وہ چونک کر ہوش میں آیا۔ اس کی صراحی دار گردن میں جھولتا سیاہ پتھر اتنا چمکتا تھا کہ بلخ شیر کی نظریں کھانا کھانے کے دوران اس پر سے پھسل پھسل جاتی تھیں۔ وہ لاکھ چاہتے ہوئے بھی اپنی بے اختیاری پر قابو نہیں کر پا رہا تھا۔ بظاہر بے نیاز بنی انا اس کی کیفیت کا مزا لے رہی تھی۔

"سچ کہتے ہیں' عورت اگر عقل سلب کرنے پر آئے تو بڑے بڑے دانا پانی بھرتے نظر آتے ہیں۔" وہ فخر سے مسکرائی۔

"اتنی جلدی جا رہی ہو۔" بلخ شیر نے اسے روکنا چاہا۔

وہ اتنے مہینوں میں لوہا گرم کر چکی تھی' آج بس چوٹ لگانے آئی تھی' اس لیے اس کے اصرار کے باوجود کھڑی ہو گئی۔

ایک ہاتھ سے پرس سنبھالتے ہوئے' دوسرا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ وہ پکڑنے لگا تو جلدی سے واپس کھینچ لیا۔ کندھا اٹھا کر انگلیاں ہلائیں اور ہنسی ہوئی پلٹ گئی۔ وہ کھڑا ایک ٹک اسے دیکھتا رہا۔ اس کے [illegible] سے جھانکتی وہ دھیا [illegible] روشنیاں بکھیر رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں چندھیانے لگیں۔ اس کی نظروں سے اوجھل ہونے سے پہلے وہ رکی' گردن موڑ کر ایک ظالم مسکراہٹ اس کی طرف اچھالی اور جھٹکے سے بالوں کی پن کھینچ لی۔ سیاہ بالوں نے ایک دم سے پشت کا احاطہ کر لیا۔ سیاہ بال' سیاہ لباس' اب جیسے وہ سر تا پا سیاہ لبادے میں چھپی تھی۔

بلخ شیر نڈھال سا کرسی پر گر کر لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ رگوں میں گردش کرتے لہو کی رفتار تیز ہوئی تھی۔ بدن جیسے ٹوٹ رہا تھا۔ وہ اس وقت صرف ایک طالب تھا۔ دل و دماغ کی ایک ہی طلب تھی۔

"انا' انا' انا"

☆ ☆ ☆

کمرے میں پھیلی ٹھنڈی سبز روشنی پردوں کے کونوں سے جھانکتی سفید کرنوں کے سامنے اپنا رنگ کھو رہی تھی۔ الارم کی آواز نے خاموشی کو چھیڑا۔ کافی دیر کسلمندی سے کروٹیں بدلنے کے بعد بھرپور انگڑائی لیتی وہ اٹھ بیٹھی۔ نہانے کے بعد بالوں کو تولیے میں لپیٹا' بلیک کافی کا مگ تیار کر کے کھڑکی کے سامنے [illegible] اور دور تک پھیلے پردے سمیٹ گئے۔ روشنی کو [illegible] راستہ مل گیا' مگر صرف کمرے کے اندر۔ [illegible] کی ٹھنڈک کے باوجود اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ [illegible] نے کھڑکی کھول دی۔ لمبے لمبے سانس لینے سے [illegible] کی خوشبو پورے وجود کا احاطہ کرنے لگی۔ بلخ شیر کو [illegible] کے پھول بہت پسند تھے۔ وہ مارگلہ کی پہاڑیوں پر [illegible] کر تلخ کافی حلق سے اتارتے ہوئے اسے سوچنے [illegible] ان کی شادی کو ایک سال ہونے کو آ رہا تھا۔

بلخ شیر کا تعلق ایک قبائلی علاقے سے [illegible]۔ ان کے قبائلی رواج کے مطابق قبیلے سے باہر شادی جرگے کی اجازت کے بغیر نہیں ہو سکتی تھی۔ جو اس قانون کی خلاف ورزی کرتا' اس سے قبیلے کی [illegible] چھین کر اسے بے مول کر دیا جاتا تھا۔ [illegible] کے آگے اگر ایک طرف خزانوں کے ڈھیر [illegible] جائیں اور دوسری طرف قبائلی شناخت رکھ [illegible] بلاشبہ [illegible] طرف [illegible]۔ قبیلے سے باہر شادی کرنے کی یہ سزا بہت [illegible] اس لیے ان کے قبیلے کا کوئی مرد جرگے کی اجازت کے بغیر قبیلے سے باہر شادی کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ سوچا تو بلخ شیر نے بھی کبھی نہیں تھا' مگر انا نے اسے کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل کہاں چھوڑا تھا۔

انا یونیورسٹی کے زمانے سے اسے پسند کرتی تھی۔ اس کے رسم و رواج سے بھی واقف تھی۔ جانتی تھی [illegible] اس سے کتنی ہی شدید محبت کیوں نہ کرے' کبھی [illegible] نہیں۔ اس لیے اس نے دوسرا طریقہ اپنایا' [illegible] کی محبت بننے کی بجائے "طلب" بن گئی' ایسی طلب جو پوری ہوئے بنا طالب کو چین نہیں لینے دیتی' رات کو سونے نہیں دیتی' دن کو کچھ کرنے نہیں دیتی۔ [illegible] امنگ سے جینے دیتی ہے نہ سکون سے مرنے دیتی [illegible] حواس سلب کر لیتی ہے۔ اسے پوری کیے بنا کوئی [illegible] نہیں ہوتا۔

[illegible] شیر نے سمندر کے کنارے ہونے والی ملاقات [illegible] اگلے ہی روز اس سے نکاح کر لیا تھا' حالانکہ طلب [illegible] کرنے کے لیے یہ نہیں دیکھا جاتا کہ ذریعہ جائز ہے یا ناجائز' مگر یہ انا کی خوش قسمتی تھی کہ بلخ شیر نے اس کے حصول کے لیے جائز راستہ اپنایا۔ اس کا کاروبار کراچی میں تھا۔ قبیلے والوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ اس لیے وہ اسے اسلام آباد لے آیا۔ تب سے اب تک وہ یہیں تھی۔ شروع شروع میں بلخ شیر یہاں سے جانے کا نام نہیں لیتا تھا۔ مہینوں اس کے پاس رہا' پھر ہفتے میں ایک بار چکر لگانے لگا۔ اب صورتحال یہ تھی کہ دو ماہ ہونے کو آئے تھے مگر وہ آنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ فون پر بھی برائے نام بات کرتا تھا۔ ایسے میں انا کا پریشان ہونا بجا تھا۔

چوکیدار نے گیٹ کھولا' لینڈ کروزر ڈرائیو وے پر آ کر رکی۔ بلخ شیر کو اترتا دیکھ کر وہ کھل کر مسکرائی۔ اسے دیکھتے ہی اتنے دنوں کی بیزاری اڑن چھو ہو چکی تھی "پیاسا کنویں کے پاس آتا ہے' کنواں نہیں جاتا" یہ سوچ کر اس کے استقبال کے لیے نیچے جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ وہ بدستور مارگلہ کا حسن دیکھتی رہی۔ کتنی دیر اپنے کندھوں پر اس کے لمس کی منتظر رہی۔

بالآخر بے نیازی کا خول توڑنا پڑا۔

اس نے گردن موڑی۔ وہ صوفے پر نیم دراز اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ آنکھیں ہر احساس سے عاری تھیں۔ انہونی کے بچھو نے زور سے اسے کاٹا۔ مگ میں بچا کڑوا سیال ایک ہی گھونٹ میں حلق سے اتارتے ہوئے اس نے خود کو پرسکون کیا۔

"بابا کو ہمارے نکاح کا علم ہو گیا ہے۔" وہ سیدھا ہو بیٹھا "انہوں نے تمہیں طلاق دینے کو کہا ہے' آگے کے معاملات وہ خود سنبھال لیں گے۔"

انا نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ کھڑکی کی طرف پشت کر کے کھڑی ہو گئی۔ چند پل اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ طویل سانس خارج کی' پھر استہزائیہ انداز میں یوں ہنسنے لگی جیسے بڑے بچے کی شیخی پر ہنستے ہیں۔

"چھوڑ سکتے ہو مجھے؟" ابرو اچکا کر پوچھا۔

"ہاں!" وہ بہت سکون سے بولا۔

"محبت پانی ہوتی ہے' جسے چھوڑا نہیں جا سکتا۔"

"تم کیا میری محبت ہو جسے میں چھوڑ نہیں سکتا؟؟"

بلخ شیر کے جواب نے اس کے وجود کی عمارت متزلزل کر دی۔

"رہ سکو گے میرے بغیر؟" لہجے میں کھلا چیلنج تھا۔ اسے ابھی تک اس کے جواب پر یقین نہیں آرہا تھا۔

"بہت آرام سے۔ اگر بابا زور نہ بھی دیتے تو میں خود یہ فیصلہ لینے والا تھا۔" وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

اس نے انا کی پھٹی پھٹی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولنا شروع کیا۔

"سب سے پہلے میں نے تمہیں یونیورسٹی میں دیکھا۔ تم سیپ میں بند موتی کی طرح اجلی ٹھنڈی اور شفاف تھیں جسے دیکھتے ہی دل نے پسندیدگی کی سند دے دی...

یونیورسٹی کا دور ختم ہونے کے دو سال بعد میں نے تمہیں اپنے آفس میں دیکھا۔ حالات کی ستائی ہوئی تنہا مجبور بے سہارا لڑکی۔ میں تم میں وہی اجلا پن پاکیزگی ٹھنڈک اور سکون ڈھونڈنے تمہاری طرف کھنچا۔ مگر تم کچھ بدل گئی تھیں۔ میں نے سیپ کو کھولنے کی کوشش کی تو احساس ہوا کہ تم سیپ میں بند "موتی" نہیں بلکہ ایک "بند بوتل" ہو۔ سیل پیک۔ میں نے رستہ بدلنا چاہا تو ڈھکن ذرا سا ہلا۔ ذائقہ چکھنے کی خواہش میں، میں وہیں جم کر رہ گیا، جب جب ہاتھ بڑھاتا "بوتل" دسترس سے دور ہو جاتی، مگر جوں ہی مایوس ہو کر پلٹنے لگتا، بوتل ابلنے لگتی۔ چوہے بلی کے اس کھیل نے "موتی" کو میری "طلب" بنا دیا، طلب پوری نہ ہونے کی تشنگی سے میرا فشار خون بڑھنے لگا تھا، طلب اور رسد کی اس کشمکش میں میرا ضبط جواب دینے لگا تو یکایک ایک قطرہ میرے حلق میں ٹپکا۔ بہت مسرور تھا، اس ایک قطرے میں۔ میں اپنا آپ بھول گیا، یاد رہی تو میری اپنی "طلب"۔

وہ سانس لینے کو رکا۔ کھلی کھڑکی سے سورج کی شعاعیں اسے تنگ کرنے لگیں۔ تو پردے برابر کر کے پھرتے اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

"اس ایک قطرے کے بعد "پوری بوتل" پینا میرا مقصد بن گیا۔ اور تم جانتی ہو کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوا۔ میں غٹاغٹ پوری بوتل پی گیا۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ بوتل کا نشہ مجھ پر اثر کرنا چھوڑ دیا، مگر میں پھر بھی گھونٹ گھونٹ پیتا رہا، مگر اب۔ اب میرا دل بھر گیا۔"

"بوتل کے۔ آخری قطرے بڑے کڑوے کسیلے تھے مگر میں جبر کر کے پیتا رہا کہ کوئی حسرت باقی نہ رہ جائے۔ یہاں تک کہ میری طلب پوری ہو گئی۔"

بلخ شیر نے چند جملوں میں انا کی پوری زندگی بیان کر دی۔

"جب بابا نے مجھے تمہیں چھوڑنے کا کہا، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوا کیونکہ اب تم ایک [illegible] بوتل ہو [illegible] زندگی میں کہیں [illegible] دان میں ہو [illegible]"

اپنے اندر کا سارا زہر اس کے کانوں میں انڈیلنے کے بعد وہ جانے کو پلٹا، پھر یاد آنے پر رکا۔ "گھر میں پہلے ہی تمہارے نام کر چکا ہوں۔ حق مہر کی رقم تمہارے اکاؤنٹ میں جمع ہے۔ یہ رہے طلاق کے کاغذات۔" اس نے انا کی طرف ایک لفافہ بڑھایا ــــ مگر اس کے ساکت وجود میں جنبش نہ ہوئی۔ وہ تو پتھر کی ہو چکی تھی۔ بلخ شیر نے تاسف بھری نگاہ اس پر ڈالی، لفافہ میز پر اچھالا۔ لمبے ڈگ بھرتا چلا گیا۔ وہ یوں ہی ساکت کھڑی رہی۔

"اور جب طلب پوری ہو گئی تو؟" اس کے کانوں میں کسی کی آواز گونجی تو "تو" کا بوجھ اس کے سر پر چڑھنے لگا۔ اس نے جھٹک کر دور پھینکنا چاہا، ناکام ہوئی۔ آج وہ خود اس "تو" کی عملی تفسیر بنی کھڑی تھی۔

یہ گھر ایک کوڑا دان تھا اور وہ اس میں پڑی خالی بوتل۔ اس نے شدت سے رونا چاہا، آنکھیں خالی رہیں۔ اس پل ایک اور ظالم حقیقت اس پر آشکار ہوئی، طالب نے اپنی طلب پوری کرنے کے لیے اسے اتنا خالی کر دیا تھا اس کے پاس تو اب دو آنسو بھی نہیں بچے تھے۔

☆☆

صائمہ اکرم

خالی ہاتھ

وہ جیٹھ کی ایک حبس زدہ شام تھی جب رام بلڈنگ کے بالکل سامنے کالی ماتا کے مندر میں بجنے والی گھنٹی کی آواز نے دل میں عجیب سی کثافت بھر دی تھی۔

مندر کا دروازہ چونکہ منہدم ہو چکا تھا اس لیے سامنے چبوترے پر بڑے فخر سے بیٹھی بے شمار بازوؤں والی کالی ماتا کو دیکھ کر دل نے وحشت بھری جھرجھری لی تھی۔ آج پتا نہیں کیوں پوری گلی میں سناٹا تھا۔ مندر کے اندر بجنے والی گھنٹی کی آواز نے پوری فضا میں ایک ارتعاش سا پیدا کیا تھا اور اس کے بعد اداسی سے لبریز خاموشی نے پورے ماحول کو پھر اپنی بانہوں میں لے لیا تھا۔

قیام پاکستان سے پہلے بننے والی "رام بلڈنگ" شاید کسی زمانے میں شان و شوکت کی حامل رہی ہو لیکن اب بوسیدگی، خستگی اور گھٹن اس کے در و دیوار پر رچ بس سی گئی تھی اور رنگ و روغن بھی شاید ایک صدی پہلے کروایا تھا اس لیے اب اس کی "باقیات" بھی تقریباً "ناپید" تھی۔ اس عمارت میں تنگ و تاریک سے آٹھ فلیٹ تھے اور ایسا لگتا تھا کہ یہاں بسنے والے سارے مکینوں کی قسمت ایک جیسی تھی۔ غربت اور [illegible] کا دامن بالکل ایک مندی [illegible] کی طرح پڑا ہوا تھا۔

اس نے جیسے ہی [illegible] بلڈنگ میں قدم رکھا، بجلی دے گئی۔ سیڑھیوں پر لگا ساٹھ واٹ کا بلب جھٹکے سے بند ہو گیا۔ اتنے سال رہنے کے باوجود وہ ان انتہائی تنگ، سیلن زدہ سیڑھیوں سے آشنا نہیں ہوئی تھی اس لیے گھپ اندھیرے میں دیوار ٹٹول ٹٹول کر اوپر چڑھنے

ناولٹ

رہی تھی۔ آج تو ویسے بھی صبح سے اس کے وجود میں بھانبھڑ سے جل رہے تھے۔ اس کے روم روم میں اضطراب کسی دہکتے ہوئے سیال مادے کی طرح گھوم رہا تھا۔ اس نے ہاتھ میں آج کا اخبار اٹھا رکھا تھا جس کی خبریں اب اس کے لیے باسی ہو چکی تھیں۔

وہ سیکنڈ فلور کے ایک بوسیدہ سے فلیٹ کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ لوہے کے بدرنگ دروازے کو دھکیلا تو وہ کھلتا ہی گیا۔ وہ جانتی تھی کہ دروازہ کھلا ہی ہو گا۔

اس کی خوش قسمتی تھی کہ جیسے ہی وہ اندر داخل ہوئی، بجلی صاحبہ آگئیں اور دو کمرے، چھوٹا سا باورچی خانہ اور انتہائی مختصر سا ٹی وی لاؤنج روشن ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ ابا کا کمرہ بند تھا۔ وہ شاید دوائیوں کے زیر اثر سو رہے تھے حالانکہ وہ دبے قدموں اندر داخل ہوئی تھی لیکن نمرہ کی آنکھ پھر بھی کھل گئی تھی۔

"کیا ہوا، سو گئی تھیں؟" اس نے نمرہ کا تھکا تھکا سا چہرہ غور سے دیکھا وہ نیلے رنگ کا لان کا ملگجا سا سوٹ پہنے ہوئے تھی جو کثرت دھلائی کی وجہ سے بدرنگ ہو چکا تھا لیکن اس کے چہرے پر ہمیشہ کی طرح مسکراہٹ تھی۔

"ابا کو کھانا دیا اور انہوں نے دوائی تو ٹائم پر لی ناں؟" اس کی فکر مندی پر نمرہ مسکرائی اور اثبات میں سر ہلا کر انتہائی محبت سے اپنی بڑی بہن کو دیکھا اور تشویش بھرے لہجے میں پوچھا "آپ نے کھانا کھایا؟"

"نہیں..." اسے آج کھانے سے چنداں دلچسپی نہ تھی۔ جس کوفت کا گھر اٹھ کر وہ گھر آئی تھی، وہ ابھی تک اعصاب پر حاوی تھی، جس نے بھوک پیاس سب کچھ ختم کر دی تھی۔

"کھانا لے کر آؤں؟ آج میں نے بھنڈی گوشت بنایا ہے۔" نمرہ کے اشتیاق بھرے انداز پر وہ جبراً مسکرائی اور دوپٹہ اتار کر کرسی پر پھینکا اور پنکھا تیز کیا۔

"یار! بس ایک اچھا سا چائے کا کپ بنا دو، بھوک بالکل بھی نہیں ہے۔" وہ غسل خانے کی طرف بڑھ گئی۔ پانچ منٹ کے بعد وہ شاور لے کر واپس آئی تو گرمی کا احساس کچھ کم ہو چکا تھا۔ [illegible] چھوٹی سی گیلری میں تنی رسی پر پھیلا کر واپس آئی تو نمرہ چائے کے دو کپ لے کر اندر آ چکی تھی اور اب اس کی طرف غور سے دیکھ رہی تھی۔

"کیا ہوا؟ ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟" چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے اس نے اپنی اٹھارہ سالہ بہن کی محویت کو نوٹ کیا اور مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"پتا نہیں کیوں ایسے لگ رہا ہے جیسے آپ کچھ پریشان ہیں۔"

"کون، میں؟" وہ مصنوعی حیرت سے پوچھ رہی تھی۔ اسے علم تھا کہ اس کی یہ چھوٹی سی حساس دل کی حامل بہن چہرے سے دل کا حال جاننے میں ماہر ہے۔ اٹھارہ سالوں میں اس نے زندگی کو خوب برت لیا تھا۔ [illegible] تلخ تجربات نے اسے وقت سے پہلے بہت بڑا بنا دیا تھا۔ [illegible] ماں اور ہماری زندگی کا [illegible] [illegible]" اس نے چائے کا کپ لیتے ہوئے [illegible] اکلوتے بہن کو سنجیدگی سے دیکھا، جس کی ہوا آج ضرورت سے زیادہ گرم لگ رہی تھی۔

"کیا سوچ رہی ہیں آپیا؟"

"سوچ رہی ہوں جیسے ہی نئی ملازمت ملی، فوراً ایک ایئر کولر لوں گی۔ ابا بے چارے اتنے گرم کمرے میں سارا دن رہتے ہیں۔" نمرہ نے چونک کر بہن کا چہرہ دیکھا جس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔

"کیا یہ ملازمت بھی ختم ہو گئی؟" نمرہ فکر مندی سے پوچھ رہی تھی۔

"ہاں آج قوت برداشت ختم ہو گئی اس لیے استعفیٰ ان کے منہ پر مار کر آ گئی۔" اس کی آواز میں عجیب سی تلخی رچی ہوئی تھی۔ اس کے جواب پر نمرہ کی مسکراہٹ لمحے بھر کو ڈگمگائی ضرور تھی لیکن لبوں سے جدا نہیں ہوئی تھی۔

"چلو، اللہ بہتر کرے گا۔ آپ ٹینشن نہ لیں کوئی نہ کوئی اور راستہ نکل آئے گا۔" نمرہ نے اپنے مخصوص ہمت دلاتے لہجے میں اسے دلاسا دیا۔ اس نے نوکری نہ ہونے کی وجوہات نہیں پوچھی تھیں کیونکہ اسے علم تھا کہ ہمیشہ کی طرح ایک ہی وجہ ہو گی جس نے اس کی باہمت بہن کے صبر کا پیمانہ لبریز کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس نے ناب گھما کر اس شاندار انٹیریئر والے آفس کا منقش چوبی دروازہ کھولا تو اے سی کی مخصوص ٹھنڈک میں زبردست مہک والے ایئر فریشنر کی خوشبو نے طبیعت فریش کر دی تھی... اس نے بڑے تمکنت بھرے انداز سے گرے کارپٹ والے فرش پر قدم رکھا تھا۔ باہر کی سخت گرمی کے موسم میں اس کمرے کا ماحول اسے کسی جنت سے کم نہیں لگ رہا تھا۔ اس شاندار آفس میں موجود لیپ ٹاپ پر مصروف شخص کی شخصیت اس آفس سے زیادہ شان دار تھی۔ وہ مردانہ وجاہت سے بھرپور تھا۔ گرے پینٹ پر سفید لائنوں والی شرٹ اور گرے ٹائی میں وہ کسی بھی خوب صورت ہیرو سے کسی طور کم نہیں لگ رہا تھا۔

عانیہ نے اسے متوجہ کرنے کے لیے پر اعتماد انداز سے سلام کیا تو وہ بری طرح چونکا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بڑی تیزی سے تبدیل ہوئے۔ ناگواری کی بھرپور لہر نے بڑی تیزی سے اس کے وجود کا احاطہ کیا تھا۔ اتنی ہی سرعت سے مدمقابل نے اس کے تاثرات کو بڑی حیرت سے پڑھا تھا۔

"مجھے عانیہ جمیل کہتے ہیں۔" اس نے فوراً اپنا تعارف کروایا لیکن سامنے بیٹھے شخص کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

"مجھے رضا کاظمی نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔" وہ مدمقابل کی تیوری کے بل کم کرنے کے لیے مجبوراً مزید بولی تھی جبکہ ارحم بخاری جانچتی نظروں سے اس کا جائزہ لینے میں مگن تھا۔ اسے رہ رہ کر اپنے لنگوٹیے دوست رضا پر شدید غصہ آ رہا تھا جو بدقسمتی سے اس کا بزنس پارٹنر بھی تھا اور پچھلے چار روز سے وہ عانیہ جمیل نامی لڑکی کی شان میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہا تھا۔

"یار! وہ بہت زبردست لڑکی ہے، قلم پر اس کی گرفت خاصی مضبوط اور حالات حاضرہ پر گہری نظر ہے۔ وہ ہر لحاظ سے انتہائی زبردست لڑکی ہے۔"

ارحم بخاری نے ایک دفعہ پھر رضا کی "زبردست" لڑکی کو غور سے دیکھا، سفید ململ کے عام سے دوپٹے، نیلے رنگ کے پھولوں والی لان کی قمیص کے ساتھ وہ سفید شلوار میں ایک انتہائی "عام" سی لڑکی تھی۔ اس کے پیروں میں دو ڈھائی سو کی شاید کسی سیل میں خریدی گئی چپل اور کندھے پر براؤن کلر کا بوسیدہ سا چمڑے کا بیگ تھا جو اس کی کمزور معاشی حالت کی داستان کھل کر سنا رہا تھا۔ اس نے درمیان سے مانگ نکال کر بال بنا رکھے تھے جبکہ چہرہ میک اپ سے بالکل مبرا تھا۔ نین نقش اس کے اچھے تھے اور رنگت بھی صاف تھی لیکن وہ کہیں سے بھی رضا کے بتائے گئے "زبردست" کے خاکے پر پورا نہیں اترتی تھی۔

وہ بالکل اس کے سامنے والی سیٹ پر بڑے طمطراق سے گردن اٹھا کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا انداز اس کے حلیے کے بالکل برعکس تھا جس کی وجہ سے ارحم کو اس پر نہ جانے کیوں غصہ آنے لگا تھا۔

"کسی بھی تعلیم یافتہ، مہذب انسان کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ بغیر اجازت کسی کے آفس میں بیٹھ جائے۔" وہ نہ چاہتے ہوئے بھی رضا کا غصہ اس پر اتار بیٹھا تھا اور اس کی یہ کوشش نادانستہ تھی۔

"میں اجازت ضرور مانگتی، اگر کوئی تعلیم یافتہ اور مہذب انسان میرا پوسٹ مارٹم کرنے کے شغل میں مصروف نہ ہوتا۔" اتنا کٹیلا جواب ارحم کو شدید جھٹکا گا تھا۔ لمحہ بھر کو اس کی زبان گنگ ہوئی۔

"دیکھیں بی بی!"

"میرا نام بی بی نہیں عانیہ جمیل ہے۔" اس نے بات کاٹ کر فوراً تصحیح کی تو ارحم کے چہرے پر ناگواری اور جھنجلاہٹ کے رنگ تیزی سے پھیل گئے۔

"اسی نام ہی کا تو سارا فساد ہے۔" وہ دل ہی دل میں

کھولا تھا کیونکہ اس کے نام کے سحر میں اس نے تصوراتی خوب صورتی کا ایک پیکر اپنے ذہن میں بنالیا تھا جو اسے دیکھتے ہی ریت کے محل کی طرح زمین بوس ہوا تھا۔

"اتنا خوب صورت نام اس طرح کی عام سی لڑکی کا بھی ہوسکتا ہے؟" وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا' اسی وجہ سے اسے جھٹکا خاصا زوردار لگا تھا۔

"آپ اپنا سی وی دکھانا پسند کریں گی؟" اس کے طنزیہ انداز پر عانیہ تناؤ کا شکار ہوئی اور اب اس کا اپنا مزاج بھی خاصا برہم ہوچکا تھا' اس کے باوجود اس نے اپنے براؤن بیگ سے نیلے رنگ کی عام سی فائل نکالی تھی۔ یہ فائل اس نے بک اسٹال سے پندرہ یا بیس روپے کی خریدی تھی۔ اس کے اوپر سفید رنگ کا تسمہ لگا ہوا تھا' جس میں تین صفحات کا سی وی پرو دیا گیا تھا۔

ارحم نے سخت ناپسندیدہ نظروں سے اس عام سے گتے کی بنی فائل کو دیکھا۔ بدقسمتی سے وہ حد درجہ برانڈ کونشس بندہ تھا اور ہر چیز میں خوب صورتی اور نفاست اس کی پہلی ترجیح ہوتی تھی۔ ان چیزوں پر وہ کسی صورت میں بھی سمجھوتا کرنے کا قائل نہیں تھا اس وقت وہ خود بھی جورجیو آرمانی کا پینٹ شرٹ سوٹ' ہیوگوباس کی ٹائی اور چینل فائیو کا پرفیوم لگائے ہوا تھا۔ عام چیز تو اس کی نظروں کے آگے کسی صورت بھی نہیں ٹھہرتی تھی۔

اس نے بمشکل ایک منٹ اس کے سی وی پر سرسری نظر ڈالی اور فائل ٹیبل پر رکھ دی۔ ہاتھ میں پکڑا قیمتی پین فولڈر میں لگایا اور لاتعلق سے انداز میں بیٹھی عانیہ کو دیکھا جو آفس میں لگی پینٹنگ کو بہت غور اور توجہ سے دیکھ رہی تھی۔

"دیکھیں عانیہ! مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ ہمارے چینل کے لیے جو کوالی فکیشن درکار ہے' آپ اس پر پورا نہیں اترتیں' اس لیے آئی ایم سوری۔" اس نے اپنی طرف سے بھرپور شاٹ لگائی جبکہ دوسری طرف اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔

"ہاں! مجھے بھی اندازہ ہو رہا ہے کہ جس پوسٹ کے لیے مجھے رضا صاحب نے بھیجا ہے' میری کوالی فکیشن اس لحاظ سے زیادہ ہے۔" عانیہ نے اسے کلین بولڈ کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

"زیادہ ہے؟" ارحم کے طنزیہ انداز میں حیرت کی فراوانی تھی۔ اسے عانیہ کے تاثرات سراسر اپنا مذاق اڑاتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ وہ اپنے بیگ سے چیونگم نکال کر اب لاپروائی سے منہ میں ڈال رہی تھی۔

"میرا خیال ہے کہ آپ کو اپنے بارے میں ضرورت سے زیادہ غلط فہمی ہے۔" وہ تمسخرانہ انداز سے مسکرایا تھا اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس لڑکی کو آخر کس چیز کا زعم ہے۔

"مجھے اپنے بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں' لیکن میں آپ کی یہ خوش فہمی دور کرنا چاہتی ہوں کہ آپ کے چینل کو ... ابھی ... نہیں ہوئے اور آپ کے اپنے پورے خاندان کو اس کے نام کا بھی علم نہیں ہوگا جبکہ میں جس چینل کو چھوڑ کر آئی ہوں اس سے تو حکومت وقت بھی خوف زدہ ہے۔ آپ لوگ یونیورسٹی سے تازہ تازہ فارغ التحصیل بے روزگار نوجوانوں کو انٹرویو کے لیے بلوائیں تو وہ شاید اپنی خدمات اس نئے چینل کو دینے پر راضی ہوجائیں ورنہ میرے جیسے لوگوں کے لیے تو ہر چینل کے دروازے کھلے ہوں گے' وہ یہاں آکر اپنا ٹائم کیوں ضائع کریں گے۔" اپنی بات مکمل کرکے وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

ارحم کے اعصاب تن گئے تھے۔ اس نے بمشکل اپنے اندر اٹھتے جوار بھاٹے کو دبایا تھا اور تیوری پر بل ڈالے اس منہ پھٹ اور بدتمیز لڑکی کو دیکھا تھا' جس کے اعصاب خاصے مضبوط تھے۔ وہ اپنی فائل بیگ میں ڈال کر اب چڑانے کے انداز میں چیونگم چبا رہی تھی۔

"رضا صاحب کو میرا پیغام دے دیجیے گا کہ برائے مہربانی مجھے مزید بار بار فون کرکے میرا وقت ضائع کرنے کی کوشش نہ کریں تو بہتر ہے کیونکہ میں زیادہ دیر تک مروت کا مظاہرہ نہیں کرسکتی۔" وہ اب باہر نکل رہی

... دروازے کے پاس پہنچ کر اس نے چیونگم کا بڑا ببل بنا کر پھوڑا تھا اور اس کی اس حرکت پر ارحم مشتعل ہوکر اسے کھری کھری سنانے کے لیے کھڑا ہوا لیکن وہ آفس سے جاچکی تھی۔

"کیا چیز تھی یہ...؟" وہ جی بھر کے بدمزا ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

ارحم کا دماغ بھک کرکے اڑا تھا۔

وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مظہر صاحب اس ... منہ پھٹ' بدتمیز اور فضول سی لڑکی کی وجہ سے اپنے اکلوتے لاڈلے بیٹے کی طبیعت ایک منٹ میں صاف کردیں گے۔ وہ پہلی دفعہ زندگی میں پاپا کے سامنے ... ہوا تھا جو بول نہیں رہے تھے بلکہ ان کے منہ سے آگ کے گولے نکل رہے تھے جو تاک تاک کر اس کے اور رضا کے اور لگ رہے تھے۔

ابھی ایک گھنٹہ پہلے ہی انہوں نے پاپا ... کو ... میٹنگ کے لیے بلایا تھا۔ رضا اس سے دس منٹ پہلے ہی پہنچ گیا تھا اور گھبرائی ہوئی نظروں سے سرمئی کلر کے ٹوپیس سوٹ میں مظہر صاحب کو دیکھ رہا تھا جن کے چہرے کے نقوش غصے کی زیادتی سے بگڑے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے پر مخصوص' دھیمی اور پروقار سی مسکراہٹ آج ناپید تھی اور آج تو وہ لفظوں کے چناؤ کے معاملے میں بھی سخت غیر محتاط تھے۔

"رضا! تمہیں کس اسٹوپڈ نے کہا تھا کہ عانیہ جمیل ... کے لیے اس ڈفر کے پاس بھیجو' جس کو خود جرنلزم کی الف' بے کا نہیں پتا' میں چار دن کے لیے ملک سے باہر کیا گیا' سارا معاملہ ہی خراب کردیا۔" وہ اس قدر مشتعل کیوں ہو رہے ہیں' ارحم یہ سمجھنے سے قاصر تھا اور "ڈفر" کے خطاب پر اس نے احتجاجی نظروں سے پاپا کو دیکھا جو اس وقت آنکھیں ماتھے پر رکھے بیٹھے تھے۔

"اصل میں انکل! اس نے مجھے اچانک ہی بتایا تھا اس کے پاس ایک اور آفر بھی موجود ہے' اس لیے میں نے ارحم کے پاس بھجوادیا۔" رضا نے ایک مرتبہ پھر صفائی دینے کی ناکام کوشش کی۔

"ماشاء اللہ!" انہوں نے طنزیہ نظروں سے اپنے سپوت کو دیکھا۔ اب کے وہ بولے نہیں' ہنکارے تھے۔

"تمہیں پوری دنیا میں ایک یہ ہی عقل مند ملا تھا' جس کے پاس اس اچھی خاصی لڑکی کو بھجوادیا' کیا قریشی صاحب مرگئے تھے یا میں نے پاکستان واپس نہیں آنا تھا؟" وہ بری طرح جھنجلا رہے تھے۔ ان کے سخت طنزیہ لہجے پر ارحم نے ناگواری سے صوفے پر پہلو بدلا تھا۔ اس کے ذہن و دل بھی سخت کھولن میں تھے اور رضا کے چہرے پر پوشیدہ محظوظ ہونے والی مسکراہٹ کو صرف ارحم بخاری ہی پڑھ سکتا تھا اور یہ تحریر اسے مزید زچ کررہی تھی۔

"انکل! آپ اتنی زیادہ ٹینشن کیوں لے رہے ہیں، کوئی اور راستہ نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔" رضا نے انہیں ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی جو بے سود گئی۔

"ٹینشن نہ لوں تو اور کیا کروں، مجھے لگتا ہے کہ وہ الو کا پٹھا سلطان ہاشمی اسے ایک دفعہ پھر ہائر کر لے گا۔" انہوں نے اپنے بدترین خدشے کا اظہار کیا۔

"یہ بات تو آپ اپنے ذہن سے نکال دیں کہ وہ سلطان ہاشمی گروپ میں واپس جائے گی، میں اس کے مزاج سے آگاہ ہوں اور وہ جس طرح ہاشمی کی طبیعت صاف کر کے آئی ہے اور استعفیٰ باقاعدہ اس کے منہ پر مار کر آئی ہے وہ دوبارہ کسی صورت وہاں نہیں جائے گی چاہے وہ اسے ایک کالم کا ایک لاکھ ہی کیوں نہ دیں۔" رضا کی تسلی پر وہ تھوڑا سا ٹھنڈے ہوئے تھے، چہرے پر تناؤ کی کیفیت میں بھی کمی آ گئی تھی۔

"لیکن وہ دنیا کا گھٹیا ترین انسان جمشید سبحانی بھی تو اس کے تعاقب میں ہے، مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ بھی اس کے چکروں میں ہے، ظاہر ہے کہ کام کی چیز کون اپنے ہاتھ سے گنواتا ہے۔ یہ تو ہماری اولاد ہے جس نے عقل نام کی چیز کو طاق پر سجا رکھا ہے ورنہ وہ اچھی خاصی راضی تھی اور صرف پیکیج طے کرنا باقی تھا۔" مظہر صاحب کی بات ارحم کو کوڑے کی طرح لگی تھی۔

"رہنے دیں پاپا! آپ خوامخواہ اسے اہمیت دے رہے ہیں جیسے "بابائے صحافت" کا خطاب اسے ہی ملنے والا ہو۔ ایسے کون سے پر لگے ہوئے ہیں محترمہ کو۔" وہ خاصے غلط موقع پر انتہائی بے تکا بولا تھا۔ مظہر صاحب نے انتہائی غضب ناک نظروں سے اسے دیکھا اور تڑخ کر بولے۔

"رضا! ذرا بتاؤ اس احمق اعظم کو کیا چیز تھی وہ، اس کی تو ایڈورٹائزنگ ایجنسی نے مت مار رکھی ہے اور رہی سہی کسر اس ایجنسی میں آنے والی سوکھی سڑی سفید چمڑی والی بے وقوف لڑکیوں نے پوری کر رکھی ہے۔ ان جاہل اور دماغ سے عاری لڑکیوں کے ساتھ رہ رہ کر یہ خود بھی ویسا ہی ہو گیا ہے۔ اسے معلوم نہیں کہ میڈیا میں اس جیسے بے وقوف لوگ جو گھر آیا ٹیلنٹ اپنے حریفوں کے حوالے کر دیتے ہیں وہ زیادہ دیر [illegible] چل نہیں سکتے۔"

مظہر صاحب آج حد درجہ برہم ہو رہے تھے چونکہ ارحم کو ان سے اس قدر برہمی کی توقع نہیں تھی اس لیے وہ خفگی سے بولا تھا۔

"مجھے تو اس میں ایسی کوئی خاص بات نظر نہیں آئی جس کی وجہ سے آپ میری انسلٹ کر رہے ہیں۔"

"لاحول ولا قوۃ۔" مظہر صاحب نے جھنجھلا کر پانی کا گلاس شیشے کی میز پر پٹخا تھا اور شعلے برساتی نظروں سے ارحم کو دیکھا جس کا چہرہ غصے کی زیادتی سے سرخ ہو رہا تھا۔

"تمہاری طرح اس نے بی گریڈ میں ساری ڈگریاں اکٹھی نہیں کر رکھی ہیں۔" ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے انہوں نے خاصا بڑا طنز کیا تھا۔ ارحم نے سخت احتجاجی نظروں سے [illegible] انہیں دیکھا اور اس [illegible] بے عزتی [illegible]

"پنجاب یونیورسٹی میں ایم فل میں گولڈ میڈل لے چکی ہے اور اس وقت سے لکھ رہی ہے جب تمہارے جیسے لڑکے او لیول کی کتابوں میں سر کھپا رہے ہوتے ہیں۔ تب کے اخبارات میں لکھ چکی ہے۔ ٹاپ ریٹنگ والے چینل پر کام کرنے کا وسیع تجربہ رکھتی ہے اور وہ جو سلطان ہاشمی نامور کالم نگار ہے، اسے تو قلم بھی پکڑنا نہیں آتا، بے شمار ایوارڈز وہ اسی لڑکی کی وجہ سے لے رہا ہے۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا......؟" ارحم بالکل نہیں سمجھا تھا۔

"مطلب تو صاف ظاہر ہے کہ سلطان اسی سے کالم لکھواتا تھا اور اپنے نام سے چھپوا کر واہ واہ کرواتا تھا اور وہ جو سیاست پر اپنا مشہور و معروف پروگرام کر کے سیاست دانوں کے پرخچے اڑاتا تھا، اس پروگرام کے پیچھے بھی ساری محنت اور تحقیق اسی لڑکی کی ہوتی تھی، جس کو وہ الو کا پٹھا کیش کروا رہا تھا۔ اللہ جانے ایسے کاٹھ کے الو اس سلطان کو کہاں سے مل جاتے ہیں۔" مظہر صاحب کے اس انکشاف پر باوجود خفگی کے ارحم کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"لیکن وہ بے وقوف لڑکی کیوں اس کو لکھ کر دیتی ہے، اپنے نام سے کیوں نہیں چھپواتی۔" وہ بری طرح جھلایا تھا۔

"ہوتے ہیں ایسے خود دماغ لوگ جن کو نام و شہرت سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ وہ صرف معاوضے کے لیے اپنی تخلیق کو دوسروں کا نام سونپ دیتے ہیں۔" وہ اب سگار سلگا رہے تھے اور ان کا ذہن مختلف قسم کی سوچوں کو جمع تفریق کر رہا تھا جبکہ تفکرات کا جال ان کے چہرے پر جوں کا توں تھا۔

رضا نے گلا کھنکھار کر ان کو اپنی طرف متوجہ کیا اور قدرے محتاط انداز سے کہا۔ "میرے خیال میں انکل! مجھے ماہیہ جمیل سے ایک دفعہ پھر بات کرنی چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی درمیانی راہ نکل آئے اور میں ارحم کے رویے پر ایکسکیوز بھی کر لوں گا۔"

مظہر [illegible] کی طرف متوجہ ہوئے "ہاں، کر کے دیکھ لو لیکن جس قسم کے مزاج کی وہ لڑکی ہے، میرا خیال ہے کہ مشکل سے ہی راضی ہو گی۔" انہوں نے صاف گوئی سے کہا تو وہ کندھے اچکا کر رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

رضا انتہائی سخت صدمے اور تاسف بھری نظروں سے اپنے سامنے بیٹھے ارحم بخاری کو دیکھ رہا تھا جو [illegible] چکن شاشلک سے بھرپور انصاف کر رہا تھا۔

"یار! مجھے ابھی تک اس بات کا یقین نہیں آ رہا کہ تم نے اس لڑکی کو صرف شکل و صورت کی بناء پر ریجیکٹ کیا تھا حالانکہ تم سے امید تو اسی بات کی رکھنی چاہیے لیکن میرا خیال تھا کہ وہ تو انکل کے آفس میں ہو گی اس لیے تمہیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہو گا۔" میریٹ میں لنچ کرتے ہوئے رضا نے اسے آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ اسے جب ارحم نے اصل وجہ بتائی تو اس کا دماغ بھی بھک کر کے اڑا تھا۔

"فار گاڈ سیک رضا! اب تم پاپا کی طرح مجھے یہ لیکچر مت دینا کہ وہ کتنی ذہین و فطین ہے اور یہ کہ اس کا تعلق افلاطون کے خاندان سے ہے وغیرہ وغیرہ۔ مجھے اچھی طرح اندازہ ہے کہ پاکستان میں کیسا کیسا ٹیلنٹ رُل رہا ہے۔ پاپا ایک دفعہ نیوز پیپر میں ایڈ تو دے کر دیکھیں، منوں کے حساب سے بے روزگار لوگوں کی درخواستیں آئیں گی اور بہت سے لوگ تو مفت میں بھی کام کرنے کو تیار ہوں گے۔" وہ اب پاستا کھا رہا تھا۔

"لیکن ہمیں درجنوں کے حساب سے ناتجربہ کار لوگوں کی ضرورت نہیں ہے۔ مسابقت کے اس دور میں کسی بھی چینل کو اپنی جگہ بنانے کے لیے انویسٹمنٹ کے علاوہ زرخیز دماغوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ صحافت کی دنیا میں بقا کی جنگ ہے یار۔" رضا کی بھوک اڑ چکی تھی۔

"تو تم اور پاپا بقا کی جنگ ہارس ٹریڈنگ کر کے لڑنا چاہتے ہو؟" ارحم کے چہرے پر دل جلانے والی مسخرانہ مسکراہٹ تھی۔ رضا کو سخت افسوس ہوا تھا۔

"ہم نے کسی بھی قسم کی ہارس ٹریڈنگ نہ کی ہے اور نہ کریں گے۔ بہتر سے بہتر کی تلاش کبھی ختم نہیں ہوتی اور اگر کوئی بہتر معاوضے کے لیے کسی ادارے کو چھوڑ کر کسی اور جگہ جاتا ہے تو یہ اس کا حق ہے، ہم اسے اس حق سے محروم نہیں کر سکتے۔" وہ ٹھنڈے پانی سے اپنے اندر کی جلن کم کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

"اور اگر وہ تمہارا ادارہ چھوڑ کر کہیں چلا جائے تو؟" ارحم نے طنز کیا۔

"ہمیں تب بھی کوئی اعتراض نہیں۔" وہ فوراً بولا تھا۔

"بہرحال جو کچھ بھی ہوا میں نے دانستہ طور پر نہیں کیا، مجھ سے خود بخود ہو گیا۔ تمہیں معلوم ہے ناں کہ میرے کچھ اصول ہیں اور میں ان سے انحراف نہیں کر سکتا۔ میں حد درجہ اسٹیٹس کونشس ہوں اور مجھے اپنی اس عادت پر کوئی شرمندگی نہیں۔ میں حد درجہ نفیس

طبیعت کا حامل ہوں اور جو لوگ مجھے پہلی نظر میں اچھے نہیں لگتے' میں ان سے بات بھی نہیں کرتا۔" وہ ٹشو پیپر ڈسٹ بن میں ڈالتے ہوئے حد درجہ تلخ لہجے میں بولا تھا۔

"انسانیت کے ناتے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں۔" رضا کا انداز طنز لیے ہوئے تھا۔

"ہوتے ہوں گے' لیکن اپنی زندگی کے لیے اصول وضابطے میں خود مرتب کرتا ہوں۔" اس نے سکون سے جواب دیا تھا۔

رضا کا سارا موڈ غارت ہو گیا تھا حالانکہ وہ ارحم کی ان عادتوں سے اچھی طرح آگاہ تھا لیکن آج نہ جانے کیوں اس کا دل دکھ اور تاسف کے گہرے احساس سے بھر گیا تھا۔ اس نے خفگی سے اپنے سامنے بیٹھے اپنے سب سے قریبی دوست کو دیکھا جو گلاس ڈور سے اندر داخل ہوتی ایک قیامت کو اشتیاق بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ سامنے ہی ایک محترمہ شعلہ جوالا بنی اندر آرہی تھیں۔ نیوی بلیو کلر کی ساڑھی میں اس کے وجود کے سارے زاویے نمایاں تھے۔ وہ اس قدر خوب صورت تھی کہ اس وقت لنچ کے لیے آئے سب ہی لوگوں کی نظریں اس پر ٹکی ہوئی تھیں۔ آستینوں سے بے نیاز اس کی سفید دودھیا باہیں بہت دل آویز لگ رہی تھیں۔ بالوں کا نفیس سا جوڑا اور مرمریں گردن میں نازک سا نیکلس تھا۔ سلیقے اور مہارت سے کیے گئے میک اپ نے اس کے چہرے کے خوب صورت نقوش میں ایک محسوس کی جانے والی دلکشی بھر دی تھی۔

وہ نزاکت سے قدم اٹھاتی پہلے سے ریزرو میز کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھ چکی تھی۔ اپنے اسٹائلش سے پرس سے وہ اپنا بلیک بیری سیل فون نکال کر اب کوئی نمبر ڈائل کر رہی تھی۔

ارحم کی نگاہیں مقناطیس کی طرح اس کے خوب صورت چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں جبکہ رضا نے سخت خائف ہوتی نگاہوں سے ارحم بخاری کو دیکھتے ہوئے انتہائی ناگواری سے کہا۔

"بس کرو اسے دیکھنا' آج کی قسط کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔"

ارحم چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوا اور اس کا خفا خفا انداز دیکھ کر ڈھٹائی سے ہنس پڑا تھا۔

"اب بتاؤ اس لڑکی کو دیکھ کر خیال نہیں آتا کہ اس کا نام "عانیہ" ہونا چاہیے۔"

"اس کے نام کا تو پتا نہیں' لیکن تمہارا نام "لوفر" ہونا چاہیے تھا۔" رضا نے جل کر کہا تو ارحم کے بے ساختہ قہقہے پر بہت سے لوگ متوجہ ہوئے۔

"یہ لڑکی میرے اگلے ایڈ میں آئے گی۔" وہ بہت پر اعتماد انداز میں اسے اطلاع دے رہا تھا۔

"ہر خوب صورت لڑکی عقل سے عاری نہیں ہوتی۔" رضا نے سابقہ طنزیہ انداز سے کہا۔

"چلو دیکھتے ہیں۔" اس کی مسکراہٹ میں واضح کمینہ پن تھی۔

☼ ☼ ☼

"جسم کو جھلسا دینے والے لو کے تھپیڑے اسے سخت اذیت میں مبتلا کیے دے رہے تھے۔ اس نے سر اٹھا کر چمکتے دمکتے آفتاب کو دیکھا جو آج آتش فشاں بنا ہوا تھا۔ اس نے لان کے دوپٹے سے چہرے پر آیا پسینہ صاف کیا اور اپنے چمڑے کے بیگ کو دائیں سے بائیں کندھے پر منتقل کیا۔

اس نے اپنے قریب موٹر سائیکل رکنے کی آواز سنی تھی۔ وہ اس کے بہت قریب آکر رکا تھا۔

"آجاؤ' بہت گرمی ہے' میں تمہیں اسٹاپ تک چھوڑ آتا ہوں۔"

وہ ایک دم اچھلی' دل بے قابو ہوا لیکن سامنے مانوس چہرہ دیکھ کر اس نے سینے پر بے اختیار رکھا ہاتھ اٹھایا۔

"تم کیا الہ دین کے جن کی طرح ہر جگہ نازل ہو جاتے ہو...." اپنی بے ترتیب سانسوں کو قابو میں لاتے ہوئے وہ بمشکل بولی تھی۔ جواب میں اس کے لبوں پر ایک گہری اور جان دار مسکراہٹ ابھری تھی۔

"ایک اسائنمنٹ کے سلسلے میں کسی سے ملنا

ہے۔" اس نے مختصراً" جواب دیا اور اس کے ہاتھ میں پکڑا سبزی کا شاپر آرام سے لیا اور موٹر سائیکل کے آگے لٹکا دیا اور اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بھی چوں چرا کیے بغیر بیٹھ گئی تھی۔

دس منٹ کے بعد وہ اپنی موٹر سائیکل اس تنگ سی گلی میں داخل کر چکا تھا۔ اسے اس گلی میں مہارت سے موٹر سائیکل چلانے کا خاصا تجربہ تھا۔ وہ اب مندر کے آگے موٹر سائیکل کھڑی کر چکا تھا۔

"آؤ' کالی ماتا کو سلام کر آتے ہیں۔" اس نے حسب معمول اسے چھیڑا تھا۔ معلوم تھا کہ وہ اس بات سے خاصی چڑتی تھی۔

رام بلڈنگ کے آگے اس کے پڑوس میں رہنے والی گیتی آرا کے پانچوں چھوٹے بہن بھائی کھیلنے میں مصروف تھے۔ ان دونوں کو دیکھ کر انہوں نے خوشی کے نعرے لگائے۔ وہ اپنی بوسیدہ جینز کی پینٹ سے ٹافیاں اور چیونگم نکال کر ان بچوں کو تقسیم کر رہا تھا۔

"تم تو کہہ رہے تھے تم کسی اسائنمنٹ کے سلسلے میں جا رہے ہو؟" عانیہ نے شکوہ کناں نظروں سے اپنے سامنے کھڑے عبدالباری کو دیکھا' کیونکہ اسے معلوم تھا کہ وہ یہ ٹافیاں اور چاکلیٹس صرف اسی دن خریدتا تھا جس دن اس نے عانیہ کے علاقے میں آنا ہوتا۔

"یار! تمہیں معلوم ہے ناں کہ میں جھوٹ نہیں بولتا۔ اسائنمنٹ سے فارغ ہو کر مجھے تمہاری طرف آنا تھا۔ تمہاری ایک امانت تمہیں دینی تھی۔" وہ اس کے ساتھ اب بوسیدہ سیڑھیاں چڑھ رہا تھا جبکہ عانیہ نے اس کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔

"تم لوگ اپنی اس بلڈنگ کے مالک ہندو بنیے سے کہتے کیوں نہیں ہو کہ اس عمارت کا حلیہ درست کروائے' کسی دن یہ زمین پر آن گرے گی۔" وہ کئی دفعہ کا دیا ہوا مشورہ ایک دفعہ پھر دہرا رہا تھا۔

"جس دن زمین پر آن گرے گی تب تو اس کو ٹھیک کروانا اس کی مجبوری ہو گی لیکن اس سے پہلے تو وہ ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دیتا ہے۔" وہ سنجیدگی سے اس کی بات کا جواب دے رہی تھی جو لاپروائی سے سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔

"ویسے یہاں آکر مجھے احساس ہوتا ہے جیسے میں برصغیر پاک و ہند کے دور میں آجاتا ہوں' جہاں ہندو اور مسلمان دونوں مل کر رہتے تھے' تم لوگ آپس میں لڑتے نہیں ہو؟" وہ یونہی باتیں کر رہا تھا حالانکہ وہ اتنے سالوں سے یہاں آجا رہا تھا کہ کوئی بھی بات اس سے پوشیدہ نہیں تھی۔

"کیوں ہم لوگ انسان نہیں ہیں کیا؟ لیکن اس بلڈنگ میں رہنے والے ہندوؤں کے آباؤ اجداد اسی علاقے میں رہتے رہے ہیں اور یہ چند گھر ایسے ہیں جو تقسیم کے بعد بھی ہندوستان نہیں گئے اور پاکستان سے محبت کے معاملے میں کم از کم یہ لوگ ہم سے بہت آگے ہیں۔ جس دن پاکستان انڈیا سے ورلڈ کپ کا سیمی فائنل ہارا' اس دن یہ لوگ ہم سے زیادہ افسردہ تھے۔ گیتی نے تو پاکستان کی جیت کے لیے خصوصی پوجا کا اہتمام بھی کیا تھا۔"

وہ ہنستے ہوئے بتا رہی تھی۔ اس بلڈنگ کے چار فلور تھے اور ہر فلور پر چار فلیٹ تھے۔ عانیہ کا فلیٹ سیکنڈ فلور پر تھا۔

وہ سبز رنگ کے بدنما سے لوہے کے دروازے کو دھکیل کر اندر داخل ہو چکی تھی۔ سامنے ضعیف اور کمزور سے ابا چارپائی پر لیٹے بس خالی نظروں سے ٹی وی کو دیکھے جا رہے تھے۔ عبدالباری نے بہت عقیدت سے انہیں سلام کیا تھا۔ ابا کی آنکھوں میں اسے دیکھ کر لمحے بھر کو ایک چمک ابھری اور پھر معدوم ہو گئی۔

"ارے باری بھیا آئے ہیں۔" نمرہ کے چہرے پر بے ساختہ خوشی کا احساس خاصا نمایاں تھا۔

"پہلی دفعہ تھوڑی آیا ہوں جو اتنی خوشی کا اظہار کر رہی ہو۔" اس نے جواباً" اس کے سر پر چپت لگاتے ہوئے کہا۔ وہ ابا کے پاس چارپائی پر بیٹھ چکا تھا جبکہ عانیہ نے سبزی کا شاپر کچن میں رکھا اور منہ ہاتھ دھونے کے لیے غسل خانے میں گھس گئی۔

وہ منہ ہاتھ دھو کر واپس آئی تو وہ بڑی رغبت سے

دال چاول کھا رہا تھا اور کم گو سے ابا اس کے قصوں پر مسکرا رہے تھے۔ اس کی آمد ہمیشہ ابا اور نمرہ کے لیے طمانیت کا باعث بنتی تھی۔

وہ عانیہ کے ساتھ ماس کمیونی کیشن میں ماسٹرز کر چکا تھا۔ وہ کب اس کے اتنا قریب ہوا، عانیہ کو اس کا احساس بڑی دیر بعد ہوا تھا۔ وہ اپنی تمام الجھنیں، غم اور پریشانیاں اس کے ساتھ شیئر کر کے خود ہلکی پھلکی ہو جاتی تھی۔ آج سے چھ سال پہلے اس کی آمدورفت اس کے گھر میں تب شروع ہوئی جب بڑے ابا کو ہسپتال میں داخل کروانا پڑا۔ ان کی ماں کے انتقال کو دس سال ہو چکے تھے اور وہ صرف تین بہنیں تھیں۔ ابا نے بہت شوق سے انہیں تعلیم دلوائی تھی۔ بس نمرہ کی دفعہ حالات اتنے بگڑ چکے تھے کہ اسے اپنی تعلیم کو پرائیویٹ طور پر جاری رکھنا پڑا ورنہ اس کی دونوں بڑی بہنوں نے بہت اچھے تعلیمی اداروں سے ڈگریاں لے رکھی تھیں۔

وہ چارپائی پر دونوں ٹانگیں پھیلا کر ابھی لیٹی ہی تھی کہ باری کو اندر کمرے میں آتا دیکھ کر اس نے فوراً" ٹانگیں اکٹھی کر لیں۔ اس نے سائیڈ میز پر رکھے خالی برتنوں سے اندازہ لگایا کہ وہ کھانا کھا چکی ہے تو ایک اطمینان کی لہر اس کے اندر دوڑ گئی۔

"کیا بنا جاب کا؟ وہ جو بخاری گروپ والوں نے تمہیں بلوایا تھا؟" بے حد سنجیدگی بھرے انداز سے پوچھتے ہوئے وہ سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔

"کچھ بھی نہیں....." لہجے میں تلخی اور بے بسی کے ملے جلے تاثر نے باری کو بھی افسردہ کر دیا تھا۔ وہ نمرہ کے ہاتھوں سے چائے کا کپ پکڑتے ہوئے حیرت سے بولا تھا۔

"لیکن ان لوگوں نے تو تمہیں خود بے حد اصرار کر کے بلایا تھا اور وہ کیا نام ہے رضا، تمہیں بار بار کالز کر رہا تھا۔"

"بس یہ بڑے لوگوں کے اپنے چونچلے ہوتے ہیں۔ کیا پتا چلتا ہے کہ کس بات پر مزاج برہم ہو جائے۔"

"تم کہو تو میں خود رضا سے بات کر کے دیکھوں۔"

"ہرگز نہیں۔" وہ تیزی سے بولی تھی۔ "مجھے ان کے ادارے میں اب کام نہیں کرنا۔" وہ دوٹوک انداز سے کہہ رہی تھی۔

"دیکھو عانیہ! تمہیں اپنے رویے میں بھی لچک پیدا کرنی چاہیے، زندگی ایسے نہیں گزرتی اور اس دور میں جب بے روزگاری کا عفریت منہ کھولے نوجوانوں کو نگلنے کو بے تاب ہے، تم ذرا ذرا سی بات پر استعفیٰ دے کر آجاتی ہو۔"

"وہ ذرا سی بات نہیں تھی باری!" اس نے احتجاجی نظروں سے اسے دیکھا جو چائے کے خالی مگ کو ہاتھ میں گھما رہا تھا۔

"تمہیں معلوم ہے کہ وہ عام سی بات نہیں تھی۔ اپنی تخلیق کو کسی دوسرے کا نام دینا کوئی آسان کام نہیں۔ خون جگر جلانا پڑتا ہے، کوئی آدھی رات تک [illegible] تب جا کر تخلیق کی چیز تب [illegible] کا صحافت کی دنیا میں ایک نام بنا تھا اور وہ مجھے میری ہی تحریر کا معاوضہ صرف پچیس پرسنٹ دے رہا تھا اور خود پچھتر فی صد رکھ رہا تھا۔ چلو یہ بھی ٹھیک لیکن اب ان ہی کالموں پر اس نے لاکھوں کا ایگریمنٹ کیا اپنی کتاب کی رائلٹی کے لیے اور مجھے اس میں سے ایک پیسہ بھی دینے کو تیار نہیں۔"

وہ اپنے اندر پنپتے احساس کے زہر کو گھونٹتے ہوئے تلخی سے بولی تھی۔

"تو تم اپنے نام سے کیوں نہیں لکھتی ہو؟ ٹھیک ہے شروع میں کم معاوضہ ملے گا لیکن کبھی نہ کبھی ایک نام تو بنے گا اور جب نام بن جائے گا تو لوگ تمہارے نخرے بھی اٹھائیں گے۔"

"آئی ایم سوری عبدالباری! میں اس کبھی نہ کبھی کے انتظار میں اپنے بیمار باپ کا علاج مؤخر نہیں کر سکتی۔ نمرہ کی پڑھائی ادھوری رہ جائے گی۔ یاد نہیں شروع میں اپنے آرٹیکل لے کر جہاں بھی گئی، ہر ایک کی ڈیمانڈ تھی کہ فری لانسنگ کروں اور اگر معاوضہ بھی دیا تو اتنا کم کہ صرف ایک دن کا چولہا جل سکے۔" وہ

مایوس تھی۔

"[illegible] کیا فائدہ عانیہ! تم خود کو ایسے ضائع کر رہی ہو۔ دیکھو کتنے لوگوں کو پتا چل چکا ہے کہ سلطان ہاشمی کے نام کے پیچھے کسی اور کا ذہن ہے۔" وہ جھنجلا کر بولا تھا۔

"لیکن کوئی بھی اس 'اور' کو اتنی پے منٹ نہیں دے گا جتنی وہ سلطان بخاری کو کر رہا ہے۔ یہاں صرف نام اور ریفرنس چلتے ہیں۔ ٹیلنٹ کو کوئی نہیں دیکھتا اور تمہیں پتا ہے ناں کہ مجھے ریفرنس سے نفرت ہے۔ میری قابلیت کو کسی کی سفارش کی ہاشمی نہیں چاہیے۔" وہ بھڑکی تھی۔ ایک لمحہ چپ رہ کر وہ تلخی سے گویا ہوئی۔

"مجھے بتاؤ عبدالباری! اگر میں غلط ہوں تو تم تو ایک بڑے باپ کے بیٹے ہو، کیوں ان اخبارات میں دھکے کھاتے پھر رہے ہو؟ تمہارے باپ نے تو تمہیں اخبار [illegible] کا مشورہ دیا ہے، لیکن تمہاری خود دار طبیعت اس کی اجازت نہیں دیتی، تمہارے پاس تو باپ کے ریفرنس ہیں، تم خود کیوں نہیں کسی اچھے ادارے میں جاتے؟" اس کی بات پر عبدالباری کے چہرے پر تاریک سایہ پھیل گیا تھا۔

"میری بات اور ہے عانیہ!" وہ دھیمے انداز سے بولا تھا اور بے ساختہ نظریں چرائی تھیں۔

"کیوں تمہاری بات اور کیوں ہے؟" وہ سرکش ہوئی تھی۔

"اس لیے کہ تم جانتی ہو کہ وہ میرا سگا باپ نہیں ہے، میری ماں کا دوسرا شوہر ہے، اس کے پیسوں پر میرا کوئی حق نہیں۔"

ماحول ایک دم عجیب سا ہو گیا تھا۔ نمرہ نے گھبرا کر ان دونوں کے خاموش سلگتے ہوئے چہروں کو دیکھا جو کسی دیمک زدہ الماری میں رکھی گرد سے اٹی کتابوں کی طرح لگ رہے تھے۔ اس کے لیے ان دونوں کی بحث کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ دونوں ایک دوسرے سے خوب لڑتے جھگڑتے اور کبھی نہ ملنے کا عہد کر کے بھی اگلے ہفتے اکٹھے بیٹھے ہوئے ہوتے

تھے۔ عبدالباری کے خلوص پر عانیہ جمیل کو کبھی بھی شبہ نہیں ہوا تھا۔ وہ دنیا میں واحد شخص تھا جس پر وہ آنکھیں بند کر کے اعتبار کرتی تھی، جس کے سامنے اس نے کبھی خودداری اور جھوٹی انا کا خیمہ نہیں تانا تھا۔ وہ بہت رجائیت پسند تھی اور بڑے بڑے حادثوں کو جھیل کر بھی مطمئن رہتی لیکن رانی جو کہ عانیہ سے چھوٹی تھی، اس کے گھر چھوڑنے کے فیصلے نے اسے وقت سے پہلے تھکا دیا تھا۔ تھکن کا ایک دائمی احساس اس کے چہرے پر منجمد ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

کمرے میں اے سی کی وجہ سے دل کو طمانیت بخشنے والی خنکی پھیلی ہوئی تھی حالانکہ اس کی گاڑی میں بھی اے سی تھا لیکن پارکنگ سے اس آفس کے درمیانی راستے میں پھیلی گرمی کی تمازت نے اس کا چہرہ سرخ کر دیا تھا۔

وہ جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئی، اس کے جلتے ہوئے مساموں کو عجیب طرح کی فرحت کا احساس ہوا۔ کمرے میں کسی دلفریب ایئر فریشنر کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ اس خوب صورت آفس کے وسط میں وسیع و عریض میز اور اس کے عقب میں ریوالونگ چیئر پر موجود ارحم نے بڑی خوشگوار مسکراہٹ سے مائرہ شیخ کا استقبال کیا تھا۔ ارحم کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ اس نے بہت غور سے اس حسین و جمیل پیکر کو دیکھا۔

گلابی رنگ کے سوٹ میں اس کی گلابی رنگت دمک رہی تھی جب کہ اس کی قمیص کے سلیولیس بازو میں سے جھانکتے ہوئے کندنی بازو، کمر تک چھوتے ہوئے گھنے سیاہ بال اور ستاروں کی طرح دمکتی آنکھیں اور ستواں ناک میں ڈائمنڈ کی نوز پن۔۔۔ کوئی بھی چیز آسانی سے نظرانداز نہیں کی جا سکتی تھی۔ اسے دیکھ کر یہی گمان ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے کسی فرصت کے لمحے میں تخلیق کیا ہے اور لگتا تھا کہ وہ خود بھی اپنے حسن کے ہتھیار سے بخوبی واقف تھی، اس لیے ایک عجیب

سی نخوت، محسوس کی جانے والی نزاکت ولاپروائی اس کے انداز کا حصہ بن چکی تھی۔

ارحم بخاری نے اسی دن اس کا فون نمبر اپنی ایڈورٹائزنگ کمپنی کے لیے مانگ لیا تھا اور اسے قطعاً بھی اس معاملے میں دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا اور مائرہ نے نہ صرف دو دن بعد اس کے آفس کا وزٹ کیا تھا بلکہ اگلے ایڈ کے لیے ایگریمنٹ سائن کرنے میں بھی سوچ بچار نہیں کی تھی۔

وہ آج تیسری دفعہ اس کے آفس میں آئی تھی اور ارحم کو اپنے پورے آفس میں مسحور کن سی روشنیاں اترتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں اور دو تین ملاقاتوں میں ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ مائرہ شیخ نہ صرف حسین ہے بلکہ ایم اے انگلش کے بعد گفتگو کے فن پر بھی خاصا عبور رکھتی ہے۔ حالات حاضرہ پر اس کی خاصی گہری نظر تھی اور وہ خود کو شوبز کی دنیا میں منوانا چاہتی تھی اس لیے اس نے ارحم کی آفر کو ایک لمحے میں قبول کر لیا تھا۔

وہ کون ہے؟ اس کا تعلق کس خاندان سے ہے؟ اس کا بیک گراؤنڈ کیا ہے؟ یہ وہ تمام سوالات تھے جس کے بارے میں مائرہ نے پہلی ملاقات میں بتا دیا تھا کہ وہ ان پر بات کرنا پسند نہیں کرتی۔ وہ اپنی "ذاتیات" کے بارے میں خاصی حساس تھی اور کسی حد تک منہ پھٹ بھی، یہی وجہ تھی کہ ہر کوئی اس سے محتاط ہو کر بات کرتا تھا۔ اس نے شوبز میں اپنے سفر کا آغاز خاصے محتاط طریقے سے شروع کیا تھا۔ اندھا دھند رول قبول کرنے کی بجائے خاصی غور و فکر کے بعد اس نے ابھی ایک دو کمرشل ہی کیے تھے۔ ماڈلنگ کی دنیا میں وہ کئی دفعہ کیٹ واک کر چکی تھی لیکن سفر کے آغاز میں اسے ابھی تک کوئی ہمباسنگ ٹائپ چیز کرنے کا موقع نہیں ملا تھا اس لیے وہ اپنے کیریئر کے بارے میں خاصی فکرمند تھی۔

وہ میریٹ میں ارحم کے ساتھ ڈنر کرنے آئی تھی جہاں اس کی ایک مشہور و معروف چینل کے پروڈیوسر اور ڈائریکٹر کے ساتھ ملاقات طے تھی۔ وہ ان سے ارحم کے ریفرنس سے ملنے آئی تھی اس لیے اسے امید تھی کہ آج معاملات کافی حد تک طے پا جائیں گے اور وہی ہوا تھا جس کی وجہ سے وہ خاصی خوش تھی۔

واپسی پر ارحم اسے ڈیفنس میں اس کے گھر تک چھوڑنے آیا تو اس خوب صورت بنگلے کو دیکھ کر اس نے توصیفی لہجے میں کہا کہ "تمہارا گھر بہت خوب صورت ہے۔"

"یہ میرا گھر نہیں ہے، میں یہاں پے اِنگ گیسٹ کے طور پر رہتی ہوں۔" اس نے فوراً تصحیح کی تو حیرت کی ایک سبک رفتار لہر نے ارحم کے چہرے کا احاطہ کیا۔

"تو پھر تمہارا گھر کہاں ہے؟" وہ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے تجسس سے پوچھ رہا تھا۔

"فی الحال تو کوئی گھر نہیں البتہ مستقبل میں میرا ایک شاندار گھر بنانے کا ارادہ ہے۔" اب کے اس نے محتاط لہجے میں جواب دیا تھا اور ارحم کو اندازہ ہو گیا تھا وہ ابھی اس موضوع پر مزید بات کرنا نہیں چاہتی تب ہی وہ الوداعیہ جملے کہہ کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھا۔ اس نے گاڑی کا دروازہ بند کرتے ہوئے مائرہ کو دیکھا جس کے لمبے بال پشت پر لہرا رہے تھے اور وہ جیسے جیسے آگے بڑھ رہی تھی، ارحم کا دل اس کے ہاتھوں سے ویسے ویسے پھسل رہا تھا۔ اس نے جیسے ہی گھر کا گیٹ بند کیا تھا اسی وقت ارحم کے دل کا دروازہ پوری قوت سے کھلا تھا۔

☼ ☼ ☼

ہال کے داخلی دروازے پر ایک قد آدم آرائشی شیشہ نصب تھا۔

نیوی بلیو کلر کے لباس میں وہ آج ضرورت سے زیادہ اچھی لگ رہی تھی یا پھر عبدالباری کو وہ ہر قسم کے حلیے میں اچھی لگتی تھی۔ آج پریس کلب میں صحافیوں کی کوئی ورکشاپ تھی اور عبدالباری کے بے پناہ اصرار پر وہ آج یہاں آئی تھی، تب ہی اسے خلاف توقع آتا دیکھ کر اس کے دل میں خوشی کا بے ساختہ احساس انگڑائی لے کر نمودار ہوا تھا۔

"کیا ہوا، اتنے غور سے کیوں دیکھ رہے ہو؟" اس نے تھوڑا سا بور ہو کر کہا۔ آج بہت عرصے کے بعد اس کے ہونٹوں پر لپ اسٹک دیکھ کر وہ کھل کر مسکرایا تھا۔

"کیا تکلیف ہے بھئی؟" اسے معنی خیز انداز میں مسکراتے دیکھ کر وہ چڑ کر بولی تھی۔

"دیکھ رہا ہوں کہ آج تو لائف بوائے کی بجائے "لکس" سے منہ ہاتھ دھویا ہے، تب ہی چمک رہی ہو۔" وہ دونوں بازو سینے پہ لپیٹے گہرے جذبے لٹاتی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"ہاں بس، آج نمو نے زبردستی لپ اسٹک لگا دی۔" وہ بری طرح جھینپ کر بولی تھی۔ اس کے بلش کرتے رخساروں پر پھیلنے والی لالی کم از کم عبدالباری کے لیے بہت انوکھی اور دلفریب تھی جبکہ وہ خلاف عادت خاصی گھبرائی ہوئی دائیں بائیں گھومتے صحافیوں کو دیکھ رہی تھی۔ کئی جانے پہچانے چہرے گھومتے ہوئے نظر آرہے تھے اچانک ان کی نظر سلطان ہاشمی پر پڑی جو اپنے بغل میں ایک تمکین اور گھبرائی گھبرائی سی لڑکی کو لیے ہال میں آرہا تھا۔

عانیہ کے چہرے کے تاثرات بہت سرعت سے تبدیل ہوئے تھے۔ اس کے متغیر چہرے کو دیکھتے ہوئے باری نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔

"لگتا ہے کہ کوئی اور بے وقوف اس گھاگ شکاری کے ہتھے چڑھ گئی ہے۔" اس نے خاصی برہمی سے تبصرہ کیا تھا جبکہ اس کے جواب میں عبدالباری نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یہ بے چاری تو شکل سے ہی ستم رسیدہ لگ رہی ہے دیکھو کتنی سراسیمگی پھیلی ہوئی ہے اس کے چہرے پر۔"

وہ دونوں سبک روی سے چلتے ہوئے سامنے رکھے صوفوں پر بیٹھ چکے تھے۔ وہ لڑکی حد درجہ استعجاب سے دائیں بائیں دیکھ رہی تھی۔

"کمینے نے اپنی چرب زبانی سے اسے قابو کر لیا ہوگا، دل سے ہی سیاہ ناگ لگتا ہے۔" وہ انتہائی جل کر بولی تھی جب کہ اس کے اس طرح چڑنے پر باری نے زوردار قہقہہ لگایا تھا۔ بہت سارے لوگوں نے مڑ کر اسے دیکھا جس میں سلطان ہاشمی بھی شامل تھا۔

"ویسے عانیہ! تم نے اس کا کیا نام رکھا تھا؟" وہ ہنستے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"زنگی۔" عانیہ کے چہرے پر بھی مسکراہٹ نے احاطہ کیا تھا۔

"بھلا کیا مطلب ہے زنگی کا؟" اس نے جان بوجھ کر چھیڑا۔

"افریقہ کا دیسی آدمی، جس کا رنگ کوے کی طرح سیاہ اور ہونٹ موٹے موٹے ہوں۔" اس کا موڈ بھی خوشگوار ہو گیا تھا۔ جاب چھوڑنے کے بعد اس نے آج پہلی دفعہ سلطان ہاشمی کو دیکھا تھا۔ اس کے کالم ابھی تک چھپ رہے تھے لیکن انداز تبدیل ہو گیا تھا اور لگتا تھا کہ آج کل یہی لڑکی اس کے لیے لکھنے کا فریضہ سرانجام دے رہی تھی، جس کو وہ اپنی پرسنل سیکرٹری کہہ کر متعارف کروا رہا تھا۔ اس کا اپنا ایک پبلشنگ ادارہ تھا لیکن اس کے باوجود اسے ہر جگہ اپنا نام پھیلانے کا خاصا شوق تھا۔

"شکر کرو تم اس بخیل آدمی کے قبضے سے نکل آئیں، وہ تو اپنا بخار بھی کسی کو نہیں دیتا۔" اسے آج عانیہ کو چھیڑنے میں مزا آرہا تھا۔

"شکر وہ کرے کہ جس کا گنجا سر میرے ہاتھوں سے بچ گیا۔ انتہائی مکار اور فریبی شخص ہے، میری تین ماہ کی تنخواہ بھی ہضم کر گیا کم بخت۔" عانیہ کا غصہ اور اضمحلال بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر پژمردگی دیکھ کر عبدالباری نے فوراً بات پلٹی اور اسٹیج کی طرف اشارہ کیا جہاں پروگرام کا آغاز ہو چکا تھا اور آغاز سے ہی انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ خاصا بور پروگرام ہے، تب ہی وہ بمشکل دو گھنٹے وہاں بیٹھے اور جب ہمت جواب دے گئی تو وہ دونوں پروگرام ادھورا چھوڑ کر ہی واپس آگئے تھے اور اس وقت وہ پریس کلب کے لان میں کھڑے تھے۔

"رانی کے بارے میں تم نے سنا..." باری نے دانستہ بات ادھوری چھوڑی۔ ایک تاریک سا بادل اس کے چہرے پر لہرایا اور آنکھوں کی روشنی ماند پڑ گئی۔

"ہاں' بہت اونچی ہواؤں میں اڑ رہی ہے۔ آئے دن خبریں سننے کو ملتی ہیں۔ بہت خوش ہے کہ اس کے باپ کا حوالہ اس کے ساتھ نہیں رہا۔" وہ چلتے چلتے رکی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک بے کس مجروح سی مسکراہٹ تیر رہی تھی۔

"باری! یہ قرب قیامت کی نشانیاں نہیں ہیں کہ وہ والدین جو سخت محنت کرکے اپنی اولاد کی پرورش کرتے ہیں' انہیں پڑھاتے اور لکھاتے ہیں اور انہیں بڑے ہو کر ان ہی کی ذات کے حوالے سے شرم آنے لگتی ہے۔"

وہ عشق پیچاں کی گھنی بیل سے ڈھکی دیوار کے پاس آکر رک گئی تھی۔ اس کے پورے وجود پر افسردگی طاری تھی' وہ تلخ انداز سے گویا ہوئی۔ "اسے شرم آتی تھی جب لوگ اسے کہتے تھے کہ یہ مشہور و معروف اسٹیج ایکٹر کی بیٹی ہے' جسے لوگ بھانڈ یا میراثی کہہ کر پکارتے ہیں حالانکہ ابا نے اسٹیج پر اتنے سال لوگوں کے چہروں پر مسکراہٹیں بکھیریں لیکن خود وہ کس کسمپرسی کی حالت میں آخری دن گزار رہے ہیں' کسی کو احساس ہی نہیں۔ دنیا کتنی بے وفا ہے نا' باری؟" وہ خود کلامی کے انداز میں بول رہی تھی۔

"میرا باپ بھی اسٹیج کی دنیا کا درخشاں ستارہ تھا۔ ظالم وقت کی دھول نے اس کے خدوخال کو دھندلا دیا ہے۔ اب وہ ایسی عمارت بن چکا ہے جسے زمانے کے سرد و گرم نے کھنڈر بنا کر رکھ دیا ہے۔ شوگر جیسا موذی مرض آکاس بیل کی طرح اس کے وجود سے چمٹ گیا ہے اور اتنی کسمپرسی کی حالت میں زندگی بسر کر رہا ہے کہ بعض دفعہ مجھے اس پر ترس آنے لگتا ہے۔" اس کی باتوں نے باری کو افسردہ کر دیا تھا۔

"یہی دنیا ہے یار.....!" وہ صرف اتنا ہی کہہ سکا تھا۔

"اصل میں باری! ابا کا مسئلہ ایک اور بھی ہے۔ وہ اپنے ماضی میں جینا چاہتے ہیں' جب وہ لوگوں کے دلوں پر راج کرتے تھے۔ وہ اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں کہ وہ دنیا کے اسٹیج پر اپنا کردار ادا کر چکے ہیں اور اب پردہ گر چکا ہے۔" باری نے اس کی آنکھوں میں تیرتی نمی کو دل سے محسوس کیا۔

"اصل میں عانیہ! اسٹیج پر کام کرنے والوں کے لیے وہاں موجود سامعین کی تالیوں کا نشہ اتنا دلفریب ہوتا ہے کہ وہ چاہتے ہوئے بھی اس سے باہر نہیں نکل سکتے اور جس شخص نے اپنی زندگی کے اتنے قیمتی سال لوگوں کو دیے ہوں' وہ اس تلخ حقیقت کو کیسے قبول کر سکتا ہے۔ اسے اسی یوٹوپیا میں رہنے دو۔" وہ دونوں بازو آپس میں باندھ کر اس لڑکی کو غور سے دیکھنے لگا جو اسے ساری دنیا سے عزیز تھی۔

"لیکن باری! زندگی ایسے نہیں گزرتی۔" اس نے جھنجلا کر عشق پیچاں کی بیل سے چند پھول توڑے اور فضا میں اچھال دیے۔

"کیوں نہیں گزرتی؟" چند لمحے پرسوچ انداز میں اسے دیکھتے ہوئے وہ قدرے سپاٹ انداز میں دوبارہ بولا۔

"مجھے دیکھو' میرے ماں باپ کی اس وقت علیحدگی ہوئی' جب میں پانچ سال کا تھا۔ میری ماں نے صرف اپنی انا کا جھنڈا بلند رکھنے کے لیے میری تحویل کے لیے قانونی جنگ لڑی اور اس کے بعد اپنی زندگی میں مگن ہو گئی۔ بابا فارن سروس میں' جاپان چلے گئے اور وہیں شادی کر لی اور ایک نئی زندگی کا آغاز کر لیا۔ اب دونوں کے اپنے اپنے بچے ہیں اور اپنی اپنی زندگیاں ہیں۔ سالوں بعد ایک آدھ کو میرا خیال آ جائے تو میرے اکاؤنٹ میں ہزاروں روپے ٹرانسفر کرکے سمجھتے ہیں ان کا حق ادا ہو گیا۔ میں بھی تو زندگی گزار ہی رہا ہوں ناں۔" وہ بہت پرسکون انداز میں کہہ رہا تھا۔

عانیہ نے رشک بھرے انداز سے اس کے آسودہ چہرے کو دیکھا۔ بلیک پینٹ پر ٹی پنک کلر کی شرٹ میں وہ خاصا ہینڈسم لگ رہا تھا اس کی ہائٹ' براؤن آنکھیں' گھنی مونچھیں اور سرخ و سپید رنگت اسے ہزاروں لوگوں میں نمایاں کرتی تھی۔ وہ خالصتاً "پٹھان" تھا اور پٹھانوں والا مخصوص انداز اس کے ہر انداز میں نمایاں ہوتا تھا۔ عانیہ کو یاد تھا کہ اس کے ڈیپارٹمنٹ کی آدھی اس کے پیچھے پاگل تھی لیکن وہ انتہائی من موجی بندہ تھا

اور بہت کم لوگوں کو لفٹ کرواتا تھا۔

"اتنے غور سے کیوں دیکھ رہی ہو؟" کسی دلفریب سے خیال نے باری کے لبوں پر بڑی نرم سی مسکراہٹ بکھیر دی تھی۔

"سوچ رہی ہوں کہ موسم خاصا خراب ہو رہا ہے' گھر چلنا چاہیے۔" اس نے سیاہ سرمئی رنگ کے بادل دیکھ کر سنجیدگی سے کہا جبکہ عانیہ کے اس بے تکے جواب پر باری نے مصنوعی غصے سے اسے گھور کر دیکھا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"کتنی بدذوق لڑکی ہو۔ اتنے خوب صورت اور رومانوی موسم کو خراب کہہ رہی ہو جبکہ مجھے تو یہ موسم بہت پُرکیف سا لگ رہا ہے۔" اس نے شہتوت کے پتوں سے لپٹ کر آنے والی ہوا میں موتیا کے پھولوں کی دلفریب مہک کو محسوس کرتے ہوئے لمبا سانس لیا۔

"جناب عالی! آپ رہتے ہیں ایک پوش علاقے کے خوب صورت فلیٹ میں' ذرا ہمارے علاقے کا حشر دیکھیے گا' آپ کو بارشوں سے چڑ ہو جائے گی۔ ساری رومانویت ناک کے ذریعے باہر نکل جائے گی۔" وہ اب ہاتھ پھیلا کر بارش کے ننھے قطروں کو دلچسپی سے سمیٹنے لگی۔ بادلوں میں ارتعاش سا ابھر رہا تھا۔

"کم آن یار! ہر قسم کے حالات کو انجوائے کیا کرو۔ جب معلوم ہے کہ اس ماحول سے فی الحال نکلنا ممکن نہیں تو اسی میں خوب صورتیاں تلاش کر لیا کرو۔ یقین کرو' زندگی بہت آسان ہو جائے گی۔" وہ بارش کی تیز بوچھاڑ سے بچنے کے لیے اسے شیڈ کے پاس لے آیا تھا۔ دونوں اب تواتر سے برستی بارش کی بوندوں کو دیکھ رہے تھے۔

"باری! ابا کے انجکشن ختم ہو گئے ہیں۔" اسے اچانک یاد آیا۔

"کوئی مسئلہ نہیں' واپس جاتے ہوئے لے لیں گے۔" اس کے پاس ہر مسئلے کا حل موجود ہوتا تھا۔

"تو کیا تم میرے ساتھ جاؤ گے۔" اس نے بظاہر سنجیدہ انداز سے پوچھا لیکن شرارت اس کی آنکھوں سے نمایاں تھی۔

"آف کورس! اب اتنے اچھے موسم میں تمہارے ہاتھ کے پکوڑے کھائے بغیر تو بالکل نہیں جاؤں گا۔" وہ اپنی عادت کے مطابق برا ماننے کے بجائے ہنس کر بولا تھا۔

"قدر گھٹا رہتا ہے روز کا آنا جانا۔" وہ پانی کے بلبلے غور سے دیکھتے ہوئے ہنستے ہوئے بولی تھی۔ آج وہ مکمل ترنگ میں تھی اور ایسا بہت کم ہوتا تھا۔

"توبہ استغفار' اتنا بڑا جھوٹ!" باری نے آنکھیں پھیلا کر باقاعدہ کانوں کو ہاتھ لگائے تھے۔

"تم کتنی جھوٹی ہو عانیہ! میں پورے تین دن کے بعد تمہارے گھر جاؤں گا۔"

"تو میں یہی تو کہہ رہی تھی۔"

"خواہ مخواہ! تم تو کہہ رہی تھیں کہ روز کا آنا جانا..."

اسے بحث کرنے میں مزا آ رہا تھا۔ آج کافی دنوں کے بعد [illegible] تو اس کی ایک انگلش اخبار میں جاب ہوئی تھی اور وہ [illegible]

"ہاں" تو یہ ہر تیسرے دن آنا بھی تو روز کا آنا جانا ہوا ہے۔" وہ کھلکھلا کر ہنسی تھی اور اسے ہنستے دیکھنا کم از کم باری کے لیے بہت خوشگوار تجربہ ہوتا تھا۔

"باری! میں سوچ رہی ہوں کہ نمرہ کی شادی کر دوں۔"

"سبحان اللہ' کیا عمدہ سوچ ہے' آپ کا اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ محترمہ! آپ نمرہ کے بجائے اگر اپنی شادی کر لیں تو وہ زیادہ بہتر ہے۔"

"میں؟" اس نے مکھی اڑائی "میں اپنے بارے میں تو سوچ بھی نہیں سکتی۔"

"تو پھر میں سوچ لیتا ہوں۔" اس کے شرارتی انداز پر اس نے گھبرا کر اسے دیکھا' جو بڑی محویت سے نظریں ٹکائے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے اس طرح گھبرانے پر وہ خاصا محظوظ ہوا تھا اور اس کے چہرے پر بکھری مسکراہٹ کے رنگ اور گہرے ہوئے تھے۔

"یا سوچ رہے ہو؟" اس کے انداز میں عجلت تھی۔

"یہی کہ نمرہ کی شادی کے لیے کوئی لڑکا ڈھونڈ کر یہ فرض بھی نبھا لیتے ہیں۔" اس کا لہجہ متبسم اور انداز شرارت لیے ہوئے تھا۔ عانیہ نے سکون کا سانس لیا تھا۔ "لیکن تم اس کی شادی اتنی جلدی کیوں کرنا چاہتی ہو؟" وہ اب سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

"مجھے اب خوف آتا ہے باری! میں نے باہر کی دنیا دیکھی ہے۔ یہاں بہت فریب اور دھوکا ہے اور مجھے ڈر لگتا ہے کہ وہ بھی رانی کی طرح کسی کی باتوں میں آ کر ایک نئی دنیا کو تسخیر کرنے نہ نکل جائے۔ جب تک اماں زندہ تھیں میں بے فکر تھی لیکن اماں کی وفات اور پھر رانی کا اتنا بولڈ قدم' میں مزید کچھ اور جھیلنے کی سکت نہیں رکھتی۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو عینی! لیکن یاد رکھنا کہ ہر کام اور ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے' اس سے پہلے کچھ نہیں ہو سکتا۔" وہ بہت خلوص [illegible] اور تمہیں اپنے بارے میں بھی کچھ سوچنا چاہیے۔"

"میرے بارے [illegible]" اس نے بے ساختہ نظریں چرائی تھیں۔

"اور میں کہاں ہوں عانیہ؟" وہ بہت آس سے پوچھ رہا تھا۔

"تم..." اس کے چہرے پر بہت خوب صورت رنگ پھیلا تھا "تم میری زندگی کے ہر راستے پر ہو۔" اس نے بے ساختہ کہا تھا۔

"لیکن میں کب تک راستوں میں رہوں گا' ہم لوگ مل کر بھی تو یہ راستہ طے کر سکتے ہیں۔" وہ آج بہت کھل کر کہہ رہا تھا۔ عانیہ کے اردگرد کئی فانوس جگمگا اٹھے تھے۔

"میں نے کب انکار کیا ہے باری!" اس کے جواب پر عبدالباری کے دل پر چاند کی کرنوں کی طرح خوشی بکھری تھی اور آنکھوں سے جیسے روشنیوں کے سوتے پھوٹ رہے تھے۔

"لیکن میں پہلے نمرہ کے فرض سے نبٹنا چاہتی ہوں۔"

عبدالباری آمادگی سے مسکرایا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تھینکس گاڈ... تمہاری آواز تو سننے کو ملی۔ مجھے تو لگتا تھا جیسے صدیاں گزر گئی ہیں اور تم سے نہ بات ہوئی نہ تمہارا خوب صورت چہرہ دیکھا۔" ارحم کی بھاری اور دلکش آواز میں گہرا انتظار اور بے تحاشا شکوہ پنہاں تھا۔

"جناب آپ خود آ جاتے ملنے..." وہ کھلکھلا کر ہنسی تھی اور ارحم کو یوں لگا جیسے مندر میں کسی نے ایک ساتھ بہت سی گھنٹیاں بجا دی ہوں۔

"محترمہ! آپ ٹھہریں مشہور و معروف ہستی' اب ہم جیسے چھوٹے موٹے لوگوں کو کہاں لفٹ کروائیں گی۔ بہرحال! تمہارا نیا ڈرامہ دیکھا' بہت آؤٹ کلاس تھا۔ تم نے تو سب کو اپنی لاجواب ایکٹنگ سے کلین بولڈ کر دیا۔ اب تو برنی صاحب بھی اپنے نئے پراجیکٹ کے لیے تمہارا انتخاب کرنے کا سوچ رہے ہیں۔" اس کی اطلاع نے مائرہ کے اندر جوش اور ولولہ بھر دیا تھا۔

"ریئلی ارحم! تمہیں کس نے بتایا...؟" وہ چہکی۔

"کم آن مائرہ کم از کم یہ بچوں والے سوال تم مجھ سے تو نہ کیا کرو۔ تمہیں معلوم ہے کہ ہمارا اپنا پروڈکشن ہاؤس ہے اور سو کونٹیکٹس ہیں' کوئی بھی بتا سکتا ہے۔" دوسری طرف مائرہ بری طرح جھینپ گئی۔

"یار! یہ مت بھولا کرو کہ میں کس کا بیٹا ہوں۔ میرے پاپا کا میڈیا کی دنیا میں ایک نام ہے۔" اس کے لہجے میں جھلکتے فخر نے مائرہ کو ایک لمحے کو چپ کروا دیا تھا... اس سے کچھ بولا ہی نہیں گیا اور پھر کچھ سنبھل کر اس نے لاپروائی سے کہا تھا۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم اپنے پاپا کے نام کو کیش کرواتے ہو۔"

"آف کورس! لیکن میرا اپنا بھی جو مقام اور نام ہے' لوگ اب اس کو بھی تسلیم کر رہے ہیں۔"

وہ خاصا خود پسند واقع ہوا ہے' اس کا احساس آج پہلی دفعہ مائرہ کو ہوا تھا لیکن وہ اس کے باپ کے نام اور

مقام سے بخوبی واقف تھی اور کیریئر کے آغاز میں اس طرح کا سہارا اس کے لیے کتنا مفید ثابت ہو سکتا ہے' اس کا اندازہ اسے اپنے پہلے پراجیکٹ سے ہی ہو گیا تھا اور وہ کم از کم ارحم سے بگاڑنے کی پوزیشن میں ابھی نہیں تھی اس لیے اس کی بات سے بدمزا ہونے کے باوجود وہ زبردستی ہنس رہی تھی۔

"مائرہ! تم دوبئی چلو گی۔۔۔؟" اس کی اچانک آفر نے دوسری جانب موجود مائرہ پر گویا شادیٔ مرگ طاری کر دی تھی۔

"دوبئی' مگر کیسے؟" اس کا دل انجانی لے پر دھڑکا تھا۔

"یار! ایک ملٹی نیشنل کمپنی کا ایڈ ہے' میں نے تمہاری کچھ تصاویر دکھائیں' فوراً" مان گئے اور میں نے انہیں کہہ دیا تھا کہ وہ میری بہت اچھی دوست ہے اس لیے مجھے تو انکار نہیں کرے گی اور تمام معاملات بھی طے کر لیے' ٹھیک کیا ناں۔۔۔؟"

اس کے الفاظ مائرہ پر ایک سحر طاری کر رہے تھے۔ ارحم کے لہجے میں چھپے اپنائیت کے رنگ اور حق جتاتا انداز کم از کم مائرہ کے لیے طمانیت کا باعث بن رہا تھا اور وہ جو اڑتی اڑتی خبریں نئی ماڈل گرلز اور ارحم کے بارے میں سن رہی تھی' ان ہی سے گھبرا کر اس نے آج کافی دنوں کے بعد ارحم کو فون کیا تھا۔ سارے اندیشے اور خوف بھاپ کی طرح اڑ گئے تھے۔

"اور پتا ہے مائرہ! میں تمہیں دوبئی میں ایک خاص گفٹ دوں گا۔" وہ بے حد جذب سے کہہ رہا تھا اور اس کا آنچ دیتا لہجہ مائرہ کے اندر رم جھم جیسی پھوار برسا رہا تھا۔ اسے شوبز کی دنیا میں آئے ہوئے کچھ ہی عرصہ ہوا تھا۔ وہ جس اکیڈمی میں ٹیوشن کے لیے جاتی تھی' وہیں پر آنے والے ایک لڑکے عامر کے توسط سے اس نے اس فیلڈ میں قدم رکھا تھا لیکن کوئی خاص پذیرائی حاصل کرنے میں ناکام رہی تھی اور وہ اب کوئی شارٹ کٹ ڈھونڈ کر اپنا مستقبل محفوظ کرنا چاہتی تھی۔

"پھر ارحم! شام کو ہم مل رہے ہیں ناں۔۔۔" وہ اس کی کیفیت محسوس کر کے ہنس پڑا' جبکہ مائرہ اپنے اچھل پچھل دل کو سنبھالنے لگی۔

✲ ✲ ✲

"ارحم! تمہارا دماغ ٹھیک ہے؟" رضا کو اس کی بات سن کر شاک لگا تھا۔ وہ اس کی ایمرجنسی کال پر اپنے سارے ضروری کام ادھورے چھوڑ کر اس کے بنگلے میں پہنچا تھا' جہاں وہ صوفے پر اوندھے منہ لیٹا چینل سرچ کر رہا تھا۔

"ہاں تو اس میں اس قدر اچنبھے کی کیا بات ہے؟" وہ لاپروائی سے کہہ رہا تھا۔

"تم واقعی مائرہ شیخ کو پرپوز کرنے والے ہو؟" اس کے حد درجہ حیرت والے انداز پر اس نے قہقہہ لگایا تھا جبکہ رضا اس کے اس انداز پر جل کر رہ گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر [illegible] ریموٹ کنٹرول اس کے ہاتھ سے چھینا اور [illegible] چینل بند کر کے وہ آرام سے اس کے پاس ہی صوفے پر بیٹھ گیا۔

"مجھے لگتا ہے کہ تمہارا دماغ چل گیا ہے۔"

"حالانکہ تم کہتے ہو کہ میرے پاس دماغ نام کی کوئی چیز نہیں۔" وہ کی چین انگلی میں گھماتے ہوئے سراسر اسے چڑا رہا تھا۔

"میں تو آج بھی اس بات پر قائم ہوں ورنہ تم اتنا فضول فیصلہ کبھی نہ کرتے۔" رضا نے صاف اس کا تمسخر اڑایا تھا۔

"تمہیں معلوم ہے ناں کہ ارحم بخاری کبھی چھوٹے موٹے فیصلے نہیں کرتا اور کوئی عام چیز تو اسے پسند نہیں آتی اور جہاں تک مائرہ کی بات ہے تو وہ پہلی لڑکی ہے' جسے دیکھ کر میرے دل میں گھنٹیاں بجی ہیں۔ شوبز میں اس کا آغاز سفر ہے اور میں نہیں چاہتا کہ اسے شہرت کا چسکا لگ جائے' اس سے پہلے ہی اس کے حقوق اپنے نام محفوظ کروالوں اور اپنی بیوی کو شوبز میں لانے کا میرا تو کم از کم کوئی ارادہ نہیں۔" وہ اب سنجیدگی سے بتا رہا تھا۔

"وہ شوبز چھوڑنے پر راضی ہو جائے گی؟" رضا نے

"[illegible] آف کورس! وہ ہمارے پروڈکشن ہاؤس میں [illegible] اور حیثیت سے کام کر سکتی ہے لیکن پردۂ اسکرین [illegible] نہیں۔" وہ حد درجہ پر اعتماد تھا۔

"تم نے اس سے بات کی۔۔۔؟"

"نہیں' ابھی نہیں۔۔۔" اس نے صاف گوئی سے [illegible]

"میرے خیال میں پہلے محترمہ کے خیالات جان لو' [illegible] شیخ چلی کی طرح منصوبے بنانا۔" رضا نے سنجیدگی سے مشورہ دیا۔

"یہ شیخ چلی کے منصوبے نہیں ہیں یار! آج تک [illegible] نے ارحم بخاری کو انکار کیا ہے؟" ایک مخصوص [illegible] سی بے نیازی اور خود اعتمادی اس کی شخصیت کا [illegible] حصہ بن چکی تھی' جو اب ناگواریت کا باعث بنتی [illegible] اور رضا تو اس سے باقاعدہ چڑنے لگا تھا۔

"[illegible]" وہ اس کی بات نظر انداز کر کے بولا تھا۔ "[illegible] ابھی اندھیر نہیں مچا ہوا۔ یاد نہیں کہ وہ ثانیہ [illegible] طبیعت ستھری لڑکی تھی۔ آج تک [illegible] اس کی وجہ سے تمہیں ذلیل کرتے ہیں۔"

"ثانیہ جمیل!" ارحم جی بھر کر بدمزا ہوا۔

"وہ تو شکل سے ہی مڈل کلاس خاندان کا چلتا پھرتا [illegible] تھی' اچھی خاصی چالاک لڑکی تھی۔ دیکھا [illegible] مشہور گروپ میں جا کر شامل ہو گئی ہے۔ [illegible] نہیں تھی ورنہ اپنی لالچی طبیعت کی بنا پر [illegible] جاتی۔"

"شرم کرو' کسی کے بارے میں اتنا غلط گمان نہیں [illegible] اور تم نے کہاں سے اس کا لالچ دیکھ لیا۔" رضا کو غصہ آ گیا تھا۔

"ظاہر ہے' اس کا سی وی اٹھا کر دیکھ لو' کسی بھی [illegible] میں اس نے چھ ماہ سے زیادہ ٹک کر کام نہیں [illegible] اس چیز کا بڑا واضح ثبوت ہے۔"

"[illegible] اللہ! کیا دلیل دی ہے آپ نے' صدقے [illegible] آپ کی ذہانت کے' کیا خوب اندازے [illegible] ہیں آپ۔ لگتا ہے بزرگ سیاست دان پیر پگارا کے جانشین ثابت ہوں گے' کیونکہ ان کو بھی پیشن گوئیاں کرنے کا خاصا شوق ہے' آپ کی طرح۔" رضا نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہتے ہوئے کشن اٹھایا اور سامنے والے صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔ وہ اس کے بچپن کا دوست تھا اور بہت زیادہ بے تکلفی سے ان کا ایک دوسرے کے گھر آنا جانا تھا۔

"تم کیا مجھے یہاں طعنے دینے کے لیے آئے ہو؟" ارحم کے لہجے میں خفگی جھلکی۔

"نہیں' آپ کے انتہائی بے ہودہ' فضول اور احمقانہ اقوال زریں سننے کے لیے آیا ہوں۔" اس کے انتہائی طنزیہ انداز پر ارحم کو ہنسی آ گئی۔

"یہ گھر کی خواتین نظر نہیں آ رہیں۔۔۔؟" رضا نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اس کی ماما اور بھابی کا پوچھا۔

"بھابی آج کل اپنی دیورانی اور نند سے ملنے انگلینڈ گئی ہوئی ہیں۔ عاصم بھائی کے ہاں بیٹا ہوا ہے ناں اور ماما آج کل اپنے پوتے کی شاپنگ میں مصروف ہیں' ان کا بھی اگلے ہفتے جانے کا ارادہ ہے۔" ارحم نے تفصیل سے بتایا۔ اس کے بڑے بھائی اعظم تو پاپا کے ساتھ الیکٹرانک میڈیا میں تھے جبکہ اس سے چھوٹے عاصم ڈاکٹر تھے اور FRCS کرنے اپنی بیگم کے ہمراہ انگلینڈ گئے ہوئے تھے اور ان سے چھوٹی بہن ندا تھی' جو شادی کے بعد دوبئی چلی گئی تھی اور آج کل وہ بھی انگلینڈ گئی ہوئی تھی۔ سب سے چھوٹے ارحم خود تھے جو اپنے والد مظہر بخاری کے ساتھ بہت کامیابی سے ایڈورٹائزنگ ایجنسی چلا رہے تھے۔

گھریلو ملازم نے ابھی ابھی چائے لا کر رکھی تھی اور رضا بے تکلفی سے اپنی پلیٹ میں اکٹھے دو کباب رکھے کھانے میں مگن تھا۔

"کس فیملی سے تعلق ہے تمہاری مائرہ شیخ کا؟" رضا نے 'تمہاری' پر زور دیتے ہوئے خاصا بڑا طنز کیا تھا' تب ہی وہ اچھل کر بیٹھ گیا۔

"پتا نہیں' وہ اس موضوع پر کبھی بات نہیں کرتی۔ اس معاملے میں تھوڑی سی ریزرو ہے۔" ارحم کی بات پر وہ ایک لمحے کو چونکا اب اس کے چہرے پر بڑی

دلچسپ مسکراہٹ تھی۔

"لگتا ہے اس کے حسن کی چکا چوند نے تمہارا دماغ ماؤف کر دیا ورنہ تم انسانوں میں بھی حسب نسب کھنگال کر پھر بات کرتے ہو جبکہ چیزوں میں تو تم برانڈ کونشس ہو ہی اور اوپر سے تمہاری والدہ محترمہ اس معاملے میں تم سے بھی چار ہاتھ آگے ہیں بلکہ سوائے انکل کے سارا خاندان ہی حد درجہ اسٹیٹس کونشس ہے، اس لیے پہلے اتا پتا کروا لینا، ورنہ آنٹی کا تو تمہیں پتا ہی ہے ناں۔" رضا نے بڑی وضاحت سے کہا تھا اور ارحم کو تھوڑا سا ناگوار لگا تھا۔

"اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ اصل میں ماما بیک گراؤنڈ کو اہمیت اس لیے دیتی ہیں کیونکہ یہ انسان کی شخصیت کو بنانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے اور پھر جب آپ کسی گھر سے لڑکی کو لے کر آ رہے ہوتے ہیں تو یہ آپ کی آنے والی نسل کا بھی تو معاملہ ہوتا ہے اور ویسے بھی رشتے داری اور رشتے ناطے اپنے ہم پلہ لوگوں میں ہی ٹھیک رہتے ہیں۔" اس نے چائے کپ میں انڈیلتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

"سبحان اللہ! کیا اصول و ضوابط ہیں، لیکن معذرت کے ساتھ میں اس معاشی تفریق پر یقین نہیں رکھتا، اس لیے آپ اپنے قیمتی خیالات کا اظہار میرے سامنے مت کیا کریں۔" وہ اب پزا کے ٹکڑے پر کیچپ لگا کر کھا رہا تھا مزے سے۔

"بہت کمینے ہو تم، پتا نہیں میری تم سے دوستی کیسے ہے؟" اس نے جھنجلا کر کشن اسے کھینچ مارا، جسے رضا نے ہنستے ہوئے کیچ کیا اور شرارت سے بولا۔

"اس لیے دوستی ہے کیونکہ میں بڑے باپ کا بیٹا ہوں۔ میرے سب کزنز اور رشتے دار بیورو کریٹس ہیں اور پھر میں تمہارا بدقسمتی سے بزنس پارٹنر بھی ہوں، چونکہ اسٹیٹس میں، میں تم سے کسی طور بھی کم نہیں اور اچھا خاصا ہینڈسم بھی ہوں اس لیے تمہاری حسن پرست طبیعت کی بھی تسکین ہو جاتی ہے، ورنہ تم نے مجھے گھاس کہاں ڈالنا تھی۔" اس نے ہنستے ہنستے ایک تلخ سچائی بیان کی تھی جبکہ ارحم نے اسے کھا

"اپنی بک بک بند کرو اور اگر میں کمینہ ہوں تو کمینے کا دوست بھی کمینہ ہی ہو گا ناں۔" اب وہ ڈھٹائی سے ہنس رہا تھا۔

"نہیں یار! کبھی کبھی کمینے لوگ کوئی اچھا کام بھی کر لیتے ہیں اور سمجھو مجھ سے دوستی تمہاری زندگی کا واحد اچھا کام ہے۔" رضا بھی اب کھل کر قہقہے لگا رہا تھا جبکہ ارحم کے لبوں پر خجالت آمیز مسکراہٹ تھی۔

"یار! تم ذرا اس مائرہ کا کچھ اتا پتا تو کرواؤ، اس سے پہلے ایک ایڈ کھوسہ کے لیے بھی کیا تھا اور وہی اسے شوبز کی دنیا میں لے کر آیا تھا۔ تم ذرا کسی سے کہہ کر معلومات تو کرواؤ۔" ارحم نے وہ بات پٹاری سے نکال ہی دی تھی جس کے لیے اسے بلوایا تھا، جبکہ رضا نے اطمینان سے کشن سر تلے رکھے ایک میگزین دیکھنے میں مگن تھا، بہت آرام سے بولا تھا۔

"کیوں، میرا ابو کون سا خفیہ ایجنسی والا ہے یا وہ کون سا اسامہ بن لادن ہے، جس کے پیچھے میں بندے لگا دوں؟" رضا کے لاپروایانہ انداز پر ارحم نے بے زاری سے اسے دیکھا۔

"یار! میں اس کے ساتھ سیریس ہوں اور تمہیں مذاق سوجھ رہے ہیں۔"

"تو یہ کون سی نئی بات ہے۔" وہ ہنوز غیر سنجیدہ تھا۔

"ٹھیک ہے نہ پتا کرواؤ، میں خود کروا لوں گا، تم سمجھتے ہو کہ تمہارے علاوہ کوئی اور یہ کام نہیں کر سکتا۔" ارحم کے سنجیدہ انداز نے اسے چونکنے پر مجبور کر دیا اس نے میز پر رکھے اے سی کے ریموٹ سے اس کی کولنگ کو زیادہ کیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"کیا تم واقعی اس لڑکی کے لیے سیریس ہو؟" ارحم نے ایک کاٹ دار نظر اس پر ڈالی اور خاموش رہا جبکہ اب رضا انتہائی سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

"اگر تم اس کے لیے سیریس ہو تو پھر اس چیز سے فرق پڑتا ہے کہ وہ کون ہے اور کس بیک گراؤنڈ سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے لیے اتنا ہی کافی ہونا چاہیے کہ تم اسے پسند کرتے ہو اور اپنی زندگی کا ساتھی بنانا چاہتے ہو۔" اس کی بات کے جواب میں ارحم نے اسے یوں دیکھا جیسے اس کی خرابی دماغ کا یقین آ گیا ہو۔

"یہ کیسے ممکن ہے، جب تک اس کے اگلے پچھلوں کا پتا نہیں چلے گا، بات کیسے آگے بڑھے گی اور پھر تم ماما کو نہیں جانتے، وہ جب تک پورا شجرۂ نسب نہیں کھنگال لیں، بات آگے کیسے چل سکتی ہے اور میں تو ماما اور پاپا کا سب سے لاڈلا بیٹا ہوں، میرے حوالے سے انہیں ویسے بھی بہت توقعات ہیں۔"

"ٹھیک ہے، پھر اس لڑکی کا خیال دل سے نکال دو۔" وہ اتنے عام اور سرسری انداز سے کہہ رہا تھا گویا یہ بہت معمولی بات ہو۔

"یہ بھی ممکن نہیں ہے، وہ بری طرح سے میرے حواسوں پر چھا گئی ہے۔"

اس کے پسپا انداز پر رضا نے سخت بے یقینی سے اپنے سیماب طبیعت دوست کو دیکھا، جو بری طرح سے الجھا ہوا تھا۔ اسے پہلی دفعہ معاملے کی سنگینی کا احساس ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس وقت رات کے ساڑھے بارہ بجے تھے۔

جب عبدالباری نے عانیہ کی حواس باختہ کال اٹینڈ کی۔ وہ بری طرح روتے ہوئے ابا کی طبیعت بگڑنے کی اطلاع دے رہی تھی۔ وہ سخت گھبرائی ہوئی تھی۔ اس بات کا اندازہ اس کی بے ربط گفتگو سے ہوا تھا۔ اس سے زیادہ حوصلے میں تو نمرہ تھی، جس نے انتہائی تحمل سے بتایا تھا کہ ابا کی طبیعت بگڑنے پر وہ لوگ انہیں سول ہسپتال لے آئی ہیں لیکن ایمرجنسی میں موجود ڈاکٹر نے کہا ہے کہ کسی پرائیویٹ ہسپتال میں لے جائیں۔

وہ آدھے گھنٹے کے اندر اپنے دوست کی گاڑی لے کر وہاں پہنچا تو جمیل صاحب کی طبیعت واقعی سخت خراب تھی۔ اس نے ہسپتال میں موجود دو لوگوں کی مدد سے ابا کو گاڑی میں ڈالا اور ایک پرائیویٹ ہسپتال میں لے آیا، جہاں ایمرجنسی میں موجود ڈاکٹر نے چیک اپ کے فوراً بعد بتا دیا تھا کہ انہیں انجائنا کا اٹیک ہوا ہے۔

انہیں فوراً کارڈیالوجی میں ایڈمٹ کر لیا گیا تھا۔ دو گھنٹے کے بعد ان کی حالت کچھ سنبھلی تو عانیہ کی جان میں جان آئی۔

"مائی گاڈ عانیہ! میرا تمہارے بارے میں یہ خیال آج بالکل غلط ثابت ہو گیا، میرا خیال تھا کہ تم بہت باہمت لڑکی ہو لیکن تم سے زیادہ بہادر تو نمرہ ہے۔" وہ بجائے جواب دینے کے سسکیاں بھرنے لگی تھی۔ اس وقت وہ تینوں ویٹنگ روم میں رکھے صوفوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور عبدالباری عانیہ کے زرد چہرے کو تاسف بھرے انداز سے دیکھ رہا تھا، جو پچھلے کئی گھنٹوں سے وقفوں وقفوں سے رو رہی تھی۔

"اب تو انکل کی طبیعت کافی بہتر ہے، پھر کیا مسئلہ ہے، کیوں رو رہی ہو؟" عبدالباری کی آواز میں پریشانی کے ساتھ جھلاہٹ بھی نمایاں تھی۔ وہ اب آنسو اپنے بازو کی پشت سے پونچھ رہی تھی۔

"ابا نے تو آج میری جان ہی نکال دی تھی۔"

عبدالباری نے غور سے اسے دیکھا۔ جان تو واقعی نکلی ہوئی لگ رہی تھی۔ انتہائی زرد رنگت، کثرت گریہ سے سوجی ہوئی آنکھیں۔ وہ گم صم بیٹھی انگلیاں مسل رہی تھی اور اس وقت رات کے تین بج رہے تھے لیکن اس جدید سہولتوں سے آراستہ ہسپتال میں گویا دن نکلا ہوا تھا۔

"باری! یہ تو خاصا مہنگا ہاسپٹل ہے۔" اس کے حواس ذرا بحال ہوئے تو اسے اندازہ ہوا اور اب ایک نئی فکر نے اسے گھیر لیا تھا۔ نمرہ بھی اس کی بات پر بری طرح چونکی تھی۔

"تو پھر؟" عبدالباری اس کی بات نہیں سمجھا تھا۔

"صبح تک تو اس کا بل ہی ہزاروں میں بن جائے گا۔" اس کے چہرے پر گہری سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔

"کیسی باتیں کرتی ہو عانیہ!" عبدالباری نے نرمی سے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور اس کی لال انگارہ آنکھوں سے نظریں چرا کر بظاہر ہلکے پھلکے لہجے میں

کہا۔ ”خود ہی تو کہتی ہو کہ عبدالباری! تمہارے اکاؤنٹ کا خزانہ بھرتا جا رہا ہے‘ اسے کچھ ہلکا کرو اور گاڑی لے لو‘ میں نے بھی سوچا کہ اپنی ذات پر تو خرچ کرتا نہیں‘ چلو کہیں تو کام آئیں۔“

عانیہ کا سارا وجود ایک دم ہلکا پھلکا سا ہوا اور آنکھیں پھر سے چھلکنے کو تیار تھیں۔ ”خبردار! ایک بھی آنسو نکلا تو میں جان نکال دوں گا۔“ عبدالباری کی دھمکی پر وہ روتے روتے ہنسی تھی۔

اگلے دن نمرہ نے ابا کی طبیعت سنبھلنے پر اسے زبردستی کچھ دیر کے لیے گھر بھیجا۔ خود وہ ان کے ساتھ تھی۔ ابا سو رہے تھے‘ ان کا نقاہت زدہ جھریوں والا چہرہ دیکھ کر اس کا دل بھر آیا۔ عانیہ اور عبدالباری تھوڑی دیر پہلے ہی گئے تھے۔ ابا کو نیند کا انجکشن لگایا ہوا تھا‘ اس لیے وہ دونوں مطمئن تھے۔ وہ اس پرائیویٹ روم میں ان کے ساتھ تنہا تھی..... کل رات سے پہلی دفعہ اسے بھوک کا احساس ہوا تھا۔ وہ نرس کو ابا کا دھیان رکھنے کا کہہ کر کیفے ٹیریا کی تلاش میں باہر نکلی۔

ایک جوس کا پیکٹ اور سینڈوچ لے کر وہ عجلت میں واپس آئی تو کمرہ نمبر چھ کی بجائے کمرہ نمبر پانچ میں داخل ہو گئی۔ اس نے تیزی سے دروازہ کھولا اور اندر سے باہر آتے شخص سے بری طرح ٹکرائی۔ ہاتھ میں پکڑا ..... جوس کا پیکٹ ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جا گرا تھا۔

”اوہ آئی ایم سوری.....“ وہ حواس باختہ ہو گئی۔

”سو سوری‘ ایم سوری!“ وہ انتہائی مہذب اور نفیس انداز سے معذرت کر رہا تھا حالانکہ غلطی سراسر نمرہ کی تھی اور اسے کمرے میں داخل ہوتے ہی احساس ہو گیا تھا کہ وہ غلط کمرے میں آ گئی ہے۔ سامنے سنگل بیڈ پر لیٹی پچاس سالہ خاتون نے بہت دلچسپی سے اس نازک سی لڑکی کو دیکھا تھا۔ ان کے چہرے پر بڑا نرم سا تاثر تھا۔

”رضا! بچی کو اندر آنے کا راستہ دو بیٹا۔“ انہوں نے انتہائی محبت سے اپنے بیٹے کو کہا تھا‘ جو انتہائی خفت زدہ انداز سے اس اٹھارہ انیس سالہ خوب صورت اور دلکش خدوخال کی حامل لڑکی کو دیکھ رہا تھا اور جو انتہائی جھینپے ہوئے انداز سے کھڑی تھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ یہیں کھڑی رہے یا باہر نکل جائے۔ جوس کا پیکٹ اس نے فرش سے اٹھا لیا تھا۔

”ارے بیٹا آؤ نا.....“ انہوں نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی ان کی ٹانگ پر پلستر چڑھا ہوا تھا اور اٹھنے کی کوشش میں ان کے منہ سے بے ساختہ کراہ نکلی تھی۔

”آپ اٹھیں مت لیٹی رہیں۔“ اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر انہیں اٹھنے سے روکا۔ انہوں نے دوبارہ تکیے پر سر رکھ لیا ان کی آنکھوں کے نیچے حلقے نظر آ رہے تھے۔

”کیا ہوا آپ کو؟“ اس نے ان کے زرد پڑتے چہرے کو تشویش سے دیکھا۔

”[illegible] ماما ان [illegible] سب بتا رہی ہیں [illegible] روم میں [illegible] سلپ ہو کر [illegible] ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی اور بیٹے نے لا کر ہسپتال میں ڈال دیا۔“ وہ بچے بچے انداز سے ہنسیں۔

”ماما! پھر نرس کو بلاؤں؟ آپ کو واش روم لے جائے۔“ رضا نے اچانک مخاطب کیا تو نمرہ فوراً بولی۔

”آنٹی! میں آپ کی ہیلپ کروں.....؟“

”ہاں ضرور بیٹا!“ ان کے چہرے پر بڑا نرم سا تاثر پھیلا تھا۔

”لیکن پلیز یہ ہاتھ میں پکڑا جوس کا پیکٹ اور سینڈوچ پہلے میز پر رکھ دیں‘ یہاں سے کوئی نہیں اٹھائے گا۔“ رضا کے شرارتی انداز پر اس نے جھینپ کر دونوں چیزیں میز پر رکھیں۔ اس کے خفت زدہ چہرے پر بڑے خوب صورت رنگ پھیلے تھے۔ بے تحاشا گوری رنگت اور دلکش نقوش جس میں معصومیت رچی ہوئی تھی‘ رضا کو اس کا چہرہ اپنے دل میں اترتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

وہ ماما کو اٹھانے میں اس کی مدد کرنے لگا کیونکہ اس دھان پان سی لڑکی کے لیے مشکل ہو رہا تھا‘ پھر وہ انہیں واش روم لے کر گئی اور دوبارہ رضا کی مدد سے انہیں لٹایا۔ رضا کے لبوں سے بڑی پرسکون سانس خارج ہوئی تھی جبکہ ماما اب اس کا انٹرویو لینے میں مصروف تھیں اور وہ انہیں اپنے ابا کے بارے میں انتہائی افسردگی سے بتا رہی تھی جبکہ صوفے کے ساتھ ٹیک لگائے رضا بڑی فرصت سے یہ سوچنے میں مصروف تھا کہ اس لڑکی کی شکل کس سے ملتی ہے اور یہ چہرہ شناسا کیوں لگ رہا ہے؟

”ماشاء اللہ! بہت پیاری اور سلجھی ہوئی بچی تھی۔“ اس نے ماما کے منہ سے یہ فقرہ سنا تو چونک گیا وہ کمرے سے جا چکی تھی۔

”شام کو دیکھنے چلیں گے اس کے بابا کو.....“ وہ نیا پروگرام مرتب کر رہی تھیں۔

”پہلے آپ خود تو ٹھیک ہو جائیں‘ اس کے بعد سیر سپاٹے کا پروگرام بنایئے گا۔ [illegible] کی شکل کی [illegible] [illegible] بیچ [illegible] ورنہ دل کہہ کر آتے [illegible] ہم چاروں بھائیوں کی شامت آجائے گی کہ ماں کا خیال نہیں رکھتے۔“ اس کی آنکھیں شرارت سے جگمگا رہی تھیں۔ والدین کی آپس میں مثالی محبت پر اکثر وہ دونوں کو تنگ کرتا تھا۔

”ہاں تو تنگ ہی کرتے ہو۔ ہزار دفعہ حیان سے کہا ہے کہ شادی کر لو‘ کم از کم گھر میں کوئی خاتون تو آ جائے گی‘ لیکن اس کے پاس ٹائم ہی نہیں ہے۔ میں اکیلی کیا کیا دیکھوں.....“ بہت خفگی سے وہ کہہ رہی تھیں حیان ان کا سب سے بڑا بیٹا تھا جبکہ اس سے چھوٹا رضا اور اس سے دونوں چھوٹے جڑواں تھے اور آرمی میں تھے۔

”تو میں کس مرض کی دوا ہوں.....“ وہ دلفریبی سے مسکرایا اور شرارت سے سینے پر ہاتھ رکھ کر گردن کو قدرے خم دیا۔

”تم.....!“ تعجب سے ان کی زبان سے بس یہی لفظ ادا ہوا تھا۔

”جو راضی نہیں ہے‘ اس کے پیچھے پڑی رہتی ہیں اور جو راضی ہے‘ اس کو لفٹ ہی نہیں کرواتیں۔“ بیگم خوشی سے بے ہوش ہوتے بال بال بچیں اور ماتھا بھی ٹھنکا۔

وہ بغور اسے دیکھنے لگیں۔ آف وائٹ پینٹ پر اسکائی بلیو شرٹ پہنے وہ خاصا خوب صورت لگ رہا تھا اور چہرے پر تازہ شیو کا اثر بھی تھا۔ انہوں نے دل ہی دل میں ماشاء اللہ کہا اور مسرت انگیز انداز سے بولیں۔

”چلو کوئی تو مانا‘ بس ذرا پلستر اتر جائے تو فوراً لڑکیاں دیکھتی ہوں۔“ خوشی کا واضح تاثر ان کے چہرے پر چھا گیا تھا۔

”لڑکیاں دیکھنے کی کیا ضرورت ہے‘ ایک ہی لڑکی کافی ہے۔“ گلاس میں پانی انڈیلتے ہوئے وہ شرارت سے بولا تھا جبکہ وہ ایک دم ہنس پڑی تھیں۔ وہ اپنے چاروں بیٹوں کے لیے بہت محبت کرنے والی ماں تھیں اور ان کی خوشی میں خوش رہتیں۔ ”سب سے چھوٹا عمر تو باقاعدہ کہا کرتا تھا کہ اماں ہماری سہیلی ہیں۔“

”تو پھر یہ جو ابھی محترمہ آئی تھیں‘ ان کے بارے میں کیا خیال ہے۔“ اس کا لہجہ شریر تھا جبکہ عالیہ بیگم نے چونک کر بیٹے کے چہرے پر پھیلے اشتیاق کے رنگ دیکھے اور خود بھی کسی خیال کے زیر اثر مسکرا دیں۔

☆ ☆ ☆

وہ رات کو ہی بیگم عالیہ کو وہیل چیئر پر بٹھا کر ساتھ والے کمرے میں نمرہ کے والد کی عیادت کو پہنچا تو سامنے عانیہ جمیل کو دیکھ کر اسے دھچکا لگا..... اس کے چہرے پر ناہی بدحواسی اور گھبراہٹ صاف پڑھی جا رہی تھی جبکہ عانیہ جو کہ کوئی میگزین پڑھنے میں مصروف تھی‘ وہ بخاری پروڈکشن کے رضا کو دیکھ کر حیران رہ گئی..... اس کی رضا سے ایک دو بار ہی ملاقات ہوئی تھی جبکہ ٹیلیفونک رابطہ اکثر رہا تھا..... جمیل صاحب دوائیوں کے زیر اثر سو رہے تھے جبکہ نمرہ کو اس نے گھر بھجوا دیا تھا کچھ گھنٹوں کے لیے اور خود ابا کے پاس تھی۔

”بیٹا! آپ نمرہ کی کیا لگتی ہیں؟ اور کیا یہ ان کے فادر ہیں؟“ عالیہ بیگم کے انتہائی شفیق اور محبت بھرے انداز پر وہ بری طرح چونکی اور فوراً کھڑی ہو گئی۔

"آپ نمو کو کیسے جانتی ہیں؟" اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا تو عالیہ بیگم نے صبح والا واقعہ سنا دیا تو وہ بھی مسکرا دی۔

"رضا صاحب! آئیں ناں، بیٹھیں۔" اس نے گم صم اور شرمندہ سے رضا صاحب کو مخاطب کیا۔

"بیٹا! آپ رضا کو جانتی ہیں۔" انہوں نے متعجب ہو کر پوچھا۔ انہیں حقیقتاً اس لڑکی کے منہ سے اپنے بیٹے کا نام سن کر حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔

"ماما! یہ عانیہ جمیل ہیں۔ بہت اچھی کالم نگار اور زبردست اسکرپٹ لکھتی ہیں۔" رضا خجالت آمیز انداز سے کہہ رہا تھا۔ اسے حقیقتاً وہاں عانیہ کو دیکھ کر شرمندگی ہو رہی تھی۔ ارحم والے واقعے کے بعد وہ خاصا شرمندہ تھا اور اسی وجہ سے دوبارہ اس سے رابطہ کرنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔

"آئی ایم سوری عانیہ! میں ارحم والے واقعے کے بعد آپ سے رابطہ نہیں کر پایا۔ یقین کریں مجھے اس کا بہت افسوس ہے۔" اس نے ہاتھ میں پکڑا پھولوں کا گلدستہ جمیل صاحب کے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔

"اٹس او کے رضا صاحب!" اس نے متانت سے جواب دیا جبکہ عالیہ بیگم کو ان کی گفتگو سے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں۔

"بیٹا! نمرہ آپ کی کیا لگتی ہیں؟" وہ ڈھونڈنے سے بھی کوئی شباہت دونوں میں نہیں نکال سکیں تھیں، اس لیے بے تابی سے بولیں تو رضا ماما کی بے تابی پر مسکرا دیا۔

"آنٹی! وہ میری سب سے چھوٹی بہن ہے۔ انٹر کیا ہے اس نے۔ آج کل پرائیویٹ بی اے کر رہی ہے۔" اس کے جواب پر دونوں ماں بیٹے کے چہرے پر پھیلنے والے حیرت کے رنگ بہت واضح تھے، اس لیے وہ مسکراتے ہوئے بولی تھی۔

"میں جانتی ہوں کہ اس کی شکل مجھ سے نہیں ملتی، میری دونوں چھوٹی بہنیں میری والدہ پر ہیں۔ وہ بہت خوب صورت خاتون تھیں جبکہ میری رنگت اور نقوش ابا سے ملتے ہیں۔" اس کے تفصیلی جواب پر وہ دونوں بے ساختہ مسکرائے تھے جبکہ وہ اب سادگی سے کہہ رہی تھی۔

"میرے ابا کو شاید آپ نے دیکھا ہو گا، شیخ جی کے نام سے انہوں نے اسٹیج کی دنیا پر پورے تیس سال کام کیا ہے۔"

دونوں نے بے ساختہ گردن موڑ کر سوئے ہوئے جمیل صاحب کو دیکھا۔ بیماری نے انہیں اس قدر لاغر اور کمزور کر دیا تھا کہ پہلی نظر میں کوئی ان کو پہچان ہی نہیں سکتا تھا۔

"اوہ! بہت افسوس ہوا" ان کی بیماری کا سن کر اور میں تو حقیقتاً انہیں پہچان نہیں پائی حالانکہ ان کے تین ڈرامے میں نے دیکھ رکھے ہیں۔ اللہ ان کو صحت کاملہ دے۔" وہ انتہائی محبت سے کہہ رہی تھیں۔ عانیہ فوراً سے دیکھ بھی [illegible] اس کے چہرے پر تاثر ڈھونڈنے میں ناکام رہی تھی جو اکثر لوگوں کے چہروں پر ان کے ذکر سے پھیلتا تھا۔

"انہوں نے اسٹیج کی بہت خدمت کی ہے لیکن افسوس کہ ہمارے ہاں لوگ خدمات کا اعتراف زبانی تک نہیں کرتے اور زیادہ تر اسٹیج کے اداکار انتہائی کسمپرسی کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور بعض لوگوں نے تو اپنی زندگی کے آخری ایام بہت دردناک انداز میں گزارے ہیں۔" رضا بھی افسردگی سے کہہ رہا تھا۔

"بس کیا کیا جائے یہ ہمارے معاشرے کی ٹریجڈی ہے۔" عانیہ بھی افسردہ ہوئی لیکن عالیہ بیگم نے دانستہ موضوع تبدیل کر دیا تھا۔ "بیٹا! آپ کی دوسری بہن کیا کرتی ہیں، شادی شدہ ہیں یا۔۔۔؟" انہوں نے بات ادھوری چھوڑی تو ایک تاریک سا سایہ عانیہ کے چہرے پر دوڑا۔۔۔

"میری دوسری بہن شوبز میں ہے۔ آج کل اس کا ایک پرائیویٹ چینل پر ڈرامہ آ رہا ہے شاید آپ نے دیکھا ہو۔۔۔"

"کیا نام ہے آپ کی بہن کا۔۔۔" رضا نے پوچھا تھا اس کی چھٹی حس الارم بجا رہی تھی۔

"مائرہ شیخ۔۔۔" وہ آرام سے بولی تھی۔
رضا کو ایک دم جھٹکا سا لگا تھا۔ اس نے بے ساختہ گردن موڑ کر بے یقینی سے اسے دیکھا جو یہ "بریکنگ نیوز" سنا کر لاپروائی سے الیکٹرک کیٹل میں چائے بنا رہی تھی۔
"ارے یہ مائرہ شیخ آپ کی بہن ہیں؟" عالیہ بیگم کو سن کر خاصی خوشی ہوئی تھی۔ وہ اس کا ڈرامہ بہت شوق سے دیکھتی تھیں "تب ہی میں کہوں کہ نمرہ کے نقوش کچھ جانے پہچانے سے لگ رہے ہیں۔ دونوں کی شکل خاصی ملتی ہے۔" عالیہ بیگم کی آواز میں خاصا جوش تھا، جسے محسوس کر کے عانیہ مسکرا دی۔
گفتگو کے دوران رضا نے قدرے محتاط انداز سے پوچھا "عانیہ کیا آپ کی سسٹر مائرہ کہیں پے انگ گیسٹ کے طور پر ڈیفنس میں رہتی ہیں؟"
"جی ہاں!" اس نے بغیر کسی لگی لپٹی کے کہا "دراصل میں ابا اس کے شوبز میں آنے کے سخت خلاف تھے اور وہ ہر روز کی بحث سے اکتا کر احتجاجاً علیحدہ رہنے لگی اور ویسے بھی وہ خاصی نفیس طبیعت کی ایک ہے ہمارے علاقے اور گھٹن زدہ فضا سے نفرت ہے۔ بس کبھی کبھار ملنے کے لیے آجاتی ہے۔" عانیہ نے چائے کے کپ پکڑاتے ہوئے صاف گوئی سے بتایا اور اس کی یہی سادگی اور سچائی عالیہ بیگم کو بھا رہی تھی۔
"بس بیٹا! یہ نئی نسل اپنے بزرگوں کے تجربات سے نہیں سیکھتی۔ اپنے ماں باپ کی محنت کی قدر نہیں کرتی۔"
"رضا کے والد چاہتے تھے کہ یہ آرمی جوائن کرے لیکن یہ میڈیا میں آگیا۔" وہ انتہائی محبت بھرے انداز سے بتا رہی تھیں۔ "لیکن مجھے ذاتی طور پر یہ قطعاً پسند نہیں کہ اولاد کو اپنی مرضی سے چلایا جائے، تجربے کرنے دو انہیں، ٹھوکر لگے گی تو خود سنبھل جائیں گے۔"
عانیہ نے مسکرا کر اس مہربان سی عورت کو دیکھا، جن کی آنکھوں اور ہر انداز سے محبت اور چاہت چھلک رہی تھی جبکہ رضا اپنی ماں کی باتوں پر صرف مسکرا رہا تھا۔ اسی لمحے دروازہ دھڑام سے کھلا اور نمرہ اندر داخل ہوئی۔ اندر کا منظر دیکھ کر نہ صرف اس کی آنکھیں بلکہ منہ بھی بے یقینی اور حیرت سے کھلا رہ گیا۔
"السلام علیکم!" اس نے گڑبڑا کر سلام کیا۔
"ماشاء اللہ، جگ جگ جیو، آؤ ناں، دروازے میں کیوں کھڑی ہو، آپ بھی سوچتی ہوں گی کہ یہ ماں اور بیٹا تو جان ہی نہیں چھوڑ رہے۔"
وہ مسکراتے انداز سے پھر گویا ہوئیں "اور اب تو یہ جان ساری زندگی نہیں چھوٹے گی۔"
عالیہ بیگم کی ذومعنی بات پر عانیہ نے چونک کر پہلے انہیں اور پھر رضا کو دیکھا، جس کی آنکھوں میں نمرہ کو دیکھتے ہوئے سو واٹ کے بلب جگمگا رہے تھے۔ عانیہ کو پہلی دفعہ احساس ہوا کہ معاملہ اتنا سادہ نہیں ہے۔

✿ ✿ ✿

وہ توپ کے گولے کی طرح ایک دھماکے کی مانند دروازہ کھول کر رضا کے آفس میں داخل ہوا تھا۔ لیپ ٹاپ پر کام کرتے رضا نے سخت حیرت سے ارحم کو دیکھا، جس کی آنکھوں میں شدید غصہ اور اشتعال بھرا تھا، بھینچی ہوئی مٹھیوں اور سرخ چہرے کے ساتھ وہ ضبط کی انتہاؤں پر تھا۔
"تم نے نیوز سنی؟ دیکھا ناں وہ الو کی پٹھی مجھ سے جھوٹ بول رہی ہے۔" کمرے میں آتے ہی وہ بولا نہیں بلکہ دھاڑا تھا۔ رضا نے نا سمجھی کے عالم میں اسے دیکھا، جو صوفے پر غصے سے بیٹھا بار بار پہلو بدل رہا تھا۔
"کس الو کی پٹھی نے؟" وہ حقیقتاً نہیں سمجھا تھا۔
"وہی مائرہ شیخ۔۔۔" اس کے بھڑک کر بولنے پر وہ بری طرح چونکا اور لاشعوری طور پر لیپ ٹاپ بند کیا۔ اس کے سارے حواس سرعت سے جاگے تھے۔
"کیوں کیا ہوا؟" اس نے سنبھل کر پوچھا۔
"ہونا کیا ہے، اس گھٹیا لڑکی سے میں نے پچھلے ہفتے پوچھا تھا کہ تمہارے والد کہاں ہوتے ہیں، مجھے انتہائی معصوم انداز سے بتانے لگی کہ ان کا انتقال ہو چکا ہے اور وہ صرف تین بہنیں ہیں لیکن رات وہ جو شیخ کے تھرڈ کلاس سے ایکٹر شیخ جی کا انتقال ہوا تو اس پر نیوز میں چھوٹی سی ڈاکومنٹری فلم دکھا رہے تھے، جس میں انہوں نے خصوصی طور پر مائرہ شیخ کا ذکر کیا۔ اندازہ کرو، سارا عالم جانتا تھا اور میں ہی اس کے ہاتھوں الو بنا ہوا تھا، دیکھو کتنی دھوکا باز لڑکی ہے۔" ارحم کو سخت صدمہ ہوا تھا۔
"اوہ سو سیڈ! کب انتقال ہوا ان کا؟" رضا کو حقیقتاً رنج کی کیفیت نے گھیر لیا تھا۔ ابھی پچھلے ہفتے تو وہ ان کو دیکھ کر آیا تھا، تب بھی ان کی حالت خاصی خراب تھی اور اس نے دانستہ ارحم کو نہیں بتایا تھا کہ اس کا پروپوزل عانیہ جمیل کی فیملی نے قبول کر لیا ہے۔
"رات سوا گیارہ بجے ان کی ڈیتھ ہوئی ہے، جنازہ آج ہے۔" وہ انتہائی بگڑے تیوروں کے ساتھ بتا رہا تھا۔
"یہ تو بہت افسوس ناک بات ہے۔" رضا نے تاسف بھرے لہجے میں کہا، لیکن وہ تو اپنے ہی غم میں الجھا ہوا تھا۔
"مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا کہ وہ اس شیخ جی کی بیٹی ہے اس بھانڈ، میراثی کی۔" وہ تنفر بھرے انداز سے کہہ رہا تھا۔
"ارحم پلیز! کسی مرے ہوئے شخص کے بارے میں ایسے الفاظ استعمال نہ کرو۔" رضا کے لہجے میں اس قدر قطعیت اور سختی تھی کہ ارحم جیسا بدلحاظ شخص بھی ایک لمحے کو خاموش رہ گیا۔
"اور جہاں تک بھانڈ اور میراثی ہونے کی بات ہے تو ان کا تعلق بھی شوبز سے تھا اور ہمارا تعلق بھی شوبز سے ہے۔ اس لحاظ سے ہم بھی بھانڈ اور میراثی ہوئے۔" رضا کے دو ٹوک انداز پر ارحم نے شاکی نظروں سے اسے دیکھا۔
"تم اپنے آپ کو اور مجھے ان تھرڈ کلاس ایکٹرز کے ساتھ ملا رہے ہو جو چیپ قسم کے مذاق کر کے لوگوں کا دل بہلاتے ہیں۔"
"تو ان ایکٹرز کو چیپ قسم کے جملے کون لکھ کر دیتا ہے؟ ہم لوگ ہی لکھ کر دیتے ہیں ناں؟" وہ حد درجہ جھنجھلا رہا تھا۔
"اور جہاں تک بات مائرہ شیخ کی ہے تو اس نے اپنے والد کے بارے میں چھپا کر غلط کیا لیکن شاید اس میں بھی ہمارا قصور ہے، اسے ہم جیسے لوگوں کی ذہنیت کا سامنا رہتا ہو گا تب ہی تو اس نے جیتے جاگتے شخص کو مار دیا۔ ہم لوگ انہی اداکاروں کے ڈرامے بہت شوق سے دیکھنے جاتے ہیں، انجوائے کرتے ہیں اور بعد میں انہیں بھانڈ اور میراثی کہہ کر ان کا تمسخر اڑاتے ہیں۔ ہم خود ایک بیمار قوم ہیں۔" وہ ارحم کی پیشانی پر لحظہ بہ لحظہ بڑھتی شکنوں کی پروا کیے بغیر بلا جھجک بول رہا تھا۔
"اور یہ جو عانیہ جمیل ہے، جس کے لفظوں کے پیچھے ہم پاگلوں کی طرح بھاگتے ہیں، جس کے دماغ کو ہم اپنے چینل کی ریٹنگ بڑھانے کے لیے استعمال کرنا چاہ رہے تھے، وہ بھی اسی شخص کی بیٹی ہے اور بڑے فخر سے اپنے باپ کا تعارف کرواتی ہے۔ اس کے باپ نے اپنی زندگی کے قیمتی تیس سال اسٹیج کے پودے کی آبیاری کرنے میں لگائے ہیں۔ اس شخص نے اپنی بیٹیوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کیا، ان کو شعور دیا، تم خود اس بات کو مانتے ہو کہ مائرہ شیخ عام لڑکیوں سے بہت مختلف ہے اور تم اس کے باپ کو بھانڈ اور میراثی کہہ کر مذاق اڑا رہے ہو۔" وہ مضبوط لہجے میں بول رہا تھا۔ کئی لمحوں تک تو ارحم کچھ بول ہی نہیں سکا تھا۔
"آئی ایم سوری! میں تمہیں بتا نہیں سکا تھا عانیہ اور مائرہ کی چھوٹی بہن نمرہ کے ساتھ میرا رشتہ ماما نے فائنل کر دیا ہے اور میری پسند اور خواہش اس میں شامل ہے۔"
"کیا!" ارحم کا منہ بے یقینی سے کھلا رہ گیا۔ اسے حقیقتاً شاک لگا تھا۔ اس کے چہرے پر انتہائی صدمے کی کیفیت لکھی صاف پڑھی جا رہی تھی۔ اس کے سر پر تو گویا پہاڑ ٹوٹا تھا۔ وہ گنگ رہ گیا تھا۔
"ابھی ایک ہفتہ پہلے فارن منسٹری کی ایک پوسٹ پر

کام کرنے والے عبدالمعید کے بیٹے عبدالباری کے ساتھ عانیہ جمیل کا نکاح اس کے والد کی خواہش اور بیماری کی وجہ سے اچانک کرنا پڑا' ہم لوگ بھی انوائیٹڈ تھے اور وہیں ماما نے نمرہ کے لیے میری بات کرلی۔" وہ اسے تفصیل بتا رہا تھا جبکہ ارحم کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ صاف گوئی سے بولا تھا۔

"آئی ایم سوری رضا! یہ تمہارا ہی حوصلہ ہے ورنہ میرا ظرف اتنا بڑا نہیں' میں کسی اسٹیج ایکٹر کی بیٹی کے ساتھ کسی بھی قسم کا تعلق نہیں رکھ سکتا۔ بہرحال تمہیں بہت بہت مبارک ہو۔"

وہ بمشکل بولا تھا' جبکہ رضا نے تاسف بھری نظروں سے اسے دیکھا' جو کبھی نہیں بدل سکتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کے دل پر مہر لگی ہوئی تھی لیکن وہ اتنا جانتا تھا کہ اس کا اپنا آسمان بے حد چمکدار اور روشن تھا۔

☆ ☆ ☆

کسی ڈراؤنے خواب کے زیر اثر مائرہ کی آنکھ کھلی تھی۔

اپنے تیز تیز دھڑکتے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے بازو کی پشت سے ماتھے پر آیا پسینہ صاف کیا اور بمشکل اٹھ کر لائٹ جلائی' کمرے میں سو واٹ کا بلب جلا لیکن اندر کی تیرگی ویسے ہی قائم تھی۔۔۔ بلب کی روشنی میں فلیٹ کی خستگی اور نمایاں ہو رہی تھی۔

اس نے چھت کے گارڈر پر نظریں جمائے اپنی زندگی کی ڈائری ذہن میں کھولی۔ ہر طرف یادوں کی کرچیاں تھیں' جو دل و دماغ میں بیٹھے پچھتاوے کو تقویت دے رہی تھیں۔ اس کے اعصاب شل ہو چکے تھے۔ وہ فلیٹ میں تنہا تھی اور تنہائی اور پچھتاوے کے ناگ اسے دن رات ڈستے تھے۔ وہ جب پیدا ہوئی تو ابا نے اس کا نام رانی رکھا تھا۔ اس کی عادات بھی بہت شاہانہ تھیں اور وہ ابا کی حد درجہ لاڈلی بیٹی تھی اور اس لاڈ میں اس نے ہمیشہ اپنی منوائی اور اکثر اس کا ناجائز فائدہ بھی بہت دھڑلے سے اٹھایا۔

وہ بچپن سے ہی بہت خود غرض تھی اور ہمیشہ اپنی ذات کے بارے میں سوچتی۔ اس کو ابا نے شہر کے سب سے بہترین اسکول میں تعلیم دلوائی اور جیسے جیسے وہ بڑھتی گئی' اسے اپنے علاقے' فلیٹ اور ماحول سے چڑ ہوتی گئی۔ وہ ابا سے اکثر لڑتی اور کسی اچھے علاقے میں گھر لینے کی فرمائش کرتی جو کہ ان کے لیے ممکن نہیں تھا کیونکہ ان کے محدود معاشی ذرائع تھے۔

اسے ابا کے پروفیشن سے نفرت تھی اور وہ اکثر اپنی کلاس فیلوز کو ان کے بارے میں غلط بتاتی۔ اسے حد درجہ تذلیل کا احساس ہوتا اگر اسے کوئی اسٹیج ایکٹر کی بیٹی کے حوالے سے مخاطب کرتا۔ اسے ابا کا حوالہ سخت ناپسند تھا اور یہی وجہ تھی کہ جب اس کے ایک کلاس فیلو نے اسے شوبز جوائن کرنے کا مشورہ دیا تو اس نے ابا کی مخالفت کی وجہ سے [illegible] چھوڑ دیا اور [illegible] میں [illegible] وہ ایک ٹاپ [illegible] اور [illegible] چاہتی تھی۔ اپنی ذات کی شناخت کے سفر میں وہ سب [illegible] چھوڑ [illegible] تھی۔ [illegible] آتی تھی وہ ایک ہی جست میں آسمان کو چھونا چاہتی تھی۔

جن دنوں ابا سخت بیمار تھے' عانیہ نے اسے بار بار فون کیا کہ وہ آکر ابا سے معافی مانگ لے لیکن وہ ہر بار اسے دھتکار دیتی تھی۔ وہ اپنے ماضی سے ہر قیمت پر چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی تھی۔ خواہشات کی دیمک نے اس کے ذہن و دل کو مفلوج کرکے رکھ دیا تھا اور پھر اسے ارحم بخاری مل گیا۔ اس نے سوچا کہ اب زندگی سہل ہو جائے گی مگر وہ جانتی نہیں تھی کہ تقدیر اپنے دامن میں کون سی گھات لیے اس کی منتظر ہے۔

اور پھر ابا مر گئے اور ان کی وفات نے اس کا سارا پانسہ الٹ دیا تھا۔ میڈیا نے اس کے حوالے سے ان کی موت کو خاصی کوریج دی تھی اور اسے ابا کے انتقال کا اتنا دکھ نہیں تھا' جتنا ان کی ذات کے حوالے سے بنی پہچان نے کرب میں مبتلا کر دیا تھا حالانکہ بے شمار لوگوں نے اس سے بہت خلوص دل سے ان کی موت کی تعزیت کی تھی اور ابا کی خدمات کو سراہا تھا لیکن ارحم

نظروں کے انداز نے اسے آسمان سے زمین پر لا پٹخا تھا۔ وہ اپنی ہی نظروں میں بے وقعت ہو گئی تھی اور اسے پہلی دفعہ احساس ہوا تھا کہ اسی باپ کے حوالے سے عانیہ اور نمرہ نے خوب صورت زندگیوں کا آغاز کیا تھا اور وہ ابا کے نام پر فخر کرتی تھیں۔ تیرگی تو اسی کے حصے میں آئی تھی۔

عانیہ اور نمرہ دونوں اپنے گھروں میں بہت آسودہ حال تھیں اور ایک وہی تھی' جس کی زندگی میں اضطراب اور بے چینی نے ڈیرے ڈال لیے تھے۔ اسے ابا کی موت کے بعد احساس ہوا تھا کہ اس کا کتنا بڑا نقصان ہوا ہے۔ ارحم نے بھی انتہائی برے الفاظ میں اسے دھتکار دیا تھا اور اسے ٹھیک طریقے سے اس کی "اوقات" دکھائی دی۔

اور وہ سمجھتی تھی کہ حسن ایک ایسا [illegible] ہے' [illegible] دنیا فتح کر سکتی ہے۔ وہ [illegible] بعد مر [illegible] کرتی تھی۔ آسائشات اور اپنی ذات [illegible] میں اس نے سکون کی دولت [illegible] تھی اور تب اسے احساس ہوا تھا کہ اس کا کتنا بڑا نقصان ہوا ہے۔

ابا اس سے آخری لمحے تک خفا تھے' یہ احساس اسے کہیں بھی سکون نہیں لینے دیتا تھا۔ اس نے شوبز کی دنیا چھوڑ دی تھی۔ عجیب سی بے چین طبیعت بن گئی تھی اس کی' جو اسے ہر لمحہ مضطرب رکھتی تھی۔ [illegible] اور عبدالباری اپنے ایک بیٹے کے ساتھ بہت خوش و خرم تھے اور اکثر اسے لینے آتے لیکن وہ ہر دفعہ جانے سے انکار کر دیتی۔ اسے اس فلیٹ سے خوشبو آتی تھی ابا کی اور وہ ساری ساری رات ننگے پاؤں ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جاتی لیکن بے چینی کم ہی نہیں ہوتی تھی۔ نمرہ بھی شادی کے بعد رضا کے ساتھ بہت مطمئن تھی اور اب رضا نے ارحم کے ساتھ اپنی پارٹنرشپ ختم کرکے اپنا بزنس شروع کرلیا تھا۔ اس کی دونوں فیکٹریاں بہت اچھا منافع دے رہی تھیں۔

بس ایک وہی سیٹ نہیں تھی۔ اسے رات بھر نیند نہیں آتی تھی۔ آج بھی ایک ڈراؤنے خواب کے زیر اثر اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ حلق بالکل خشک تھا اور کمرے میں حبس اور گرمی کا احساس بڑھ گیا تھا۔ وہ سرعت سے اٹھ بیٹھی اور کمرے کی ساری کھڑکیاں کھول دیں لیکن گرمی کا احساس جوں کا توں تھا۔ وہ ننگے پاؤں' دوپٹے سے بے نیاز دروازہ کھول کر باہر گیلری میں نکل آئی۔

سامنے مندر میں بب کی روشنی میں کالی ماتا کی مورتی سے اسے عجیب سا خوف لاحق ہوا۔ کالی ماتا جو موت کا پیغام تھی۔ اس کو اپنا وجود مردہ لگ رہا تھا۔ تنہا اور خالی ہاتھ۔۔۔ زیست کا یہ سفر اس کو پتا نہیں کب تک اکیلے کاٹنا تھا کیونکہ پچھتاوؤں کے موسم اتنی آسانی سے کہاں گزرتے ہیں۔ اس نے رنجیدگی سے آسمان پر اماوس کے اداس چاند کو دیکھا۔ نیچے تنگ اور بوسیدہ گلی بالکل ویران تھی جیسے وہ تنہا تھی۔۔۔ بالکل تنہا۔۔۔ اور خالی ہاتھ۔

☆

نعیمہ ناز سلطان

”سمیرا کا میاں بے نابت ہی گھٹیا اور کمینہ انسان ہے کیا بتاؤں تمہیں‘ ایسے بھگو بھگو کے جوتے مارتا ہے میری بہن کو‘ ہاتھ سے مارے تو اتنی تکلیف نہیں ہوتی مگر زبان کی مار بڑی بری ہوتی ہے نا۔“

شائستہ بھابھی اپنی دیورانی سے اپنی بہن کا دکھڑا رو رہی تھیں۔

”ہاں یہ تو ہے‘ جسمانی اذیت تو کبھی نہ کبھی ختم ہو جاتی ہے‘ روح کی اذیت زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے۔“ فرح نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔

”کیا کریں‘ دو بچے ہیں۔ کوئی فیصلہ بھی نہیں کر سکتے۔ بس بے چاری صبر کر رہی ہے۔“ انہوں نے ایک گہری سانس لی۔ ”بڑی سیدھی سادی ہے میری بہن۔“

”ہوں۔“ اس بار فرح نے محض ایک ”ہوں“ پر اکتفا کیا۔

وہ سمیرا سے کئی بار مل چکی تھی اپنی زبان اور انداز و اطوار سے وہ کسی بھی طرح سیدھی سادی نہیں تھی۔ ایک طرح سے وہ اپنی بہن شائستہ بھابھی کا ہی پرتو تھی۔

”اچھا بھابھی! میں چلوں۔“ فرح نے اٹھنے کی کوشش کی۔

”بیٹھو جاؤ کیا کرو گی جا کر‘ کھانا تم نے پکا لیا ہے۔ میاں تمہارے دس بجے تک آئیں گے‘ ابھی تھوڑی دیر میں لائٹ جانے والی ہے‘ بے کار نیچے پریشان ہو گی گرمی میں۔“ شائستہ بھابھی نے اپنائیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بیٹھنے پر اصرار کیا۔

ٹھیک ہی کہہ رہی تھیں۔ فرح نہ چاہتے ہوئے بھی بیٹھ گئی۔ اسے کل کے لیے اپنے کپڑے پریس کرنے تھے اور لائٹ کا کوئی بھی بھروسا نہیں تھا۔ اب تو اکثر صبح سے رات گئے تک غائب رہتی تھی اس لیے وہ احتیاطاً اپنے اور شوہر کے کپڑے استری کر کر کے رکھ دیتی تھی تاکہ عین وقت پر بجلی کی عدم موجودگی کی وجہ سے پریشانی نہ ہو مگر اس وقت تو شائستہ بھابھی اسے بٹھانے پر مصر تھیں۔

”بجلی والوں نے کتنا پریشان کر رکھا ہے‘ ہے نا؟“ شائستہ بھابھی نے اپنا سلسلہ کلام دوبارہ شروع کیا۔

”بجلی والے ہی کیا‘ جس کا جتنا بس چلتا ہے‘ اس نے دوسرے کو پریشان کر رکھا ہے۔“ فرح نے ان کی بات کے جواب میں کہا۔

”[illegible] دیکھو ذرا‘ اتنے [illegible] بجلی [illegible] ہے پھر بھی ہزاروں میں بل آتا ہے۔ اب تو ڈنڈا لگانے [illegible] نہیں رہا۔“

”اگر کوئی فائدہ نہیں ہے تو ڈنڈا نہ لگائیں‘ کوئی ضروری تو نہیں۔“ فرح نے محتاط انداز میں اظہار خیال کیا۔

”سب ہی لوگ چوری کی بجلی استعمال کر رہے ہیں۔ ہم نے لگا لیا تو کیا ہوا۔“ شائستہ بھابھی نے کئی بار کی [illegible] دہرایا۔

”کوئی کچھ بھی کرے‘ سب کو اپنی اپنی قبر میں اکیلے ہی جانا ہے۔“

”اے ہائے‘ بھئی! یہ موت اور قبر کی باتیں نہ کیا کرو‘ مجھے تو بڑا ہی خوف آتا ہے سن کر۔“ شائستہ بھابھی نے دہل کر کہا۔

”یہ تو اٹل حقیقت ہے بھابھی!“

”ہاں ہے تو‘ بس بڑھاپے میں اللہ اللہ کر کے اپنے گناہ بخشوائیں گے۔“ شائستہ بھابھی نے کچھ سوچ کر اس کی بات سے اتفاق کیا۔

”کون جانے‘ کسے بڑھاپا دیکھنا نصیب ہو‘ کسے نہ ہو‘

توبہ کی توفیق ہو نہ ہو۔“ فرح کو ان کی باتوں پر بہت حیرت ہوتی تھی۔

”اپنے بھائی کا بتایا تھا میں نے تمہیں؟“ انہوں نے نیا موضوع چھیڑا۔ ایک تو ان کے رازدار اتنے سارے تھے کہ وہ بھول جاتی تھیں کہ کس کو کیا بات بتا چکی ہیں اور کیا بتانے سے رہ گئی ہے۔

”کیا؟ کچھ ذکر تو کیا تھا کہ معاملہ سنگین ہو گیا ہے۔“ فرح نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

”فیصلہ ہو گیا نا اس کا‘ طلاق دے دی‘ بھئی جب وہ خود ہی رہنے پر راضی نہیں تو کوئی کیا کر سکتا ہے‘ بچے وچے تو ہیں نہیں ہم نے بھی کہا کہ چھوڑو‘ طلاق دے کر جان چھڑاؤ۔“ وہ اپنے مخصوص تیز تیز لہجے میں بول رہی تھیں۔

”بہت افسوس ہوا سن کر۔“ فرح کو واقعی دکھ ہوا [illegible] کی شادی [illegible] بہت افسردہ ہو جاتی تھی۔ [illegible] کام پر [illegible] باپ جب [illegible] پر ایک [illegible] انسان [illegible] رنجیدہ نہ ہو۔

”افسوس کیسا‘ اچھا ہے جان چھوٹ گئی ہماری۔ خس کم جہاں پاک‘ سامان بھی چلا گیا ان کی چیزیں ان کو واپس کر دیں‘ اپنا سامان ہم نے سب رکھ لیا۔ شکر ہے زیور میرے بھائی کے قبضے میں ہی تھا‘ جو ہم نے چڑھایا تھا وہ واپس رکھ لیا‘ ان کا زیور ان کو دے دیا‘ ان کی کوئی چیز ہم نے نہیں رکھی۔“

شائستہ بھابھی اپنی رو میں بولے چلی جا رہی تھیں۔

”مگر بھابھی! یہ تو غلط ہے۔“ فرح نے مضطرب ہو کر ان کی بات کاٹی۔

”کیا؟“ وہ چونکیں۔

”اللہ کا حکم تو یہ ہی ہے کہ اگر خدانخواستہ نوبت طلاق تک آ جائے تو بیوی کو جو کچھ دیا ہے وہ واپس نہیں لینا چاہیے۔ سورۃ البقرہ اور سورۃ النساء دونوں میں واضح احکام ہیں کہ طلاق کی صورت میں جو کچھ بیوی کو دیا ہے‘ وہ واپس لینا ٹھیک نہیں اور ایک حدیث کے مطابق یہ ایسا ہی ہے کہ کوئی قے کرے پھر اسے چاٹ لے۔“ فرح نے قرآن اور حدیث دونوں کا حوالہ دیا۔
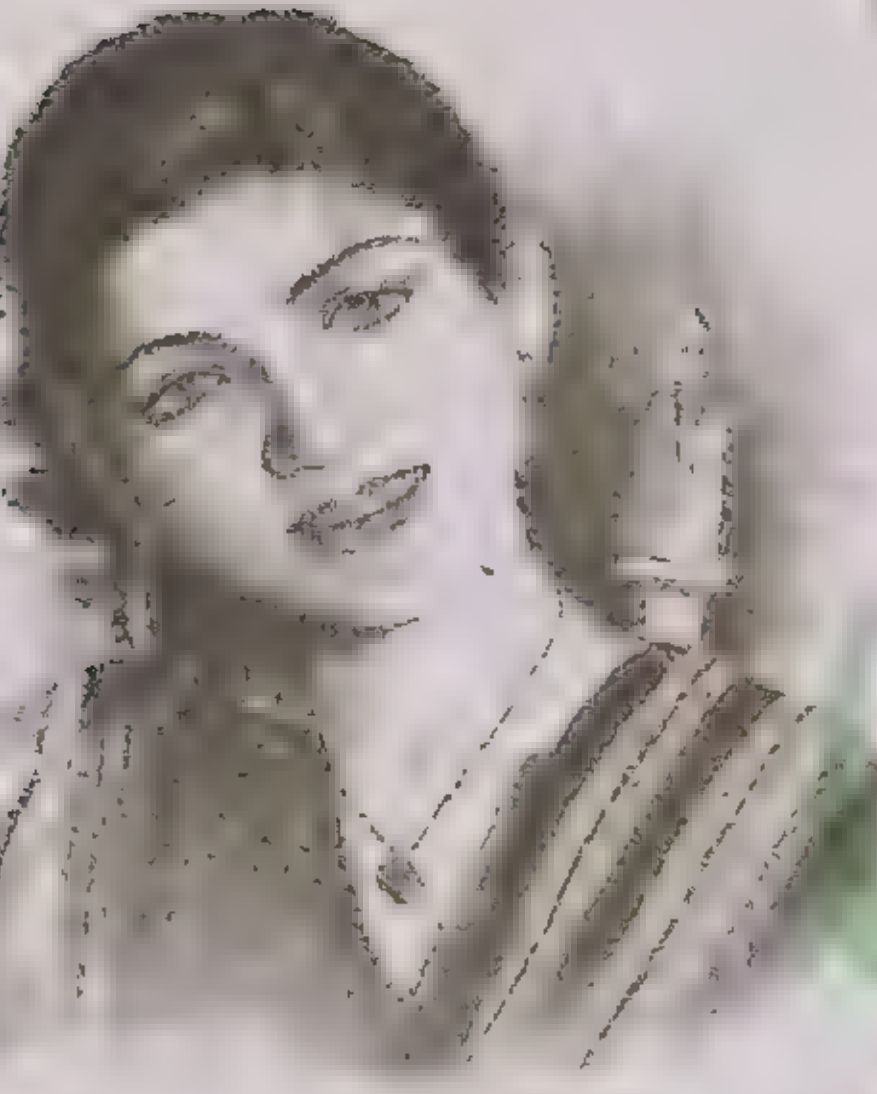
”بھئی اب ہم کوئی مولوی تھوڑی ہیں‘ ہمیں یہ سب کیا پتا‘ جو دنیا کا دستور ہے وہی کیا۔“ شائستہ بھابھی گڑبڑا کر بولیں۔

”پھر بھی بھابھی! ہمارے معاملات کی رہنمائی کے لیے ہمارے پاس قرآن اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے۔ دنیاوی طور طریقوں کا کیا ہے‘ کہیں کی اینٹ‘ کہیں کا روڑا‘ بھان متی نے کنبہ جوڑا۔ ہمارے زیادہ تر رسم و رواج اور طور طریقے دوسرے مذاہب اور اقوام کے ہیں ہم آنکھیں بند کر کے اندھا دھند ان پر عمل کر رہے ہیں‘ وہ بھی بڑے خضوع و خشوع سے۔“ فرح نے تفصیلی بات کی۔

”اے ہائے بہن! سونا اتنا مہنگا ہو رہا ہے‘ پورے چھ تولے سونا چڑھایا تھا اور چھوٹی موٹی سلامی کی چیزیں الگ‘ ایسے کیسے واپس دے دیتے‘ ہمارا تو لاکھوں کا نقصان ہو جاتا۔“ شائستہ بھابھی نے چمک کر جواب دیا۔

”شکر ہے حق مہر شرعی رکھوایا تھا‘ بتیس روپے آٹھ آنے اس کے منہ پہ مار دیے۔“ وہ فرح کے کچھ

کہنے سے قبل دوبارہ بول پڑیں۔
"پتا نہیں یہ بتیس روپے آٹھ آنے کی شریعت کس نے نکالی ہے۔ حق مہر تو اپنی حیثیت اور استطاعت کے مطابق رکھنے کا حکم ہے' جتنا مرد ادا کرسکے۔ ہاں یہ ہے کم ہو اور حق مہر کی فوری ادائیگی ہو، یہی پسندیدہ ہے۔" فرح کا مطالعہ کافی گہرا اور وسیع تھا' خاص طور پر قرآن ترجمہ اور تفسیر سے پڑھنے اور سمجھ کر عمل کرنے کی عادی تھی۔
"ہم تو بھئی یہی سنتے آئے ہیں کہ شرعی حق مہر یہی ہے' بتیس روپے آٹھ آنے۔"
وہ فرح کی باتوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے لاپروائی سے گویا ہوئیں "اور مہر دیتا کون ہے، ہمارے میاں نے خود پہلی رات ہم سے معاف کروالیا تھا۔"
"ہم لوگوں نے بھی بہت سے معاملات میں اپنی مرضی کی شریعتیں گھڑ رکھی ہیں۔" فرح نے ایک عمومی تبصرہ کیا۔
"چھوڑو نا' تم بھی کیا باتیں لے کر بیٹھ گئیں' یہ بتاؤ۔" وہ بے زاری سے [illegible] "[illegible] کے سوٹ نہیں بناؤ گی۔ بازار چلنا میرے ساتھ۔ بڑے اچھے اچھے پرنٹ آئے ہوئے ہیں۔"
"قیمتیں بھی تو بہت اچھی اچھی ہیں۔" فرح بے بسی سے مسکرادی۔
"ہاں...." ان کے منہ سے فقط یہی لفظ نکلا تھا کہ
"چلو' ٹائم ہو گیا ان کے جانے کا۔" شائستہ بھابھی اٹھ کر جنریٹر آن کرنے لگیں۔
"ٹھیک کہہ رہی ہو' اب یہی دیکھ لو' بڑی مشکل سے ایک ہزار کا دیا ہے اور کپڑا بھی کوئی خاص نہیں ہے۔" واپس آکر سلسلہ کلام دوبارہ وہیں سے جوڑا۔
"پتا نہیں مہنگائی کی وجہ ہے یا ہمارے معاملات سے برکت ختم ہوگئی ہے۔ پیسہ جاتا ہوا نظر آتا ہے چیز آتی ہوئی نظر نہیں آتی۔ نہ وہ کوالٹی ہے جو پہلے کبھی ہوا کرتی تھی۔"
"مہنگائی بہت ہوگئی ہے۔ اب ہمیں ہی دیکھ لو' ہم تین افراد تو ہیں' ایک بیٹا اور ہم دو میاں بیوی' اچھی خاصی تنخواہ ہے ان کی تھوڑی بہت اوپر کی آمدنی بھی ہو جاتی ہے' پھر بھی گزارا نہیں ہوتا۔ میرا اور ان کا انہی پیسوں پر ہی جھگڑا ہوتا ہے۔" شائستہ بھابھی بتاتے بتاتے ہنسنے لگیں۔
"میری تو سمجھ میں نہیں آتا۔ تم دونوں آگے کیا کرو گے' ابھی تو چلو دو ہو' اب کچھ ماہ بعد تین ہو جاؤ گے' بچوں کے خرچے بہت ہوتے ہیں۔ شوہر تمہارا پکا مولوی ہے۔ حرام' حلال کے چکر میں پڑا رہتا ہے۔ اسے سمجھایا کرو' خالی خولی تنخواہ میں گزارا کب تک کرے گا۔ اس کی تو سیٹ بھی اتنی اچھی ہے' اچھی خاصی اوپر کی آمدنی ہو سکتی ہے۔" شائستہ بھابھی بڑی فکر سے اسے سمجھا رہی تھیں۔
"آپ پریشان نہ ہوں بھابھی! اللہ کا شکر ہے' ہمارا گزارا بہت اچھی طرح ہو رہا ہے۔ ابھی بھی ہمارا رازق اللہ ہے۔ تب بھی ہمارا رزق وہی دے گا۔ ہمیں کوئی فکر نہیں۔" فرح بولتے بولتے سنجیدہ ہوگئی۔
"اچھا بھئی' ہم تو تمہاری خیر خواہی میں بول رہے تھے' جیسے بھی تم خوش رہو' تمہاری مرضی۔" شائستہ بھابھی کھسیانی ہو گئیں۔
"کیا پکایا ہے آپ نے؟" فرح نے موضوع بدلا۔
"چکن رکھی ہے دوپہر کی' ملکہ مسور پکائی ہے ابھی تھوڑے سے چاول بگھار لوں گی۔ یہ کب سے کہہ رہے تھے' دال چاول کھانے کے لیے' معاذ نخرے کرتا ہے' اس کے لیے گوشت کی کوئی نہ کوئی ڈش بنانا پڑتی ہے۔" انہوں نے تفصیل سے بتایا۔
"اچھا!" فرح نے سر ہلایا۔
"بڑا غلط ٹائم رکھا ہے اس وقت لائٹ جانے کا۔" فرح بھابھی نے گھڑی دیکھتے ہوئے تاسف سے کہا۔
"ڈرامہ نکل رہا ہے آپ کا؟" فرح سمجھ گئی۔
"ہاں نا' اتنا اچھا ڈرامہ آتا ہے اس وقت مگر لائٹ ہی نہیں ہوتی' رات کے ڈیڑھ بجے دیکھنا پڑتا ہے' صبح اتنی زبردست نیند آتی ہے کیا بتاؤں' مگر مجبوری ہے' اٹھنا پڑتا ہے' دونوں باپ بیٹا چھ بجے اٹھ کر بیٹھ جاتے ہیں

اٹھنے کے لیے شور مچانا شروع کر دیتے ہیں۔"
"جلدی سو جایا کریں تاکہ صبح اٹھنے میں پریشانی نہ ہو۔" فرح نے مشورہ دیا۔
"رات میں ڈرامے آتے ہیں نا' جو دن میں نہیں دیکھ پاتی' وہ رات میں دیکھتی ہوں۔ کم بخت سارے ہی اتنے اچھے ہیں' کون سا چھوڑوں۔"
"کوئی ایک آدھ چھوڑ دیا کریں۔" فرح ہنسنے لگی۔ اس کے علم کے مطابق وہ دو تین چینلز کے تقریباً چھ سات ڈرامے تو ضرور ہی دیکھتی تھیں۔
"یہ بھی ایک نشہ ہے۔ ایک بار شروع کر دو تو چھوڑنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔"
"ٹھیک کہہ رہی ہیں' ہماری آدھی سے زیادہ قوم اس نشے کی عادی ہو گئی ہے۔" فرح نے ایک گہری سانس لی۔
"سمیعہ آئی تھی تمہارے پاس؟" انہیں کچھ یاد آیا۔
"جی' دوپہر میں آئی تھی' کل قرآن خوانی ہے نا ان کے گھر۔" فرح نے جواب دیا۔
"ہاں' تمہیں دعوت دے دی؟" شائستہ بھابھی کا انداز سوالیہ تھا۔
"جی؟" فرح نے مختصر جواب پر اکتفا کیا۔
"اچھا' دراصل میرے پاس وہ صبح آئی تھی قرآن خوانی کا کہنے' پھر فوراً ہی چلی بھی گئی' کہہ رہی تھی کہ بازار جا رہی ہوں' فرح بھابھی کو شام میں کہہ دوں گی۔ میں نے سوچا' جانے تمہیں بلانے کا ارادہ ہے بھی یا نہیں' پھر مجھے یہ بھی خیال آیا کہ جب وہ جٹھانی کو بلا رہی ہے تو دیورانی کو کیوں نہیں بلائے گی' ہے نا۔" شائستہ بھابھی خود ہی سارا تجزیہ کر کے مطمئن ہو گئیں۔
فرح کیا کہتی' مسکرا کر خاموش ہو گئی۔
"جاؤ گی؟" انہوں نے سوال کیا۔
"ان شاء اللہ تعالیٰ۔"
"ویسے یہ لوگ خود تو کسی کے گھر جاتی نہیں ہیں۔ میں نے ارسل کی سالگرہ میں بلایا تو کوئی بھی نہیں آیا۔" شائستہ بھابھی نے پھر اظہار خیال کیا۔
"ان دنوں غالباً ان کے اپنے خاندان میں شادی کی تقریبات چل رہی تھیں' آپ نے ہی تو بتایا تھا کہ وہ بعد میں آئی تھیں۔" فرح نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔
"ہاں آئی تھیں تین دن بعد' دو سو روپے کا لفافہ پکڑا کر چلی گئیں' میں نے تو ان کی بیٹی کی شادی میں پورے پانچ سو روپے دیے تھے۔ اب میرے گھر کی خوشی میں زیادہ نہیں دیتیں تو کم سے کم وہی لوٹا دیتیں جو میں نے دیے تھے۔" شائستہ بھابھی کو اصل رنج اس بات کا تھا' فرح کی سمجھ میں اب آیا۔
"خیر میرا تو فی الحال کوئی ارادہ نہیں ہے جانے کا' میں نے تو سوچا ہے کہ گھر پر ہی دو سپارے پڑھ دوں گی' تمہیں نمبر بتا دوں گی' تم جاؤ تو میری طرف سے بتا دینا۔" انہوں نے اپنا پروگرام بتایا۔
"اچھا!" فرح نے ایک گہری سانس لی۔ اللہ کے کلام کا پڑھنا بھی دنیاوی تعلقات کے جوڑ توڑ کی نذر ہو رہا تھا' اس سے بڑی بدنصیبی اور کیا ہوگی۔
دوسرے دن وہ سمیعہ کے گھر جانے کے لیے تیار ہوئی تو سیڑھیاں اترتے ہوئے فرح نے سوچا کہ بھابھی سے بھی پوچھ لیتی ہوں۔
"کیا پتا ان کا ارادہ بدل گیا ہو۔" اس نے دوپٹہ ٹھیک کرتے ہوئے سوچا اور مین گیٹ کی طرف مڑنے کے بجائے اندر کا دروازہ کھول کر لاؤنج میں داخل ہوگئی۔
شائستہ بھابھی سامنے ہی صوفے پر براجمان ٹی وی دیکھنے میں محو تھیں۔
"جا رہی ہو سمیعہ کے ہاں؟" انہوں نے ریموٹ اٹھا کر آواز دھیمی کی۔
"آپ سے پوچھنے آئی تھی' چل رہی ہیں؟"
"میں نے کل بتایا تو تھا نہیں' تم آخر کے دو سپارے نکلوا دینا' میں نے پڑھ لیے ہیں' ٹھیک ہے!"
"آپ بھی چلتیں تو اچھا تھا' سمیعہ بھابھی خود آکر دعوت دے گئی تھیں' یہ ان کا حق ہے کہ ان کی دعوت ہم قبول کریں۔" فرح نے انہیں آمادہ کرنے کی

کوشش کی۔

"چلو' پھر کبھی سہی' ویسے بھی میں اب جا کر کیا کروں گی' اب تو میں نے ان کے سپارے بھی پڑھ دیے ہیں۔" شائستہ بھابھی نے عذر تراشا۔

"اچھا' پھر میں چلتی ہوں' آپ گیٹ بند کرلیں۔"

"ہاں ہاں تم جاؤ' میں بند کرلوں گی۔" انہوں نے ٹی وی پر سے نظریں ہٹائے بغیر سرہلا دیا۔

"شائستہ بھابھی نہیں آئیں؟" سمیعہ نے اسے اکیلے آتے دیکھا تو فوراً پوچھا۔ وہ فرح ایک دم گڑبڑا گئی۔ "وہ ذرا مصروف ہیں' کسی کام میں لگی رہی تھیں کہ آنا مشکل ہے' ویسے انہوں نے آخر کے دو سپارے پڑھ دیے ہیں' آپ نکال دیجیے گا۔" فرح نے بات بنائی۔

"ٹی وی دیکھنے میں مصروف ہوں گی' اس وقت پورے ہفتے کی قسطیں اکٹھی آتی ہیں۔ ہم سے پوچھو' ہم تو ان کی رگ رگ سے واقف ہیں۔"

سامنے والوں کی فائزہ نے سپارہ پڑھنے کے دوران طنزیہ لب ولہجہ اختیار کیا' ان کی اور شائستہ بھابھی کی ذرا کم ہی بنتی تھی۔ بچوں کے جھگڑے بڑوں تک پہنچ جاتے تھے۔

"تو بھئی' یہ اچھی آئیں ڈراموں کی شوقین' ہم بھی تو سب کام چھوڑ چھاڑ کر اللہ کا کلام پڑھنے آئے ہیں۔ میرے تو اتنا شدید درد ہو رہا تھا سر میں' پھر بھی ہمت کر کے آئی۔ لوگوں کے دلوں کو پتا نہیں کیا ہو گیا ہے' اتنی مبارک محفلیں چھوڑ کر ٹی وی کے آگے بیٹھے رہتے ہیں' ہم سے تو ایسی بے حسی نہیں دکھائی جاتی۔" فریدہ آنٹی نے بھی اپنی خود ساختہ نیکی کا ڈھول جملہ حاضرین کے سامنے پیٹا۔

"ہماری بہو کون سی کم ہے' وہ بھی نیند کے مزے لے رہی ہے' مجھے صبح ہی منع کر دیا تھا کہ میں نہیں جاؤں گی' میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" کالے گیٹ والی ریحانہ خالہ نے بھی بول کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔

"عمیرہ بھی نہیں آئی ابھی تک؟" فیروزہ بھابھی نے سوال اٹھایا۔

"وہ تو رات سے اپنے گھر گئی ہوئی ہے۔" فائزہ نے پڑھنا روک کر اطلاع دی۔

"ہائیں کیا پھر جھگڑا کر لیا ساس سے؟" ریحانہ خالہ نے چونک کر فائزہ کو دیکھا۔

"ساس سے نہیں' شوہر سے' بڑا زبردست جھگڑا ہوا ہے' ہمارے گھر میں تو ساری آوازیں آرہی تھیں' ساس بھی بول رہی تھیں' شوہر بھی۔ دونوں سے اکیلے ہی مقابلہ کر رہی تھی۔ سسر کی من من کسی نے سنی ہی نہیں سارے بچوں کو بھی ساتھ لے گئی اپنے میکے۔" فائزہ نے ایک ہی سانس میں ساری اطلاع فراہم کی۔

"خود ہی آجائے گی واپس' پانچ بچوں کے ساتھ میکے والے کتنے دن رکھیں گے۔" شاہدہ بھابھی نے صبر نہیں ہوا تو وہ بھی بول ہی پڑیں۔

فرح اپنا سپارہ شروع کر چکی تھی۔ اس نے ان خواتین کی قینچی کی طرح چلتی زبانیں اور ان کے ہاتھوں میں پکڑے سپاروں کو تاسف سے دیکھا اور چپ چاپ اپنا سپارہ پڑھنے لگی۔

"اچھا بھئی۔ باتیں بعد میں کرنا' اب خاموشی سے پڑھو۔" فریدہ آنٹی کو کچھ خیال آیا تو زور سے بولیں۔

"ہم کہاں باتیں کر رہے ہیں وہ تو بس ایسے ہی باتوں میں بات نکل آئی۔" فائزہ سمیت سب ہی کھسیا کر دوبارہ سپاروں کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

"بات سنو۔" کچھ دیر بعد فرح کے برابر بیٹھی فائزہ نے کہنی سے اسے ٹہوکا دیا۔

"ہوں؟" فرح نے ایک لمحے کو اس کی طرف توجہ کی۔

"تمہیں سمیعہ نے کھانے کا کہا تھا؟" فائزہ نے اس کے کانوں میں سرگوشی کی۔

"اونہوں۔" فرح نے سپارے پر سے نظریں ہٹائے بغیر نفی میں سرہلا دیا۔

"اچھا!" فائزہ کے انداز میں تھوڑی سی مایوسی جھلک آئی۔

سب کی سب ایک' ایک' دو' دو سپارے پڑھ کر آرام سے بیٹھ کر باتوں میں مشغول ہو گئیں۔

فرح نے تیسرا سپارہ پڑھ کر رکھا تو ایک سپارہ اور باقی تھا اس کے علاوہ اور کوئی بھی نہیں پڑھ رہا تھا' اتنے میں سمیعہ آگئی۔

"کیا ہوا' ختم ہو گئے سپارے؟"

"نہیں۔ ایک باقی بچا ہے۔" فرح نے وہ سپارہ بھی پڑھنے کے لیے اٹھا لیا۔

"یہ میں رات کو پڑھ لوں گی' آپ رہنے دیں' وہ دراصل ناشتہ لگاؤں گی تا' سب کو دیر ہو رہی ہے۔ گھر جانے کے لیے بیٹھی ہیں۔" سمیعہ نے اس کے سوالیہ انداز کو دیکھ کر وضاحت کی۔

"تھوڑی دیر رک جاؤ' میں پڑھ دیتی ہوں۔"

"نہیں نہیں۔ میں رات میں پڑھ لوں گی۔" سمیعہ سپارہ لے کر چلی گئی۔

دسترخوان بچھایا جا رہا تھا کہ شائستہ بھابھی کی آمد ہوئی۔

"بڑے موقع سے آئیں۔" فائزہ نے مذاق کے پردے میں لپیٹ کر طنز کا تیر پھینکا۔

"ظاہر ہے' ہم ان لوگوں میں سے تھوڑی ہیں جو کھانے پینے کے چکر میں چار گھنٹے پہلے ہی آکر بیٹھ جاتے ہیں۔" شائستہ بھابھی نے بھی جواب میں طنز کا تیر مارا اور جا کر فرح کے برابر میں بیٹھ گئیں۔

"میں نے سوچا کہ سپارے تو میں نے پڑھ ہی دیے ہیں' اب جا کر اپنا حصہ بھی لے لوں۔" شائستہ بھابھی نے اس کے کان میں بے تکلفی سے سرگوشی کی۔

"اچھا!" فرح نے ایک گہری سانس لی۔

"دسترخوان بچھا اور انواع و اقسام کی نعمتیں سج گئیں۔ سموسے' گلاب جامن' دہی پھلکیاں' چھولے' چپس اور چکن رول۔"

"تم لوگوں نے وہ خبر پڑھی' امریکہ کے پادری والی' اللہ توبہ! میرا تو دل دہل گیا۔ قرآن کی بے حرمتی کرنے والا کافر دیکھنا سیدھا دوزخ میں جائے گا۔" ریحانہ خالہ نے دسترخوان پر بیٹھتے ہوئے مخاطب کیا۔

"ہاں' میں نے بھی ٹی وی پر دیکھا تھا۔ بھلا بتاؤ' ہمارے دین ایمان کا معاملہ اور ہمارے حکمران خاموش۔ اللہ کے کلام کا بھی کوئی خیال نہیں۔" فائزہ نے ہاں میں ہاں ملائی۔

"ہم مسلمان بھی بے حس ہو گئے ہیں۔ ورنہ کس کی اتنی جرأت تھی کہ یوں علی الاعلان قرآن پاک کو جلانے کا ناپاک ارادہ ظاہر کرے۔ ہم سب کو اللہ سے توبہ کرنا چاہیے۔" فریدہ آنٹی نے سموسہ پلیٹ میں رکھتے ہوئے گفتگو میں حصہ لیا۔

"ہم تو اتنا ادب احترام کرتے ہیں اپنے قرآن کا' نہ اس کی طرف پاؤں پھیلاتے ہیں' نہ پشت دکھاتے ہیں' اپنے گھروں میں اونچی جگہ پر رکھتے ہیں' سب سے اچھے اور خوب صورت کپڑوں کے غلاف بناتے ہیں۔ اتنی قدر و منزلت بھلا وہ پادری کیوں کریں گے' وہ تو ویسے بھی جلن حسد کے مارے ہیں' ان سے اچھائی کی توقع کیا رکھنا؟" فیروزہ بھابھی نے بھی اپنی عقیدت و محبت کا اظہار کیا۔

"سنا ہے' ایک دو روز میں احتجاجی مظاہرہ ہوگا' میں تو جاؤں گی اس میں۔ اللہ کے کلام کی حرمت کے لیے ہم نہیں نکلیں گے تو اور کون نکلے گا؟" فائزہ نے جوش میں آکر کہا۔

"اے لو' تو ایسی کیا بات ہے' ہم بھی چلے جائیں گے۔" ریحانہ خالہ نے دہی پھلکیوں اور چھولوں سے پیالہ بھرا۔

"قرآن کی حرمت کے لیے تو سب ہی کو نکلنا چاہیے کیوں؟" فریدہ آنٹی نے سب کو مخاطب کیا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں' سب کی سب اشیائے خورد و نوش سے بھرپور انصاف کرتے ہوئے اثبات میں سرہلا رہی تھیں اور خاموشی سے دھیرے دھیرے کھاتے ہوئے سدا کی حساس فرح کے حلق میں نہ جانے کیا اٹک رہا تھا۔

"قرآن کا احترام تو ہمیں بھی سیکھنا ہے۔ کب سیکھیں گے؟"

اس کے دل نے چپکے سے سوال کیا اور وہ اس سوال کا جواب نہیں ڈھونڈ پا رہی تھی۔

☼

آسیہ رزاقی

حسابِ ابھی باقی ہے

”مولانا حالی پانی پت کے میدان میں پیدا ہوئے۔ جب وہ پیدا ہوئے ان کی عمر پانچ سال کی تھی۔“

کچن کی صفائی کے دوران الماری کے تختے سے بہت پرانا اخبار ہٹاتے ہوئے عادتاً ”پڑھنے لگی۔ عینی اسٹول پر چڑھی اوپر کا حصہ صاف کر رہی تھی‘ دھپ سے نیچے کودی۔

”ہیں؟ ہیں؟ کیا بک رہی ہو؟“

”بک نہیں پڑھ رہی ہوں‘ دیکھو بہت پرانا اخبار ہے‘ اس میں ایف اے کے امتحانی پیپرز کے بارے میں جوابات لکھے ہیں جو لڑکوں نے دیے تھے۔ عطاء الحق قاسمی کا کالم ہے‘ پڑھو۔“

صفائی بھول بھال کر دونوں پرانے بوسیدہ اخبار میں سر گھسا کر بیٹھ گئیں۔ لڑکوں کی شان دار تعلیمی کارکردگی اور معلومات پر عش عش کرنے لگیں‘ اور ہنستی رہیں۔ مامی نے اندر آکر عینی کی پیٹھ پر زوردار دھپ رسید کیا۔

”یہ صفائی ہو رہی ہے؟ کب سے‘ میں کہوں کہ بے چاری لڑکیاں لگی ہیں کام سے‘ میں کھانا ہی تیار کرلوں مگر یہاں تو لطیفے بیان کیے جارہے ہیں۔“

عینی نے پیٹھ سہلائی۔ ”کیا ہے کھانا‘ اونہہ۔ کتنی ظالم ماں ہیں آپ اور شاید ظالم ساس بھی۔“

مامی انہیں گھورتی ہوئی باہر چلی گئیں۔ صفائی پھر

مکمل ناول

دے رہی تھیں۔
پھر کھانے کے بعد سنا کہ وہ لاہور روانہ ہو گیا چھٹی نہیں ملی تھی۔

☆ ☆ ☆

دو تین دن بعد ابا اپنی جاب پر گھر بند کر کے روانہ ہو گئے۔ صبا ماموں کے ساتھ ساہیوال جانے کے لیے بس میں بیٹھی۔ راستے بھر روتی رہی ماہی سمجھاتی رہیں مگر اس کے آنسو نہ رکے۔ یہ بھی کوئی شادی ہے رخصتی کیا ایسی ہوتی ہے؟ ہائے اماں کتنے ارمانوں سے جہیز جمع کر رہی تھیں۔ کسی چیز کی کمی نہ ہو اپنا گھر اپنا شہر اپنی دوست سہیلیاں سب کچھ چھوڑ کر جانا کتنا اذیت ناک ہوتا ہے اور اب پتا نہیں کب آنا ہو سکے گا۔ ابا سکھر سے فارغ ہو کر پتا نہیں کب آ سکیں گے۔ اماں رہیں نہیں میکا ہی نہ رہا اب کون بلائے کون جائے۔

ساہیوال رات کو پہنچے۔ عینی ثوبی باجی رخشی آپا موجود تھیں۔ تینوں نے خوشی اور غم کے اظہار کیے۔ عینی پڑھائی میں بہت مصروف تھی۔ اس کے سیکنڈ ایئر کے امتحان قریب تھے۔ رخشی آپا ڈلیوری کروانے کو تیار بیٹھی تھیں۔ ثوبی باجی کی ساس بیمار تھیں اس لیے وہ اپنی عزیز ترین پھوپھو کی وفات پر ملتان نہ جا سکیں۔

سب کے بے حد اصرار پر بھی اس سے کچھ کھایا نہ گیا۔ چکر آ رہے تھے تھکن صدمہ اور مستقبل کی فکر عینی نے بتایا۔

"بھیا وہاں سے نکاح کے بعد ساہیوال ہوتے ہوئے لاہور گئے ہیں۔ بتا رہے تھے کہ ابا نے جب مجھ سے موٹی پہلوان سے نکاح کا پوچھا تو انکار کرنے سے پہلے میں نے اتفاق سے اس کو دیکھ لیا۔ یار! موٹی تو ہے پر ہے بہت حسین بس ناک پھیلی ہوئی ہے میں نے سوچا مروڑ کر پتلی کر ہی لوں گا۔ سو اقرار کر لیا فٹ۔"

"ہائے ناک کب پھیلی ہوئی ہے۔"

وہ بے ساختہ اپنی ناک چھو کر بولی۔ "وہ تو روتے روتے ناک رگڑتے رگڑتے" جھینپ کر چپ ہو گئی۔

"ہاں۔ میں بھی دیکھ رہی ہوں ناک تو خاصی پتلی ہے موٹی بھی کوئی خاص نہیں ہو تم۔" عینی اسے سر سے پیر تک چیک کر کے بولی۔

صبا جلدی سو گئی۔ اس کے بعد مامی نے بیٹیوں کو تفصیلاً آگاہ کیا۔ وہاں کے حالات راشد بھائی کی فکریں لوگوں کے رویے ماموں نے کہا۔

"چھوڑو وہاں کی باتیں بچی یوں بھی ہماری ہی تھی اب اپنی ہو گئی ہے۔ غم زدہ ہے اس کا ہمیشہ خیال رکھنا زیادتی نہ ہو اس کے ساتھ۔"

☆ ☆ ☆

صبح وہ اٹھی پو پھٹ رہی تھی وضو کر کے نماز فجر ادا کی اماں کی مغفرت کے لیے دعائیں کیں۔ گھر کیا [illegible] [illegible] پاک نکال کر پڑھنے لگی۔ اماں [illegible] اپنی گھر سے دوری نئے اور پرانے رشتوں کا ملن آنسوؤں سے صفحے بھیگنے لگے کتنی دیر تک انہیں سوکھنے کے لیے ہوا دیتی رہی۔ وقت گزرنے کا احساس تب ہوا جب عینی ناشتے کے لیے بلانے آئی ثوبی باجی رات ہی اپنے گھر چلی گئی تھیں۔

رخشی آپا بھی سوئی ہوئی تھیں۔ ان کا ایک بیٹا بھی تھا وہ اپنے [illegible] رہی تھا۔ باپ اور دادی کے پاس ثوبی باجی کے [illegible] تھے۔

عینی کی چھٹی تھی وہ کچھ دیر پڑھتی پھر صبا کے پاس بیٹھ کر باتیں کرتی صبا کو تو بس اماں کا ذکر ہی پسند تھا۔ اسی میں دلچسپی تھی۔ اس کے بھیا کو برسوں سے دیکھا نہ تھا تو اس کے ذکر میں دلچسپی بھی نہ تھی بے خیالی میں سنتی رہتی پھر آخر چند دن میں یہاں کے ماحول اور فضا کی عادی ہو ہی گئی اب رہنا تو یہیں تھا۔

صحن میں زینہ تھا اوپر کچھ مکانیت تھی مگر اس نے اوپر جا کر کبھی دیکھا نہ تھا۔ اماں کے ساتھ کبھی کبھار آنا ہوتا تو بس دو دن زیادہ سے زیادہ تین دن کے لیے۔

[illegible] کے ساتھ صحن میں ہی کھیلتی رہتی یا کمرے میں عینی کی گڑیاں ہوتی تھیں ان سے کھیل لیتی۔ اوپر جانے کا خیال ہی نہ آیا۔ باتوں باتوں میں عینی نے اسے خبردار کیا۔

"اوپر کمرے میں جن رہتے ہیں۔ آوازیں آتی ہیں کھٹ پٹ کی۔ دن میں تو کوئی چلا بھی جاتا ہے رات کو اف توبہ۔" ایک رات فون آیا۔ رخشی کو اسپتال لے جایا جا رہا ہے ماہی سنتے ہی چلی گئیں۔

اگلے دن عینی کالج گئی تو کہہ گئی۔

"کالج سے میں رخشی آپا کے پاس جاؤں گی ان کے بیٹے کو دیکھنے ابا جلدی آ جائیں گے۔ گھبرانا مت۔"

گھبرانے کی کوئی بات نہ تھی۔ صحن میں تین اطراف میں کیاریاں بنی ہوئی تھیں۔ وہ وہاں بیٹھ کر [illegible] پودے [illegible] دھنیا پودینہ بھی لگا ہوا تھا۔ اسے ابا یاد آنے لگے۔ انہیں بھی باغبانی کا شوق تھا۔ ہائے اماں کیسے آناً فاناً تم ہو گئیں۔ اب کون کرے گا میرے لاڈ میری ضدیں پوری کرنے والے ہی اب۔۔۔ ایک زندہ ہو کر دور۔۔۔ دوسرے۔

بھوک کا احساس ہوا تو چونکی۔ پتا نہیں کچھ کھانے کو ہے یا نہیں۔ عینی کچھ بتا کر ہی نہیں گئی۔ دیکھوں کچھ پکانا آتا نہ تھا مگر شاید کچھ بنا ہی لوں۔ ابھی وہ کچن تک پہنچی نہ تھی کہ دروازے پر زوردار گھنٹی کسی کی آمد کا اعلان۔

"اوہ! یہاں تو گھنٹی بھی اس قدر تیز آواز کی ہے کہ بس توبہ ہے آتی ہوں بابا دم تو لو۔" دروازے پر پہنچ کر پوچھا کون ہے؟"

باہر کچھ سامان رکھنے اٹھانے کی پھر ٹیکسی ڈرائیور سے کرائے کی بحث۔ اس نے ذرا سا پٹ کھول کر دیکھا پتا تو چلے کون سامان سمیت آیا ہے مگر باہر سے ایک زوردار دھکا لگا۔ آنے والے نے دروازہ ایسے زور سے کھولا۔ وہ پیچھے ہٹ گئی ورنہ منہ پر آ کر لگتا۔

"ارے۔۔۔ ارے۔۔۔ تم ہو کون؟ یوں بھلا دن دہاڑے اندر گھسے آ رہے ہو اے مسٹر سنو!"

وہ چلاتی ہوئی اس تیز رفتار بندے کے پیچھے بھاگتی صحن تک پہنچی۔ مگر وہ شخص تو چھلاوہ تھا۔ آگے ہی آگے چلتا گیا۔ پھر سوٹ کیس بیگ اور تھیلا زمین پر پٹخ اور چلایا۔

"کیا ہے؟" مڑ کر اسے گھورا بھی۔ "گھر والا ہوں کیا گھر والے رات کو گھستے ہیں۔ فضول لڑکی اب منہ کیا تک رہی ہو پانی پلاؤ ای۔۔۔ ای! عینی تو کالج میں ہو گی بھلا تم ہو کون؟"

وہ اب پہچان گئی تھی۔ دوڑی جھٹ پٹ ٹھنڈے پانی کا گلاس اس کی نذر کیا۔ سمجھ میں نہ آیا کہ شرمانا چاہیے۔ دوپٹے کا آنچل وغیرہ مروڑ کر دانتوں تلے دبا کر ترچھی نظروں سے دیکھ کر یا ڈٹ جانا چاہیے۔ ڈٹے رہنے کو ترجیح دی۔ وہ برآمدے میں کرسی پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ وہ خالی گلاس لینے کو بڑھی تو ماتھے پر ہاتھ مار کر بولا۔

"وہ۔۔۔ یاد آیا آپ تو وہ ہیں ہماری جی حضوری محترمہ خاتون اول و آخر انجم۔۔۔"

"فضول اداکاری" تلملا گئی۔

"اس خیال میں نہ رہنا میں کوئی جی حضوری نہیں کرنے والی ہاں یہ یاد رکھنا دو مہینے بڑی ہوں تم سے۔"

"شکریہ پہچان لینے کا ڈاکو سمجھ کر شور نہیں مچایا۔"

"شور تو بہت مچایا تم نے سنا نہیں ویسے اس شہر میں ڈاکو سامان لے کر آتے ہیں لے جانے کے بجائے؟" آنکھیں چڑھا کر گھورنے لگا۔

وہ صحن سے بیگ اٹھانے لگی فوراً لپکا۔

"رہنے دو خادم موجود ہے اٹھا لے گا۔"

"ایں۔۔۔ کون؟ خادم کون۔"

"میں بذات خود اور کون تم کیا سمجھ رہی ہو۔"

صبا نے گھبرا کر بیگ نیچے پٹخا۔ "کیا؟ تم موٹی نہیں ہو؟" (ویسے شکل تو وہی لگ رہی تھی۔ بچپن میں بال منڈوانے پر بہت روتا تھا مگر ماموں گنجا کروا دیتے تھے۔ اب تو۔۔۔ بڑے بھی ہیں گھنے اور براؤن سے۔) ہیں؟"

وہ چونکی۔
وہ ہنسا۔ "امی کہاں ہیں؟ گئی ہوں گی محلے کی سیر کرنے ایک چوکیدار گھر بٹھا کر۔"
"زخشی آپا کے بیٹا ہوا ہے' وہیں گئی ہیں۔"
"اچھا۔ کھانے کو کچھ ہے تو لے آؤ۔ راستے میں بھی کچھ کھانے کو نہیں ملا۔"
"چلو جی' ایک اور بھوکا آگیا۔" کچن میں جا کر دیکھا۔ فریج ٹٹولا' کچھ نہ ملا۔ ابھی پوری طرح علم بھی نہ تھا کہ کون سی چیز کہاں رکھی ہے۔
"یہاں تو کچھ نہیں ہے۔" وہیں سے پکار کر کہا۔
وہ فوراً" آیا' آلو انڈے دستیاب ہو گئے۔ "چلو انڈے ابالنے رکھ دو' پھر سالن کا مسالہ بناؤ۔"
"مسالا؟" "پھوہڑ عورت مسالہ نہیں جانتیں؟ پیاز کاٹو' تیل میں لال کرو۔"
صبا کو غصہ آنے لگا۔ اس نے کب کھانے پکائے تھے جو مسالہ بنانا جانتی۔ "اتنے بہت سے انڈے؟" پھر انڈے اس نے ساس پین میں ڈال کر ابالنے کو رکھے تو وہ پریشان ہو گئی۔
"میں' تم' بینی' امی' ابا' کتنے ہوئے؟ میں دو کھاؤں گا۔" "حساب کا تیز ہے واقعی۔"
"ویسے بھی' ایک عدد بھوکے ہوتے ہوئے گھر میں پکا ہوا کھانا ہو نہ ہو؟ عجب۔"
"اے۔۔۔ اے۔۔۔ زبان سنبھال کے' مجھے فضول عہدے نہیں چاہئیں۔ رشتے سے بھانجی کا ہے۔"
"پھوہڑ بھانجی" بڑبڑا کر آلو چھیلنے لگا۔ پیاز لال ہو گئی تو اس نے اس میں لہسن' ہلدی' نمک' مرچ ڈال کر مسالہ تیار کیا۔ آلو ڈال کر بھون لیے' پانی ڈال کر آنچ تیز کی۔ انڈے ابل گئے تھے۔ اتار کر پانی میں ڈال کر ٹھنڈے کیے' چھل گئے تو پھر جھانکنے لگا۔
"اب ان انڈوں کو مسل کر یا چھری سے باریک کاٹ کر آلو کے سالن میں ڈال دو' پکنے کے لیے پھر ہلکی آنچ پر دم دے دو۔" "ہدایتیں' کسی ٹی وی چینل کا شیف نہ ہو تو۔"
"ہیں۔۔۔ کیا۔۔۔ انڈے۔۔۔ مسل کر؟"

"اف!" ماتھے پر ہاتھ مار کر منہ سکوڑ کر تقدیر سے شکوہ کیا۔ "کچھ نہیں آتا' کیا ہو گا میرا' بھئی آلو کے سالن میں انڈے توڑ کر بھرتہ بنا کر ڈالو۔ ہم ایسا ہی کھانا پسند کرتے ہیں۔"
اتنے دن میں یہ تو اندازہ ہو گیا تھا کہ مامی کے اور اماں کے ہاتھ کے کھانے میں کوئی خاص فرق نہیں۔ یہ پتا نہیں کون سی ڈش تھی' اماں انڈے ابال کر چھیل کر ثابت سالن کر کر رکھ لیتی تھیں۔ آلو کا سالن تیار ہو جاتا تو اس میں انڈے ڈال دیے جاتے۔ ڈش میں نکالتے وقت چھری سے آدھا کاٹ کر رکھتیں۔ یہ کیا سمجھا رہا ہے' سمجھ میں نہیں آیا۔
پھر اس نے خود آگے بڑھ کر سارے انڈے توڑ کر اپنے حساب سے بھرتہ بنا کر اچھے بھلے آلو کے سالن کا ستیاناس کر دیا بلکہ حشر نشر کیا' بد شکل' ملغوبہ سا [illegible] دیکھ کر رونا آیا۔ اب یہ کھانا ہے گا۔ یہ بدہیت سالن ڈش میں نکالتے وقت وہ خود کو اس عجب ڈش کے لیے تیار کرنے لگی۔ ماموں' مامی ساتھ آئے' بینی بھی' بیٹے کو دیکھ کر نہال ہو گئے۔ بینی برتن رکھتے ہوئے کہنے لگی۔
"بھیا کہہ رہے تھے' کھانا صبا نے بنایا ہے۔ بہت خوش ہیں۔ کہہ رہے تھے پھوپھو کے پکائے کھانوں کا تو دور دور شہرہ تھا۔ آخر ان کی بیٹی نے ان ہی سے سیکھا ہے۔"
وہ منہ کھول کر رہ گئی۔ منہ چڑاتے سالن ڈونگے میں نکال لائی۔ سب میز کے آگے بیٹھ چکے تھے۔ سالن دیکھ کر یک زبان ہو کر بولے۔ "یہ کیا ہے؟"
"انڈے آلو کا سالن۔" صاحبزادے چہک کر بولے۔ "صبا نے کہا کہ وہ بہت عمدہ بناتی ہے' میں نے کہا چلو بنالو۔"
"انڈے؟" ماموں نے مامی کو دیکھا۔ "انڈے کہاں ہیں' آلو نظر آ رہے ہیں۔"
"میرا خیال ہے آلو بھوکے تھے۔ سارے انڈے کھا گئے۔" موسٹی نے بغور دیکھ کر خیال ظاہر کیا۔
مامی ڈونگے میں چمچہ ہلانے لگیں۔ تعجب اور حیرت

ان کے چہرے سے ظاہر تھا۔

"بھائی!" عینی صبا کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر چلائی سمجھ گئی تھی۔ "یہ آپ کی حرکت تھی؟"

"کیا ہے کیوں چیخ رہی ہو؟" وہ بگڑ کر بولا۔ "چلو میرے بیگ میں ڈبے رکھے ہیں' نکال لاؤ' پزا اور روسٹ۔ میں اسی لیے لے آیا' جانتا تھا کھانے میں کیا ملے گا۔"

"ہائے معصوم۔"

عینی جھٹ اٹھ کر بھاگی۔ پیکنگ سے پزا نکالتے ہوئے بڑبڑایا۔

"پتا چل گیا' محترمہ پکانے سے ہی نہیں' عقل سے بھی عاری ہیں۔"

اسے بہت زور کا رونا آرہا تھا۔ ہوٹل کا کھانا حلقوں میں نکلا جارہا تھا۔ وہ اپنی پلیٹ میں آلو انڈے کا سالن لے کر اپنے کمرے میں آگئی۔ اس کی نااہلی کا ثبوت پیش کرتے ہوئے ذرا شرم نہ آئی۔ اپنی ہدایات کا ذکر نہیں۔ عینی نے پکارا' مگر وہ یہی بے مزا سالن کھاتی رہی۔ ماموں نے ڈانٹا۔ مامی کو چند انڈوں کے ضیاع کا دکھ تھا۔ پھر وہ تلافی کے طور پر پلیٹ میں پزا اور روسٹ لے کر آیا۔

"چلو۔ سوری۔ بھئی کیا ہے؟ اچھا چھوڑو' یہ لو تمہارے لیے خاص طور پر لایا تھا' یہ لو۔"

پلیٹ بڑھائی' صبا پر شدید غصے کا دورہ پڑا' ہاتھ مار کر اس نے موسیٰ کے ہاتھ کی پلیٹ گرادی۔ روسٹ پزا سلاد سب [illegible] تھا۔ وہ بھونچکا کھڑا رہ گیا۔

"کچھ تمیز تم میں ہے کہ نہیں؟" وہ چلائی۔ "جب میں نے پکایا ہے تو کھا بھی لوں گی' مروں گی نہیں۔"

اس نے جھک کر گری ہوئی پلیٹ اور کھانا اٹھایا اور بغیر کچھ کہے باہر چلا گیا۔ اپنی پلیٹ وہیں پلنگ پر رکھ کر وہ بھی گم صم ہوگئی۔ احساس ہوا کہ اس نے یہ اچھا نہیں کیا۔ شاید اسی لیے غصہ حرام ہے۔ غلطی ہوجاتی ہے' اب رزق کی بے حرمتی تو کردی۔ اور اس کی بھی غصے میں۔۔۔

عینی آئی مگر چپ چاپ اپنی کتابیں سمیٹتی رہی' کچھ بولی نہیں' پھر واش روم میں گھس گئی۔ باہر آئی تو بھی الماری میں کچھ تلاش کرتی رہی۔ صبا [illegible] یہ کچھ کہتی کیوں نہیں۔ الماری بند کرکے صبا کی پلیٹ اٹھا کر باہر چلی گئی۔ صبا پر اس کی خاموشی کا عجیب اثر ہوا' پچھتاوا' ملال' جھلاہٹ' وہ کبھی کرسی پر بیٹھتی' کبھی پلنگ پر' پھر اٹھتی کمرے کا چکر لگاتی۔ شام کو عینی اس کے لیے چائے لے کر آئی۔ صبا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھا۔ کچھ کہہ نہ سکی۔

"ارے۔۔۔ ارے بھئی' کچھ نہیں' بھیا کی عادت ہے' ابا نے بہت ڈانٹا' اب منہ سجائے بیٹھے ہیں۔ اصل میں اسکالرشپ پر جارہے ہیں سوئیڈن۔ ویزا بھی آگیا' بس ٹینشن دور کرنے کی کوشش کررہے ہیں' اگلے ہفتے جانا ہے۔"

صبا مزید مرجھا گئی۔ ثوبی باجی آگئیں۔ رخشی کی مجبوری تھی۔ موسیٰ [illegible] گیا۔

[illegible]

ایک ہفتہ ایسے گزرا جیسے پر لگ گئے ہوں' گھر میں ہلچل سی تھی۔ موسیٰ کے دوست' محلے والے' مامی کے عزیز رشتے دار' کھانا' چائے' مٹھائی اور شور۔

جس رات اسے جانا تھا۔ شام کو وہ چائے کے برتن دھو رہی تھی' پیچھے آکر کھڑا ہوگیا۔

"اچھا جی۔ ہمارا معاف کردو۔ اور کچھ کھانا پکانا سیکھ لو۔ مجھے انڈے آلو بالکل پسند نہیں۔ نئی نئی ڈشز' رشین' چائنیز' اٹالین اور ڈونٹ' بنانا خوب۔"

"تیاری ہوگئی؟" اس نے نرم لہجے میں پوچھا۔ کہ تو چاہتی تھی کہ ان ممالک کے کھانوں میں پھر مینڈک' چھپکلی' کیڑے ہی ملیں گے اور مجھے ان سے بہت خوف آتا ہے۔

"ہاں جی۔ فل تیاری' تم تو شکر کروگی کہ دفع ہورہا ہوں۔"

"میں کیوں شکر کروں گی؟ میرا کیا ہے' گھر تمہارا' ماں' باپ تمہارے۔"

"میں بھی تمہارا' بولو' بولو' تم بھی اب تو۔۔۔ اپنا

[illegible] چلو گی؟"

"پتا نہیں۔"

"واہ۔ کیا شان بے نیازی ہے۔ دل رکھنے کو ہی اقرار کرلو۔ آخر مجازی خدا ہوں' زبردستی بھی لے جاسکتا ہوں' سمجھ کیا رہی ہو' محترمہ! خاتون اول' دوم' سوم۔"

"توبہ' یاد رکھو' مجھ سے چھوٹے ہو' بدتمیزی برداشت نہیں کروں گی۔"

"میں بھی زبان درازی برداشت نہیں کروں گا۔ رشتہ میرا بڑا ہوگیا ہے۔" بڑے فخر ہیں بھئی۔

"اچھا چھوڑو' ویسے دراصل یہاں سے تو بس میں لاہور جانا ہے۔ لاہور سے سیٹ ہے۔ ابا اور میرے دوست جارہے ہیں خدا حافظ کہنے۔ چلیں تم بھی' کون اپا ہے؟" ہائے شوق۔

"تمہارے دوستوں کے ساتھ؟ توبہ' کبھی نہیں' [illegible] بھی [illegible] نہیں ہے۔"

"یاد کروگی مجھے؟" پرشوق لہجہ' پرامید نگاہیں۔

"ہوں۔۔۔ اچھی بات ہوئی تو کرلی۔" برتن دھوئے جارہی تھی۔ تین تین بار دھولیے' مگر۔۔۔

"چلو' بری بات ہی سہی' کسی بہانے یاد کرلینا' انڈے آلو کا سالن ہی سہی۔"

ڈانا کھڑا تھا جانے کا نام نہیں لیتا' ارے بھئی۔ رات ہوگئی ہے' کچھ کام۔۔۔ یعنی ماں' بہنوں سے مل کر باتیں ہی کرلو۔

"میں جارہی ہوں۔" وہ مڑی کب تک دھلے دھلائے برتن دھوتی۔ باہر نکل رہی تھی تو اس کے بڑبڑانے کی آواز سنی۔

"میرے خدا۔۔۔ کیا ظالم جڑوالی ہے۔ لڑکیاں منگیتر کے لیے رویا کرتی ہیں۔ یہاں بانکا سجیلا نیا نکور ہے۔۔۔ مگر نرم نرم جذبے کجا' نرم الفاظ تک نہیں۔ کہاں بہاؤں میں؟"

دروازے پر ہی کمر پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔ اسے ذرا دیکھ کر اور بھی اترا رہا تھا۔

"یہ؟ کیا کہا تم نے؟ جڑوا کس کو کہا؟"

"جس کو کہا۔ اس نے سمجھ لیا۔ ویسے کئی الفاظ اور القاب ہیں۔ مثلاً" شریک حیات' شریک زندگی' یہ تو بہت ہی باوقار اور بھاری بھرکم ہیں۔ (تم پر سجتے تو ہیں۔) پھر ہے بیگم۔ یہ ذرا نخرے والی ہے۔ بیوی معصوم سا لفظ ہے' تم پر بالکل نہیں اچھا لگے گا۔ جڑوا ہے' صحیح لفظ' لڑاکا' بدمزاج' جھگڑالو' میری پسندیدہ' جیسے کہ تم۔"

اگر وہ سمجھتی تھی کہ وہ اس پر رعب جمالے گی' تو یہ مشکل لگا اس وقت' چمچہ اٹھا کر کھینچ کر مارنے کو دل چاہا' ہمسائی کی آواز آرہی تھی۔ پیر پٹختی باہر نکلی۔

اسٹیشن پر سب گئے۔ مامی' عینی' ثوبی' رخشی کو بھی جانا پڑا۔ بس کے بجائے ٹرین میں جارہے تھے سب۔ مامی رنجیدہ تھیں۔ اکلوتا لاڈلا بیٹا' لاہور سے آہی جاتا تھا۔ اب پتا نہیں کب آئے۔ مامی کے گلے لگ کر بولا۔

"امی! کیوں اداس ہیں؟ پڑھائی ختم کرکے آجاؤں گا۔ فافٹ' میرا دل بھی اب کیسے لگے گا وہاں' آپ کے بغیر۔"

کہتے ہوئے آنکھ سے صبا کی طرف اشارہ کیا' عینی کھلکھلا کر ہنسی۔

"دیکھیں' کتنی خوش ہیں' میری بہنیں ہنس کر وداع کررہی ہیں۔"

"ارے بیٹا! کیسے گزریں گے میرے دن' ساری رونق چلی جائے گی میرے گھر کی۔ لاہور سے آتو جاتا تھا۔"

"رونق چھوڑ کر جارہا ہوں امی! اسی سے دل بہلالیں۔" پھر صبا کو آنکھ ماری۔ عینی ہنسی سے دہری ہوگئی۔

صبا رخ موڑ کر پلیٹ فارم کی رونق دیکھنے لگی۔ ماموں اسے لاہور جہاز میں بٹھا کر آگئے۔ پھر اس کا فون آگیا۔ وہ تو شکر کررہی تھی کہ چلا گیا۔ لاہور میں ہوتا تو بہانے بہانے آتا۔ پہلے کی بات اور تھی۔ آکر اسے تنگ ہی کرتا۔ اور سب سمجھتے کہ صبا کی وجہ سے آتا ہے۔۔۔۔۔ اور کچھ بعید بھی نہ تھا

کہ اسی کی وجہ سے جلدی جلدی آتا۔ پہلے تو مہینے دو مہینے میں آتا تھا۔ اب دل لگی کے لیے جلدی جلدی بھی آسکتا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس کے جانے سے گھر میں سناٹا ہوگیا۔ ایک ہفتہ اس قدر گہما گہمی رہی تھی' اب واقعی بے رونقی سی ہوگئی۔ ثوبی باجی اور رخشی آپا بھی کم ہی آتیں۔ عینی امتحانوں میں مصروف۔ خالی وقت میں اماں کو یاد کرتی۔ ابا کا فون آتا تو رونا آجاتا۔

"ابا! آپ آنہیں سکتے؟"

"آؤں گا' چھٹی ملے گی تب۔ بہت سخت ڈیوٹی ہے۔" پھر اسے سمجھاتے' سب تمہارے اپنے ہیں۔ ماموں سے باتیں کیا کرو اپنی ماں کی' اپنا دل وہیں لگاؤ بیٹا! اب وہ ہی تمہارا گھر ہے۔"

سکھر اتنی دور تو نہ تھا۔ ملتان آہی جاتے تھے۔ پتا نہیں کیا مجبوری تھی۔ ایک سال گزر گیا۔ ماموں نے برسی پر قرآن خوانی کرائی۔ یتیم خانے میں دو دیگ پلاؤ کی بھیجی۔ ابا کا فون آیا۔ انہوں نے بھی مسجد میں قرآن خوانی کروا کر طالب علم بچوں کو کھانا کھلایا۔ وہ سمجھ رہی تھی' ابا ضرور آئیں گے' بیٹی کی دل دہی کے لیے۔ مگر فون پر ہی دلاسا دیتے رہے۔ اسے کلام پاک پڑھ کر ماں کی روح کو بخشنے کی تاکید اور سسرال میں دل لگانے' خوش رہنے کی ہدایتیں۔

ایک دن ماموں نے کہا۔ "آفس کے کام سے سکھر جانا ہے صبا! تم چاہو تو ساتھ چلو مگر میں رکوں گا نہیں۔ رات کو روانہ ہو جاؤں گا' صبح دفتر میں حاضری ضروری ہے۔ تم اپنے ابا سے مل لینا۔"

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں' وہ بخوشی تیار ہوگئی۔ صرف ٹوتھ پیسٹ اور برش رکھ لیا۔ کنگھا تو پرس میں تھا ہی۔ ماموں کے ساتھ ہی واپسی ہونا تھی۔ ماموں کو ٹرین سے جانا تھا۔ اس میں ایک سیٹ تو تھی۔ دوسری نہ تھی۔

صبا نے کہا۔ "کوئی بات نہیں' ملتان میں سیٹ مل جائے گی۔ ورنہ ملتان تک کھڑی ہو کر یا کسی مسافر کے بکس پر بیٹھ جاؤں گی۔"

اور ہوا بھی یہ ہی' ایک بکس پر جگہ ملی۔ ملتان میں سیٹ بھی مل گئی۔ سوتے جاگتے' روہڑی تک سفر گزرا۔ وہاں سے سکھر کے لیے بس لی۔ سکھر پہنچ کر ہوٹل میں دونوں نے ناشتا کیا' پھر ٹیکسی میں چلے۔ تنگ گلیوں سے ٹیکسی گزر رہی تھی۔

"ماموں! کون سی جگہ ہے؟" نیند سے بند ہوتی آنکھیں اب کھل گئی تھیں۔

"پرانا سکھر ہے۔ یہیں رہتے ہیں تمہارے ابا۔" وہ یہ سن کر سخت بددل ہوئی۔

پھر ایک جگہ ٹیکسی رکی۔ ماموں اسے بیٹھا رہنے کا اشارہ کر کے اترے۔ کسی سے کوئی بات کی' پھر واپس آئے۔ ٹیکسی پھر چل پڑی۔ ماموں نے ڈرائیور کو کوئی پتا سمجھایا تھا۔ چند منٹ بعد آخر ایک ہی تنگ گلی میں وہ اترے۔ ماموں نے ایک دروازہ بجایا۔ دروازہ کھلا' وہ ماموں کے پیچھے داخل ہوگئی۔ اندر پہنچنے سے صحن کا سین بھی دل شکن تھا۔ سیلن کی بدبو' اور اندھیرا' حالانکہ اب سورج تو چمک رہا تھا مگر باہر' اندر روشنی مدھم تھی۔ ایک خاتون ماموں کو گلے لگائے کھڑی تھیں۔ اس نے بے اختیار چٹکی سے ناک دبائی۔ پھر ماموں نے بزرگ خاتون سے کہا۔

"آپا! یہ صبا ہے' میری بھانجی۔"

صبا نے انہیں سلام کیا' انہوں نے ہاتھوں کا پیالہ بنا کر اسے بغور دیکھا۔ (روشنی تھی ہی نہیں' پھر کس وجہ سے اور کس چمک سے بچ رہی تھیں۔)

"آئے ہئے۔ میری رشو کی بیٹی' اللہ جی' کیسی جوان موت مری میری رشو۔"

اسے گلے لگا کر جھکوں پھکوں رونے لگیں۔ ان کے دوپٹے میں بھی وہ ہی بوسیدہ سی بو تھی' صحن کی سیلن جیسی' مگر محبت کی خوشبو غالب تھی۔ اشارے سے انہیں اپنے پیچھے بلایا۔ کمرے میں لے گئیں۔ غالباً ان ہی کا کمرہ تھا۔ ان ہی کی عمر کا' ویسا ہی سادہ اور بوسیدہ۔

"آپا! وہ بھائی راشد گھر پر نہیں ملے۔ پڑوسی نے بتایا۔ انہوں نے گھر بدل لیا ہے۔ کچھ پتا ہے' اب وہ کہاں ہوں گے؟" پھر تفصیلاً" بتایا کہ صبا ان سے ملنے آئی ہے۔ اور جب تک وہ اپنے کام سے فارغ ہوں گے یہ اپنے ابا کے پاس رہے گی۔ واپسی رات کو ہوگی۔ وہ آج چھٹی کرلیں گے۔

آپا۔ جو ماموں کی رشتے کی بہن تھیں' پلنگ پر بیٹھ گئیں۔ جوان ہی کی عمر کا لگتا تھا۔ ان کے نحیف وجود کے بیٹھنے سے ہی کراہنے لگا۔ ماموں' بھانجی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

آپا نے ناک پر انگشت شہادت دھری۔ (تعجب) اور دائیں بائیں دیکھا۔ کمرہ اتنا تاریک نہ تھا اور اس کمرے میں بس کل یہ ہی فرنیچر تھا' یعنی ان کا پلنگ اور دو کرسیاں' جس پر وہ بیٹھے' ایک میز تھی۔ جس پر چھوٹا سا سرہانے رکھا تھا اور ٹائم پیس' یقیناً" ان ہی کی عمر کی ... [illegible] ... ہوگی ہے۔ پرانی فلموں میں ایسی ٹائم پیس ہی ہوتی تھی۔

"اچھا؟" نہایت تعجب سے کچھ ٹھہر کر بولیں۔

"تمہیں نہیں پتا؟"

"کیا آپا؟" ماموں انہیں دیکھ رہے تھے مگر وہ صبا کی طرف منہ کر کے بیٹھی تھیں۔ غالب' ہچکچاہٹ۔

"بچی۔" وہ ذرا سا کھنکھاریں۔ اور پھر صبا کو ... کیوں نہیں بتیں۔ صبا جھلا رہی تھی۔

... میں راشد نے شادی کرلی ہے' کئی مہینے ہوگئے۔"

شاید چھت سر پر گر جاتی تو اتنا زخم نہ ہوتا۔ صبا کو لگا' بالکل خالی ہوگئی ہے۔ خون کی روانی' دل کی دھڑکن' کی حرارت' کچھ بھی باقی نہ رہا۔

"آپا! کیسے؟ بھلا ایسے کس طرح۔" ماموں ... سے انہیں' کبھی صبا کو دیکھنے لگے مگر صبا کو یقین ... ماموں نے پہلو بدلا۔

"اب... کہاں ملیں گے؟" وہ صبا کو ان سے ملوانے کا تہیہ کرچکے تھے۔

"کہاں کیا مطلب؟ نئی سسرال میں' یہاں کے مشہور تاجر کی بہن کئی سالوں سے بیوہ بیٹھی تھی۔ رشو کے انتقال کے بعد کتنے دن روتے رہے۔ دفتر کے پڑوس میں اس تاجر کی دکان تھی۔ بس ہمدردی اتنی بڑھی کہ رشتے داری میں بدل گئی۔ بیوی کو جہیز میں مکان ملا ہے۔ ایک دکان ملی ہے اور اللہ بھلا کرے تمہارا... لاکھوں کی سلامی' بس بھیا' اب کیا کہیں۔"

انہوں نے آنچل سے چہرہ رگڑا۔ صبا پتھر بنی بیٹھی تھی۔ ماموں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"تو پھر' اب مل ہی لیتے ہیں' کیا حرج ہے؟ کیوں بی بی! آپا! کچھ نئے گھر کا پتا' دراصل مجھے آفس کے لیے کچھ شاپنگ کرنا ہے۔ ایک صاحب سے ملاقات بھی کرنا ہے' رات تک واپس جانے کا ارادہ تھا' اب... اچھا پھر' صبا! تم یہاں رکو' میں... شام کو آکر...."

وہاں رکنے کا تو سوال ہی نہ تھا۔ اس خبر کے سن لینے کے بعد گھر کی تاریکی' سیلن اور گھٹن میں اضافہ ہی ہوا تھا۔

"ماموں! جہاں بھی آپ جارہے ہیں' مجھے بھی لے چلیں۔" اس نے چپکے سے کہا۔

"بیٹا! تم کہاں بازاروں میں میرے ساتھ پھرو گی' میں راشد بھائی سے...."

صبا نے ماموں کے کندھے پر سر رکھ دیا۔ دل قابو میں کہاں تھا۔ اب ابا سے ملنے کی خواہش بھی نہیں رہی' کچھ ایسا دھچکا لگا تھا کہ سوچنے کی صلاحیت بھی نہیں رہی۔

"اری بچی! یہاں ٹھہرو' بچے اسکول سے آجائیں گے' دل لگ جائے گا' تمہارا' میں چائے لاتی ہوں۔" وہ اٹھنے لگیں ... کر دیا۔

"آپا! نا... آپ تکلیف نہ کریں۔" ماموں نے کھڑے ہو کر اسے اشارہ کیا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ صبا سخت شاک کی کیفیت میں ہے۔

دونوں باہر آنے لگے تو خاتون بھی اٹھ گئیں۔ صبا کو گلے لگا کر بہت تسلی دی۔ گھر کی تاریکی' سیلن اور گھٹن کے باوجود ان کے وجود میں محبت اور شفقت کی کمی نہ

تھی۔ خدا حافظ کہہ کر دونوں گلی میں آئے۔ خاتون نے دروازہ بند کرلیا اور اسے لگا کہ آج کے بعد سکھر کا ہر دروازہ اس پر بند ہوگیا۔

ماموں نے پروگرام تبدیل کردیا تھا۔ وہ بس میں بیٹھے جو ساہیوال جارہی تھی' صبا کا حلق سوکھ گیا۔

ماموں نے راستے میں کھانے کا پوچھا۔ چائے کے لیے کہا۔ جہاں بس رکتی' ماموں اسے کھانے کے لیے کچھ لادیتے مگر بھوک کیا' اس کی پیاس بھی اڑ چکی تھی۔ سڑک کے کنارے کتنے مناظر تھے' کہیں ریت کی پہاڑیاں' ٹیلے' کیلوں کے باغ' کپاس کے کھیت' اسے کتنی دلچسپی تھی۔ سفر میں وہ راستے کے مناظر میں کھوئی رہی تھی مگر اب اس کا ذہن ابا میں اٹکا ہوا تھا۔ نئی اماں' ابا کی وہ محبت جو ان کو اماں سے تھی' کتنی سطحی تھی کہ ایک سال گزرنے سے پہلے ہی وہ فراموش ہوگئی' اب ابا۔ نئی دلہن کی محبت کا دم بھرتے ہوں گے۔ انہیں میرا خیال بھی کبھی آتا ہوگا یا مجھے بھی بھول گئے۔ سوچ سوچ کر غم زدہ ہوتی رہی۔ اونگھنے لگی' پھر سوگئی۔

شام ڈھلے گھر پہنچے۔ ممانی حیران ہوگئیں۔

"اتنی جلدی سے آگئے؟" ماموں اشارہ کرکے انہیں اندر لے گئے۔ صبا کمرے میں گھس کر رونے لگی۔ روتی ہی رہی' جیسے اماں کے لیے روئی تھی۔ ممانی اسے چپ کرانے کی کوشش کرتی رہی۔

"ابا کہہ رہے ہیں تم نے صبح ناشتے کے بعد کچھ نہیں کھایا۔ چلو کھانا کھالو' کمزوری ہوجائے گی۔" مگر اس کا معدہ بھی بند ہوچکا تھا۔ پانی پی کر سوگئی۔ صبح حسب معمول نماز اور تلاوت کے بعد کچن میں گئی۔ مامی نے اسے پیار کیا۔

"افسوس تو ہوا' مگر وہ بھی کیا کرتے۔ اتنی عمر بھی نہیں کہ گزار لیتے اکیلے۔ مرد کو بڑھاپے میں عورت کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ خدمت' مدد' تعاون' دکھ سکھ' درد میں کسی اپنے کے ساتھ کے لیے اور بھی۔ پچاس سال کا مرد بوڑھا ہوتا بھی نہیں' کتنے لوگ اس عمر میں پہلی شادی کرتے ہیں۔ سوچو' وہ کب تک تنہا رہتے۔ کسی ساتھی' ہمدرد کی تو زندگی میں ضرورت ہوتی ہے۔ چلو کوئی بات نہیں' تم مل لیتیں۔ آخر کوئی گناہ کیا ہے نہ تمہارے ساتھ ناانصافی۔ مل ہی لیں گے کسی دن آکر۔ دل برا نہ کرو۔"

انہوں نے اسے سمجھایا پھر وہ کام میں لگ گئیں۔ وہ چپ چاپ ناشتا کرتی رہی۔ ماموں اگلے دن سکھر چلے گئے۔ آکر بتایا وہ ابا سے ملنے ان کے دفتر چلے گئے تھے مگر وہ کراچی گئے ہوئے ہیں چھٹی لے کر "غالباً" بیگم کے ہمراہ۔

صبا کا دل بے چین ہوا۔ ابا کبھی اماں کو ان کے اصرار کے باوجود کراچی لے کر نہیں گئے۔ دراصل کراچی میں ابا کا کوئی رشتے دار تھا ہی نہیں۔ اماں کے ہی کچھ عزیز تھے۔ شادی وغیرہ کی تقریبات میں بلاتے تھے مگر اماں [illegible] تک۔ اماں بھی [illegible] انہیں اپنے عزیزوں سے ملوانے [illegible]

[illegible]

* * *

دن عجیب پھیکے پھیکے بے رنگ' بے رونق سے ہوگئے تھے۔ کوئی امنگ رہی' نہ شوق' نہ خواہش' نئی پڑھائی میں مگن' نہ خوشی [illegible] آج تمیں تو ان بچوں کے ساتھ دن اچھا گزر جاتا۔ ورنہ وہ ہی بے کلی' اداسی اور یادیں جو دل مرجھانے والی ہوتیں۔

ایک دن عجیب بات ہوئی۔ دروازے پر ایک سوزوکی لوڈر آکر رکی۔ ماموں دریافت حال کے لیے گئے۔ واپس آئے تو الجھے الجھے سے تھے۔ صبا سے پوچھنے لگے۔

"صبا! ملتان میں تمہارے پڑوس میں کوئی ریحان اصغر صاحب رہتے تھے؟"

"جی ماموں' کیا ہوا؟"

"وہ ہی آئے ہیں۔ وہ تمہارا کچھ سامان لے کر آئے ہیں۔"

"میرا سامان؟" وہ ہونقوں کی طرح انہیں دیکھ رہی

"میرا خیال ہے تم خود ہی ان سے مل لو' بہت جلدی میں ہیں اور بیگم! تم چائے بنالو' سوزوکی کا ڈرائیور بھی پیے گا۔"

کہتے کہتے ماموں اسے لے کر بیٹھک میں آئے' جہاں ریحان اصغر واقعی موجود تھے۔ ملتان کے پڑوسی' ان کی اماں اور دادی سے اماں کی بہت دوستی تھی۔ سلام کے جواب میں انہوں نے اٹھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"کیسی ہو صبا؟" بڑی اپنائیت تھی۔

اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ میکے کی یاد' اماں کی یاد۔

"جی۔ ٹھیک ہوں' خالہ جی اور دادی کیسی ہیں؟"

"شکر ہے۔ دادی حج کرنے جارہی ہیں' تمہیں بہت دعا کہلائی ہے' امی نے بھی اور ہاں' وہ پچھلے دنوں تمہارے [illegible] ملتان آئے تھے۔"

"ملتان؟ [illegible] آئے تھے؟"

بے قرار ہوگئی۔ انہوں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔

"دراصل۔ وہ مکان کا سودا کرنے آئے تھے۔ سامان کچھ' فروخت کردیا' کچھ ضرورت مندوں میں بانٹ دیا اور یہ سامان' تاکید کرگئے تھے کہ جلد سے جلد ساہیوال پہنچا دوں' تمہارا سامان ہے' مجھے آنے میں ہی دیر ہوگئی۔ معذرت چاہتا ہوں۔"

اب وہ ماموں کی طرف متوجہ ہوئے۔

"میرا خیال ہے اب تو سامان اتروانے میں آپ کو [illegible]"

صبا سے کھڑا نہ ہوا گیا۔ وہ کرسی پر بیٹھ گئی' سر چکرانے لگا' مکان' ملتان' سامان' آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ ماموں ان کو چائے دے کر چند سوالات کرکے باہر چلے گئے۔ غالباً" ڈرائیور کو چائے دینے۔ ریحان اصغر نے اس کی طرف دیکھا۔ کچھ افسوس کے الفاظ بھی کہے' وہ سن نہ سکی۔

"امی بھی کہہ رہی تھیں' اب تو گھر بھی نہیں رہا' پھر بھلا تم کیا آؤگی۔ مگر۔ کبھی موقع ملے تو میاں کے [illegible] خوشی ہوگی' مرحومہ خالہ سے امی کی بڑی خالص دوستی تھی۔"

خالص دوستی' خالص محبت' خالص ممتا کہاں گئے یہ جذبے' باپ کی محبت کو کیا کہنا چاہیے۔ ممتا کے مقابلے میں' باپتا' باپتا' لاپتا' واہ رے ابا۔ مکان فروخت کرکے اسے بھی بکاؤ مال کی طرح پھینک دیا' بانٹ دیا۔

ماموں اندر آئے تو وہ وہیں اسی طرح بیٹھی تھی۔ خالی آنکھیں' خالی ذہن لیے مامی کی آوازیں آرہی تھیں۔ ماموں نے اسے لپٹا لیا۔ تو اس کے سوئے ہوئے ذہن نے انگڑائی لی۔ وہ ان سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ خوب روئی۔

"ماموں' میرا میکا ختم ہوگیا۔"

"کوئی بات نہیں بیٹا! میں جو ہوں' تمہاری ماں کا سگا بھائی' میرا گھر تمہارا میکا ہی ہے۔ بس کرو بھول جاؤ۔"

وہ ماموں کو کیسے بتاتی۔ بھول جانا بہت مشکل ہوتا ہے اور صبر۔ صبر تو اس میں تھا ہی نہیں۔ اماں ہمیشہ اس کے بے صبرے پن پر کہتی تھیں۔

"لڑکی میں صبر نہ ہو تو پھر اس میں اور لکڑی میں کیا فرق' دیکھنا اپنے بے صبرے پن سے کتنا نقصان اٹھاؤ گی' ہوش کرو۔"

ماموں اسے باہر لے آئے۔ سامان صحن اور برآمدے میں پھیلا پڑا تھا۔ مامی پریشان تھیں۔ کہاں رکھوائیں۔ اس سے پوچھا۔ وہ جل گئی۔ "جنوں والے کمرے میں رکھوادیں' وہ ہی استعمال کریں گے۔"

مامی بے ساختہ ہنس دیں۔ منہ پر ہاتھ رکھ کر رو دیں۔

"اے ہے۔ اللہ برتنا نصیب کرے' تمہارا جہیز ہے' تمہاری ماں نے کس شوق سے جمع کیا تھا۔ یہ ڈنر سیٹ تو میرے ساتھ جاکر ہی لیا تھا لاہور سے' اور یہ کمبل کوئٹہ سے منگوایا تھا۔"

مامی تفصیل بتانے کے موڈ میں تھیں۔ وہ اندر چلی گئی۔

ماموں نے کہا۔ "فی الحال اوپر ہی رکھوا دیتے ہیں' یہاں تو جگہ ہے نہیں' صوفہ چاہو تو ڈرائنگ روم میں رکھوالو۔"

وہ اندر بیٹھی آوازیں سنتی رہی۔ محلّے کے لڑکوں کو بلوا کر ماموں نے بکس اور مختلف ڈبے (بقول مامی کے اس کے جہیز کے) اوپر رکھوائے۔ صوفہ ڈرائنگ روم کی زینت بنا۔

ابا نے اپنا آخری فرض ادا کر دیا تھا۔ اس کا جہیز بھیج کر، اور خود وہ؟ کہاں تھے؟ باپتا؟ لاپتا؟ مامی کئی دفعہ گنوا چکی تھیں۔ ڈنر سیٹ، سلائی مشین کی۔ ٹوسٹر، شالیں، نان اسٹک دیگچیوں کا سیٹ، نہ جانے کیا کیا، عینی نے سن کر کہا۔

"ہائے، صبا چلو اوپر چل کر دیکھتے ہیں، کیا کیا چیزیں ہیں، مجھے بڑا شوق ہے جہیز دیکھنے کا۔"

"کیا؟ اوپر جنوں کے کمرے میں" صبا کی گھگھی بندھ گئی۔

"تو۔ دن کو وہ وہاں نہیں ہوتے۔ رات کا بسیرا ہے ان کا۔ دن میں تو میں چلی بھی جاتی ہوں، کچھ لینا، یا رکھوانا ہو۔"

مگر صبا کی اوپر جانے کی ہمت نہ تھی۔ اسے جنوں سے بہت ڈر لگتا تھا۔

عینی نے کئی بار پہلے بھی کہا تھا کہ چلو ٹیرس پر، پچھلی گلی میں شادی ہو رہی ہے، دوپہر کی بارات ہے۔ دولہا دیکھیں، ٹیرس سے سب صاف نظر آتا ہے۔

مگر صبا بھلا اوپر جاتی؟ سیڑھی پر قدم رکھنا، جنوں کو اپنے اوپر عاشق کروانا، اف توبہ، اماں کبھی اس کے سر میں تیل لگاتیں تو کہتی رہتیں۔

"صبا! بالوں کا خیال کر لیا کر، ورنہ بڑھاپا آنے تک گنجی ہو جائے گی، میری طرح اور بیٹا! ان کو سلجھا کر سمیٹ کر چوٹی بنایا کر، اتنے لمبے اور گھنے بالوں کے عاشق ہوتے ہیں جن، اگر کہیں نظر پڑ گئی ان کی تو بس چمٹ جائیں گے۔"

پھر وہ کتنے قصے سناتیں۔ اسے تو جنوں سے ڈر ہی نہیں، چڑ بھی تھی، بال بکھرا کر جھومتی ڈولتی لڑکیاں، فلموں اور ڈراموں میں ہی دیکھی تھیں۔ عاملوں کے ہاتھوں سے ڈنڈے کھاتیں، موٹی آواز میں بولتیں۔

"نہیں جاؤں گا، کبھی نہیں جاؤں گا۔" اور پھر دھوئیں کے مرغولے، نہ بابا نہ، [illegible] جن [illegible] نہیں کرانے۔

"اور اس جن کا کیا کرو گی، جو سویڈن گیا ہوا ہے۔" عینی اسے یاد دلاتی رہتی تھی۔

پھر اسے افسوس ہوا، دیکھ ہی لیتی کیا کیا بھیجا ہے ابا نے، اماں نے کتنی چیزیں تو خود اس کی پسند کی لی تھیں۔ وہ وال کلاک، سنہری حروف والا اور سرخ غلیچہ، جسے اماں تخت پوش کہتی تھیں۔ اوہ۔ اور [illegible] سب چیزیں اس کی پہنچ سے باہر تھیں۔ شاید جنوں کے تصرف میں۔ لاکر میں اس کا زیور تھا، پتا نہیں وہ بھی ہے یا نانی بیگم کے حوالے کر دیا۔

عینی اب فارغ تھی اور جہیز بنانے میں مصروف، صبا بھی اس کی مدد کر دیتی، دوپٹوں میں لیس ٹانکتی، کروشیے کی بیل بناتی، کبھی قمیص پر ستارے لگاتی [illegible] ڈیزائن بناتیں۔ وہ۔ بغیر لیس کے کچھ نہ انہوں نے صبا کو اوڑھنے دیے۔

☼ ☼ ☼

عینی کا رشتہ بھی آ گیا۔ ماں، بیٹی سر جوڑ کر مشورے کرتیں۔ ماموں نے سوچنے کے لیے وقت مانگا۔

دوپہر کا وقت تھا۔ دروازے پر کھٹ کھٹ ہوئی۔ مامی محلّے کے بچوں کو برا بھلا کہتی دروازے پر گئیں جو اسکول سے آتے ہی کرکٹ شروع کر دیتے اور وکٹیں ان کے دروازے کو بناتے۔ پھر گیند اندر آتی تو فیلڈنگ مامی کو کرنا پڑتی۔ گیند اٹھا کر دور پھینکتیں، کم بختوں کو کچھ دور تو بھگانا پڑے۔ امائیں بیٹوں کو بے مہار چھوڑ کر سیر کو نکل جاتیں، واہ! اچھی ڈیوٹی ہے، گلی کو میدان جنگ بنا دیا۔ توبہ، کس قدر کا شور۔

"ٹھہرو تو جاؤ بدذاتو! آج خبر لیتی ہوں۔"

جونہی دروازہ کھولا، کوئی ان سے بڑے زور سے لپٹا، چیخ نکل گئی، لڑکھڑا گئیں، زور لگا کر چھڑایا، پھر چیخیں، [illegible] تھی، خوشی سے معمور، پیچھے بیگ اٹھا کر اندر لا کر رکھ رہے تھے، وہ موسیٰ سے چمٹی ہوئی تھیں، ماں، خوشی سے بے قابو ماں۔

موسیٰ نے انہیں گود میں اٹھا لیا اور اندر لا کر چھوڑا، ماں کو شاباش دیتے ہوئے بھول گئیں کہ کیا کرنے گئی تھیں۔ عینی اور صبا آ گئیں، عینی تو بھائی سے لپٹ گئی، صبا دور کھڑی رہی۔

"ارے بابا!" "السلام علیکم، دیکھ لیں، کسی دم چھلے کے بغیر آ گیا ہوں، چھڑا چھانٹ، شاباشی دیں، مٹھائی بانٹیں۔" وہ ماموں کے سامنے جھکا، ماموں نے ہنس کر چپت رسید کیا۔

"بھوک، بھوک، سخت بھوکا ہوں جلدی سے کھانا دو، راستے میں کچھ کھایا ہی نہیں۔" مزے سے آرام کرسی پر گردن کے نیچے ہاتھ کیے لیٹا تھا، عینی برتن لگا رہی تھی، مامی نے صبا سے کہا۔

"[illegible]"

صبا نے روٹیاں پکائیں۔ میز کے گرد سب بیٹھے تھے، اس نے روٹیاں سامنے رکھ دیں۔ لگتا ہے اور پکانا پڑیں گی، ایسا ٹوٹ کر کھانے پر گرا، مر بھکوں کی طرح [illegible] رہا تھا۔ جلدی سے چار پھلکے مزید پکا لائی۔

"یہ ملازمہ نئی ہے، وہ بھی اتنی موٹی تازی، کام کیا [illegible] اینڈتی رہتی ہوگی، مٹھس۔"

[illegible] دیکھ بھی رہا تھا کہ اس پر کیا اثر ہو رہا ہے، عینی ہنس ہنس کے دہری ہو گئی۔ وہ پیر پٹختی کچن میں آئی۔ ہونہہ، بدتمیزی کی سند لایا ہے، مامی کو دیکھو، ڈانٹنے کے بجائے ہنس رہی ہیں، لاڈلا کہیں کا، میں [illegible] لگ رہی ہوں، وہ بھی نکمی مٹھس، اف، [illegible] رہی اور برتن ادھر ادھر پٹختی رہی۔

"دراصل اب جہاں سے میں آیا ہوں۔" "اف..." [illegible] کے پیچھے سے اچانک آواز سن کر اچھل [illegible] "وہاں سب اتنی گوری گوری گلابی گلابی نازک [illegible]یاں ہوتی ہیں۔"

[illegible] رہ گئی تھی، مگر اسے تو بات پوری کرنی ضروری تھی۔

"کہ میں سمجھا، چونکہ ہمارے ملک میں کھانے پینے کے، چوری چوری ہر چیز ٹھونسنے کے اتنے مواقع ہوتے ہیں کہ لازماً ملازمائیں صحت مند اور توانا ہوتی ہیں، ہوتی ہیں نا؟"

"تو۔ لے آتے وہاں سے نازک اندام گلابی گلابی ملازمہ۔ میں چھٹی کر لیتی۔" شدید غصہ تھا۔

وہ معذرت کرنے لگا، مگر صبا کا پارہ چڑھا تو کم ہی نہ ہو۔ عینی نے آکر صلح کروائی۔ مامی کو سخت تشویش۔ آمد کا پہلا دن اور بدمزگی سے آغاز، یہ کوئی اچھا شگون نہیں۔

ماموں مسکرائے۔ "بچے ہیں، خوشی میں کبھی کبھار ایسا بھی ہو جاتا ہے، ایک عمر کے ہیں، اس لیے۔" (مگر پہلے ہی دن) مامی منہ بنائے بیٹھی رہیں۔ یہ نہ سوچا پہل بھی تو آپ کے بیٹے نے کی ہے۔

☼ ☼ ☼

عینی کے لیے اقرار ہو گیا، پھر شادی کی تاریخ بھی ٹھہر گئی۔ ماموں پریشان تھے۔ اخراجات... جہیز... ٹولی جیسا تو کچھ نہ تھا۔ رخشی جتنا تو ہو اور ان کی طبیعت بھی خراب تھی۔ ایک دم انہوں نے طے کیا۔ عینی کے ساتھ صبا کی رخصتی بھی کر دی جائے تاکہ دونوں بچے کچھ سنجیدگی اختیار کریں۔ صبا تو اس بات پہ ہونق، مگر نندوں نے اس کی ایک نہ سنی۔ اسے دلہن کی طرح سجا کر چھوڑا اور عینی کے برابر بٹھا دیا۔ اسے سخت شرم آ رہی تھی۔

"لوگ کیا کہہ رہے ہوں گے۔"

"کہہ رہے ہوں گے بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔"

عینی کو شوخی سوجھ رہی تھی۔ "نہ میری رخصتی ہوتی، نہ تمہاری آج کے دن پتا نہیں۔ کب تک تمہیں انتظار کرنا پڑتا۔ ابا بہت ذہین ہیں۔"

ادھر عینی دولہا کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی۔ ادھر ٹولی، رخشی اور دوسری کزنز اس کے سامنے ڈانس کرتی تالیاں بجاتی گانے گاتی اسے اپنے جلو میں لے کر

چلیں۔
ماموں، مامی نے بہت خوش دلی سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعاؤں کے ساتھ رخصت کی اجازت دی۔ ابھی پھر سے یہ قافلہ آدھی مسافت طے کر پایا تھا کہ کسی کو یاد آیا۔
"دولہا... دولہا کہاں ہے۔ دولہا کے بغیر بھی کوئی رخصتی ہوتی ہے؟ بلاؤ۔" دولہا اپنی بہن کو دور تک رخصت کر کے آئے تھے۔ فوری بلاوے پر اندر آئے۔
صبا کو پھر ماموں کے پاس بٹھا دیا گیا۔ خدا خدا کر کے دولہا برآمد کیے گئے۔
"ہائے میں صدقے۔ کیسا شرمیلا دولہا ہے۔" ایک بڑی عمر کی کزن نے زور سے کہا۔ "دیکھو، پرانے زمانے کے دولہاؤں کی طرح منہ پر لال رومال رکھ کر آیا ہے۔"
"ہائے موسیٰ! یہ لال رومال کہاں سے لے لیا تم نے؟"
وہ صبا کے پاس آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ آخر اسی کو تو دلہن لے کر جانا تھی۔ منہ نہ کر دلا۔ "ہائے اللہ جی! بڑی آج آرہی ہے مجھے ہنسی اور یہ لال رومال عینی نے چلتے چلتے مجھے دے دیا، کہنے لگی بھیا تمہارے کام آئے گا، میں نے لے لیا۔"
"لو... سن لو، عینی نے کیوں دیا، اور اس کے پاس کہاں سے آیا۔"
"وہ... عینی کی ساس نے دیا تھا آنسو پونچھنے کے لیے۔ اس نے کہا۔ تم لے لو، میں تو رونے والی ہوں نہیں۔"
پھر وہ ہی گیت، تالیاں، رقص، دولہا، دلہن ساتھ ساتھ پیچھے پیچھے، یہ اور بات کہ شرمیلے دولہا نے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے دو بار اس کے بازو کو چٹکی کاٹی۔ ایک بار زور کا ٹہوکا دیا۔ چاہتی تو وہ بھی اس کے چٹکی لے سکتی تھی مگر اسے ابا، اماں کا غم کھائے لے رہا تھا۔ یہ ڈھکوسلہ اس کو پسند نہ تھا، مجبوری تھی۔
ابا کو خبر تک نہ ہوئی، بیٹی رخصت بھی ہو گئی۔

کمرے میں پہنچ کر بھی وہ چار ڈانس جیتا کیے گئے۔ آخر سب انہیں چھوڑ کر باہر نکل گئیں۔ اس نے سکھ کر سانس لیا اب وہ تھی اور اس کا نصیب۔ موسیٰ اترا اترا کر ادائیں دکھائے چلا جا رہا تھا۔ چھچھورپن، پھر اس کی بندروں جیسی حرکتوں پر ہنسی آگئی۔ مارے خوشی کے پلنگ پر قلابازیاں کھانے لگا۔
"مان گئی، مان گئی، میری دلہنیا۔" اس نے بھی موسیٰ کو تھپڑ رسید کر ہی دیا۔ عجب تماشے کر رہا تھا، فضول وہ اس کا تھپڑ کھا کر بدمزا نہ ہوا۔ خوش ہوا، پھر یک لخت پوچھنے لگا۔
"ارے یار! بھوک... تم نے کھانا کھا لیا؟" کھانے کی نوبت ہی کہاں آئی تھی۔ عینی کی رخصتی کے بعد کھانے کا پروگرام تھا۔ اس نے انکار میں گردن ہلائی۔
"اوہو... میرا خیال ہے کھانا کھا لیا جانا ہے، وا... [illegible] ... کہنے چلا، پلٹ کر کہا... [illegible] ... بھی لگی تھی مگر..."
"سب کہاں گئے؟" پکار رہی تھی۔
"کہیں کے دولہا، دلہن کس قدر بے صبرے ہیں کہنے دو کیا ہم رات بھر بھوکے رہیں گے۔"
وہ دونوں آگے پیچھے برآمدے میں پہنچے۔ سب کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔
"کسی نے پوچھا ہی نہیں کھانے کا۔" موسیٰ بول گیا۔ "کیا شادی کی رات کو فاقہ کرایا جاتا ہے۔ یہ سخت سزا ہے، اس پر نظر ثانی کی جائے۔"
"میں کھانا تمہارے کمرے میں بھجوا رہی تھی۔" مامی نے خفگی سے کہا، انہیں دلہن کی بے باکی پسند نہ آئی۔
وہ کرسی پر بیٹھ گئی، میز پر ان کے لیے کھانا رکھا گیا۔ اس سے تو شرم کی وجہ سے کھایا بھی نہیں گیا۔ مگر مہمان کھانا کھا کر جلدی ہی چلے گئے۔ رخشی، ثوبی خدا حافظ کہنے دروازے تک گئیں، تو جلدی جلدی صبا کھا ہی لیا۔ ماموں، مامی سونے چلے گئے تھے۔ ثوبی اور رخشی کے میاں ڈرائنگ روم میں تھے۔ وہ...

...دن میں چلی گئی تھی۔ موسیٰ بے فکری سے کمرا رہا تھا۔ صبا کو عجیب لگا وہ دن بس کوئی ان کے پاس ٹھہرا ہی نہیں کہ آخر وہ نئی تو دلہن، اس کی خاطر... وہ تو برتن سمیٹنے لگی تھی، شاید کچن میں پہنچا بھی دیتی مگر لہنگا، پھر موسیٰ نے بھی اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
"چلو بس کرو۔" وہ پھر کمرے میں آئے۔ وہ دروازے میں ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ جھجک رہی تھی۔
"میں... رات کے کپڑے تو بدل لوں۔" دروازے سے رکے دیکھ کر موسیٰ نے اشارے سے پوچھا تو اس نے فضول سا بہانہ کیا کپڑے بدلنے کا، خود شرمندہ بھی ہوئی۔
"اندر چلو، پھر بدل لینا، کیا یہیں کھڑے کھڑے بدلو گی میرے سامنے۔" اف بے شرم، چھچھورپن ختم... [illegible] ... وہ اندر آئی، ... [illegible] ... رات کے کپڑے کرسی پر رکھے نظر آئے۔ موسیٰ شوخی پر آمادہ تھا۔ وہ غصے میں تپ رہی۔ رات بھر دونوں لڑتے رہے۔ اسے موسیٰ کی کوئی ادا اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ بچکانہ چھیڑ چھاڑ فضول لگ رہی تھی۔
"میں تم سے نہیں... اپنی بیگم سے دو ماہ چھوٹا ہوں، ایک تختی لکھ کر گلے میں لٹکا دوں؟"
"تمیز سے بھی تو بات کر سکتے ہو۔" وہ جھینپ مٹا گئی۔
"اچھا... جی... آیا جان صاحبہ، اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ سے کچھ اپنی ذاتی... پرائیویٹ بات کر سکتا ہوں؟ بہت ہی خاص، ضروری، نازک اور اہم۔" قریب آکر بڑی مسکینی سے بولا کہ ہنسی آگئی۔ تکیہ اٹھا کر مارنا چاہا، جو اس نے بڑی مہارت سے کیچ کر لیا۔

☼ ☼ ☼

عینی کا ولیمہ دو دن بعد تھا۔ ماموں کو موسیٰ کے ولیمہ کی فکر تھی۔ مامی نے کہا۔ اگر ہم مہندی کے دن صبا کی رخصتی رکھ لیتے تو عینی کے بارات والے دن ولیمہ ہو جاتا۔ کفایت ہو جاتی۔ خیر اب اچانک پروگرام بنا ہے تو۔ ولیمہ موسیٰ کی نوکری لگ جانے کے بعد کریں گے۔ کچھ پیسے جمع ہو جائیں گے تو۔
بات آگے پر ٹل گئی۔ کسی کو بھی صبا کے ابا یاد نہ آئے۔ موسیٰ خوش تھا۔ وہ اسے سب کے سامنے بھی تنگ کرتا، کبھی پہلوان جی، کبھی استانی جی کہہ کر بلاتا۔
"ہر وقت سبق پڑھاتی رہتی ہیں محترمہ۔"
موسیٰ ملازمت کی تلاش میں تھا۔ جب بھی انٹرویو کے لیے کہیں جاتا، واپس آکر انٹرویو لینے والوں کی نقل کر کے سب کو ہنساتا، کبھی ان کے احمقانہ سوالات کو لطیفہ بنا دیتا۔ عینی آئی ہوئی تو وہ اور اس کا میاں بھی خوب ہنستے۔ عینی خوش تھی۔ اظفر اس کا شوہر بھی ہنس مکھ کھلنڈرا سا تھا۔
پھر آخر موسیٰ کو اس کی من پسند ملازمت مل گئی۔ مامی نے بہت خوشی منائی۔ سب جگہ مٹھائی بانٹی۔ بیٹیوں کو جوڑے دیے، صبا کو بھی۔
"ہائے بھیا۔ تم کتنے خوش قسمت ہو۔" عینی اپنا جوڑا لے کر بے حد خوش تھی۔ "ساری خواہشیں پوری ہو گئیں، حسین و جمیل من پسند دلہن بھی مفت میں مل گئی، اور اتنی اچھی ملازمت بھی۔"
"ابھی خواہشیں کب پوری ہوئی ہیں۔" وہ شکایتاً صبا کو دیکھ کر بڑبڑایا۔ "ابھی ایک اور خواہش ہے کہ جلدی سے ایک، دو بچے ہو جائیں، جلدی سے پھر انہیں گود میں لے کر باہر سیر کراؤں۔"
"ہائے بیٹے۔ ہو جائیں گے کیا فکر ہے۔" مامی بیٹے کی بے باکی پر شرما گئیں۔
"کب ہوں گے؟" روز پوچھتا ہوں، کوئی خبر ہے؟ بچوں کی تو الٹا مجھے مارنے کو دوڑتی ہے۔"
بہنوں کا ہنسی کے مارے برا حال، مامی منہ پر ہاتھ رکھ کر دوبارہ شرمائیں، صبا دوڑی دوسرے کمرے میں۔
"بیٹا! جلدی کاہے کی ہے۔"
"ہے نا امی! جلدی ہی ہے، جی چاہتا ہے صبح آنکھ کھلے تو برابر میں لیٹا انگوٹھا چوس رہا ہو۔"

"بے وقوف۔ اتنی جلدی تھوڑی ہوگا۔ ایک ذرا صبر۔"

"یہ جلدی ہے؟ دو مہینے ہو گئے ہیں۔" اس کی حیرت بہنوں کا ہنس ہنس کر دہرا ہونا۔

"سال دو سال، کبھی چار سال لگ جاتے ہیں بیٹا! اولاد والا ہونے بھی۔"

"کیا؟ چار سال؟" زور سے چیخا، ماں کا جملہ منہ میں ہی رہ گیا۔

"میں چار سال انتظار نہیں کروں گا، ہاں" مایوسی سے منہ لٹکا کر بیٹھ گیا۔

"ہائیں۔ قدرت کے نظام کو سمجھنے والا آج تک پیدا نہیں ہوا، ہم کیا چیز ہیں؟ انتظار تو کرنا ہوگا۔"

"میں دوسری شادی کرلوں گا۔" سامنے صبا کو گزرتے دیکھ لیا تھا۔ "مجھ سے انتظار نہیں ہوگا۔"

☼ ☼ ☼

ایک رات ماموں سوئے تو سوتے ہی رہ گئے۔ نہ کسی سے خدمت لی، نہ کسی کو تکلیف دی۔ صبا پر غم کا ایک اور پہاڑ آگرا۔ [illegible] ہائے اب کون ایسی محبت کرے گا۔ گھر میں سب سے بڑھ کر چاہنے والے، خیرخواہ، صبا کے اصلی ہمدرد اور سب سے قریبی عزیز۔

چند دن گھر میں سوگ رہا، پھر حالات معمول پر آگئے۔ مامی پر بہت ہی اثر رہا۔ صبا ان کے پاس بیٹھی رہتی۔ ان کے سر میں کنگھا کرتی، کمر دباتی، باتیں کرتی، وقت کسی طور گزر رہا تھا۔

بار بار ذہن میں موسیٰ کے الفاظ گردش کرتے، "میں دوسری شادی کرلوں گا۔" ہونہہ۔ کرلے پھر، وہ تو جیسے جھولی میں بھر کر بچے لائے گی۔ آتے ہی جھٹک کر جھولی خالی کرلے گی تو آدھی درجن بچے چیں، چیں کرتے انگوٹھا چوستے مل ہی جائیں گے۔

کئی دن موسیٰ سے بات چیت بند رہی، کچھ مصروفیت بھی تھی، تعزیت کے لیے لوگ آتے رہے، وہ ان کے پاس خاطر میں بیٹھی رہتی مامی کے ساتھ۔

پھر ایک دن کراچی سے کسی کا فون آیا۔ صبا نے سنا انجان آواز تھی، ماموں کی تعزیت کے لیے اکثر ایسے فون آتے ہی تھے۔ "صبا صاحبہ سے بات کرنا ہے۔"

"جی فرمائیے، بول رہی ہوں۔"

"وہ۔ ایسا ہے کہ آپ کے والد صاحب راشد فاروقی۔ فوت ہو گئے ہیں۔ انہوں نے آپ کا نمبر دیا تھا کہ ان کی بیماری کی خبر دے دوں، لیکن اسی رات وہ فوت ہو گئے، مجھے موقع نہیں ملا۔ دو دن ہو گئے ہیں آج ان کے قل ہیں، سوری کہ میں۔"

ریسیور اس کے ہاتھ سے پھسل گیا۔ وہ سر تھام کر وہیں بیٹھ گئی۔ دو دن ہو گئے ہیں، اگر اسی دن فون آتا پھر بھی۔ فوراً کراچی پہنچنا مشکل تھا۔ کیسے، کیسے ہوا یہ، بیماری کون سی بیماری، وہ تو کبھی بیمار نہیں ہوئے۔ عجیب ہی [illegible] بتایا۔ انہوں نے گلے لگا کر ہمدردی کی، وہ خود بھی بہت اکیلی سی ہو گئی تھیں۔ [illegible] کبھی کہتیں۔

"صبا! اپنے ماموں کو ماش کی دال نہ دینا۔ انہیں منع ہے۔" کبھی کہتیں "بیٹی! اپنے ابا کو بادام کا شربت بنا دو۔"

تیس سال کا ساتھ تھا، عادت پڑ چکی تھی، ابا نے بھی اماں کے ساتھ پچیس سال گزارے تھے۔ وہ تو دس سال بعد پیدا ہوئی تھی۔ اسی لیے لاڈلی تھی۔ پتا نہیں ابا بھی اماں کے بارے میں بھول سے کہتے ہوں گے۔

"رشیدہ بیگم! ایک کپ چائے کی طلب ہے۔"

مگر۔ اب تو ان کی دوسری بیگم ہیں۔ ہائے بے چاری، دوسری دفعہ بیوہ ہو گئیں۔ ان کی قسمت، سکھ تھوڑی بھی مل ہی لیتی۔ ابا سے بھی اور اماں دلہن سے دشمن تو نہیں ہو سکتیں، ابا کے خیال سے کچھ قدر کر ہی لیتیں۔

ابا نے تو اپنی زندگی سے خارج کر دیا تھا۔ کبھی بلانے یا ملنے کی کوشش ہی نہیں کی، بس اماں کا جمع کردہ اس کا سامان بھیج دیا۔ کیا گھر کی قیمت میں میرا حصہ نہ تھا۔ ابا ایسے تھے تو نہیں، شرمندگی کی وجہ سے پھر فون بھی نہیں کرسکے، مگر۔ لوگ دوسری شادی کر ہی لیتے ہیں۔ شرمندگی کی تو۔ بات نہ تھی۔ مجھے شاید محسوس ہوتی ہو، اگر ایک بار بھی بلاتے تو ماموں کے ساتھ چلی جاتی۔ ابا اس سے کہتے۔

"صبا بچی! ان سے ملو، یہ تمہاری اماں ہیں۔" میں کیا کرلیتی۔ سر جھکا کر ان کو سلام کرکے گلے لگ جاتی۔

"ابا کہتے دیکھا منور! (لالا جو بھی ان کا نام ہوگا، سکینہ، مومنہ، اللہ جانے۔) میں نہ کہتا تھا، میری بیٹی بہت اچھی ہے۔"

وہ بھی مجھے کبھی تو بلا ہی لیتیں، کم از کم اس موقع پر وہ کسی اجنبی سے یہ نہ سنتی کہ آپ کے والد فوت ہو گئے ہیں۔ (ویسے میں شاید اتنی بھی اچھی نہیں کہ ابا کا یہ دل دکھانے والا فعل نظر انداز کر دیتی، اب بھی نہیں کیا۔) زندگی بھر، یعنی اب تک ابا سے خفا ہی رہی۔ اب [illegible] کاش، سکھر جا کر ملنے آتی، کراچی کا پتا معلوم کر لیتی [illegible] نہیں پوچھا۔ ماموں سے کہتی وہ کسی ذریعے سے معلوم کرا لیتے۔

یہ پچھتاوا عجیب سا دکھ دے گیا۔ وہ جیسے پستی میں گرتی جا رہی تھی۔ لگتا تھا، جسم کا کوئی حصہ بے جان ہو گیا ہے۔ دل پر ایسا زخم لگا تھا، جو ابا کی موت کے غم سے بڑھ کر اذیت پہنچا رہا تھا۔ اپنی ضد، ایسی ضد کہ اتنا بڑا صدمہ پہنچا سکے گی۔ سوچا نہ تھا، اماں کی طرح کسی دن ابا بھی [illegible]

ماموں کے انتقال کی خبر بھی انہیں نہیں دی۔ کوشش سے تو ہر کسی کا پتا معلوم کیا جا سکتا ہے۔ ہائے یہ میں نے کیا کیا۔ موسیٰ اس کی خاموشی سے خائف تھا اور وہ چاہتی تھی وہ اسے بولنے پر مجبور کرے۔ دھاڑیں مار کر رونے کو جی چاہتا، مگر کوئی رونے بھی دے۔ موسیٰ کو خیال ہی نہیں آیا کہ اس کو اکسائے۔ رونے پر مجبور کرے۔ اس کے اندر پلنے والے غم کو باہر نکلنے کا راستہ بنائے۔

مامی بھی چند دن بعد بھول گئیں کہ اس پر ایک غم کا پہاڑ آگرا ہے۔ اس پہاڑ کے بوجھ کو ہٹانے کی سبیل کریں۔ شاید وہ یہ بھی بھول گئی ہوں، بس ایک ہی کام تھا۔

"موسیٰ کو فلاں چیز پسند ہے، وہ بنادو، موسیٰ کے لیے ڈھما کا پکا دو، موسیٰ کو وہ کھلا دو، یہ کھلا دو۔"

اور پھر ایک دن عینی آئی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے بھی آئی تھی، مگر اس نے ابا کی موت کا پرسہ نہ دیا۔ تولی، رخشی بھی آئی تھیں۔ چپ چپ تو تھیں، مگر۔ انہوں نے بھی کوئی دکھ یا ہمدردی کا اظہار نہیں کیا۔ گویا طے کر چکی تھیں کہ صبا سے راشد فاروقی کا تعلق ختم ہو چکا تو بھلا اسے کیا غم ہوگا۔ دنیا داری یا دکھاوے کو ہی کچھ ذکر کر لیتیں۔ وہ بھی اندر کا لاوا اگلتی۔ اندر ہی اندر پکتا رہا، اب تو دھواں دینے لگا تھا۔ شعلہ بھڑکنے میں شاید کوئی لمحہ، آتش فشاں پھٹنے میں بہانہ چاہیے تھا۔ اور وہ موقع عینی نے فراہم کر دیا۔ اسے بے زار خاموش تھکی تھکی سی دیکھ کر ازراہ ہمدردی پوچھ ہی لیا۔

"کیا بات ہے؟" کیسی بیمار بیمار لگ رہی ہو۔ اتنی چپ چپ اداس اداس۔

"اچھا۔" وہ بھڑک گئی۔ "تو باپ کے مرنے پر بھنگڑے ڈالے جاتے ہیں؟ خوشیاں مناتے ہیں؟ گانے گائے جاتے ہیں؟ آخر کیا کروں۔ جو سب کو پتا چلے، میں باپ کے مرنے پر بہت خوش ہوں۔ تم ہی بتاؤ۔ کیسے اپنی خوشی ظاہر کروں؟" اف آگ اگلتا لہجہ۔

عینی بری طرح گھبرا گئی۔ سٹپٹا کر بولی۔ "مگر۔ ان کی وفات کو تو مہینہ بھر ہو گیا ہے، میں سمجھی کہ۔"

"کہ میں بھول چکی۔" "اپنے اس باپ کو، جس کا چہرہ دیکھنا بھی نصیب نہیں ہوا، اس گھر میں آنے کے بعد۔ کیسا منحوس دن تھا وہ، جب میں وہاں سے آئی، میری بدنصیبی کا پہلا دن۔" اب آنسو بھی بے قابو تھے اور دل بھی۔

"ایسا تو نہ کہو صبا!" عینی نرمی سے سمجھانے لگی۔ "خدا نہ کرے کہ یہاں آنا منحوس ہوا ہو۔ ارے اللہ کی مرضی میں کس کا دخل۔ آخر ابا بھی تو ہمیں چھوڑ گئے۔ اب کیا ہم خود کو بدنصیب کہیں گے؟"

"نہیں۔ اللہ نہ کرے کہ تم لوگوں پر میرا سایہ بھی

پڑے۔ تمہارے ماشاءاللہ بھائی' بہن ہیں' ماں ہیں۔ نیکا سلامت ہے تمہارا۔ میرا تم سے کیا مقابلہ۔ میں تو اکیلی ہوں۔ ماں نہ باپ' نہ گھر ہی رہا۔ پتا نہیں میری زندگی کا اب کیا مقصد ہے۔ اللہ مجھے بھی اٹھا لیتا۔ کم از کم آج یوں تو نہ روتی' بلکہ ساری زندگی کا رونا ہے۔"

"صبر صبا! صبر میں اجر ہے۔ اتنی مایوسی کی کیا بات ہے؟ یہ گھر تمہارا ہے' تمہارا شوہر ہے' ہم سب تمہارے ہیں۔"

"ہونہہ۔۔۔ سب۔" وہ طنزاً بولی۔ "جب ماں' باپ ہی نہیں رہے تو اور کون اپنا ہوگا۔ شادی ہی ایسی منحوس ساعت میں ہوئی' اور۔۔۔ ملتان چھوڑ کر آنا بدنصیبی میں اضافہ ہوا۔ اے اللہ! مجھے اماں کے ساتھ ہی مر جانے دیا ہوتا۔"

اپنے مرنے کا تصور خاصا ہولناک اور اذیت ناک تھا۔ اماں کے جنازے کے ساتھ اس کے جنازے کا چنگ۔ وہ سفید کفن میں لپٹی پڑی ہے پھر اپنی موت پر وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ عینی کی سمجھ میں نہیں آیا' کیسے تسلی دے۔ مہینہ بھر میں ایک آواز نہ نکلی۔ وہ تو بات چھیڑ کر پچھتا رہی تھی کہ اچانک اسے ہوا کیا؟

"اچھا۔۔۔ بس۔ اب چپ ہو جاؤ۔ مرنے والے کو تکلیف ہوتی ہے۔ دیکھو بھیا تمہارا کتنا خیال رکھتے ہیں۔"

"خاک خیال رکھتے ہیں؟" وہ اور بھڑکی۔ "اسے کیا' میں مروں یا جیوں' اصل میں تو وہ ہی میری بربادی' بدنصیبی کا باعث ہے۔ نہ ماموں اس کا نام لیتے' نہ میں یہاں آتی۔ نہ ابا سے جدائی۔ وہ مجھے اپنے ساتھ ہی لے جاتے۔"

"لے جاتے' تو؟ کیا ہوتا؟ موت کا ایک دن مقرر ہے۔ وہ فوت ہو جاتے' تم اکیلی رہ جاتیں' پھر کہاں جاتیں؟ ظاہر ہے یہیں آنا تھا تمہیں' جب نہ سہی' اب سہی۔ بھیا کے ساتھ نکاح تو نصیب میں تھا' پھر بھی ہوتا' جب نہ سہی۔ اب۔"

صبا پر کچھ اثر ہوا' آہستہ سے بولی۔
"ابا کے ساتھ تو رہتی آخر وقت تک' پھر شاید۔۔۔ وہیں ملتان میں میری شادی کر دیتے" اپنے گھر میں رہتی' انہیں بھی شادی کی ضرورت نہ پڑتی' میں ان کی خدمت کرتی۔"

"یہاں۔۔۔ تمہیں کوئی تکلیف ہے؟"

"تکلیف؟ یہ کم ہے کہ مجھے ایسے آدمی کے ساتھ رہنا پڑ رہا ہے' جس سے شادی کا میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔"

وہ پھر جلال میں آ گئی۔ عینی ہکا بکا ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ بھی کبھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ صبا۔ اس طرح کہہ سکتی ہے۔ وہ پھر رو رہی تھی۔ عینی اسے چھوڑ کر دوسری طرف چلی گئی۔

زیادہ رونے سے' غصہ کرنے سے' طبیعت خراب ہو گئی' بوجھل بوجھل' وہ لیٹی تو غنودگی طاری ہو گئی۔ عینی نے کھانا بنایا' وہ یوں ہی پڑی رہی۔ شاید بلڈ پریشر لو تھا۔ آج تو بار بھی خوب' بجز اس نال [illegible] پھر کیوں اس قدر [illegible] رہی تھی [illegible] بھی نہیں کھایا گیا۔

موسیٰ نے اندر آ کر پوچھ لیا۔ "کھانا کیوں نہیں کھایا تم نے؟"

"بھوک نہیں ہے' تم نے کھا لیا؟"

"ہوں' کچھ کھا ہی لیا۔" وہ ست سا تھا۔

"تو بس کافی ہے' کھا تو لیا۔" وہ ترشی سے بولی' وہ کھڑا تھا۔ چپ چاپ' یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے' موسیٰ اور خاموشی۔

"صبا!" کچھ دیر بعد اس نے اسے پکارا' اور یہ پہلی بار تھا کہ وہ اس کا نام کسی لاحقے کے بغیر لے رہا تھا۔
وہ چونکی۔ "ہاں۔۔۔ کیا ہے؟"

"میں۔۔۔ دوپہر کو آیا تھا۔" کچھ سوچتے ہوئے اس نے کہا۔ "جب تم عینی کے ساتھ باتیں کر رہی تھیں' میں نے' وہ سب سن لیں۔" لہجہ بہت روکھا تھا۔ وہ دھک سے رہ گئی۔ ہائیں! یہ کیا ہوا؟

"تم۔۔۔ واقعی مجھ سے نفرت کرتی ہو؟" پوچھ رہا تھا۔ وہ چپ' کیا بولتی' اس نے کیوں سن لیا' میں اس قدر بکواس کرتی رہی۔

"جتنی بے زاری تم ظاہر کرتی ہو' کیا واقعی اتنی ہی بے زار ہو؟" "اف۔۔۔ سوال پہ سوال۔"

وہ چپ رہی تو پھر اپنا جملہ دہرایا' چڑ گئی۔ "جب سن لیا ہے تو تصدیق ضروری ہے؟"

"تمہیں۔۔۔ میرا ساتھ زندگی بھر کے لیے منظور ہے نہ گوارا ہے' ہیں نا؟ ایسا کچھ کہا تھا تم نے؟"

"میں جھٹلا نہیں سکتی' مگر مجھے کچھ یاد نہیں کہ غصے میں کیا کچھ کہہ دیا تھا' پلیز۔۔۔ میرے سر میں شدید درد ہے۔ طبیعت خراب ہے' مجھے سونے دو' سوال جواب نہ کرو۔"

کچھ دیر سناٹا سا چھا گیا' پھر وہ سو ہی گئی۔ سوتے میں اسے کچھ آوازیں تو اٹھا پٹخ کی سنائی دیں' پروانہ کی' اب وہ بھی غصے میں کچھ تو کرے گا۔

صبح سویرے آنکھ کھلی' تو وہ کمرے میں نہ تھا' اچھا [illegible] کمرے میں جا کر [illegible] اٹھ کے اماں [illegible] بلڈ [illegible] بھوک لگی تھی' کچن جا کر ٹھنڈا دودھ پی کر آ گئی۔ ابھی مامی یا عینی بیدار نہیں ہوئی تھیں۔ ویسے وہ کچھ بھی کہہ دیتی۔ موسیٰ لاکھ ست۔ کچھ کہتا نہ تھا۔ ہر بات مذاق میں اڑانے کی اس کی عادت تھی۔ وہ پھر لیٹی تو نیند آ گئی۔ کافی دیر بعد جاگی' سورج چمک رہا تھا۔

کچن میں آئی۔ عینی ناشتا بنا رہی تھی۔ اس سے بات نہیں کی۔ چپ چپ سی تھی۔ اسے ندامت ہو رہی تھی' کیا فضول باتیں عینی سے کی تھیں۔ اب نجانے کیسے ہو۔

"رات میرا بلڈ پریشر بہت لو تھا۔ بستر پر گری' تو ہوش نہ رہا۔"

عینی چپ چاپ پراٹھے بیلتی رہی۔

"سوری عینی! کل میں نے تم سے شاید کچھ غلط باتیں کر دی تھیں۔ غصہ آتا ہے تو میں پاگل ہو جاتی ہوں اور غم کے ساتھ غصہ بہت ہی برا۔"

"صرف غلط باتیں نہیں' تم نے بہت زیادہ غلط اور فضول باتیں کی تھیں' مگر اب کیا فائدہ؟"

یہ تو وہ بھی سمجھتی تھی کہ اب کوئی فائدہ معذرت کا نہیں' جو تیر کمان سے نکل گیا واپس نہیں آتا' لیکن دل کے زخم کا مداوا بھی تو کوئی نہیں۔ ابھی موسیٰ سے بھی معذرت کرنا ہے' وہ تو فوراً قبول کر لے گا اور پھر شروع کر دے گا' اپنی مزاحیہ حرکتیں' اف غلطی پہ غلطی کرتی جاتی ہوں۔ خیر۔"

"دراصل مجھے یہ دکھ بھی تھا کہ تم نے۔۔۔ کسی نے بھی مجھ سے ہمدردی اور تعزیت نہیں کی' مجھے بہت تکلیف پہنچی تھی' باپ تو پھر باپ ہی ہوتا ہے۔"

"ہم لوگ۔۔۔ صرف تمہیں مزید تکلیف پہنچنے کے خیال سے نہیں کہہ سکے۔ مگر تم نے بھی ذرا سا افسوس ظاہر نہیں کیا' اس لیے ہم چپ رہے کہ نہ جانے ذرا سا چھیڑنے سے تم پر کیا اثر ہوگا۔ ظاہر ہے جو صدمہ تمہیں ہوا ہے وہ کم تو نہیں' ہم بھی اس غم سے گزر چکے ہیں۔"

مامی بولتی ہوئی آ رہی تھیں۔ عینی چپ ہو گئی۔

"ارے اتنا وقت ہو گیا' چائے بن رہی ہے' یا پائے پک رہے ہیں اور یہ موسیٰ آج کیا چھٹی کرے گا۔"

"نہیں وہ تو کمرے میں نہیں' شاید آفس۔۔۔ میں دیر سے اٹھی ہوں' تو اس لیے۔"

کہنے کو کہہ دیا' مگر دل دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ صبح سویرے جب وہ اٹھی تھی' دودھ پینے آئی تھی' موسیٰ تو کمرے میں جب بھی نہ تھا' کیا آدھی رات کو آفس چلا گیا۔ ہائے اللہ! عینی کمرے میں جا کر دیکھ آئی۔ باتھ روم خالی تھا۔ شاید آفس جلدی جانا ہوگا۔ مامی اور عینی تو یہی سوچ کر چپ ہو گئیں' مگر صبا کو اندیشے ستانے لگے۔ خفا ہو کر گیا ہے۔ پتا نہیں اب کیا کرے گا؟ وہ کسی کو بتا بھی نہیں سکتی کہ ممکن ہے خفا ہو' ممکن ہے آفس جلدی جانا ہو' شام تک دل بے چین رہا۔ خوف کے مارے آفس فون بھی نہیں کیا۔ مامی شاید کر ہی لیتیں' مگر عینی کی چند سسرال والیاں آ گئیں۔

شام ہو گئی' آفس ٹائم گزر گیا۔ مامی کے حواس جواب دے گئے۔

"اتنی دیر' اتنی دیر تو کبھی نہیں ہوئی اسے' صبا! تم سے کچھ کہہ کر گیا ہے۔ آخر اتنے سویرے جانے کا

کوئی مقصد ہوگا' بتایا تھا؟"

"نہیں' مجھے کچھ نہیں بتایا۔"

وہ بار بار یقین دلاتی' کہیں گیا ہے تو فون کرے گا۔ مامی کو یقین تھا۔ مگر ماں کی ممتا کو قرار کہاں۔ آفس فون کیا' کسی نے اٹھایا ہی نہیں۔ مطلب خالی آفس ہے' نہ فون آیا' نہ خبر' قیامت کی رات تھی۔ پوری رات جاگتے گزری۔

☆ ☆ ☆

صبح صبا نے موسیٰ کی الماری کھولی۔ خوف ناک انکشاف' الماری خالی تھی' کپڑے' گرم سوٹ' جوتے' موزے کچھ نہ تھا۔ دو بیگ بھی اپنی جگہ پر نہ تھے۔ صبا کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

عینی آگئی' اس کی چیخ نکل گئی۔

"امی! بھیا کا پاسپورٹ بھی نہیں ہے' بٹوا نہیں' کچھ بھی نہیں' وہ سب کچھ لے کر گئے ہیں' ہائے امی! بھیا تو کہیں چلے گئے۔" عینی سر تھام کر بیٹھ گئی۔

صبح کا نور پوری کائنات کو روشن کر چکا تھا۔ اور صبا کا نصیب تاریک ہو گیا تھا۔ مامی صبا کے پیچھے پڑ گئیں۔ وہ کیا بتاتی۔ کچھ خبر ہو تو بتائے۔ وہ تو خود بھی ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کی تفسیر بنی بیٹھی تھی۔ اچانک عینی نے سر اٹھا کر کہا۔

"صبا۔۔۔ کہیں انہوں نے دوپہر کی تمہاری وہ باتیں تو نہیں سن لی تھیں؟ شاید دوپہر کو آئے ہوں' یہ ہی کہنے کہ انہیں کہیں جانا ہے۔"

"مگر۔۔۔ رات کو تو۔۔۔ یہیں تھے۔ کھانا کھایا تھا۔ تب کچھ تو بتاتے۔"

صبا کی جان پر بن گئی' مامی اسے کھا جانے نہیں بلکہ بھنبھوڑنے والی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ ان کے پوچھنے پر عینی نے سب کچھ بتا دیا۔ کیوں چھپاتی' اسے وہ باتیں زہر لگی تھیں تو موسیٰ کو تو۔

مامی کے غصے۔ طیش کی حد نہ رہی۔ وہ چیل کی طرح اس پر جھپٹیں۔ تھپڑوں سے اس کا منہ سجا دیا۔ با کیا طاقت تھی ان کے کمزور جثے میں۔ صبا جیسے پہلوان

کہہ کر موسیٰ مذاق اڑاتا تھا۔ کچھ سوء ادب اور کچھ نالائقی کے باعث' رات بھر کی جاگ' فکر پریشانی اور مامی کا جلال۔

"ضرور تو نے اس سے بھی کچھ بکواس کی ہوگی۔ (ہاں کی تھی' مگر بتا نہیں سکتی کہ کیا؟) "ہائے میرا بچہ' کہاں چلا گیا' اس منحوس کی وجہ سے۔"

کہہ کر پھر دو ہتھڑ رسید کیے۔ شور سن کر برابر والی رضیہ آپا آگئیں۔ وہ بھی دم بخود' جوان بیٹا سامان سمیت غائب اور گھر والوں کو خبر نہیں۔

"یہ کیسا جادو ہے' باپ کو مرے ابھی ایک سال ہی ہوا ہوگا' یہ نئی افتاد' ارے مگر بے چاری بہو کا کیا قصور ہے' مار مار کر منہ سجا دیا۔ وہ اف تک نہیں کر رہی۔ پٹ رہی ہے' بے چاری۔" انہیں صبا پر بہت ترس آ رہا تھا۔ مامی روتے روتے پھر اس کی طرف لپکیں۔ وہ تو رضیہ آپا نے اس کے سامنے آ کر بچا لیا۔ ورنہ وہ آج صبا کو [illegible] کر دیتیں۔ عینی زرد [illegible] اس میں سکت نہ تھی کہ ماں کو روک سکے۔

"یہ ہے میرے بچے کی دشمن' اسی نے کچھ کہا ہے' تب ہی وہ گھر سے نکل گیا۔ ارے یہ منحوس ہے' پہلے ماں کو کھا گئی' پھر ماموں اس کی نحوست کا شکار ہوئے۔ باپ کو بھی ہضم کر گئی اور اب میرے بچے کی دشمن ہو گئی۔ ہائے کہاں چلا گیا۔ میں اب اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی' رضیہ! تم سامنے سے ہٹو' اس نے سب کو کھا لیا۔"

"آپا! توبہ کریں' کوئی کسی کو نہیں کھاتا۔ سب اپنی موت مرتے ہیں' وہم نہ کریں۔ دعا کریں اللہ خیر رکھے۔ جب سامان لے کر گیا ہے تو اپنی مرضی سے گیا ہے نا۔ اس کا کیا قصور' اسے بتا کر جانا چاہیے تھا' اگر خفا بھی تھا تب بھی۔"

"بتایا ہوگا اس نے' اس مکار بھتنی کو' اس نے اس کو مجبور کیا ہوگا۔"

ثوبی' رخشی آگئیں۔ دونوں کے شوہر بھی آ گئے۔ پریشانی تھی' مگر وہ لوگ بھی یہ ہی کہتے رہے کہ اگر کوئی خفا ہو کر جاتا ہے تو کسی کو بتا کر جاتا ہے۔ پورے سامان

[illegible] تو نہیں جاتا اور پاسپورٹ بھی نہیں۔

وہ فون کرتے رہے۔ آفس سے بھی پتا نہ چلا۔ مگر مامی کو یقین تھا۔ ان کے بیٹے کو گھر سے نکلا دینے والی یہ ہے۔ انہیں اس کی صورت سے نفرت ہو گئی۔ آفس میں ایم ڈی چھٹی پر امریکہ گئے ہوئے تھے۔ پچھلے سب کے ملازمین کو کچھ علم نہ تھا۔

"دفع ہو جا۔ نکل میرے گھر سے۔" شام کو ہر طرف سے مایوسی کے بعد مامی کو از سر نو جوش آیا۔ "اب میں اسے بھی گھر سے نکالوں گی۔ میں اس کی صورت نہیں دیکھ سکتی' ہرگز نہیں' نکل یہاں سے۔"

ان کی تڑپ میں بے بسی تھی۔ غصہ اور ہیجان' صبا ان کے قدموں میں گر گئی۔

"مامی! میں سچ کہہ رہی ہوں مجھے نہیں پتا' میں نے [illegible] نہیں کیا' میرا یقین کریں۔" [illegible] "نکل' نکل ابھی نکل۔"

"مامی! میں آپ کی بیٹی ہوں۔ میرا اس گھر کے سوا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ میں کہاں جاؤں گی۔" بلک بلک کر گھگھیاتے ہوئے رو رو کر فریاد کر رہی تھی' مگر مامی جلاد بن چکی تھیں۔

عینی نے ماں کو پکڑا۔

ثوبی' رخشی نے بھی سمجھانا چاہا۔ شام ڈھل رہی تھی۔ صبا نیم بے ہوشی کی حالت میں تھی۔ پورا دن بغیر کھائے پیے گزر گیا تھا۔ وہ چیخ پکار سن رہی تھی' سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ پھر۔۔۔ رخشی سے مامی نے کہا۔

"اچھا۔ تم لوگوں کی وجہ سے اتنا کر سکتی ہوں' اس سے کہو اوپر کے کمرے میں چلی جائے۔ نیچے نظر آئی تو مجھے موسیٰ کے جانے کا دکھ اور بھی بڑھے گا۔ مجھے اب اس کی شکل نہیں دیکھنی۔"

صبا نے بے یقینی سے ان سب کو دیکھا۔ سب نے نظریں چرا لیں۔ مامی گھورتی رہیں۔

"ہاں۔ اب وہ ہی کمرہ تیرا ٹھکانا ہے۔ وہاں نہیں تو پھر کہیں بھی چلی جا۔"

صبا کے آنسو آبشار کی طرح بہہ رہے تھے۔ تینوں بہنیں ہائے ہائے کرتی ماں کو پکڑ کر اندر لے گئیں۔ صبا کے قدم اپنی جگہ جم گئے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا یہ کیا کہہ گئیں مامی۔ رضیہ آپا اس کا ہاتھ پکڑ کر زینے کی طرف لے چلیں۔ ان کے دل میں صبا کے لیے پیار امڈ رہا تھا۔ ترس اور ہمدردی کے علاوہ۔

وہ اسے تقریباً گھسیٹتی ہوئی لے گئیں۔ کمرہ دیکھ کر دکھ سے آب دیدہ ہو گئیں۔ کمرہ فضول کاٹھ کباڑ سے بھرا ہوا تھا۔ ٹوٹی کرسیاں' پرانا صوفہ' تختے' ایک بان کا پلنگ بالکل جھلنگا' صبا کو صوفے پر ٹکا کر انہوں نے چیزیں ادھر ادھر کر کے جگہ بنائی اور پلنگ کو لٹایا۔ اب بان کے پلنگوں کا رواج نہیں رہا۔ فوم کے گدوں والے بیڈ آ گئے ہیں۔ یہ پلنگ اسی لیے ڈال دیا گیا ہوگا۔ بے کار سمجھ کر' یہ کسے علم تھا کہ اس پلنگ کو اس گھر کی بہو کے لیے سنبھال کر رکھا گیا ہے۔

نیچے جا کر انہوں نے سب کے سامنے اس کمرے کی حالت زار کا نقشہ کھینچا۔ مامی نے چلا کر کہا۔

"کر لے گی خود کوئی انتظام' کوئی اس کا نوکر نہیں ہے۔"

وہ بستر پر بے حال لیٹی تھیں۔ ایک بیٹی سر دبا رہی تھی' دوسری پیر سہلا رہی تھی' رخشی نے کچھ دبی دبی آواز میں کہا۔

"اور وہاں تو پانی کا مٹکا بھی نہیں ہے۔"

"اور صبا کو جنوں سے کتنا ڈر لگتا ہے۔"

عینی نے بھی کچھ اثر ڈالنا چاہا مگر مامی کو اپنے بچے کی فکر کے آگے اور کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا' غصہ پھر بڑھ گیا۔

"ارے تو مرنے دو اسے' تمہیں اس کی فکر ہے اور میری جان سوکھ رہی ہے' ہائے میرا لاڈلا' کیا کہہ کر کمبخت نے اسے۔۔۔ اور تم کو قسم ہے میری جان کی' اگر تینوں میں سے کسی نے اس خبیث کو بلایا یا بات کی یا کوئی اوپر اس سے ملنے گیا' تم میرا مرا دیکھو' مجھے اس سے اب نہ ہمدردی ہے' نہ ہوگی' کوئی تعلق ہے نہ

ہو گا' ختم۔"

وہ پھر بستر پر گر گئیں۔ جوش میں اٹھ کر بیٹھ گئی تھیں۔ رخشی کے میاں نے ایک بالٹی بھر کر پانی اوپر پہنچا دیا۔ کمرے اور صبا کی حالت زار پر تاسف ہوا مگر ساس کے جلال کو دیکھ چکے تھے۔ عینی نے کھانا نکال دیا۔ کچھ بسکٹ اور ایک مگ میں دودھ بھی دے دیا۔ جگ میں پانی اور گلاس بھی' سب رضیہ آپا نے اوپر پہنچایا۔ وہ صوفے پر بے سدھ پڑی تھی۔ وہ اس کے پاس بیٹھ کر اس کا سر سہلاتی رہیں۔

"ہائے بے ماں' باپ کی بچی۔ مار' مار کر منہ تو کیا ہاتھ بھی سجا دیے بے چاری کے' کیا ظلم ہے' ارے یہ بھی کسی کی بیٹی ہے۔ ماموں کی روح قبر میں تڑپ گئی ہو گی۔"

صبا کو کچھ ہوش آیا۔ ادھر ادھر دیکھ کر چیخ ماری۔ جنوں کا کمرہ' رضیہ آپا کا ہاتھ پکڑ لیا' وہ تسلی دینے کے سوا کیا کرتیں' سمجھا بجھا کر زبردستی کچھ کھلایا۔ دودھ پلایا' مگر اس کا خوف کم کیا ہوتا' رات کی تاریکی میں اور بڑھ گیا۔

"رات کو یہاں جن رہتے ہیں' وہ آئیں گے۔"

"نہیں آئیں گے' اور کوئی جن یہاں ہے بھی نہیں' جہاں کوئی انسان ہو وہاں جنوں کا کیا کام۔ جن ہمیشہ خالی گھروں' خالی اور سنسان جگہوں میں رہتے ہیں۔ تم پر ترس بھی آ رہا ہے کیا کروں؟"

"آپا! ماں سے معافی دلوا دیں۔ میں نے کوئی ایسی بات نہیں کی جس کی وجہ سے موسیٰ کو جانا پڑا' مجھے کچھ معلوم نہیں' مجھے جنوں سے ڈر لگتا ہے' بالوں سے چمٹ گئے تو۔"

"دیکھو بیٹا! ابھی تو ان سے کچھ کہنا بے کار ہے' ہاں بیٹے کی خیریت کا فون آ گیا' تب شاید وہ مہربان ہو جائیں۔ ڈرو نہیں' جن کچھ نہیں کہتے' ہو ویسے بھی مشہور کر دیا جاتا ہے' ہوتے ہوا تے ہیں نہیں' خیر میں دیکھتی ہوں' آج تو تمہارے پاس سو جاتی ہوں' پھر۔"

انہوں نے مزید جگہ درست کی' کچھ چیزیں کمرے کے باہر ڈال دیں۔ صوفے کا جو ٹوٹا ہوا تھا اسی کو قابل استعمال بنایا۔ صبا نے ان کو یہ سب کرتے دیکھا تو ہمت کی' ملتان سے آئے ہوئے اس کے بکس یہیں رکھے تھے۔ ایک بکس کھول کر پلنگ کی چادر' تکیے نکالے' ایک تکیہ تہہ کر کے رضیہ آپا کو دیا' تکیے کی جگہ' پلنگ پر اپنے لیے چادر ڈال کر وہ اس پر لیٹی تو اندر دھنس گئی' بہت ہی جھولا سا تھا۔ اسے جاگتے دیکھ کر سمجھانے لگیں۔

"اب سو جاؤ' میں یہیں ہوں' مجال ہے کسی جن کی جو آئے۔ آیت الکرسی پڑھ کر حصار کر دیا ہے۔ اللہ حفاظت کرنے والا ہے۔"

وہ باتوں میں بہلاتی رہیں۔ رات کی تکان' دن کی مار پیٹ' جسم سارا شل ہو گیا تھا' مگر نیند آ ہی گئی۔ کمرے سے' اس ماں کا دل بدگمان تو ہو گا' اور ماں کبھی بیٹے کو قصوروار نہیں سمجھتی' حالانکہ یہاں بھی بہو سے زیادہ [illegible] ... جو کسی کو بتائے بغیر معلوم نہیں کہاں کے رفو چکر ہو گیا۔

✡ ✡ ✡

دن اور دو راتیں گزر گئیں۔ کہیں سے فون کر لیتا۔ ماں سے تو بات کر سکتا تھا مگر وہ اس معاملے میں کیا بولتیں۔ البتہ یہ سزا جو اس بے چاری کو دی گئی ہے۔ اس کی خطا سے زیادہ ہے۔

اجالا ہو گیا' تو اس کا ہاتھ پکڑ کر نیچے آ گئیں۔ وہ بہت ڈری ہوئی تھی' مگر رضیہ آپا کی وجہ سے آ گئی۔ عینی کچن میں تھی' صبا کو دیکھ کر ڈر گئی۔ تھپڑوں کی سرخی اس کے رخساروں پر سیاہی میں بدل گئی تھی۔ ایک آنکھ سوجی ہوئی تھی۔ آنکھوں تلے سرمئی غبار سا تھا' بال الجھے ہوئے۔ جسم سے ناتوانی ظاہر ہو رہی تھی۔

"اسے کچھ کھلا پلا دو' کہیں مر مرا گئی تو خون تمہاری گردن پر ہو گا۔ میں اب گھر جاتی ہوں۔"

انہوں نے کچھ احساس دلانا چاہا تھا۔ عینی کو بھی ترس آ گیا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر کرسی پر بٹھانے والی تھی کہ کمرے سے مامی نے چلانا شروع کر دیا۔

"[illegible] عینی اور تم نے اسے کچھ کھانے کو دیا' آج اس کا کھانا میرے گھر میں حرام ہے۔ کرے اپنا [illegible] انتظام' اب میں اسے اپنے کچن میں نہ دیکھوں' کھائے اگر ذرا کچھ چکھے بھی۔"

آواز تھی کہ نقارہ' لہجہ تھا جیسے خدائی فرمان' اف' اور اتنی نفرت' اگر کسی کا خیال تھا کہ مامی رات [illegible] کے بعد رویے میں لچک لے آئیں گی تو وہ [illegible] پر ہو سکتا ہے۔ صبا گھبرا گئی۔ عینی کا ہاتھ بھی اپنی [illegible] پر لٹک گیا۔ وہ اندھوں کی طرح کچن سے باہر آ گئی۔ رضیہ آپا فوراً مامی کے پاس جا کر اس کی حمایت اور [illegible] میں درخواست کر رہی تھیں' مگر مامی غرور و تکبر کی اونچی نشست پر تشریف فرما تھیں۔

"اتنی ہی ہمدردی ہے تو تم ہی اسے کھلا دو' مرتی ہے [illegible] اس کے لیے یہ ہی بہتر ہے' اس کے سب [illegible] ... [illegible] ... نہیں [illegible]۔"

جب تک وہ زینہ زینہ کر کے ہانپتی ہوئی اوپر پہنچی [illegible] ڈر تھا' خوف اور تنہائی' تب تک رضیہ آپا اس گھر [illegible] پار کر کے گلی میں اور پھر اپنے گھر میں پہنچ چکی تھیں۔

وہ صوفے پر گری' بے قراری سے رو رہی تھی' مگر [illegible] حال مانتا تھا کہ اس نے موسیٰ سے زیادتی کی ہے' [illegible] کوئی ایسی زیادتی نہ تھی۔ وہ شوہر تھا' اسے [illegible] رہنا چاہیے تھا۔ وہ تو اس کی رگ رگ سے [illegible] تھا۔ ایسی باتیں وہ کرتی رہتی تھی۔

"میں نے تو بھیا تمہاری ساس سے کہہ دیا' بہن نہ رازق ہو نہ رزاق' اللہ سب کا رازق ہے۔ اگر تم [illegible] ہو کہ تمہارے گھر سے اسے کچھ نہیں ملے گا۔ [illegible] بھوکی رہے گی' نہ اس بھول میں نہ رہنا' ناشتا کرو' [illegible] نے ابھی چائے دم کی تھی۔ گرم ہے اور بیٹی اب [illegible] کیا کرنا ہے' تمہاری ساس پاگل ہو گئی ہیں۔ ان [illegible] ان کا بیٹا ہے۔ وہ آئے گا' تب دماغ صحیح ہو گا ان

کا' ابھی تو نہیں ہو سکتا کچھ بھی۔"

اسے لگا وہ مر گئی۔ کیا تھا اگر ماں کے ساتھ ہی مر جاتی۔ مامی نے خدائی فرمان جاری کر دیا تھا اور وہ خود اتنی بے غیرت نہ تھی کہ حرام کھانے پر تیار ہوتی اب مجھے ان سے کچھ نہیں مانگنا' معافی نہ کھانا' بھوکی مر سکتی ہوں' حرام نہیں کھاؤں گی' وہ بلائیں گی' تب بھی نہیں۔

"فکر نہ کرو' اللہ مالک ہے' وہ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا' بس ہمت ہونی چاہیے' دوپہر کا کھانا بھی لے آؤں گی' رات کا بھی' تمہاری ساس ابھی تو مجھ سے کچھ نہیں کہیں گی۔ تمہارے ماموں کے میرے میاں اور میرے جیٹھ سے بہت اچھے تعلقات تھے۔ یہ بھی بہن بنی ہوئی تھیں میری۔ جو آج فرعون بن گئی ہیں۔ یہ ایسی نہیں تھیں' بس پتا نہیں یہ اولاد کیوں آزمائش بن جاتی ہے۔"

رضیہ آپا باتوں سے بہلا کر اسے خاصا کھلا چکی تھیں۔ گو کہ حلق میں انڈہ بھی پھنس رہا تھا۔ پر اتنا بھی' مگر پیٹ ظالم اور اگر ان کو بھی ذرا سا خیال تھا کہ مامی کچھ نرم پڑ جائیں گی۔ رخشی اور عینی تھوڑا بہت انہیں سمجھا رہی تھیں۔ مگر۔۔۔ یہ خیال خام تھا۔ رضیہ آپا پھر آؤں گی کہہ کر چلی گئیں۔

اکیلی' وحشت' تنہائی' وقت گزارنے کے لیے چیزیں ادھر ادھر ہٹانے لگی۔ کنارے لگا دیں' مگر اب بھی۔۔۔ وہاں بہت سامان تھا۔ شکر ہے کہ اس کے بکس یہاں پر تھے۔ اس نے تو کھول کر دیکھا بھی نہ تھا۔ اب بھی دل نہ چاہا۔ سلائی مشین البتہ رکھی تھی۔ دوپہر بھی ہو گئی۔ موسیٰ پتا نہیں کہاں ہو گا۔ کچھ اتا پتا' خیر خبر' اونہوں' اسے کون بتائے گا۔ رضیہ آپا کھانا لے آئیں' وہ شرمندہ ہو گئی۔

"آپا! آپ نے کیوں تکلیف کی' میں گزارا ہی لیتی آج کا دن' ناشتا بھی تو خاصا کر لیا تھا۔"

"ابھی میں تمہاری ساس کے پاس گئی تھی۔ ان سے بھی میں نے کہا۔"

"آپا... میں جو کچھ کر رہی ہوں۔ صرف انسانی رشتے اور اللہ کے خوف کے باعث‘ کل کو مجھ سے سوال ہوگا کہ تمہارا پڑوسی بھوکا سویا۔ اور تم نے پیٹ بھر کھانا کھایا۔ میرا صبا سے رشتہ نہ تعلق‘ جب سے آئی ہے شاید دو باتیں کبھی کرلی ہوں۔ ورنہ تم میری بہن میری پڑوسن‘ اگر صبا کو کچھ ہوگیا تو گناہ ہوگا تمہارے سر‘ اپنی قسم کا کفارہ دے کر اس کو معاف کردو‘ بلالو نیچے‘ انسانوں میں تو رہے‘ اکیلی اور باتھ روم تو بس ایک چھوٹی کوٹھڑی ہے۔ نلکا نہیں تو پانی کدھر سے آئے گا۔ کمرے میں پنکھا تک نہیں۔ جانور کو بھی پانی تو چاہیے‘ ہوا بھی‘ وہ تو انسان کا بچہ ہے‘ مگر تمہاری کٹر دل ساس‘ منہ پھیرے بیٹھی رہیں۔ میں نے عینی سے کہا‘ بیٹا تم گواہ رہنا‘ میں نے تو سمجھانے کی پوری کوشش کرلی‘ میں کسی طرح دال چٹنی لاکر کھلادوں تو کل کو یہ نہ کہنا میرا کوئی مفاد تھا۔ مار‘ مار کر اسے لجا دیا ہے۔ سارا بدن پھوڑے کی طرح دکھ رہا ہو تو تعجب کیا۔
بس عینی سر جھکائے چپ بیٹھی رہی۔
"آپا... آپ آئندہ ان سے کچھ نہ کہیں‘ مجھے دیکھنا ہے وہ کتنا ظلم کرسکتی ہیں۔"
ضد آجائے تو صبا پر جنون طاری ہوجاتا تھا۔ اب اسے ماں سے کچھ نہیں لینا۔ مگر رضیہ آپا پر کیا ذمے داری ہے‘ سوچتی رہی۔

موسیٰ کا فون آگیا۔ بہت مختصر بات کی۔ ایمرجنسی میں اچانک جانا پڑا۔ آفس والوں نے پہلے ہی بکنگ کرالی تھی۔ بتایا اس لیے نہیں کہ سب بہت رنجیدہ ہوں گے۔ آفس کے ایک کلرک کو ہی علم تھا۔ وہ باپ کی فوتگی پر چھٹی لے کر چلا گیا۔
بعد میں تفصیلی فون کرنے کا کہہ کر بند کردیا۔ عینی نے ماں سے صبا کو بلانے کا کہا۔ مگر وہ بھی ضدی تھیں۔ انہیں عینی نے جو صبا کی گفتگو کا بتایا تھا۔ وہ اسی پر یقین کیے ہوئے تھیں کہ ضرور صبا کی نفرت کے اظہار پر وہ گھر سے چلا گیا اور زبردستی آفس کا کام نکال کر جرمنی جارہا ہے‘ ورنہ یہ فون ایک دن پہلے کیوں نہیں کیا۔
وہ ہرگز معاف کرنے پر تیار نہ تھیں۔ جب تک موسیٰ از خود ان سے اس کی صفائی میں نہ کہے۔
اگلا فون اور بھی مختصر تھا۔ جرمنی پہنچ کر کیا تھا۔ صرف پہنچنے کی اطلاع دے کر بند کردیا۔ عینی نے چند غیر ضروری برتن بے کار سمجھ کر کونے میں ڈال دیے تھے۔ اٹھا کر زینے پر رکھ دیے۔ وہ پینے کے لیے پانی لینے نیچے آئی تو برتن اٹھا کرلے گئی۔ رضیہ آپا نے اسے پکانے کے لیے کچھ سودا لاکر دے دیا۔ آٹا چاول‘ دالیں‘ پیاز لہسن اور کچھ سالن کے مسالے۔
"یہ میں قرض سمجھ کر دے رہی ہوں۔" انہوں نے اسے تسلی دی۔ موسیٰ کے آنے کے بعد اس سے واپس لے لوں گی۔ ابھی ان سے کام چلاؤ۔ پھر اور لادوں گی‘ مگر تمہیں اپنے بارے میں اب سوچ لینا چاہیے۔ موسیٰ کا فون آگیا ہے۔ اور اس کی ماں [illegible] پڑھ رہی ہیں۔ [illegible] بتایا۔ وہ لوگ اس خوشی میں مٹھائی [illegible] کر آئے ہیں۔ مطلب ہے کہ وہ اب بھی اسی پر ڈٹی ہوئی ہیں ورنہ تمہیں بلالیتیں۔"
صبا دم بخود تھی۔ موسیٰ کا فون آگیا اور کسی نے [illegible] تک نہیں۔ اس نے کیا بتایا ہوگا۔ شاید میری شکایت کی ہوگی۔ تب ہی ماں نے اپنا فیصلہ نہیں بدلا۔ گویا اب سزا شروع ہوئی ہے‘ اصل سزا۔ موسیٰ کے اقرار کے بعد کہ وہ اسی کی نفرت کے سبب چلا گیا۔ اب کب تک یہاں رہنا ہوگا اور کیسے زندہ رہنا ممکن ہے۔ یہ سوالیہ نشان اسے پریشان کررہا تھا۔ رضیہ آپا کچھ نہ کچھ پکا ہوا کھانا بھی لے آتی تھیں‘ کبھی سبزی بھی دے جاتیں۔ اس دن آئیں تو کہنے لگیں۔
"منہ چھپا کر بیٹھنے سے مسئلے حل نہیں ہوتے۔ صبا اب تمہیں ہمت کرنی ہوگی۔ میری نند کا ایک اسکول ہے۔ نرگس نے بھی اس میں سروس کرلی ہے۔ انہیں کمپیوٹر ٹیچر... نہ ملی تو پھر بھی وہاں نوکری مل سکتی ہے‘ انہیں ضرورت ہے۔"
صبا کو یہ مشورہ پسند آیا۔ اسے ہاتھ پیر چلانے تھے۔

آگے زندگی اور مشکل ہوگی۔ شکر ہے کہ عینی ان [illegible] رہنے کے لیے آئی ہوئی تھی۔ اس کا شوہر [illegible] بارہ ماہ کے لیے ٹریننگ کے لیے ملائیشیا گیا ہوا تھا۔ وہ نظر بچا کر کبھی صبا کے کپڑے‘ جوتے‘ کبھی مختلف اشیا اوپر زینے پر رکھ دیتی یا رضیہ آپا کو دے دیتی۔ کبھی ٹھنڈا پانی [illegible] بھرا جگ بھی مل جاتا۔ وہ خود نیچے جاکر جگ بھر کر [illegible] چکروں میں بالٹی بھرتی تھی۔ پھر جو دو چار برتن تھے ان میں بھی بھر کر رکھتی‘ زینے کے اترنے چڑھنے میں سانس بے قابو ہوجاتا۔
رضیہ آپا پر بھی ترس آتا جو خاص اس کی خاطر آتی تھیں۔ کبھی کبھی دن میں ان کے کئی چکر لگ جاتے‘ وہ [illegible] سویرے تیار ہوکر نیچے آگئی۔
[illegible] کا چہرہ مرجھا گیا۔ اسکول کی پرنسپل بہت معقول اور سنجیدہ خاتون تھیں۔ اسکول بہت بڑا نہ سہی [illegible]
رضیہ آپا [illegible] خاموش رہیں۔ گھر واپس آئی بہت تھکی ہوئی سی لگی۔ عینی اسے ہولے ہولے چڑھتے دیکھ رہی تھی۔ ایک ایک سیڑھی کس مشکل سے اوپر [illegible] تھی وہ‘ عینی تاسف سے دیکھتی رہی۔ جاب مل [illegible] بھی‘ پوچھنے پر اس نے بتایا۔
[illegible] غلطی [illegible] کو کس سال تک پہنچا دیتی ہے۔ [illegible] نے ابھی تک صبا کے بارے میں کچھ نہیں کہا [illegible]۔ اس کے فون کے علاوہ دو‘ تین خط بھی آئے تھے۔ [illegible] سے تصویریں اس نے بھیجی تھیں۔ سب کو [illegible] یقین تھا کہ صبا کے کسی عمل کے سبب موسیٰ [illegible] سے جلاوطنی قبول کی ہے۔

✲ ✲ ✲

اپنی ہمت‘ حوصلہ اور قوت ارادی کے بل پر صبا نے [illegible] جانے کا سلسلہ شروع کردیا۔
[illegible] سے جہاں کچھ اطمینان ہوا‘ مشقت بڑھ گئی‘ [illegible] کر اوپر لے جانا‘ کھانا پکانا‘ اپنے لیے چائے کا انتظام‘ کبھی وہ راستے سے سبزی یا چٹنی یا دال لیتی ہوئی آتی‘ وہ لے کر اوپر جانا مرحلہ۔
ایک دن عینی نے پورا سودا منگا کر چپکے سے زینے پر رکھ دیا‘ سیڑھیوں کے موڑ پر‘ نیچے سے وہاں نظر نہیں پڑتی تھی۔ صبا نے اٹھالیا‘ مگر تنخواہ ملتے ہی رقم رضیہ خالہ کے ذریعے عینی کو دے دی۔
گرمی کی شدت اور کمرہ تندور بن جاتا۔ نرگس اسکول سے واپسی پر اسے اپنے ساتھ لے جاتی۔ کھانا بھی اپنے ساتھ بہ صد اصرار کھلاتی‘ کچھ دیر ٹھنڈے کمرے کی پنکھے کی ہوا میں وہ چند منٹ نیند کے مزے لے لیتی‘ پھر ہڑبڑا کر اٹھ جاتی۔ اس کا یہ عمل یعنی نرگس کے گھر کا چند منٹوں کا قیام بھی اس کا جرم نہ بن جائے۔
گھر میں موسیٰ کے ڈرافٹ آئے۔ ایک ملازمہ رکھ لی گئی تھی جو کھانا بنانے کے علاوہ اور کئی کام کرلیتی تھی۔ عینی چلی گئی۔ صبا کی صحت بھی خراب رہنے لگی۔ رضیہ آپا زبردستی اسے ڈاکٹر کے پاس لے گئیں۔ اس نے دواؤں کا لمبا کاغذ حوالے کیا اور ہدایتیں الگ‘ بہت کمزور ہو‘ خون کی کمی ہے‘ سیب کھاؤ‘ سیب کا جوس پیو‘ بچہ صحت مند ہے۔ اس کے لیے تم کو طاقت کی ضرورت ہوگی۔
دواؤں کے لانے کی نوبت ہی نہ آئی۔ رضیہ آپا نے زبردستی سیب خرید دیے‘ دواؤں کے لیے اتنی رقم نہ تھی۔ بمشکل دال روٹی پر گزارا ہو رہا تھا۔ مہنگائی‘ بچے کی خبر تو اسے تھی‘ کاش اس رات وہ موسیٰ کو بتا دیتی۔ اس رات جب وہ اس سے جواب طلب کررہا تھا۔
"تم مجھ سے اتنی نفرت کرتی ہو جتنی بے زاری ظاہر کرتی ہو واقعی اتنی ہی بے زار ہو۔ تمہیں میرا ساتھ زندگی بھر کے لیے منظور ہے نہ گوارا ہے؟"
کاش وہ غصے میں نہ آجاتی۔ فضول بکواس کے بجائے کہتی‘ میں تمہیں بتادوں گی یا کہتی چند دن بعد معلوم ہوجائے گا تمہیں مگر غصہ‘ ظالم غصہ واقعی کسی وجہ سے حرام قرار پایا ہے۔ عقل گم کردیتا ہے‘ بندے

دن تو گزر ہی رہے تھے' بچے بھی بڑے ہو رہے تھے۔ اگر کوئی اس سے پوچھ لیتا' اتنے کم پیسوں میں دو بچوں کے ساتھ کیسے گزارا کر لیتی ہو' وہ بتا نہ پاتی' وہ صرف اتنا بتا سکتی تھی کہ دو بچوں کے وزن کے ساتھ پیدل چلتی ہوئی وہ زینہ چڑھ کر اوپر آتی تو یاد آتا' پانی صبح ختم ہو گیا تھا۔ پھر بچوں کو پلنگ پر چھوڑ کر نیچے جا کر جگ بھر کر لانا' ایک مشکل اور اذیت ناک مشقت تھی' پھر۔ کھانا بنانا' خواہ وہ دال ہو' بچوں کا اکثر پیٹ نہ بھرتا' اور جب وہ دیکھتی موسیٰ کے بھیجے ہوئے ڈرافٹ گھر میں خوش حالی سجا رہے ہیں۔ اور وہ بھوکی ہے' نیا کچن تعمیر ہو رہا ہے' بچے بھوکے ہیں' اسے خود پر ترس آجاتا۔

پورے گھر میں ٹائلیں لگائی جا رہی تھیں۔ دروازے تبدیل ہوئے۔ اندر کی تبدیلی کا علم نہ تھا۔ مزدوروں کی آمدورفت بتا دیتی' اندر بھی کچھ ہو رہا ہے۔ رخشی' ثولی' یعنی بچوں سمیت آجاتیں' رونق ہو جاتی' ہنگامے جاگ اٹھتے' طرح طرح کے کھانوں کی خوشبوئیں اوپر کمرے میں کھڑکی کے ذریعے اندر آتیں' وہ کھڑکی بند کر دیتی۔

☆ ☆ ☆

دن گزرتے جا رہے تھے۔ کسی نہ کسی طرح بیماری' تکلیفیں' گرما کا موسم عذاب بن کر نازل ہوتا۔ کبھی لو کے تھپیڑے' کبھی حبس' دم گھونٹ دار' کبھی سردی سے بغیر چٹخنی کی کھڑکی دھماک سے کھل جاتی تو سرد ہوا جسم میں تیر کی طرح کھب جاتی۔ پھر وہ کس کس جتن سے اس کو بند کرتی۔

اب وہ اپنی کوئی بات' کوئی ضرورت رضیہ آپا سے نہ کہتی۔ انہوں نے آنا کم کر دیا تھا۔ گھٹنوں میں اتنی جان نہیں رہی تھی کہ زینہ چڑھ اتر سکیں۔ خود ہی کوئی ضرورت کا احساس کر کے بھجوا دیتیں' کبھی پکا ہوا کھانا' چائنیز چاول' چکن کارن سوپ' بچوں کے نام سے آجاتے۔ پانی کی وجہ سے اسے بہرحال نیچے جانا پڑتا تھا۔

سیڑھیوں کے نیچے ناہموار اتنی جس اس سے حوض کوثر تھا۔ غنیمت کہ مامی نے اسے نکلوا نہیں دیا۔ مامی کا سامنا ہونے پر وہ سلام ضرور کرتی تھی۔ ادھر جواب "دفع دور" کڑوا منہ بنا کر اندر چلی جاتیں۔ عتاب میں نظرثانی کی اب بھی گنجائش نہ تھی۔ ان چہرے کی خشونت آنکھوں میں نفرت اول دن کی طرح برقرار تھی۔

موسیٰ نے بھی شاید ایسی ہدایت دی ہو کہ اس کوئی نہ ملے یا کچھ بھی۔

کچھ دن سے طبیعت زیادہ خراب رہنے لگی۔ بخار آجاتا' السر کی تکلیف ہو گئی۔ رضیہ آپا کے نوٹ بخار کی عام گولیاں' کبھی کارآمد ہوتیں' کبھی بے کار۔ چھٹی کر نہیں سکتی تھی' تنخواہ کے کٹنے کے ڈر سے۔

گرمی کی چھٹیاں شروع ہو گئیں۔ پھر تو کوئی ... پڑا۔ وہ فری ن بھی خارش اسکول ... بچے داخل ہو گئے تھے۔ انہیں مجبوراً" لانا پڑتا۔ گرمی برداشت کرنی پڑی' مگر آرام مل گیا۔ جسمانی آرام اسکول جانے کی تھکن نہ تھی۔ لیکن گھر میں تو بچوں کا خیال کرنا پڑتا تھا۔

دو مہینے آخرکار شدید گرمی اور حبس کے نرغے میں کبھی میرس پر' کبھی زینے پر بیٹھ کر ہوا کے تھپیڑوں سے اتار دیتی۔ کمرہ تو تندور بنا ہوا تھا۔ بچے بھی ہر موسم کے عادی ہو گئے تھے۔ اب اسکول جانے کے لیے ان کے پاس کپڑے نہ تھے۔ پرانوں کو ہی درست کرنے کی کوشش کرتی۔ ملتان سے آئے بکسوں میں موسم کے ریشمی کپڑے تھے۔ وہ بھی اس نے سی کر سردیوں میں پہن کر کام چلا لیا تھا۔ مگر گرمی' اندھیرا نظر آتا ہر سو اس کے نصیب کی طرح۔

بخار شاید فکر کی وجہ سے اور السر ٹینشن کی وجہ سے زور پکڑ گیا۔ کمزوری' مایوسی' نرگس بہت خیر رکھتی تھی مگر اس کی شادی طے ہو گئی تھی۔ وہ اب شادی کی تیاری میں شاپنگ کرتی رہتی' اس کی شادی پر ... کے بیٹے سے ہوئی تھی' پھوپھی زاد تھا۔

ایک دن بیگ لے کر آگئی' آتے ہی اس نے بچوں کو پیار کیا۔ ان کے لیے کھانے پینے کی چیزیں لائی تھی۔ کچھ تو انہیں دیں' باقی ایک تختے پر رکھ دیں' بسکٹ وغیرہ۔ پھر صبا کو چھو کر دیکھا۔ متفکر ہوگئی۔

"پھر بخار چڑھالیا۔"

وہ نقاہت سے مسکرائی۔ اب وہ کبھی مسکرا دیتی' تو لگتا تھا' بسور رہی ہے' نرگس کو احساس ہوا اور تاسف۔

"صبا باجی! جب نکاح کے بعد آپ یہاں آئی تھیں' ہائے ہم سب محلے والی لڑکیاں دنگ رہ گئی تھیں کہ دنیا میں اتنا حسن بھی ہو سکتا ہے۔ سچ اب کوئی دیکھے تو پہچان نہ سکے۔"

"اچھا۔ چھوڑو' جس کام سے آئی ہو وہ بتاؤ' قصیدہ خوانی چھوڑو۔"

"اچھا تو سنیے۔ جناب ہوا یوں کہ ہماری۔ مطلب کہ میری پھوپھو' مطلب کہ پرنسپل صاحبہ۔ مطلب۔ ہماری ہونے والی ساس' آہم انہوں نے مجھے پچیس ہزار روپے بھیجے کہ میں اسکول ٹیچرز یعنی اپنی کولیگ کو ان پیسوں سے تحفے دوں۔ اپنی طرف سے' تو جناب میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا۔ میں نے کچھ ٹیچرز کے لیے ریشمی اور جارجٹ کے سوٹ لے لیے اور آپ کے اور سمیعہ اقبال کے لیے لان کے دو' دو سوٹ لے لیے۔ میں پوچھنے آئی ہوں کہ آپ ریشمی یا جارجٹ کے لینا پسند کریں گی یا لان کے؟ سمیعہ کی بھی شادی ہو رہی ہے۔ اس کے بھی ریشمی کپڑے بہت ہیں۔ اس نے خود کہا کہ اسے لان کے سوٹ لا دوں۔"

وہ اب جادو کا پٹارہ کھول رہی تھی۔ یعنی بیگ جس میں سے رنگ برنگے کپڑے نکل رہے تھے۔

"رہنے دو نرگس! مجھے پسند کر کے کیا کرنا ہے۔ جو تم دو گی وہ ہی ٹھیک ہوں گے۔" اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ واہ میرے مولا۔ تو کتنا مددگار اور مہربان ہے۔ کیسے لمحے بھر میں ساری فکر دور کر دیتا ہے۔ تیری شان کے کیا کہنے۔ نرگس کھل کر مسکرائی۔

"اور اگر میں بتا دوں' میں نے آپ کے لیے جو پسند کیے تھے وہ سلنے کے لیے دے بھی دیے درزی کو' تو آپ کو میری پسند قبول کرنی پڑے گی۔"

"اوہ۔ بسرو چشم۔ مجھے تم تمہاری پسند دونوں پر بھروسا ہے۔" وہ پھر مسکرائی۔ (یا بسوری)

"تو پھر۔ یہ لیں ان سوٹوں کے دوپٹے۔ امی کہہ رہی تھیں کہ سل کر آجائیں تب لے جانا' مگر داد دیں میری بے صبری کو۔"

"میں داد بھی دوں گی' شکریہ بھی کہ ملے سلائے مل رہے ہیں۔ میں واقعی مشین پر بیٹھنے کے لائق نہیں۔"

نرگس کے جانے کے بعد وہ خوب روئی۔ تشکر کے آنسو' اللہ بھی کیسا غریب پرور ہے۔ نہ جانے کتنوں کی مدد کرتا ہے۔ گو کہ [illegible] تم [illegible] مار کر رو گے۔ یہ دورہ اکثر اس پر پڑتا' جب بے بسی اور بے کسی حد کو پہنچ جاتی لیکن بچے سہم جاتے تھے' اس لیے ضبط کر لیتی۔

اسکول کھلنے سے دو دن پہلے' پھر تیز بخار ہو گیا۔ عموماً تو وہ نہا کر بخار کم کر لیتی تھی۔ مگر۔ تیز بخار' گھبراہٹ اتنی تھی کہ نیچے جا کر پانی لانے کی ہمت نہ ہوئی اور گھر میں پانی نہ تھا۔ اس کے پاس بخار کم کرنے کا یہ ہی علاج تھا۔

پانی تو چاہیے تھا۔ ایک جگ لا کر بالٹی میں ڈالا۔ دوبارہ دونوں جگ لے گئی۔ بالٹی اٹھا کر لانے کی سکت کہاں تھی۔ صبح بھی اتنی گرمی ہوتی تھی۔ رات بھر پسینے بچوں کے بھی بہتے۔ صبح نہانا ضروری ہوتا۔ جگ بھر کر بالٹی بھر لیتی۔ پھر پینے کے لیے بھی لانا ہوتا تھا۔ پانچواں چکر تھا کہ سچ مچ چکر آگیا۔ ریلنگ پکڑ لی۔ مگر قدم اکھڑ گئے تھے۔ ملازمہ ادھر سے گزری۔ اس نے جلدی سے پکڑ کر سیڑھی پر بٹھایا۔

"بہت تیز بخار ہے' بی بی! تم علاج کیوں نہیں کرتیں۔ ننھے ننھے بچے' تم مر گئیں تو کون سنبھالے گا۔ وہاں تو بیٹی رہ گئی' ہاں ننھے ننھے بچے کون پالے گا۔"

نیچے مائی ملازمہ پر برس رہی تھیں۔

"تو اس کی نوکر ہے' یا میری' اس کا کام کرنا ہے تو تنخواہ بھی اسی سے لے۔ (نقل کر کے) اوپر والی کو بخار ہے۔ تو میں کیا کروں؟"

"ہا۔ ہائے۔ بیگم صاحب جی۔ ننھے ننھے بچوں والی ہے۔ اوپر نلکا نہیں ہے۔ دس چکر پانی کے لیے کرتی ہے نمانی۔ اس کر کے میں نے پانی اوپر پہنچایا سی۔ کہیں پوڑیوں سے ڈگ کر مر مرا گئی' خیر؟"

"مرنے دے اسے۔ تو اس کی کون لگتی ہے؟ تیرا کیا واسطہ اس سے' بتا؟ کیا تعلق ہے تیرا اس سے بتا؟"

"چنگا جی۔ تسی کہندے او تے خیر' پر اللہ [illegible] بندے نا بندے [illegible] نیا ہے جی۔ [illegible]"

صبا کو ان کے توتے منصوبے لگنے پر سچ مچ ہنسی آگئی۔ رات پھر نہائی۔ تھوڑے پانی سے [illegible] کی۔ نیند بھی آگئی۔

صبح اسکول جانا تھا' چھٹیوں کے بعد پہلا دن' صبح بچوں کو نہلایا۔ پھر کچن میں جا کر رات کی روٹی کا ملیدہ بنا کر انہیں دے دیا۔ رات کو بچوں نے صرف دال کھائی تھی۔ جلدی سے دو روٹیاں پکا کر کپڑے میں لپیٹ کر رکھیں۔ اپنے لیے چائے بنالی' ذرا سا روٹی کا ٹکڑا رات کا بچا تھا۔ وہ ہی کھا لیا۔ دال تیار ہوئی تھی۔ مگر بگھارنے کا وقت نہ تھا۔ ایک تسلے میں پانی رکھ کر اس میں دال کی دیگچی رکھ دیتی تھی' کہ دوپہر تک خراب نہ ہو جائے۔ گو کہ پانی بھی گرم ہو ہی جاتا تھا۔ مگر دال ٹھنڈی ہونے کے بعد تسلے میں رکھنے سے بچت ہو جاتی۔ باہر نکلی تو نرگس مل گئی۔ اس نے رکشہ لگوالیا تھا۔ صبا اور بچے بھی بیٹھ گئے۔ شکر ادا کیا۔

موسیٰ کا اسٹیشن سے فون آیا تھا' پانچ سال بعد وہ کراچی سے ٹرین کے ذریعے ساہیوال آپہنچا تھا' اور پھر وہ گھر بھی آگیا۔ بے شمار سوٹ کیس' بیگ' تھیلے' ڈبے پورے صحن میں پھیلے پڑے تھے۔ وہ مائی سے لپٹ گیا تھا۔ آج اس نے یہ نہیں کہا' شاباشی دیں' کوکی دم چھلا لگا کر نہیں لایا۔ چھڑا چھانٹ آیا ہوں اور کہتا بھی کیسے۔ اس کی جرمن بیوی ساتھ آئی تھی۔

"عینی نہیں آئی؟ اس کے بیٹے کی سالگرہ کے لیے خصوصی طور پر آیا ہوں۔ ورنہ اگلے ہفتے آنے کا پروگرام تھا۔"

"لو عینی بھی آگئی۔ عینی نے بڑے فخر سے اپنے بھیا کو دیکھا۔ کتنا خوب صورت ہینڈسم اور معزز سا لگ رہا تھا۔ بھائی سے لپٹ گئی۔

"اور وہ تنک چڑھی استانی باجی کدھر ہیں؟" سوال تھا کہ بم' کہیں بارود پھٹا۔ سب دم بخود' مائی نے اس کے پیچھے کھڑی دبلی پتلی سن جیسے بالوں والی عورت کو دیکھا۔

"ارے یہ تعارف تو کرا موسیٰ!"

دیکھنے میں خاص نہ تھی' کرخت چہرہ تھا۔ مگر گوری تھی۔

"یہ روز' میری' میری بیوی تصویریں تو بھیجی تھیں میں نے۔"

"ہاں' ہاں' ہاں' بہنیں اس نئی آئی ہوئی گوری سے چمٹ گئیں۔ بوسے لیے جانے لگے۔

"عینی! صبا کدھر ہے۔" اشارے سے بھی پوچھا۔ عینی بوکھلا گئی۔

"وہ انہیں تو خبر بھی نہیں ہے شاید۔" وہ ہکلا گئی۔

"کیوں؟" وہ اس قدر زور سے چیخا کہ عینی ڈر گئی۔ اس نے اس خاص عورت کو دیکھا۔

"بتاؤ عینی! کیا وہ گھر میں نہیں ہے۔" عینی کو لگا کہ موسیٰ کو غصہ آگیا ہے۔

"ادھر مت دیکھو' عینی! مجھے بتاؤ روز میری اردو نہیں سمجھتی' کہاں ہے صبا؟"

"اوپر۔ اوپر کے کمرے میں' بھیا! وہ اوپر رہتی ہیں۔"

"کیا؟ جنوں کے کمرے میں؟ وہ تو بہت ڈرتی تھی' وہ وہاں' کیا' کیا مطلب ہے؟"

ماما آگے بڑھیں۔ "مجھ سے پوچھو میں بتاتی ہوں، جس دن تم بغیر کچھ بتائے کہیں غائب ہو گئے۔ مجھے پتا چلا کہ تم اس کی نفرت کی وجہ سے۔۔۔ تم نے اس کی بیٹی سے باتیں سن لی تھیں نا؟ تو تم سب چھوڑ چھاڑ چلے گئے، تو میں نے ہم سب نے اس سے تعلق ختم کر لیا۔ میں تو اسے گھر سے نکال رہی تھی، مگر پھر اسے اوپر کا کمرہ دے دیا۔ جب سے کوئی اس سے نہیں ملتا۔"

موسیٰ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ اس نے چکراتے ہوئے سر کو ادھر ادھر ہلایا۔ سہارے کے لیے کچھ تلاش کیا۔ سنہری ٹائلوں سے سجا چم چم کرتا صحن اور بد رنگ زینے کی ریلنگ۔ ہاتھ میں آئی وہی پکڑ کر سیڑھی پر گرا، دوران خون تیز ہو رہا تھا۔ کھڑا ہوا اور کسی سے کوئی سوال کیے بغیر دھم دھم کرتا زینہ چڑھ گیا۔ پیچھے اس کی جرمن بیوی بھی اسی رفتار سے اوپر گئی۔

ماں، بہنیں سراسیمگی کے عالم میں وہیں جم سی گئیں۔ پھر جیسے تھک کر کرسیوں پر لڑھک گئیں۔

موسیٰ نے انہیں حیران کر دیا تھا۔ موسیٰ نے اوپر جنوں کے کمرے کا دروازہ [illegible] دھکے سے کھولا۔ سامنے کا سین، حیران کن کم، پریشان کن زیادہ تھا۔ کسی ادنیٰ درجے کے ملازم کا سرونٹ کوارٹر بھی اس سے بہتر ہوتا ہے۔ پھٹی پرانی بد رنگ چادر زمین پر بچھی ہوئی تھی۔ اس کے اوپر دو بچے اپنے اسکول بیگ کھولے بیٹھے بڑی دل جمعی سے کاپیوں پر ڈرائنگ کر رہے تھے اور ایک بے حد پرانے بان کے جھولا پلنگ پر مٹی مٹی رنگت والی چادر پر ایک عورت بلکہ عورت کا ڈھانچہ پڑا تھا۔ بے سدھ، مٹیالی رنگت، مگر بخار کے باعث تمتمایا ہوا چہرہ۔ آنکھوں تلے سرمئی حلقے، سوکھے بازو پلنگ کی پٹی پر بے جان سے پڑے تھے۔ سانسوں کا زیروبم تیز تر۔ جرمن عورت نے آگے بڑھ کر اسے دیکھا۔ ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ حیران اور دہشت زدہ موسیٰ سے انگلش میں کہا۔

"بہت تیز بخار ہے۔ اسے ٹریٹمنٹ کی فوری ضرورت ہے۔ پانی، ٹھنڈا پانی فوراً لاؤ۔ یہ ہے کون؟"

ڈونگا بھر پانی تھا۔ وہ لے آیا۔ جرمن عورت نے نفی میں سر ہلایا۔ پھر اسے جگ نظر آیا۔ اس کا پانی ڈونگے میں ڈال کر اس نے اپنا رومال گیلا کر کے صبا کے ماتھے اور چہرے پر پھیرا۔ بچے حیرانی سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ پھر لڑکے نے جس کے ریشمی بال پسینے سے ماتھے پر چپکے ہوئے تھے، کھڑے ہو کر کہا۔

"انکل! آپ ہمارے لیے کھانا نکال دیں گے؟ ماما کی طبیعت بہت خراب ہے۔"

موسیٰ الجھی ہوئی نظروں سے بچے کو دیکھنے لگا "بیٹا آپ کون؟"

"میں احمد ہوں اور یہ میری بہن فاطمہ۔ انکل کچن ادھر ہے۔ بھوک لگی ہے تو۔۔۔" موسیٰ روبوٹ کی طرح کچن میں گھسا۔ بچہ ساتھ ساتھ ٹوٹا ہوا فرش [illegible] رہنے دیں۔ طبیعت ٹھیک ہوئی تو وہ اٹھ کر کھا لیں گی۔"

موسیٰ پر حیرت کے دروازے کھل رہے تھے۔ کون بچے ہیں، کس کے ہیں، اس قدر پراعتماد۔ پتلی بے رنگ دال، بچہ ایک چمچہ اسے دے رہا تھا۔ موسیٰ نے چمچے سے دال پلیٹ میں نکالی۔ بچے نے [illegible] دال کی مقدار کو چیک کیا۔ بڑے بوڑھوں کی طرح گردن ہلا کر کہا۔

"بس کافی ہے" پھر چنگیر کی طرف دیکھا۔ ایک کپڑے میں دو روٹیاں تھیں۔ بچے نے ایک لے لی۔

"یہ ماما کی ہے، ہم تو آدھی آدھی کھاتے ہیں۔"

"وہ جو بچی ہے کیا وہ۔۔۔"

"بچی؟" وہ مدبرانہ انداز میں مسکرایا۔ "وہ بچی نہیں ہے انکل، میری بھی استانی ہے، نام فاطمہ ہے، ماما کہتی ہیں آفت کی پڑیا ہے، ہم کھانا کھا لیں، آپ کا شکریہ، تھینک یو۔"

وہ دوسری پلیٹ میں روٹی رکھ کر واپس کمرے [illegible]

اسی چادر پر بیٹھ گیا۔ اس کی بہن نے بیگ میں [illegible] کتابیں جمع کر کے رکھ لی تھیں۔ دونوں بچے دال روٹی کھا رہے تھے۔ موسیٰ کو لگا وہ کسی غلط جگہ آ گیا ہے۔ کیا یہ صبا ہے؟ کوئی کس طرح اس قدر سوکھ سکتا ہے، وہ جو پہلوان، موٹی اور اسے وہ دبلی ہی اچھی لگتی تھی۔ اس سوکھے ڈھانچے میں زندگی بھی ہے یا۔۔۔ برداشت نہ ہوا تو وہ نیچے بھاگا، جہاں اس کی ماں اور بہنیں دم سادھے بیٹھی تھیں۔

"کوئی مجھے بتائے گا؟ آخر ہوا کیا ہے؟" اس نے جلتی آنکھوں سے ان تینوں کو دیکھا۔ ان کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ ہانپ رہا تھا۔ اسے یقین کیوں نہیں آتا کہ جس ڈھانچے کو وہ دیکھ کر آیا ہے، وہ صبا ہے، وہ کیسے صبا ہو سکتی ہے؟

"بس تم جو اس طرح چلے گئے، میں نے سزا کے طور پر اسے اوپر روانہ کیا، برداشت نہ تھی مجھے۔ آخر اس کے رویے اور [illegible] کی وجہ سے ہی تم مجھے بتائے بغیر گئے تھے نا؟"

"مگر میں نے فون پر بتایا تو تھا، اچانک آرڈر پر مجھے جانا پڑا۔"

"مگر تم نے کبھی صبا کا پوچھا ہی نہیں، کبھی اس سے بات کرنے کا نہیں کہا، پھر ہم کیا سمجھتے۔"

"مگر میں نے کبھی یہ بھی نہیں کہا کہ صبا کی وجہ سے [illegible]، میں کیا کروں، میں ضد میں اتنا عرصہ [illegible] رہا۔"

"تم نے کبھی خط میں بھی اس کا ذکر نہیں کیا، اس کے نام خط بھیجا، نہ ڈرافٹ، میں نے تو اس دن غصے میں مار مار کر اس کا بدن سجا دیا کہ کم بخت بول! تو نے کیا کہہ دیا جو میرا بچہ اس طرح چلا گیا، وہ یہ ہی کہتی رہی میں نے کچھ نہیں کیا، مجھے کچھ خبر نہیں، آخر وہ معافی کس بات کی مانگتی رہی، پھر میں نے سب سے کہہ دیا، کوئی میرا مرا ہوا منہ دیکھے اگر اس سے تعلق رکھو یا بات کرو۔"

"امی۔" وہ رو رہا تھا، بال نوچ رہا تھا۔ "ہاں خفا تھا میں، مگر اس کی وجہ سے جرمنی نہیں گیا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ صبا خود رابطہ کرے گی تو میں اس سے بات کروں گا، اس لیے خط لکھے، آپ کو، بہنی کو کہ وہ ایڈریس دیکھ لے، اور خط ہی لکھے۔ اگر فون نہیں کر سکتی، جب آپ سے فون پر بات ہو جاتی تھی، تو خط کی کیا ضرورت تھی، میں مرا تو نہیں تھا جو آپ نے میری صبا کو اپنے گھر اور زندگی سے خارج کر دیا۔ آخر کبھی مجھ سے پوچھا تو ہوتا، اف میری ضد۔"

"بس چپ، تم نے خود شک پیدا کیا۔ تم ہی کبھی پوچھ لیتے، میں نے تو اس کا کھانا بھی حرام کر دیا۔ اب نوکری کرتی ہے، اسی دن کہہ دیا۔ اپنا خود انتظام کر لو، یہاں کا کھانا حرام ہے، وہ دن آج کا دن۔" موسیٰ کے دل میں شگاف بڑھتا جا رہا تھا، ہاں غلطی اس کی بھی ہے، لیکن اس غلطی کا خمیازہ صبا بھگت رہی ہے، میری ماں اتنی ظالم کیسے ہو سکتی ہے۔

"بچے اسٹوڈنٹ ہیں کیا؟"

"اسی کے ہیں۔" اب امی کا لہجہ مدھم تھا۔ "بہنی کے بیٹے سے تین دن بڑے، ارے وہ کدھر ہے روزمیری۔"

امی کو غیر ملکی بہو کی فکر ہوئی۔ اور اسے یاد آیا، روزمیری ٹھنڈے پانی کا کہہ رہی تھی۔ وہ پانی لے کر اوپر پہنچا۔ اسے وہ ننھے بچے یاد آئے، پتلی دال سے آدھی آدھی روٹی کھانے والے وہ ننھے بچے جو اس کے اپنے تھے، اس گھر کی نسل، اب سین بدل گیا تھا، بچے کھڑے تھے، روزمیری سے ٹوٹی پھوٹی انگلش میں جتنی ان کو آتی تھی، سوال جواب کر رہے تھے۔ ٹھنڈا پانی بچوں نے بھی پیا اور صبا کے ماتھے، گردن، چہرے پر ٹھنڈک پہنچتے ہی وہ ایک دم بیٹھ گئی۔ سامنے موسیٰ تھا، ہڑبڑا گئی۔ کتنی دفعہ ایسا خواب، مگر موسیٰ اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا تھا۔

"کیسی ہو، یہ کیا کر لیا ہے؟" آواز اس کے گلے میں پھنس گئی تھی۔ صبا مسکرا دی۔ (بسوردی)

"تم۔۔۔ تم کب؟" وہ بال سمیٹتے ہوئے اٹھی۔ روزمیری پر نظر پڑی جو اب بھی اسے ہدایتیں دے رہی تھی، موسیٰ نے اسے ادھر متوجہ دیکھ کر بتایا۔ "یہ روزمیری ہے، میری جرمن بیوی۔" اور بغور اس کے

چہرے کے تاثر کو جانچا۔ کچھ نظر نہ آیا' خون ہوتا تو رنگ ہوتا۔
"اوہ' میں سمجھی ڈاکٹر ہیں۔" کیا شان بے نیازی تھی۔
موسیٰ کے چہرے پر ضبط کی سرخی تھی۔ "یہ ڈاکٹر ہی ہے' اس کا نام تو جرمن تلفظ میں بڑا سخت تھا۔ چرخ چوں' یا گالیڈا ٹائپ تھا۔ میں نے بدل دیا ہے اب یہ روزمیری ہے' اور روز... یہ صبا ہے۔" روزمیری کے منہ سے جرمن چیخ برآمد ہوئی۔ گو کہ یہ جملہ موسیٰ نے اردو میں بولا تھا' مگر وہ سمجھ گئی۔
"صبا! یہ خاص طور پر تم سے ملنے آئی تھی۔" موسیٰ کا لہجہ زخمی زخمی تھا۔
"یہ؟ صبا؟ جو تم کہتے تھے' حسین اتنی کہ چاند شرمائے' رنگ ایسا جیسے بہار میں کھلتا گلاب' اور... اور... موسیٰ! پانچ سالوں میں تمہاری ماں نے وینس کو کھنڈر بنا دیا' کیسے؟" اس کی حیرت کم نہیں ہو رہی تھی۔
"مجھے کسی نے کچھ نہیں بنایا میں جیسی تھی ویسی ہی ہوں' پلیز مجھے موضوعِ گفتگو نہ بنایا جائے' آپ نے میری خبر گیری کی' شکریہ۔ آپ لوگ نیچے جائیں' وہاں سب انتظار کر رہے ہوں گے۔"
بڑا ٹھنڈا لہجہ تھا' وہ پیر نیچے کر کے چپل تلاش کرنے لگی۔ موسیٰ جیسے برف تلے دب گیا۔ اس نے روزمیری کو اشارہ کیا' وہ تاسف سے اسے دیکھتی واپس جانے لگی'
"موسیٰ آگے تھا' اس نے سنا' بچہ کہہ رہا تھا۔
ماما! ہم نے کھانا کھا لیا' انکل سے میں نے کہا تو انہوں نے نکال کر دیا۔"
"تم نے تھینک یو بولا تھا؟"
"جی ماما۔"
موسیٰ صحن میں چکر لگا رہا تھا۔ گاہے گاہے نظر اٹھا کر اوپر کے کمرے کو دیکھتا۔ اور از سر نو پشیمان ہو کر بال نوچتا' ملازمہ اس کے پاس آ کر ٹھہر گئی۔
"صاحب جی اوپر والی بڑی غریبنی ہے' نالے بیمار ہوتا رہندی اے نمانی۔ اس کا علاج کروا دیں' دعائیں دے گی' اور جی اس کے باتھ روم میں نلکا ہوا دین' بخار میں بھی دس' دس چکر اوپر نیچے کے کرتی ہے' پانی کے لیے۔
پانی کا تو بڑا مسئلہ ہے جی' اللہ خوش ہو جائے گا۔" امی کی پکار پر وہ اندر چلی گئی۔
پنکھا نہیں' نل نہیں' پرانے کپڑے' پرانا بستر' دال روٹی' جھلنگا پلنگ' اور صحت... یہ میری محبت ہے' اسے میری محبت کی اتنی بڑی سزا دی ہے امی آپ نے' میں اسے کیا بتاؤں' اس کا سامنا کیسے کر سکوں گا۔ اس کی عقل خبط ہو کر رہ گئی' شرمندگی اور پچھتاوے' وہ صحن میں چکراتا رہا۔ اِدھر سے اُدھر' اُدھر سے اِدھر' ٹانگیں تھک گئیں' پھر ثوبی آ گئی' از سر نو خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ تینوں بہنوئی بھی آ گئے۔ کھانا شروع ہوا اس کے سامنے پلاسٹک کی پلیٹ آ گئی' پتلی دال۔
"ہم آدھی آدھی روٹی کھاتے ہیں۔" آنکھیں جلنے لگیں' [illegible] لقمہ منہ تک نہ [illegible] جا سکا۔ پلیٹ بھر بریانی لے کر اوپر آ گیا۔ امی جھلنگا پلنگ پر دائیں بائیں دونوں بچے' کمزور' نحیف اجڑی بجڑی۔
"بچوں کو کھانا کھلا دو۔" بڑے ضبط سے گزرنا پڑا تھا یہ جملہ کہتے ہوئے۔ اس نے موسیٰ کو دیکھا' پھر ذرا سا اٹھی۔
"تمہیں کسی نے بتایا نہیں' پانچ سال پہلے میرے لیے اس گھر کا کھانا حرام ہو چکا ہے' اور یہ میرے ہی بچے ہیں' اللہ کا لاکھ لاکھ احسان ہے' بچوں نے [illegible] آج تک ایک دانے کا احسان نہیں لیا' لے جاؤ۔ شہر میں بہت سے یتیم بچے ہیں اور یہ پہلی رات نہیں ہے' انہوں نے اس سے پہلے بھی کئی بار فاقے کیے ہیں' ہمارے لیے اب کچھ بھی پہلی بار نہیں' بھوک' پیاس' فاقہ۔" وہ بستر پر گر گئی۔
موسیٰ سنگین مجسمے کی طرح چند لمحے کھڑا رہا' پھر سکتہ ٹوٹا' اور وہ نیچے آ گیا۔ سب نے دیکھا۔ بریانی کی بھری پلیٹ' جوں کی توں واپس آ گئی ہے۔ موسیٰ پلیٹ میز پر رکھ کر باہر نکل گیا۔ اس نے ایک لقمہ بھی حلق سے نہیں اتارا تھا۔ ماں' بہنیں چور سی بن گئیں۔ روزمیری

اس کے پیچھے آئی تھی۔
"کیوں لے آئے واپس' دے کر آتے۔" وہ بھی تو آدھی روٹی اور دال کھاتا دیکھ چکی تھی۔ ہمدرد تو تھی اور دلی سے اسے ہمدردی ہی تھی۔ اس کے غم کو کم کرنے اس کے دکھ کا مداوا کرنے کے لیے ہی اس نے موسیٰ سے شادی کی تھی۔ وہ موسیٰ کے ہر غم کی رازدار تھی۔
"وہ سب سو چکے تھے۔" اس نے درد کی تیز لہر سینے میں محسوس کی اور آگے بڑھ گیا۔ امی نے شاید ثوبی کو اس کے پیچھے اسی لیے بھیجا کہ وہ موسیٰ کو بہلا لے گی۔ وہ ابھی تو آئی تھی اور دامادوں کے سامنے اس کو موسیٰ اور صبا کے بارے میں کچھ بتانا مناسب نہ تھا۔
وہ بیڈ روم میں چلا گیا۔ جہاں عینی اس کے سوٹ کیس رکھواتی رہی تھی۔ کمرہ بے حد اسٹائلش طریقے سے سجایا گیا تھا۔ قیمتی قالین' اور بیش قیمت پردے' [illegible] نازک شیڈز [illegible] بلب ہر شان [illegible] رہے تھے۔ ثوبی نے اندر آ کر خوش دلی سے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔
"ہاں' کیسا اپنا کمرہ' امی نے تمہاری شادی کا سنتے ہی گھر کو نیا نکور بنانے کا تہیہ کر لیا تھا۔ خاص طور پر روزمیری کے شایانِ شان' پسند آیا؟ اور یہ کمرہ بھی روزمیری کے لیے ہی سجایا گیا ہے' کھڑکیاں نکلوا کر' ولایتی درتے بنوائے ہیں۔"
"کیا روزمیری فرانس کی شہزادی ہے؟" وہ اکھڑ کر تو [illegible] بہن کے ساتھ یہ کیسا لہجہ تھا۔
"نہیں مگر' وہ ترقی یافتہ ملک کی لڑکی ہے۔ اسے ہمارا پرانا گھر کیا پسند آتا۔ آخر رہنا تو اس کو یہیں ہے' تو ذرا خوش ہو جائے۔"
"روزمیری... ایک کسان کی بیٹی ہے' جیسے ہمارے ملک کے کسان ہوتے ہیں غریب اور جاہل' وہ ایک نرس ہے' جیسی ہمارے ملک میں ہوتی ہیں' کم تعلیم یافتہ' مجبور' میں نے ایک معاہدے کے تحت شادی کی تھی۔ اسے تحفظ چاہیے تھا' مجھے رہائش' میں کسی سستے اپارٹمنٹ میں رہ سکتا تھا۔ مگر پیسے بھیجنے کے لیے کفایت کر کے رقم بھیجتا رہا اور یہاں میری کمائی' اُدھر کی محنت مشقت کی کمائی' یہاں چمک دار پتھر لگوا کر ضائع کی گئی۔"
بے حد غصے میں تھا' بلکہ غضب ناک' ثوبی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اسے اس رویے کی توقع نہ تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی۔ وہ صبا سے مل چکا ہے' وہ بچوں کو کسمپرسی کے عالم میں دال روٹی کھاتے اور اب ان کو فاقے سے کرتا دیکھ آیا ہے۔
"اور یوں بھی روزمیری یہاں رہنے کے لیے نہیں آئی۔ وہ صرف صبا سے ملنے' اسے دیکھنے آئی ہے۔"
اب ثوبی کے جھٹکے چھوٹ گئے۔ اس کا رنگ سفید پڑ گیا۔ "کیا وہ یہاں نہیں رہے گی؟"
"نہیں۔ پرسوں اس کی لاہور سے فلائٹ ہے' میں نے اسے طلاق دے دی ہے' معاہدے کے تحت۔"
ثوبی باجی کے پتھر ہونے کی باری آ گئی۔ وہ منہ اور آنکھیں کھولے اسے تعجب اور دکھ سے دیکھ رہی تھیں۔
"وہ صرف یہ دیکھنے آئی تھی کہ صبا کے ساتھ رہ سکے گی یا نہیں' مگر اس نے کہا۔ میں اپنی زندگی خطرے میں نہیں ڈال سکتی۔ جب صبا کے ساتھ ایسا سلوک ہو سکتا ہے تو غیر ملکی کو کیوں برداشت کیا جائے گا۔ ورنہ وہ شاید رہ جاتی' مگر بہت ڈر گئی ہے اور طلاق کے کاغذ ابھی میرے پاس ہیں' کل دستخط کر کے اس سے سائن کروا کر دے دوں گا۔"
وہ بستر پر لمبا لمبا لیٹ گیا' آنکھیں بند کر لیں گویا گڈ نائٹ اینڈ خدا حافظ' کوئی بات کرنے کے قابل اسے چھوڑا ہی نہیں' کتنے شوق سے لاہور کی شادی کا فنکشن ادھورا چھوڑ کر بھائی سے ملنے' اس سے جی بھر کر باتیں کرنے کے ارادے سے بھاگی بھاگی آئی تھی اور یہاں موسیٰ تو بدل ہی گیا' تینوں بہنیں دیر رات تک جاگتی رہیں اور حیران ہوتی رہیں۔ اگر انہوں نے بھی صبا کی رہائش دیکھ لی ہوتی وہ سمجھ جاتیں کہ موسیٰ کیوں ایسا ہو گیا ہے۔

☼ ☼ ☼

صبح سب کی دیر سے ہوئی۔ امی ملازمہ کے ساتھ ناشتے کی تیاری کر رہی تھیں۔ میز پر انواع و اقسام کے ناشتے کا سامان موجود تھا۔ حلوہ پوری، چنے، آلو پراٹھے، آملیٹ، ڈبل روٹی کے سلائس، فرائی انڈے، کیا معلوم گوری بہو کو کیا پسند آئے۔ موسیٰ نے ناگواری ظاہر کی۔ اس نے صرف ایک سلائس اور انڈا لیا۔ چائے لے کر برآمدے میں جا بیٹھا۔ امی پیچھے آگئیں۔

"بیٹا، میرے لال، میرے چندا! تم نے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔ رات بھی کھانا نہیں کھایا۔ میں نے اتنے شوق سے سب بنوایا تھا تو کچھ ماں کی خاطر ہی کچھ کھا لیتے۔"

"کھا تو لیا تھا رات کو ماں کا دیا ہوا صدمہ، غم، افسوس اور پچھتاوے۔" (تلافی کیسے ہو؟) امی کا اس کے کندھے پر رینگتا پیار بھرا ہاتھ ساکت ہو گیا۔ رخشی نے موسیٰ سے پوچھ ہی لیا۔

"ہمارے لیے کیا لائے ہو، روز کہہ رہی تھی بہت تحفے لیے ہیں تم نے سب کے لیے۔ تم گئے ہو تو میرا ایک بیٹا تھا۔ اب تین ہیں، اور جینی کا بھی ایک، شلی باجی۔۔۔"

موسیٰ کھڑا ہو گیا، وہ کسی بات میں دلچسپی لینے کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ کمرے سے دو سوٹ کیس کھینچ لایا، ایک بیگ بھی، جینی خوش تھی، دو دن بعد اس کے بیٹے کی سالگرہ ہے۔ سسرال میں شو مارنے کا خوب موقع ملے گا۔ کتنے اچھے موقع پر بھیا آئے ہیں۔ سب کے لیے ہی کچھ نہ کچھ تھا۔ مگر روزمیری سے بقیہ سوٹ کیسوں، بیگوں کی بابت پوچھا۔ اس نے لاپروائی سے گردن ہلائی۔

"وہ سب موسیٰ اور صبا کے لیے ہیں۔" وہ چپ کی چپ رہ گئیں۔

موسیٰ اپنے بیڈ روم کے آگے برآمدے میں کرسی پر بیٹھا تھا۔ صحن میں چمکتے دمکتے ٹائل شعاعیں بکھیر رہے تھے۔ پورا گھر قیمتی خوب صورت اشیا سے سجا دیا گیا تھا۔

کیا انسانیت کے ناتے موسیٰ کے بچوں کو چھت کا

چکا تھا بھی صبا کو کسی بستر پر لٹا کر ہی "یہ کیا کر دیا میں نے" وہ ہونٹ کاٹنے لگا۔ اب ہمت ہی نہ تھی کہ اوپر جا کر دیکھے، معذرت کرے یا تلافی۔ دروازے کی گھنٹی وہ ہی پرانی تھی۔ تیز آواز والی۔ موسیٰ گھبرا کر کھڑا ہوا، ملازمہ دروازہ کھولنے گئی تھی۔ ایک لڑکی، سفید چادر میں چہرہ چھپائے سیدھی اسی کی طرف آرہی تھی، وہ آگے بڑھا۔ "موسیٰ بھائی!" اس نے بے تکلف لہجے میں اسے پکارا تھا۔ موسیٰ تو پہچانتا نہ تھا اور پہچانتا بھی کیسے۔ اس کا چہرہ چادر میں تھا۔ بس آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ شفاف بے ریا۔

"میں۔۔۔ ادھر ساتھ والے گھر میں رہتی ہوں۔ آپ نہیں جانتے شاید، میں رضیہ آپا کی بیٹی ہوں۔" (تعارف مکمل ہو گیا، آگے۔) میں ٹوئنکل ٹوئنکل لٹل اسٹار اسکول میں پڑھاتی ہوں۔ (ہم؟ میں کیا کروں؟)

"صبا آپی بھی اسی اسکول میں [illegible] ہیں۔" (اوہ) "آج بھی وہ تیز بخار میں اسکول آگئیں اور وہاں انہیں خون کی الٹی ہوئی ہے۔ وہ اس وقت اسپتال میں ہیں۔ پلیز انہیں بچا لیں۔" اس کا لہجہ درد بھرا، آواز آنسوؤں میں بھیگی بھیگی تھی، وہ باہر لپکا۔

"پلیز بھائی! کچھ رقم رکھ لیجیے۔" وہ اسی بھیگی آواز میں کہہ رہی تھی۔ "میں نے رکشہ روکا ہوا ہے، آجائیے۔"

موسیٰ نے جیب پر ہاتھ مارا۔ بڑا محسوس کیا، وہ اس کے ساتھ صحن پار کر رہا تھا۔ روزمیری شاید کچھ سمجھ گئی تھی۔ وہ بھی لپکی چلی آئی۔ اسپتال کے کوریڈور میں ایک ہجوم اکٹھا تھا۔ لباس سے یونیفارم سے پہچانا جاسکتا تھا۔ ٹیچرز اور طالب علم طالبات۔ فق چہرے اور پریشانی آنکھوں میں۔ سفید کوٹ پہنے بڑی عمر کی ڈاکٹر تیز لہجے میں ایک سفید ساڑھی والی سنجیدہ اور بہت پریشان خاتون پر برس رہی تھی۔

"آپ لوگ تعلیم یافتہ ہو کر جہالت کا ثبوت کیوں دیتے ہیں؟ مریضہ کی حالت دیکھی ہے آپ نے؟ نہ جانے کب سے فاقے کر رہی ہے اور اگر اسے کچھ

ہو جاتا تو آپ لوگ ڈاکٹر کو الزام دیتے میں ذرا نہ ہچکچاتے۔ پہلے مریض کو لب دم کرو، پھر اسپتال لاؤ، وہ مر جائے تو ڈاکٹروں کی غفلت کہہ کر احتجاج کرو۔ السر نہ جانے کب سے پک رہا ہے۔ کیا آپ نے کبھی اس کا چیک اپ بھی نہیں کرایا؟ علاج نہیں کرا سکتے تو زہر دے کر مار دیں، ڈاکٹر کو ذمہ دار نہ بنائیں۔ شکر کریں کہ ابھی السر ہی تھا، جو پھٹ گیا، فوری ٹریٹمنٹ نے بچا لیا ہے۔ اگر کچھ دن اور بغیر علاج کے رہتی تو کینسر ہو سکتا تھا۔ اور وہ بچے، پلیز ان کو وہاں سے ہٹائیں، ماں کا ہاتھ پکڑے روئے جا رہے ہیں اور ماں کو کچھ ہو جاتا تو پوری زندگی روتے۔"

پورا لیکچر جھاڑ کر ہاتھ ہلاتی ڈاکٹر مڑ کر چلی گئی۔ نرس نے چپکے سے امی ساس کا تعارف کرایا، پرنسپل صاحبہ ہیں۔ ڈاکٹر ان کو صبا آپا کی ساس [illegible] تعارف کرایا۔ "آپ [illegible]" [illegible] ہو گئی تھی۔ مگر موسیٰ سے بات کرتے ہی وہ اپنی فکر اور [illegible] پر قابو نہ پا سکیں۔ "ڈاکٹر نے کیا سنائی ہے [illegible] کچھ سننا پڑ رہا ہے جبکہ اس خطاب کے مستحق آپ ہیں۔ نرگس جاؤ، انہیں لے جاؤ، اس کے پاس، خون کی الٹی ہوئی تو میرے خدا میں تو سمجھی بس ختم۔"

کہتی ہوئی وہ اسکول کے متاثرین کو جلوس کی شکل میں لے کر گیٹ کی طرف چلی گئیں۔ نرگس انہیں لے کر جنرل وارڈ میں آئی۔ ایک بیڈ پر صبا کا جسد پڑا تھا۔ ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ دائیں بائیں دونوں بچوں نے ایک ایک ہاتھ ماں کا تھاما ہوا تھا۔ ماما، ماما کے سوا اور کچھ ان کے منہ سے نکل ہی نہیں رہا تھا۔ آنسوؤں کے نشانات ان کے گالوں پر ابھی بھی نظر آرہے تھے۔ نہ جانے کب سے اور کب تک روتے رہے تھے۔ رضیہ آپا اس کے سرہانے کھڑی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ صبا کا ماتھا سہلا رہی تھیں۔ موسیٰ انہیں تو پہچانتا تھا۔ اشارے سے سلام کیا۔ صبا آج کل سے بھی زیادہ نحیف تھی۔ روزمیری موسیٰ کا بازو

پکڑے کھڑی تھی۔ بے حد دہشت زدہ تھی۔ صبا کو دیکھ کر اس کی آنکھیں بہنے لگی تھیں۔ پھر وہ موسیٰ کے پاس سے ہٹ کر صبا کے سرہانے گئی۔ چارٹ اٹھا کر پڑھتی رہی، پھر اس نے باری باری دونوں بچوں کو پیار کیا۔ صبا کا سانس چل رہا تھا، اس لیے اسے زندہ کہا جاسکتا تھا۔ ورنہ اس کے جسم میں خون تھا نہ گوشت، صرف ہڈیاں، دہشت، خوف، مایوسی، موسیٰ کے جسم کا رواں رواں کھڑا ہو گیا۔ یہ ڈھانچہ، سانس نہ چل رہا ہو تو اسے لاش ہی کہتے ہیں۔

ایک اور ڈاکٹر وارڈ میں داخل ہوئی۔ "بچوں کو یہاں سے لے جائیں۔" اس نے نرمی سے موسیٰ سے کہا۔ "پلیز۔۔۔ برا نہ لگائیں۔ یہ جنرل وارڈ ہے۔ مریض ڈسٹرب ہوتے ہیں، یہ دوائیں۔" اس نے ایک پرچہ موسیٰ کو دیا۔ کچھ ہدایتیں دے کر اگلے مریض کی طرف چلی گئی۔ موسیٰ نے احد کو گود میں بھر لیا، پھر دوسری سمت جا کر فاطمہ کو اٹھا لیا اور جنرل وارڈ کے باہر آیا۔

موسیٰ نے بارہ دن، بارہ راتیں اسپتال کے کمرے میں ہی گزار دیں۔ صبا کی خاطر، بچوں کے ساتھ، صرف ایک شام، جب وہ روزمیری کو لے کر لاہور گیا۔ ایئرپورٹ پر اسے رخصت کر کے واپس آیا تو رات ڈھائی بجے تھے۔ بچے رضیہ آپا کے پاس چھوڑ گیا تھا۔ اسے اپنے گھر والوں کا اعتبار نہ تھا۔ اور اس کی بے تابی صبا نے خود محسوس کی تھی۔ جب ساڑھے تین بجے اسپتال کا ایمرجنسی گیٹ کھلوا کر وہ پرائیویٹ کمرے میں آیا، صبا جاگ رہی تھی، بچوں کے ساتھ، موسیٰ کی کمی بھی محسوس ہو رہی تھی۔

✡ ✡ ✡

بارہ دن بعد بے شمار دواؤں، ڈاکٹر کی ہدایتوں کے ساتھ ٹیکسی پر وہ صبا کو گھر لے آیا۔ کئی بار اس نے امی سے کہا تھا۔ عزیز بھائی یا افتخار سے کہہ کر ایک گاڑی خرید لیں۔ آپ کو بھی آسانی رہے گی، مجھے بھی۔ مگر امی کو ڈرائیور رکھنا منظور نہ تھا۔ اور اب اسے خود اتنی مشکل ہو رہی تھی۔ شوروم جانے پسند کرنے میں نہ

جانے کتنے دن لگتے۔ اور وہ صبا کو ایک منٹ کے لیے بھی نہیں چھوڑ کر جانا چاہتا تھا۔ صبا میں طاقت آگئی تھی۔ علاج' غذا' دوا' توجہ اور اطمینان نے اس کو اپنے پیروں سے چلنے کے قابل بنا دیا تھا۔

وہ اندر آکر اپنے آشیانے کی جانب بڑھی۔ ابھی پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تھا۔ موسیٰ نے آکر ہاتھ پکڑ لیا۔ بہت سہولت اور محبت کے ساتھ لے اسی کمرے میں لے آیا' جہاں وہ رخصت ہو کر آئی تھی۔ اور جہاں سے موسیٰ انجانی منزل کی طرف روانہ ہوا تھا۔ کئی دن وہ صبا کے لیے خود کھانا تیار کرتا رہا۔ بچوں کو اپنے ہاتھ سے کھلاتا رہا۔ ملازمہ حیرت کی تصویر بنی اسے دیکھا کرتی۔ صبا اب تیزی سے صحت مند ہو رہی تھی۔ موسیٰ بچوں کو تیار کر کے خود اسکول چھوڑنے جاتا۔ موسیٰ نے ابھی تک کسی سے کچھ پوچھا' نہ شکوہ کیا۔ وہ بے نیاز ہو گیا تھا۔ اس کی زندگی اب صبا اور بچوں کے گرد گھومتی تھی۔ اسے کسی سے سروکار نہ تھا۔ خرچ کے لیے اب بھی ماں کو رقم دیتا تھا۔ امی کو اس نے شرمندہ کر دیا تھا۔ ثوبی اور رخشی بھی نادم تھیں۔

عینی ایک دن ماں سے الجھ رہی تھی۔ ''دیکھا امی آپ نے' میں کہتی رہی آپ ایک بار تو تحمل کر کے بھیا سے بات کر لیں۔ صبا کے بارے میں' مگر آپ کو یہ ہی یقین تھا کہ وہ صبا کی وجہ سے ہی ملک چھوڑ گئے ہیں۔ ٹھیک ہے انہیں بتا کر جانا چاہیے تھا۔ اور یہ بھی اتفاق تھا کہ اسی دن دوپہر کو انہوں نے میری اور صبا کی باتیں سن لیں۔ انہیں غصہ آیا۔ مگر۔۔۔ وقتی غصہ تھا کہ بغیر کسی سے کچھ کہے چلے گئے' جانا تو تھا انہیں۔

اگر صبا کا کوئی قصور ہوتا' کبھی تو بھیا کے منہ سے نکلتا۔ رو رو کر قسمیں کھاتی رہی۔ آپ اسے مارتی چلی گئیں۔ وہ معافی مانگتی۔ آپ اس کے مکا رسید کر دیتیں۔ آپ کو مرحومہ پھوپھو جان کا خیال آیا' نہ ابا کا' کتنا لاڈ کرتے تھے ابا صبا کا اور۔۔۔ امی آپ کو پتا تھا اس کو تیسرا مہینہ ختم پر ہے کہیں بے جگہ چوٹ لگ جاتی' بچہ ضائع ہو جاتا۔ پھر اس کا گناہ بھی آپ کے سر ہوتا۔'' عینی رو دینے کے قریب تھی۔

''اچھا تو ہوا تو نہیں پاگل تھی میں جو بے جگہ کے چاٹتی؟ غصہ اتنا تھا میرا شوہر بیٹا پتا نہ کوئی مال ہوتی یہ ہی کرتی' میرا دل تو کہہ رہا تھا اس کا گلا دبا دوں۔''

''غصے میں آپ کو احساس تھا کہ بے جگہ مکا نہیں مارنا۔ یہ خیال نہ آیا کہ انتظار تو کر لیں۔ جرم ثابت ہوئے بغیر سزا سنا دی۔ جنوں سے کتنا ڈرتی تھی اور کتنی خوشامد کر رہی تھی آپ کی' پیر پکڑ لیے تھے۔ بھیا کا فون آنے کے بعد بھی آپ نے اس کو بتایا نہیں' سزا میں کمی نہیں کی اور ہم سب کو بھی پتا نہیں کیا ہو گیا تھا۔''

''اچھا' چپ' سن لے گا تو اور بھی بگڑ جائے گا۔ وہ بھی پتا نہیں کیا کچھ سنا چکی ہو گی۔'' امی نے تنبیہہ کی۔ اور وہ جو ثوبی باجی کو کچھ بتا رہا تھا' عینی کی آواز دونوں بہن' بھائی نے بخوبی سن لی۔ وہیں سے پکار کر بولا۔

''میں [illegible] ہو یا [illegible] عینی نے کہا' [illegible] کر [illegible] صبا! تو بی ہو چکی ہے۔ میں اس سے کچھ پوچھتا بھی نہیں۔ [illegible] آپ بتائیے' اور [illegible] کر دیکھ آیا صبا بے چارے میں گھبر گیا چھوڑ کر آپ نے۔''

وہ بہت دل گرفتہ تھا۔ اسے امی ابا سے بہت محبت تھی۔ وہ ان سے جواب طلبی کو بد تمیزی سمجھتا تھا۔ البتہ ایک دن جب ثوبی' رخشی اور عینی تینوں تھیں۔ وہ انہیں بہ اصرار اوپر لے گیا۔ پھٹی ہوئی بدرنگ چادر کارپٹ کا نعم البدل تھی فرش پر۔

''یہاں میرے بچے بیٹھ کر ہوم ورک کرتے اور کھانا کھاتے تھے۔ دال' روٹی۔'' اس نے بتایا۔ جھلنگا بان کا پلنگ جس کو قبر کی گہرائی سے مشابہ کہہ سکتے ہیں' اس پر بھی بدرنگ چادر بچھی تھی۔ تکیے کی جگہ پھٹے پرانے کپڑے لپیٹے رکھے تھے۔

''یہ صبا اور اس کے بچوں کی آرام گاہ ہے۔'' وہ کمنٹری کر رہا تھا۔ ایک پرانا پایہ ٹوٹا صوفہ' جس کا کپڑا گھس چکا تھا۔ اس کے ٹوٹے پائے کے نیچے تختے رکھ کر توازن برقرار کیا گیا تھا۔ اور جس کی پشت کی طرف کچھ تختے تلے اوپر پڑے تھے۔ ان پر ایک کھلا ہوا بسکٹ کا ڈبہ ابھی تک پڑا تھا' جو اس دن نرگس لے کر

''یہ ہے صبا کا ڈرائنگ روم' دیکھا' اوپر چھت ملاحظہ ہو' پنکھا ندارد' جیل میں قیدیوں کو بھی پنکھے کی سہولت تو ہوتی ہے' آگے چلیں' یہ باتھ روم ہے۔ ایک پرانی بالٹی اور ڈونگا' اس شاہی حمام کا سرمایہ ہے۔ آگے چلو' کچن ہے یہ۔'' وہ بولتے بولتے رک گیا۔ گلا رندھ گیا تھا۔ کچن تاریک بغیر بلب کے تھا۔ ٹوٹے برتن پرانی گھسی دیگچی' کنارہ ٹوٹا مگ' چٹخا ہوا پیالہ۔ عینی کو تو خوب یاد تھا۔ اس نے ہی بے کار پرانے برتن اس کو بھیجے تھے۔ (کسی فقیر کی جھگی بھی اس سے بہتر ہو گی۔)

اس نے کنڈہ ٹوٹا مگ' اور پلاسٹک کی گھسی ہوئی پلیٹ ثوبی' رخشی کے سامنے لہرائی۔ ''ان برتنوں میں میرے بچے کھانا کھاتے تھے۔'' اس لیے آنسوؤں کا گولہ حلق میں اٹک رہا۔ ''ذرا آپ' صرف ایک دن اس کمرے میں رہ کر دکھا دیں۔ ثوبی آپا' ایک گھنٹہ ہی اس بستر پر لیٹ کر دکھیں۔ پانچ سال' چھ سال' نہیں۔'' کہتا ہوا ضبط گریہ سے سرخ آنکھیں مسلتا ہوا وہ تیزی سے ہلکہ دوڑتا ہوا کمرے سے نکلا۔ اور دھڑ دھڑ کرتا زینہ پار کر گیا۔ تینوں بہنیں' پرانے کاٹ کباڑ' سیمنٹ اکھڑی دیوار کے درمیان مجسموں کی طرح کھڑی تھیں پسینہ پسینہ۔ پندرہ منٹ میں ہی ان کے ہر مسام سے پسینہ پھوٹ بہا۔ اگست کا آخر تھا۔

سب کے صبر اور برداشت کو خراج تحسین کیا پیش کرتیں۔ ندامت اور شرمساری نے پانی پانی کر دیا۔ وہ نظر ملا کے بات کرنے سے ہچکچانے لگیں۔

اور صبا واقعی بے زبان ہو گئی تھی۔ اسے بظاہر کوئی فرق نہ پڑا تھا۔ ہاں اس کی زندگی میں ایک فرق ضرور ہوا تھا۔ موسیٰ اس کا عاشق زار بن گیا۔ وہ تو اس کے اشارے پر شاید آسمان سے چاند تارے بھی لے آتا۔ مگر وہ۔۔۔ کوئی اشارہ بھی کرے' وہ تو گونگی ہو گئی تھی۔ بے تاثر چہرہ بے رنگ آنکھیں۔

امی بھی اب اس سے ڈرنے لگی تھیں۔ کچھ نہ کہنے والی کیفیت اس کے چہرے اور ہر انداز سے ظاہر ہوتی تھی۔ وہ صحت مند ہو کر گھر کے چھوٹے موٹے کاموں میں بھی حصہ بٹاتی۔ کبھی کچن جا کر ملازمہ کی مدد کر دیتی۔ کوئی میٹھا بنا لیتی۔ بچوں کے لیے بھی کچھ تیار کرتی۔ کچن کی الماریاں صاف کرتی۔ برتن اندر سے نکال کر انہیں صاف کر کے سیٹنگ بدلتی۔ موسیٰ کے آفس سے آتے ہی فوراً چائے بنا کر لے جاتی۔ امی بے چاری حق دق اسے دیکھا کرتی۔ امی کے کمرے میں جا کر ان کا بستر درست کر دیتی۔ ان کے کپڑے استری کرتی' خاموشی سے۔ اسے کچھ بولتے کسی نے نہیں سنا۔ عینی' ثوبی' رخشی آتیں۔ وہ خود ان کی خاطر کرتی۔ بچوں سے کھیلتی' وہ تینوں ہی جھینپی جھینپی رہتیں ۔۔۔۔ اس کے چہرے پر کوئی شکوہ یا ملال نہ ہوتا۔ بے تاثر چہرہ۔ نہ شرمندہ کرنے والی کیفیت' فخر' نہ غرور' رضیہ آپا اس کے پاس آتیں۔ کبھی نرگس کے دوپٹوں پر لیس یا گوٹا لگوانے کو دے جاتیں۔ کبھی قمیص کے گلے پر ستارے لگوانے ہوتے۔ نرگس کی شادی کے لیے پرنسپل صاحبہ خود اسے مدعو کرنے آئیں۔ جب تک نوکری وہ چھوڑ چکی تھی۔ شادی دسمبر میں ہونی تھی۔ اور نومبر آچکا تھا۔

''نرگس کے لیے اچھا سا تحفہ لینا ہے۔ تم جو لائے ہو بکس بھر کر' اس میں سے ہی کچھ نکال لیتی ہوں۔'' پہلی فرمائش تھی' موسیٰ خوش ہو گیا۔

''نہیں۔ وہ سب تمہارا ہے' ہم مارکیٹ جا کر لے آئیں گے۔ دولہا کے لیے بھی اور میں تو پرنسپل صاحبہ کے لیے اپنی طرف سے بھی گفٹ دوں گا۔ مجھ پر پڑنے والی ساری ڈانٹ' ڈاکٹر کی ان ہی نے سنی۔ وہ مجھ پر قرض ہے' یہ اچھا مناسب موقع ہے ادا کرنے کا۔''

نرگس کی شادی ہو گئی۔ اس کی ساس نے بطور خاص موسیٰ کا شکریہ ادا کیا۔ انہیں اپنا تحفہ بہت پسند آیا تھا۔ جمہوریہ چیکوسلواکیہ کا بلوری گل دان تھا۔ رضیہ آپا نے صبا کو ہر موقع پر آگے آگے رکھا۔ آخر وہ نرگس کی بڑی بہن تھی۔ نرگس کی فرمائش پر اس نے ہر فنکشن پر ساڑھی پہنی جو موسیٰ اس کے لیے لایا تھا بکس بھر کر۔ (بقول صبا کے) آج کل اس پر

روپ بھی آیا ہوا تھا۔ پہلے والی صبا بن گئی تھی اور موسیٰ تن من دھن سے فدا ہونے کو تیار' بچے کچھ دن تو انکل ہی کہتے رہے' پھر صبا نے ہی بابا کہلوایا۔ موسیٰ کو اس پر بے حد خوشی ہوئی کہ اس نے بچوں کو اس نئے رشتے سے خود آگاہ کیا۔

☼ ☼ ☼

ایک دن وہ چادر تہہ کرتے ہوئے نارمل انداز میں کہنے لگی۔ "تم نے ڈیڑھ مہینے کے بعد ہی مجھ سے بچوں کی فرمائش کی تھی۔ یاد ہے' ایک بچے کی' دیکھو میں نے آنا" فانا" تمہاری خواہش پوری کردی' پلے پلائے دو بچے دے دیے تمہیں۔" (وہ خود ہی اس "آنا" فانا" کی طویل العمری سے آگاہ تھی۔) موسیٰ نے کتاب میز پر رکھ دی۔

"اور اگر۔۔۔ اس دن تم مجھے بتا دیتیں۔۔۔ میں جرمنی جانے سے انکار کردیتا۔"

"اور اگر۔۔۔ تم نے مجھے غصہ نہ دلایا ہوتا' تو میں تمہیں بتانے والی تھی' لیکن اس طرح ہونا تھا' سو ہوا' اب احساس ہوتا ہے' غصہ اچھی چیز نہیں' نقصان زیادہ۔"

"شکر ہے' تمہیں احساس ہوا' آئندہ احتیاط کروگی۔"

"اب میں تمہیں' دوسری بار پھر' تحفہ دے سکتی ہوں۔"

موسیٰ اپنی جگہ پر ہی کھڑا ہوگیا۔ پھر بیٹھا' ایک بار پھر کھڑا ہوا' صبا کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑے پرشوق لہجے میں کہا۔

"تھینک یو' اینڈ شکریہ' بہت بہت شکریہ۔ اور اب میں خوش خبری کے بعد تمہیں کیا دوں؟ مانگو کیا مانگتا ہے بچہ۔" وہ بڑی پیار لٹانے والی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہی پہلے جیسے دن لوٹ آئے تھے۔ وہی پہلے جیسی صبا بھی۔ سب کچھ پہلے کی طرح ہوچکا تھا۔ صبا کو جھٹکا سا لگا' دور ہٹ گئی۔

"مجھے۔۔۔ وہی پرانے دن لوٹا دو' ویسی ہی سزا سنا دو' دلیل نکالا' جلاوطنی' بن باس کی سزا' اس اوپر والے کمرے کو میرا نصیب بنا دو' تم نہیں کرسکتے' تو ماں سے کہو' وہ آج بھی ایسا کرسکتی ہیں۔"

کس قدر ٹھنڈا لہجہ تھا۔ برفانی تودے جیسا۔ اور کتنے گرم الفاظ تھے۔ جھلسا دینے والے' وہ یک لخت شعلوں کے درمیان گھر گیا تھا۔ ہر سمت آگ تھی' دھواں ہی دھواں۔ وہ دھم سے کرسی پر گرا' نہ جانے کیا کیا یاد آگیا۔ وہ کمرہ' وہ پلنگ' وہ برتن' صبا کو بھی تو وہی کچھ یاد آیا تھا۔

موسیٰ سے ضبط نہ ہوا' دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانک کر رونے لگا' روتا چلا گیا' برداشت نہیں تھی اس میں' صبا نے اس پر تاسف کی نظر ڈالی۔ "بچپنا!" اس کی آواز بلند ہوگئی۔

ماں گھبرا کر اندر آئیں۔ صبا آندھی کی طرح باہر [illegible] صحن میں [illegible] محسوس کرنے لگی [illegible] ہوں۔ [illegible] عجیب سا احساس [illegible]۔ موسیٰ کے رونے کی آواز آرہی تھی۔۔۔ بے قابو ہوگیا تھا۔ اس نے تو کچھ سہا نہیں' بھگتا نہیں' جو کچھ میں نے سہا اور سہتی ہی گئی' پھر یہ کیوں اتنا بے قرار۔۔۔ اف سنجیدگی نہیں۔ بچپنا ہے ابھی تک۔ ماں اس کے پاس آکر رکیں۔ انہیں یہ توقع نہ تھی کہ وہ سیڑھی پر بیٹھی ملے گی۔ سیمنٹ کی میلی گندی سیڑھی۔

"کیا کہا ہے تم نے موسیٰ سے۔ بولو' کیا کرکے آئی ہو؟" وہی تند تلخ لہجہ' نفرت انگیز الفاظ۔ اس نے بے خیالی میں سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ ویسا ہی غضب ناک چہرہ' آگ اگلتی آنکھیں' سن ہوتے اعصاب' گرمی جذبات سے اپنی اصلی حالت میں آنے لگے۔

"ارے بولتی کیوں نہیں۔ گونگی ہوگئی کیا؟ بتا' کیا کہا ہے میرے بیٹے سے۔"

"اسی سے پوچھیں۔ ابھی تو ہے' کہیں گیا نہیں۔" وہ تیز آواز میں بولی' چھ سال پہلے کے مقابلے میں غصہ۔

"وہ بتا دیتا تو یہاں کیوں آتی؟ بتا کیا ہوا ہے؟"

"کچھ نہیں' کچھ بھی تو نہیں' نہ پہلے کچھ کیا تھا' نہ اب' اور اس سے کہہ دیں اب اگر کہیں جاتا ہے تو بتا کر [illegible]' مقدر پر تہمت نہ لگ جائے۔" تھا مختلف سین [illegible] اس چھ سال پہلے کے سین سے۔

ماں ڈر گئیں۔ "وہ تو کبھی بچپن میں نہیں رویا۔ اب اسے۔۔۔ کیوں جائے گا کہیں' ضرور کوئی بات [illegible] کے یہاں چوروں کی طرح آبیٹھی ہے' کیا چاہتی ہے' میں نے تو کہا' چلو بھئی میاں' بیوی راضی' تیرا تو دماغ ہی عرش معلی پر پہنچا ہوا ہے۔ میرا بیٹا ہے وہ' میرا [illegible]' میرے اشارے پر آج بھی پتا صاف کرسکتا ہے۔ کسی گمان میں نہ رہنا۔ شامت آئی ہے' کیا پھر اوپر جانا چاہتی ہے' تو جا' چلی جا' اوپر کا کمرہ خالی ہے۔" غیض و غضب میں منہ سے تھوک اڑا رہی تھیں۔

"ماں۔۔۔ میری نہیں' اب اوپر جانے کی آپ کی باری ہے۔"

ٹھنڈے لہجے میں گرم انگارہ [illegible] اور وہ کمرے [illegible] دروازہ بند کرکے [illegible] بغیر کہ [illegible] دم بخود کھڑی رہ گئیں۔ اندر سین کچھ یوں تھا کہ سوئے ہوئے بچے جاگ کر روتے ہوئے باپ سے لپٹے ہوئے تھے۔ فاطمہ دائیں جانب باپ کے بکھرے بال سنوار رہی تھی۔ بے بسی کے عالم میں بال [illegible]۔ بائیں طرف احمد اس کے چہرے پر بوسے دے رہا تھا۔ موسیٰ کے بازو دونوں کو اپنے حصار میں لیے ہوئے تھے۔ اب مسکرا رہا تھا۔ نظر اٹھا کر صبا کو اشارے سے بلایا۔ وہ اس کے پاس بیٹھی تو بولا۔

"تم سے اچھے تو تمہارے بچے ہیں' تم رلاتی ہو' یہ آنسو پونچھتے ہیں۔"

صبا پر تھکن کا غلبہ ہورہا تھا۔ اس نے موسیٰ کے کندھے پر سر رکھ دیا۔

"سوری موسیٰ۔" گلوگیر آواز میں اس نے کہا۔

دونوں بچے ایک زبان ہوکر بولے۔ "سوری موسیٰ۔" موسیٰ نے اپنے بازو مزید پھیلا کر صبا کو حلقے میں لے لیا۔

"سوری صبا۔ بہت کمزور کردیا ہے تم نے مجھے۔"

بچے چلائے۔ "سوری بابا' سوری ماما۔" پھر سب ہنسنے لگے۔

☼ ☼ ☼

اوائل اگست کی ایک حبس زدہ صبح وہ پھر ماں بن گئی۔ موسیٰ اور بچوں کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ انہوں نے کبھی اتنا چھوٹا بے بی دیکھا نہ تھا۔ اگر دادی کے ساتھ رہ رہے ہوتے تو پھوپھیوں کے بچے دیکھ لیتے تو اتنی حیرت نہ ہوتی۔ پھوپھیاں چھوٹے بچے کے لیے تحائف لائیں۔ دادی نے بھی محبت نچھاور کی۔ صبا خاموشی سے پھوپھیوں کا جوش و خروش دیکھتی' جو بچے سے تتلا کر باتیں کررہی ہوتیں۔ ان کے چہرے خوشی سے دمک رہے ہوتے۔ رضیہ آپا اور نرگس اسے اور بچے کو دیکھنے آئیں۔ رخشی نے ان کو دکھانے یا سنانے کے لیے خوشی کا اظہار کردیا۔

"میں نے سوچا ہے' سوا مہینہ ہوجائے تو شان دار پارٹی کریں گے۔ گائے گائیں' کتنے دن سے گھر میں رونق نہیں ہوئی' کیوں موسیٰ؟"

وہ بھول گئی کہ "تقریباً" ہر ہفتہ جب تینوں بہنیں میکے آتی تھیں' بچوں کے ساتھ' خاصی رونق گہما گہمی ہوجاتی تھی۔

صبا سے ان کا نمائشی جوش برداشت نہ ہوا۔ بولنے پر مجبور ہوگئی۔ "رخشی آپا' یہ پہلا بیٹا تو نہیں ہے' نہ ہی سالہا سال کے بعد منتوں' مرادوں کا پیدا ہوا ہے۔ اس سے پہلے بھی دو بچے ہیں۔"

رخشی سٹپٹا گئی۔ "وہ اصل میں۔۔۔ موسیٰ کے سامنے تو پھر یہ ہی ہوا ہے۔"

رضیہ آپا نے حیرت سے پوچھا۔ "تو موسیٰ کو دکھاوے کے لیے پارٹی ضروری ہے؟ لو بھلا۔ پہلوٹی کے دونوں بچے تو اکیلی صبا نے پال لیے۔ تم بہنوں نے ان کی شکل دیکھنی بھی ضروری نہیں سمجھی۔ خوشی منانے کا تو ذکر ہی کیا۔"

رخشی تو چپکے سے باہر کھسک گئی۔ عینی پھنس گئی جو بچے کو گود میں لیے بیٹھی تھی۔ موسیٰ اسے گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا جس کا چہرہ لٹک گیا تھا۔

کچھ دن آگے سرکے۔ موسیٰ کا خیال تھا کہ تینوں بچوں کے اعزاز میں فنکشن کیا جائے۔ صبا نے سختی سے منع کر دیا۔

"چھوٹے کے لیے جو کرنا ہے کرلو' کیونکہ یہ تمہارے سامنے پیدا ہوا ہے' دادی پھوپھو ہوں کا لاڈلا ہے۔ احمد اور فاطمہ کے لیے... کچھ کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ صرف میرے ہیں' ان کے لیے آج تک کچھ نہیں ہوا تو اب بھی کچھ نہیں ہوگا۔ فنکشن کے دن... میں احمد اور فاطمہ کو... نرگس کے پاس بھجوا دوں گی۔"

موسیٰ بخوشی مان گیا اور ماں اس کی فرماں برداری پر پیچ و تاب کھا کر رہ گئیں۔

موسیٰ کو کمپنی والے اب دوسرے ممالک بھیجنا چاہتے تھے۔ کینیڈا یا امریکہ۔ ابھی کچھ فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ موسیٰ سب کو ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ وہ یہ بات عینی کو بتا رہی تھی۔ عینی کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ صبا کو اندازہ تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے۔ مگر جرأت نہیں ہو رہی۔ پھر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد عینی نے آخر کہہ ڈالا۔

"صبا آپا! ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم بڑی باجی' امی' رخشی آپا اور مجھے معاف کر دو' ٹھیک ہے' ہمارا رویہ صحیح نہ تھا۔ ہم' اب شرمندہ بھی ہیں مگر اب تو پھر پہلے جیسا ہو گیا ہے۔ بھیا بھی خوش ہیں۔ تم بھی لاکھوں میں کھیلنے لگی ہو۔ تم ابھی تک ہم سے خفا ہو' بے تکلفی سے بات نہیں کرتیں' امی سے بھی۔"

"لاکھوں کیا' کروڑوں' اربوں میں کھیل رہی ہوتی' تب بھی میرا رویہ یہ ہی ہوتا۔ عینی! میں فرشتہ نہیں۔"

"مگر... گزری ہوئی کل کو یاد کرنے کا فائدہ؟ تم بھول سکتی ہو' دلوں کی کدورت دور ہو جاتی ہے۔"

"دلوں کی کدورت؟ کدورت کیوں پیدا ہوئی؟ تم بھول سکتی ہو' میں نہیں' سوچا تھا' میں کبھی ان گزرے دنوں کو کسی کے سامنے نہیں لاؤں گی' لیکن کیا کروں' اس دن کی اپنی بے بسی' جب میں رو' رو کر قسمیں کھا رہی تھی اور ماں مجھے گھسیٹ رہی تھیں۔ باہر نکالنے کے لیے گھر کے باہر... ایک شریف زادی کو رات کے وقت گھر سے نکالنے کا مطلب؟ میں اس گھر کی عزت تھی۔ باہر انسانوں کے روپ میں بھیڑیے ہوتے ہیں' اس شہر میں میرا کوئی عزیز نہ تھا جس کے گھر چلی جاتی' میرے ماں' باپ نہ تھے' بہن بھائی نہ تھا۔ تمہارا احسان ہے' تم نے ماں کو روکا' لیکن اس وقت... میں صدمے سے نہیں' حیرت سے مرنے کے قریب ہو گئی۔ جب مجھے اوپر کے کمرے میں جانے کے لیے کہا گیا۔ وہ جنوں والا کمرہ' میں نے کبھی دن میں بھی وہاں جانے کی ہمت نہیں کی تھی۔

جب اس کمرے میں رضیہ آپا مجھے پکڑ کر اوپر لے کر گئیں' مجھ میں سکت نہ تھی۔ شاید ہوش بھی نہ تھا۔ تھپڑ' گھونسے' جسم کا کوئی حصہ چوٹوں سے بچا نہ تھا۔ [illegible] بہت وحشت ہوئی اور پھر... اس گھر کا کھانا مجھ پر حرام کر دیا گیا۔ عینی کیا اتنا ظلم کوئی اپنا کر سکتا ہے' کسی اپنے پر؟ میں اپنی نہ تھی' وہ جو میرے اندر پل رہے تھے وہ تو تھے

موسیٰ کے فون آنے کے بعد بھی کسی کو مجھ پر ترس نہ آیا۔ نہ موسیٰ نے تم لوگوں کو کچھ بتایا' نہ تم نے پوچھا۔"

"مجھے معلوم ہے صبا! لیکن حالات کی بہتری بچوں کے تعلق سے آئے..."

"بچوں کے تعلق سے؟ کون سا تعلق؟ تم نے کوئی تعلق رکھا تھا؟ کبھی انہیں دیکھنے کی کوشش کی؟ میں مجرم تھی' بچوں کو سزا دینے کا اختیار بھی تم لوگوں کے پاس تھا؟ کیا اس رات کی اذیت بھول جاؤں۔ جب اکیلی چھت پر تڑپ تڑپ کر ٹہل رہی تھی۔ آوازیں دے دے کر گلا بیٹھ گیا۔ کسی نے سنی میری آواز؟ اور کسی طرح صبح ناقابل برداشت اذیت سے نیچے اتری تھی۔ ایک ایک سیڑھی پل صراط بن گئی۔ ہر سیڑھی

لگتا تھا۔ دم [illegible] آواز نکلتی اور جب درد سے بے چین ہو کر چیخ پڑی تھی۔ رخشی آپا نے اندر سے جھانکا۔ شاید وہ میری طرف آنے لگیں' تب ماں نے کہا چھوڑ دو' بھگتے گی خود۔" میرے دل پر چھری کی نوک گزر گئی۔

"صبا میں تو بہت چاہتی تھی' ان سے کہتی۔" کمزور لہجہ تھا۔

"جس دن تمہارا افراز پیدا ہوا' اس رات بھی میرا خوف سے دم نکلنے لگا۔ میرے بچے دو دن کے تھے اور ماں ملازمہ کو لے کر تمہارے گھر چلی گئیں' پورے گھر میں' میں اکیلی اور بچے' خوف اور بھوک کا سامنا' ماں گھر کا دروازہ لاک کر کے گئی تھیں' رضیہ آپا اندر نہیں آ سکتی تھیں۔ شاید اس دن میں بھوک سے بے تاب ہو کر کچن سے لے کر کچھ کھا ہی لیتی حرام بھی مگر وہاں لاک لگا تھا۔ میرے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا۔ پانی پی پی کر بیت گیا۔ بچے بھوک سے تڑپتے' پانی کے سوا کچھ نہ تھا کہ ان کے منہ میں [illegible] دوسرے دن ٹیرس پر اڑتے ہوئے کوا ایک روٹی گرا گیا۔ میں نے اس روٹی کو پانی میں بھگو کر کھایا۔ پھر دودھ اترا' جب تیسرے دن بھی ماں نہ آئیں' رضیہ آپا نے اپنے گھر کے صحن سے کپڑے میں پوٹلی بنا کر روٹی اور کباب پھینکا۔ ہر رات آزمائش صبر کی حدیں ختم ہوتی جا رہی تھیں' خوف اور بے بسی۔"

"میں جانتی ہوں صبا! مجھے بہت افسوس بھی ہے۔" عینی کچھ بولنا چاہتی بھی تھی مگر صبا سامنے دیکھتے ہوئے بولتی جا رہی تھی جیسے فلم چل رہی ہو۔

"اسکول کی جاب بھی نعمت تھی' کیا کرتی' جب پیدل تین میل چل کر اسکول پہنچتی' جان آدھی ہو چکی ہوتی' سردی میں لنڈے کے دو' دو روپے کے سوئٹر ٹھیلے سے لے کر پہنائے۔ کوئی لحاف تھا نہ کمبل' رضائی' لنڈے کے موٹے سوئٹر' ان کی سلائی کھول کر اپنی شالوں کے درمیان جما کر سی لیا۔ دسمبر' جنوری کی سرد راتیں' کھڑکی کھل جاتی اور کمرہ برف خانہ بن جاتا۔ بچے بڑھے تو... اخراجات منہ کو آنے لگے۔ اسکول میں آپا کی جگہ خالی ہوئی۔ میں نے اس کے لیے بھی گزارش کی' کلاس ٹیچر' کمپیوٹر کلاس ٹیچر' چھوٹی کلاسوں کی آیا بن گئی۔ بچوں کو باتھ روم لے جانا' کھلانا پلانا' منہ ہاتھ دھونا' یہ ہی کام تھا میرا' اور میرے بچے ایک کونے میں پڑے ہوتے۔" کیسے بھولوں؟ چاہتی ہوں کچھ یاد نہ آئے۔

ان دنوں بھی ہر طرف سے بے نیاز ہو جاتی۔ مگر کوئی نہ کوئی خبر' کوئی اطلاع سینے کا ناسور بن جاتی۔ پتا چلا' موسیٰ نے شادی کر لی ہے۔ گوری بہو کے لیے گھر کو بالکل نئے انداز میں سجایا جا رہا ہے۔ پورے گھر میں ٹائل بچھائے گئے۔ مہینوں مزدور کام کرتے رہے۔ میرے بچے سیڑھی پر تماشا دیکھنے بیٹھ جاتے' کبھی کوئی مزدور کھانا کھاتے ہوئے روٹی کا ٹکڑا نہیں تھماتا' مجھے کبھی انکار نہیں ہوا۔ جو بھی ان کو کھانے کی کوئی چیز دیتا' میرے دل سے اس کے لیے دعا نکلتی' ایک دن ایک مزدور نے احمد کو روٹی کا ٹکڑا دیا۔ ساتھ میں ایک بوٹی بھی پکڑا دی۔ احمد نے لینے سے انکار کر دیا کہا کہ بہن بھی ہے۔ اس نے فاطمہ کے لیے بھی روٹی اور بوٹی دے دی۔ اس دن گھر میں کھانے کے لیے کچھ نہ تھا۔ فاقہ تھا' دونوں نے دو روٹی اور بوٹی کھائی میرے دل سے مزدور کے لیے کتنی دعائیں نکلیں۔ مہینے کے آخری دنوں میں کئی کئی دن ہم تینوں ایک روٹی کھا کر گزار دیتے۔

"پلیز صبا... اب بس کر دو' خدا کے لیے۔" عینی رونے لگی تھی مگر صبا تو لگتا تھا بالکل بہری ہو گئی ہے۔ اس کا ریکارڈ چلنا شروع ہوا تو ختم ہونے کا نام نہ لیا' یادوں کا پٹارہ کھل گیا تھا۔

"جب موسیٰ کی شادی کی خبر آئی۔ ماں نے تم سب کی شاندار دعوت کی۔ صحن میں ماربل کی بڑی والی میز پر... قسم قسم کے کھانے رکھے تھے۔ گھر میں خاصی گہما گہمی تھی۔ ماں افتخار بھائی سے کہہ رہی تھیں۔ "یہ تو موسیٰ کا ولیمہ کر رہے ہیں ہم۔ وہاں تو اس نے ولیمہ کیا نہ ہوگا۔" تمہاری رخشی آپا کی ساس وغیرہ بھی تھیں۔ تم لوگوں نے گانے گائے۔ اور اس دن ہم نے کھانے میں دال کا سوپ پیا تھا۔ آٹا تھا نہ پیسے۔"

"پلیز صبا' معاف کردو' سب کو معاف کردو۔" عینی لجاجت سے گڑگڑا رہی تھی۔

"زبان سے کہہ دوں' میں نے معاف کیا' مگر دل نہ مانے' یہ تو منافقت ہوئی۔ نہیں عینی! میں نہیں کر سکتی منافقت' تم لوگ کر سکتے ہو۔" سیدھا حملہ تھا۔

"مجھے اندازہ ہے اور ہم پچھتاتے بھی ہیں' اب اور کس طرح کہوں۔" زچ ہو گئی عینی۔

"کچھ کہنے کی گنجائش نہیں' نہ میں سن سکوں گی' خاموشی ہی بہترین طریقہ ہے۔"

"تمہاری خاموشی ہی ہم کو کھائے لیتی ہے' تم... بات چیت کر کے' دل ہلکا کر لیا کرو۔"

"عینی! یہ جو میں دل کی آواز تم تک پہنچانے کی کوشش کر رہی ہوں' یہ اور کیا ہے؟ اسی لیے تم سے اپنی ذلت' بے وقعتی' بچوں سے ماں کی نفرت' تم لوگوں کی بے نیازی کے شکوے کرنے پر مجبور ہو گئی۔"

"میں اس رات... پوری رات جاگتی اور روتی رہی۔ مجھے تو یہ ہی لگا۔ جیسے اب میرا تعلق واقعی ختم ہو گیا۔ مجھے گھر سے ہی نہیں زندگی سے بھی نکال دے گا' پھر میرا یہاں رہنے کا کیا جواز ہے۔"

"کیسی فضول بات ہے' خدا کے لیے اب تو دل بھی جو تم پاگل ہو جاؤ گی۔"

"ہو چکی ہوں۔" ٹھنڈے لہجے میں اس نے چپکے سے کہا۔ "شاید ایک دن ایسا ہو گا' جب خود پر گزری قیامت کی گھڑیاں' دل سے نکال دوں' بھول جاؤں' لیکن بچے... ان کو کس جرم کی سزا ملی۔ سبزی اور فروٹ والے گلے سڑے پھل اور سبزی پھینک دیتے تھے۔ میں انہیں شاپر میں ڈال کر لے آتی۔ کاٹ کر' چھیل کر' ادھر ادھر سے کچھ نہ کچھ تھوڑا سا نکل آتا' رضیہ آپا ہر پھل لے آتی تھیں۔ بچوں کے لیے' مگر میں بھی کسی طرح انہیں ہر چیز کھلانے کی کوشش کرتی۔ میں روزے سے ہوتی۔ اور روزہ کھولنے کے لیے صرف گرم پانی' بچوں کے آدھا کلو دودھ میں پانی ملا کر ایک کلو کرنے کے باوجود دو دن بمشکل چلاتی' رضیہ آپا نہ ہوتیں' تو ہم فاقوں سے مر جاتے۔"

تم تو کوئی واقعات کی زندہ بھی گواہ ہو۔" عینی اس کا ہاتھ پکڑ کر رونے لگی' عاجزی سے' دردمندی سے بولی۔

"چپ کرو' صبا پلیز' میں اب برداشت نہیں کر سکتی' میں نہیں سن سکوں گی۔"

"تم سن نہیں سکتیں' میں نے جسم و جاں' دل و دماغ اور اعصاب ان ہی عذابوں کی نذر کر دیے۔ مگر میں تو صرف بوجھ ہلکا کرنے کے لیے... تم ہی کہہ رہی تھیں۔ دل ہلکا کر لو'

تمہارے بیٹے کی ہر سالگرہ اسی گھر میں منائی گئی' جب اس روز شاید چوتھی سالگرہ تھی' ہال میں ضیافت کا انتظام ہو رہا تھا۔ مہمانوں کی آوازیں۔ کیک' پیسٹری' فروٹ چاٹ' سموسوں اور پیٹیز کی خوشبوئیں کمرے میں آئیں۔ میں نے کھڑکی بند کر لی۔ مجھے پتا نہ تھا احمد بچوں کی آوازیں سن کر نیچے [illegible] کی طرف [illegible] سب بچے اس سائیکل پر باری باری سیر کر رہے تھے۔ صحن کا چکر لگا کر احمد [illegible] ہاتھ [illegible] لگا۔ ماں نے اندر سے آ کر اس کا ہاتھ اس قدر زور سے جھٹکا' دھکا دے کر کہا۔ (منگی سی لی) مر رہے کم بخت۔" وہ دھکے سے سیڑھی پر جا گرا۔ اور دوسرے ہاتھ سے کلائی دبانے لگا۔ سوچ [illegible] میرے [illegible]

جس بچے کو انتہائی حقیر کے ساتھ' سب بچوں کے سامنے' دھتکار دیا گیا۔ اسی کے باپ کی کمائی سے اس دعوت کا انتظام ہوا' اسی کی کمائی سے سائیکل خریدی گئی۔ میں کیسے بھولوں' اس روز بھی کھانے کے لیے میرے گھر میں کچھ نہ تھا۔ دودھ تھا' میں نے بچا کر رکھا تھا' اس امید میں کہ شاید رضیہ آپا روٹی یا بسکٹ لے آئیں۔ تو میں انہیں دودھ میں بھگو کر کھلا دوں۔ اس روز میرا بچہ' وہ آدھا کپ دودھ بھی نہ پی سکا۔ اس کی کلائی سوج گئی تھی۔ تکلیف سے رات کو کراہتا' تو میرے پاس' اس کو پیار کرنے کے سوا کوئی علاج نہ تھا۔ یہ بچے اکیلے میرے ہی تھے کیا؟ کوئی باپ تو ہو گا ان کا۔ کیونکہ اب حضرت عیسیٰ دوبارہ جنم نہیں لیں گے۔

بس مجھے چپ نہ کراؤ' اب تم نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔" (سسکیاں اور سسکیاں۔)

رخشی آپا کے بیٹے کی سالگرہ' تولی باجی کی بیٹی کی شادی میں کامیابی پر نیچے دعوت چل رہی تھی۔ میں [illegible] احمد پتا نہیں کیسے اٹھ کر آ گیا۔ نیند میں تھا۔ [illegible] صحیح نہیں پڑا' اوپر سے لڑھکتا ہوا نیچے آیا تھا۔ میں نے دیکھا' اس کا پورا چہرہ خون میں تر بتر تھا۔ اور نہ جانے کہاں کہاں سے خون فوارے کی طرح اچھل رہا تھا۔ آبشار کی مانند بہہ رہا تھا۔ میں جگ پھینک کر چیخ کر رہی' بخار کی شدت اور کمزوری پھر خون کی گھبراہٹ' [illegible] سے اٹھایا نہیں جا رہا تھا۔ اس وقت میں چیختی چلاتی رہی "کوئی آؤ میرے بچے کو دیکھو" اندر سے [illegible] کر رہے تھے۔ کسی طرح میں اسے گود میں لے کر دروازے کی طرف بڑھی۔ رخشی آپا نے شاید چیخیں [illegible] نے ان کا ہاتھ پکڑ کر اندر [illegible] اور [illegible]

اس دن کا زخم آج بھی ہرا ہے۔ اور میں اسے ہر بار [illegible] ہوں۔ شاید [illegible] بہت بڑی... [illegible] میں اسے لے کر باہر [illegible] سے گلی میں بھی کھڑی تھی۔ رضیہ آپا کہیں سے آئی تھیں۔ بلال [illegible] رضیہ آپا نے [illegible] اور چلائیں "بلال! ٹیکسی روکو۔" پھر بلال لپکتا آیا۔ [illegible] کو مجھ سے لے کر ماں' بیٹے دونوں ٹیکسی میں بیٹھ کر [illegible] جاتے جاتے رضیہ آپا کہہ گئیں "اوپر جاؤ۔ [illegible] کے پاس۔" مگر مجھے ہوش نہ تھا۔ وہیں دروازے کے سامنے بیٹھی رو رو کر ڈرامے کرتی رہی۔ [illegible] میں روتی رہی۔ اور بخار کم ہو گیا۔ پھر بلال احمد کو گود میں لے آیا۔

رضیہ آپا اس کی دوائیں لے کر اوپر ہی آ گئیں۔ بلال اسے لے کر اوپر گیا۔ اسے صوفے پر لٹایا۔ اور [illegible] تسلی دیتا رہا۔ "گھبرائیں نہیں۔ دوا کا اثر ہے' ایک گھنٹے بعد ہوش آئے تو دوا اور دودھ پلا دیں۔" پھر وہ [illegible] پانی لے کر نیچے گیا۔ وہاں گرا ہوا جگ بھی بھر لایا۔ [illegible] دن وہ آتا رہا۔ پانی لاتا رہا۔ احمد کی بینڈیج کے لیے اسے لے جاتا رہا۔ تب ماں نے یہ خبر نشر کی کہ بلال کے ساتھ صبا کا معاشقہ چل رہا ہے۔ جب چاہے آتا ہے دندناتا ہوا اوپر چلا جاتا ہے۔ لیکن سب نے ہی اسے احمد کو پٹیوں میں لے جاتے دیکھا تھا۔ وہ کبھی اکیلا نہیں آیا' نرگس یا رضیہ آپا ساتھ آتیں۔

مجھے آج تک علم نہ ہو سکا کہ بچوں کی پیدائش کے اسپتال کے اخراجات رضیہ آپا نے کتنے ادا کیے۔ اور احمد کے زخموں کے ٹانکوں' دواؤں' ٹیکسی کے کرایوں پر کیا خرچ ہوا۔ اور ماں نے الزام لگایا۔ رضیہ آپا میری ایجنٹ ہیں۔ میں اسکول کے بہانے ڈیٹ پر جاتی ہوں۔ سوچو بچوں سمیت' احمد کے سر' ماتھے' تھوڑی پر [illegible] ٹیپ لگی رہی۔ اس کے علاوہ بھی کافی چوٹیں آئی تھیں' ہاتھ پیر زخمی تھے۔ تم لوگوں نے بھی دیکھا ہو گا۔ رخشی آپا نے تو خون بہتا دیکھا تھا۔ کسی نے کبھی خبر لی؟" وہ بہت ہیجانی کیفیت میں تھی۔

عینی اب آواز کے ساتھ رو رہی تھی۔

"عینی پلیز۔ تم رو و نہیں۔ اب کیا ہو سکتا ہے؟ میں اپنی ماں کو کھا گئی۔ ماموں کو کھا گئی۔ پھر بچے کے باپ کو کھا لیا۔ یہ ہی کہا تھا ماں نے' وہ سمجھ رہی تھیں کہ حسب عادت میں موسیٰ کو بھی کھا گئی۔ جب موسیٰ کی خیریت مل گئی۔ پھر بھی؟ یہ ہے... خیر اور موسیٰ کو تو میری خبر لینے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ تو شادی کر کے گھر بسا کر بیٹھ گیا تھا۔ پھر اسے ظاہر ہے کہ بیوی کی کیا پروا۔ ایک کانی تھی' مگر عینی! تم تو میری دوست تھیں۔ رشتے ختم کرنے کے بعد دوستی کو بھی خیرباد کہہ دیا' تمہیں کبھی وہ وقت یاد نہ آیا۔ جب ہم ذرا' ذرا اسی بات کا بہانہ کر کے ہنستے رہتے تھے۔

عینی صبا سے لپٹ کر زور' زور سے رو رہی تھی۔ اور صبا خود اپنے زور بیان پر متحیر سی تھی۔ اسے خیال تک نہ تھا کہ وہ بھی اس تسلسل سے بول سکتی ہے۔

سانس لینے کو رکی' پھر عینی پر ترس آ گیا۔ رو' رو کر عینی کا منہ سرخ ہو گیا تھا' آنکھیں سوج گئی تھیں۔ اسے بھی ناقابل بیان اذیت کا سامنا تھا۔

"دیکھوں محمد نہ اٹھ گیا ہو۔" وہ اٹھی۔ نیند سے

جاگ کر بہت روتا ہے۔"

صبا کا بوجھ اتر گیا تھا۔ اور عینی کے کندھے ندامت کے بوجھ سے جھک گئے تھے۔

وہ دونوں نہیں جانتی تھیں برآمدے کے پرے سیڑھیوں کے پیچھے کھڑی ماں بھی سب سن کر پچھتاوے کی آگ میں جھلس گئی ہیں۔ اور پھر وہ اس آگ کو آنسوؤں سے بجھانے کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ صبا عینی کے کندھے کو چھو کر سیڑھیوں کے نیچے لگے واش بیسن کی طرف آئی' جہاں سے سالوں اپنے لیے پانی بھر کرلے جاتی رہی تھی۔ منہ ہاتھ دھو کر اپنے کمرے میں آئی۔ ایک دم ٹھٹک گئی۔

ہائے یہ کیا ہوا۔ سامنے بیڈ پر محمد کے پیروں کی جانب آڑا لیٹا ہوا موسیٰ شاید سب سن چکا تھا۔ نہ جانے کب آیا' خبر ہی نہ ہوئی' موسیٰ کی آنکھیں چھت پر لگی تھیں اور ان سے آبشار کی مانند بہنے والے آنسوؤں نے بستر کی چادر گیلی کردی تھی۔ وہ بے حس و حرکت اس طرح لیٹا تھا جیسے کوئی مردہ' یہ کیسے [illegible] پاؤں' مجھے اور عینی کو خبر تک نہ ہوئی۔ وہ [illegible] ہوئی اندر آئی۔

"کیا بات ہے؟ آفس سے جلدی کیوں آگئے۔ کب۔۔۔ کب آئے؟"

"جب تم نے کہا تھا۔ میں لاکھوں میں نہیں کروڑوں میں کھیل رہی ہوتی۔ تب بھی یہ رویہ ہوتا۔" وہ بھاری آواز میں بتا رہا تھا۔ صبا کا سانس رکنے لگا' اوہ۔۔۔ اول سے آخر۔

"ایک اتفاق ایسا بھی ہوتا ہے۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "جو کوئی بات میری لاعلمی میں کی جاتی ہے میں کسی نہ کسی طرح سن لیتا ہوں۔ دو گھنٹے ہوگئے ہیں میں آیا تو محمد اٹھ گیا۔ اسے پانی پلایا' وہ پھر سو گیا' میں سنتا گیا' سنتا گیا' پہلے اگر تم نے بتایا ہوتا میں برداشت نہ کرپاتا۔ اچھا ہوا اب سنا' بہتر ہوا۔"

نہ جانے کیا کہہ رہا تھا۔ پھر سر کو جھٹکتا ہوا واش روم میں گھس گیا۔ کافی دیر لگا کر آیا' منہ دھو کر' صبا بستر پر بیٹھی پچھتا رہی تھی۔ غلطی پر غلطی۔ گناہوں میں

انشاءاللہ میں نے کیوں عینی پر راز [illegible]۔

"تم ابھی سے پیکنگ شروع کردو۔" وہ نارمل [illegible] صبا بے یقینی سے دیکھ رہی تھی۔

"ہم ان شاء اللہ اس مہینے کے آخری ہفتے [illegible] سعودی عرب جا رہے ہیں۔ معلوم ہے کہاں؟" صبا بے یقینی سے گردن ہلانے لگی۔

"مکہ مکرمہ۔" اس نے جیسے دھماکہ کردیا۔ "[illegible] مکرمہ میں نئی عمارتوں' ہوٹلوں کی تعمیر ہو رہی ہے' [illegible] مجھے وہاں بھیج رہی ہے۔ کتنی بڑی خوش خبری [illegible] آیا تھا۔ تم نے رلا دیا۔"

شدت جذبات نے صبا کا گلا بند کردیا۔ سعودی عرب' مکہ مکرمہ' میرے ایسے نصیب کہاں۔ آنسو [illegible] لگے' موسیٰ نے اس کے آنسوؤں کو ہتھیلی سے اٹھایا۔

"یہ تمہارے صبر کا انعام ہے۔" وہ مسکرا [illegible] [illegible] اور آنسو [illegible] [illegible] [illegible] کہنا چاہ [illegible] موسیٰ مسکرایا۔

"تمہیں ایک اور خوش خبری سنانی ہے' روز میری [illegible] فون آیا تھا۔ محمد کی مبارک باد اور تمہاری خیریت [illegible] رہی تھی۔ اور یہ کہ آخر اس کی شادی بھی ہوگئی [illegible] کسی لبنانی تاجر سے' روز میری مسلمان ہوگئی [illegible] خوش ہے۔"

"اچھا۔ میں بھی اسے مبارک باد دوں گی۔ [illegible] بھی ادا کرنا ہے۔ اس نے میری تیمارداری بھی کی [illegible] ہمدردی کی۔ تم نے اسے طلاق دینے میں جلدی [illegible] ہم۔۔۔ ساتھ رہ سکتے تھے۔"

"یہ تم آج کہہ رہی ہو۔" وہ ہنسا۔ "مگر وہ نہیں [illegible] سکتی تھی۔ تمہیں دیکھ کر خوف زدہ ہوگئی تھی۔"

دونوں عام سی باتیں کرنے لگے' جیسے ابھی [illegible] پہلے کچھ ہوا نہ تھا۔ کسی نے کچھ کہا نہ کسی نے [illegible] ماں کو ان کے جانے کی خبر ہوئی۔ خوش ہوگئیں' جب علم ہوا کہ سعودی عرب کے قانون کے [illegible] رہائش کے لیے وہاں نہیں جاسکتی' ان کے ارمان [illegible] اداس کر گئے۔

"میں بالالوں گورنمنٹ ویزا پر' پھر نرسے اور [illegible] [illegible] اس نے بہت تسلی دی۔ صبا [illegible] رہی [illegible] [illegible] کسی سے بات کرنے کا ہوش نہ تھا۔

سب آئے مبارک باد کے لیے' نفیسہ آپا اور نرگس بھی آئیں۔ رضیہ نے بھی صاف طور پر کہا۔

"صبا! یہ تمہارے لیے انعام ہے' صبر کا اعزاز ہے' اس تکلیف کا' جو تم نے سہی۔ میری بیٹا صبا کی بہت قدر کرنا' یہ تمہارے لیے خوش قسمتی کی علامت ہے۔"

موسیٰ نے ان کے سامنے سر جھکا کر کہا۔ "جی میں تو اپنے بچوں کا بھی شکر گزار ہوں' [illegible] کے صبر اور ضبط نے مجھے نیا سبق دیا ہے۔ اس کم عمری میں انہوں نے بھوک اور فاقے برداشت کیے' جبکہ ان کا باپ لاکھوں [illegible] کما رہا تھا۔ اب میں ان کے نام تبدیل کر رہا ہوں۔ [illegible] [illegible] [illegible] صبا [illegible] [illegible] محمد [illegible] [illegible] [illegible] موسیٰ [illegible] نے سب کے اندر سے داد دی۔ "واقعی موسیٰ بھائی' صبا پر جتنا فخر کیا جائے کم ہے۔" عینی نے اٹھ کر صبا کو گلے لگایا۔ موسیٰ کے اعلان پر حیران بھی تھی' شکر گزار بھی۔

بہت ہی تیزی میں عجلت کے ساتھ مجسٹریٹ کے سامنے نئے ناموں کا اندراج ہوا' پاسپورٹ بنے اور وہ سعودی عرب ہو گئے۔ مکہ شریف میں ان کو بہت [illegible] دار اور خوبصورت ملا تھا۔ حرم شریف کے بہت [illegible] صبا کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ اتنی آسانی زندگی [illegible] بھی مل سکتی ہے۔ اسے توقع تھی نہ امید' جانے ہی [illegible] نصیب ہوا' تینوں بچوں کے ساتھ وہ جتنا شکر [illegible] کم تھا' ان کے بچوں کو اب صبر اور محرومیوں کا [illegible] اجر مل گیا۔

وہ عمرے کرتے نہ تھکتی۔ اگلے سال ماں اور رضیہ کے لیے حج کی درخواستیں دی گئیں۔ ماں کی مسترد [illegible] رضیہ [illegible] آگئیں۔ پھر ماں کو بھی موسیٰ نے [illegible] عرب بلوالیا۔ اسے جاب مل گئی مگر وہ جدہ میں [illegible] رضیہ ہر سال بیٹے کے پاس وزٹ ویزے پر آجاتیں۔ موسیٰ کے لیے دعاؤں کا خزانہ لے کر۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ ماں کا آنا نہ ہوسکا۔ عمرے کے لیے بھی نہیں' وزٹ ویزے پر بھی نہیں' کبھی وہ خود بیمار ہوجاتیں کہ سفر نہ ہوسکتا' کبھی ان کی درخواست رد ہوجاتی۔ ویزے میں غلطی نکل آتی اور پھر ثوبا کی چھوٹی بیٹی ابنارمل پیدا ہوئی تھی۔ وہ بیمار ہوجاتی۔

موسیٰ کو شدید قلق تھا۔ بلال نے تو نرگس اس کے میاں اور ساس کو بھی حج کرادیا۔ صبا روز حرم شریف جاتی تھی۔ علاوہ فجر کے' اس کی تقریباً" ہر نماز حرم شریف میں ادا ہوتی۔ دونوں بچوں کے ساتھ' محمد کو گھر چھوڑ دیتی۔ اسے ایک میڈ مل گئی تھی۔ جو بچوں کے کام کرتی تھی۔

صبا میں عجیب سا تغیر آیا تھا۔ اس میں استغنا پیدا ہوگیا تھا۔ وہ بہت کم گو اور بے فکر ہوگئی تھی۔ موسیٰ نے بھی اسے آزاد چھوڑ دیا تھا۔ جہاں چاہے جائے' جو مرضی کرے' وہ کئی بار مدینہ شریف گئی۔ اب اس کے آنسو بھی آزاد ہوگئے تھے۔ نماز یا تلاوت کے درمیان وہ زارو قطار روتی' ابا' اماں' ماموں کے نام پر کئی عمرے کرلیے۔

پانچ سال بے حد پرسکون' آرام سے گزر گئے۔ موسیٰ سال میں دو بار ماں سے ملنے جاتا۔ اس نے ماں کے آرام کی خاطر عینی کو گھر میں شفٹ کرادیا۔ اس کے میاں کے والدین تو تھے نہیں۔ بہن' بھائی اپنے اپنے مقام پر' لہٰذا اسے کوئی اعتراض نہ ہوا۔

ماں کے اخراجات کے لیے جو رقم بھیجا کرتا۔ وہ اتنی ہوتی کہ عینی کی فیملی بھی ٹھیک ٹھاک گزارا کرلیتی۔ عینی کے میاں نے بچت کی رقم سے پلاٹ بھی لے لیا تھا۔

"اب ہمیں کینیڈا جانے کے آرڈر ملے ہیں۔" ایک دن موسیٰ نے بم پھوڑا۔ معلوم تو تھا کہ یہاں کام ختم کرکے ایک بار جانا ہی ہے۔ مگر۔۔۔ صبا کو لگا ابھی آزمائش باقی ہے۔

"میں چاہتا ہوں کسی اور کمپنی کے تھرو' مجھے یہیں

کسی بھی شہر میں کام مل جائے۔ مگر فی الحال تو مشکل ہے کوشش کرنے سے... شاید دو' تین سال میں کامیابی ہو جائے۔ فی الحال کینیڈا ہی جانا ہے۔ اچھا ہے' بچوں کی تعلیم بھی اور ان کے لیے کچھ کمائی بھی کر لیں گے۔ بہت پیسہ ملنے کا امکان ہے' ترقی اور سہولیات بھی بہت ہیں۔" وہ بہت جوش میں تھا۔

"پاکستان ہی چلتے ہیں۔" صبا کی بات ٹھک سے دماغ میں چبھی۔ وہ بہت سنجیدہ تھی۔

"ہیں؟ کیا؟ پاکستان کا جو حال ہے دیکھا ہے میں نے؟ اب ترقی مل رہی ہے' دولت مل...."

"چھوڑو دولت' بہت کما لی' اب جنت کمانے کی فکر کرو۔"

"تمہاری ماں کو تمہاری ضرورت ہے۔ اب ہمیں اپنے فرائض کی ادائیگی کے لیے وطن جانا ہوگا۔"

"یہ تم کہہ رہی ہو۔" حیرت کم نہیں ہو رہی تھی۔ وہ تو سال میں دو بار جاتا تھا۔ صبا نے کبھی جانے کی کوشش کی نہ ضرورت سمجھی۔

"ہاں تو کل میں حرم شریف میں نماز پڑھ رہی تھی' اچانک یوں لگا میں وہاں نہیں ہوں' میں کہیں نہیں تھی۔ احمد مجھے پکار رہا تھا اور میں اسے پہچان نہ سکی۔ میرا ذہن' ایسے تھا جیسے صاف اور سادہ سلیٹ' اس میں کچھ نہ تھا۔ نہ جانے کتنی دیر بعد اصلی پوزیشن پر آئی۔"

"تو تم نے بھلا دیا' وہ سب اور معاف کر دیا؟"

"جب قدرت مجھے معاف کر سکتی ہے تو میری کیا اوقات! میرا غرور' تکبر مجھے اس حیثیت تک لے گیا۔ میں جان نہ سکی' دنیا میں ہر عمل' قدرت کے اشارے سے ہوتا ہے' اسی عمل نے ماں کو میری سزا کے لیے نامزد کیا تھا۔ لیکن جب میں یہاں آئی اس خوشی اور غرور کے ساتھ کہ..... مجھے اللہ نے انعام سے نوازا ہے۔ ہاں یہ بھی درست' لیکن میں جو بڑے طمطراق سے عینی سے کہہ رہی تھی' میں کچھ نہیں بھول سکتی' وہ بھی میرا غرور اور احساس برتری تھا' لیکن کل جب میرا ذہن ایک سادہ صاف سلیٹ کی طرح ہو گیا اور میں یادداشت گم ہونے والی کیفیت سے دوچار ہوئی' تب میں اپنی اوقات پہچان گئی' ہم تو ذرے جتنی طاقت اور اہمیت نہیں رکھتے' پھر اس اعتماد اور بھروسے پر یہ دعوے؟ نہیں۔ کبھی دوبارہ ایسی کیفیت سے دوچار ہو گئی۔ تو نہ کسی سے معافی مانگنے نہ کسی کی خدمت کے عوض دعائیں لے سکوں گی۔ جانا کب ہے پاکستان؟"

وہ ایک دم موضوع سے ہٹ گئی۔ موسیٰ اسے دیکھتا رہا۔ "تم کیا قطب یا اولیاء کے عہدے پر پہنچ گئی ہو؟ یقین کرو۔ میں کینیڈا کا جانا کینسل کر کے پاکستان کی تیاری کر رہا تھا۔"

صبا پھر سے پیکنگ میں مصروف ہو گئی' مگر وہ دیکھ رہا تھا۔ صبا گم صم ہے' نہ وطن جانے کی خوشی کا اظہار' نہ مکہ مکرمہ سے جدائی کا غم' وہ پوچھنے پر مجبور ہو گیا۔

"پاکستان جانے کی خوشی تو ہے' لیکن ایک ملال سا [illegible] انتظار ہے' کہ مکہ [illegible] مقصد تھا' وہ ہم نے حاصل کر لیے۔ عبادت اور اصلاح' ہم ان شاء اللہ پھر اگلے سال آ سکتے ہیں۔ ماں کو لے کر حج کر لیں۔"

پانچ سال میں وہ ایک حج کر سکے تھے۔ جو کر چکے تھے' اب امید تو تھی کہ ماں کے ساتھ پھر آئیں' یقیناً "بہت سی غلط فہمیاں دور ہو گئی تھیں۔ صبا نے پھر ایک فرمائش کر ڈالی۔

"وہ جو کمپیوٹر کے ذریعے تم سب سے باتیں کرتے تھے' کیمرے کے سامنے۔ مجھے وہیں عینی سے بات کرنی ہے۔"

موسیٰ نے فون کر کے عینی کو کمپیوٹر روم میں آنے کی تاکید کی۔ صبا نے پہلے کبھی اس کمرے میں آنے کی کوشش کی نہ ضرورت سمجھی۔ موسیٰ اسے وہاں بٹھا کر کیمرہ آن کر کے خود باہر نکلا' مگر تجسس' آخر عینی سے کیا ضروری بات کرنی ہے۔

صبا کے سامنے اسکرین پر عینی نظر آئی' وہ بھی صبا کو دیکھ کر حیرت زدہ تھی۔ پانچ سال میں پہلی بار صبا کو دیکھا تھا۔ "عینی!" صبا اس کا نام لے کر خود پر قابو نہ پا سکی' آواز بھرا گئی۔ عینی کی بھی وہ ہی کیفیت تھی۔ اس کی آنکھیں بہنے کو تیار' موسیٰ بچوں کو تو لے کر بیٹھتا تھا۔

یاد نہیں۔

"عینی! ایک بات پوچھنی تھی بہت ضروری۔"

"ہاں' ہاں پوچھو۔" آواز اس کی بھی موٹی ہو گئی' ضبط گریہ سے۔

"وہ... سنو' مولانا حالی تو پانی پت کے میدان میں پیدا ہوئے تھے۔ میں سوچ رہی ہوں مرزا غالب کہاں پیدا ہوئے ہوں گے۔" آنسوؤں کے ریلے کے ساتھ ہنسی کا فوارہ بکھیرتی صبا دس' بارہ سال پہلے کے زمانے میں پہنچ گئی۔ عینی کا بھی وہ ہی حال تھا۔

"وہ۔ میرا خیال ہے' لاہور کے شاہی قلعے میں پیدا ہوئے ہوں گے۔" قہقہہ۔

"لو' مرزا غالب کبھی لاہور آئے ہوتے تو پیدا ہوتے لاہور کے قلعے میں۔" قہقہہ۔

"اسی طرح' جیسے مولانا حالی پانی پت کے میدان میں کبھی نہیں گئے' مگر پیدا ہو گئے وہاں۔"

"اچھا' تو پھر تم کہاں پیدا ہوئی تھیں؟" دونوں کے بچے ماؤں کو حیرانی سے دیکھ رہے تھے۔ (آنسوؤں کی برسات میں قہقہے لگاتی۔)

"جہاں تم پیدا ہوئیں' میرے خیال سے جنجال پورہ مناسب ہے' نہ تم کبھی وہاں گئیں' نہ میں' پیدا ہونے کے لیے جنجال پورہ چلے گئے' کبھی کبھی کھی کھو کھو' او ہو ہو' ہا ہا ہا۔"

دونوں کے چہرے نمکین پانی کی آبشار میں بھیگ چکے تھے۔ باہر سن گن لیتا موسیٰ' آسمان کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور بلند آواز میں قہقہہ لگاتا باہر چلا گیا' بکنگ ہو چکی تھی۔ اسے ٹکٹ خریدنے جانا تھا۔

"ارے ہاں' مولانا حالی تو جب پیدا ہوئے' پانچ سال کی عمر تھی' عینی تمہاری پیدائش کے وقت بھلا کیا عمر ہوگی؟"

"میری؟ اٹھارہ سال' اور تمہاری؟"

"پورے بیس سال' موسیٰ سے دو مہینے بڑی ہوں' اب لگا لو۔"

قہقہوں کا طوفان تھمنے میں آتا تھا' نہ آبشار میں کمی ہوئی تھی۔

دونوں طرف کے بچے ایک دو سہمے سہمے اشاروں میں باتیں کرنے لگے' ماؤں کی گفتگو ان کی سمجھ سے بالاتر تھی۔

عینی کے پیچھے دروازے پر ماں کھڑی ان دونوں بے تکی بے ربط گفتگو سن کر حیران ہو رہی تھیں۔ وہ صبا کو نظر نہیں آ رہی تھیں۔ مگر ماں اسے دیکھ بھی رہی تھیں' سن بھی رہی تھیں۔ ان کی فضول بکواس کے باوجود' وہ صبا کے لیے دل سے دعا کر رہی تھیں۔ اتنے عرصے کی خفگی بے نیازی اور پہلے کے وہ واقعات آخر کار اسی نے پہل کی تھی۔ دوستی اور محبت کو تازہ کرنے کی' شاداب رکھنے کی' یہ اس کا... ان سب پر احسان تھا۔

شاید' اب مجھے معافی مل جائے' اور سب کچھ پہلے جیسا ہو جائے۔ شاید... مجھے اب... حج کی اجازت اللہ کے حضور سے مل ہی جائے۔ پہلے وہ امید کرتی تھیں۔ اب یقین ہو چلا تھا' لیکن یقین بھی شک میں بندھا ہوا کہ حساب ابھی باقی ہے۔

راشد فاروقی کے گھر کی قیمت میں سے صبا کے حصے کی رقم کا چیک کوئی ریحان اصغر دے گئے تھے۔ یہ کہہ کر کہ وہ جب سامان لائے تھے' صبا کے ماموں کو بتا گئے تھے کہ راشد صاحب کی اجازت سے وہ یہ رقم بطور قرض لے کر اپنے تصرف میں لا رہے ہیں۔ جب بھی ممکن ہوا' وہ فوری ادائیگی کریں گے۔ یہ رقم بچوں کی پیدائش کے بعد وہ دے گئے اور انہوں نے غصہ میں دی ہی نہیں' جب گھر کی تعمیر ہو رہی تھی وہ رقم ضرورت پڑنے پر اس میں لگا دی' پھر بھول گئیں۔ اب... یاد آیا ہے' صبا کو تو خبر ہی نہیں۔ کیا وہ معاف کرے گی؟ کیا اللہ معاف کر دے گا؟ جب یاد آیا تب سے توبہ استغفار کر رہی تھیں۔ اب یہ بھی ایک ظلم ہی تھا۔ (اور وہ اس وقت فرعون کا روپ دھار چکی تھیں۔)

پانچ سال بیٹا ارض مقدس میں مقیم رہا۔ انہیں بلاوا ہی نہیں آیا۔ کیا یہ سزا ہے؟ تنبیہ ہے؟ اللہ کی ناراضی ہے؟ رو رو کر معافیاں مانگتی تھیں' صبا معاف کر دے گی۔

یہ بھی امید نہیں یقین ہے۔

جاری ہے

ناولٹ

تلاش میں ہے سحر

فیضیہ عامر

اس نے سامنے والے گھر کے آگے گاڑی روک دی۔

ہاں وہی گھر ہے' بالکل وہی ہاں رنگ بدل گیا ہے' گیٹ کا رنگ بھی پہلے سفید تھا اب سیاہ ہے' باہر کی دیواریں پہلے ہلکے بھورے رنگ کی ہوا کرتی تھیں اب ہلکے گلابی رنگ کی ہیں۔ البتہ یہ صاف محسوس ہو رہا یہ رنگ کروائے ہوئے بھی کافی وقت ہو گیا' وہ دل کی دھڑکنوں کو قابو کر رہا تھا' جن کی آواز اسے سنائی دے رہی تھی۔ ماتھے پر پسینے کی بوندیں نمودار ہو رہی تھیں' موسم اگرچہ بہت اچھا تھا۔ اوائل نومبر کے دن کراچی میں بہت ہی خوشگوار ہوتے ہیں۔ اس کی نظریں گیٹ پر مرکوز تھیں۔ اس کنڈی کو اس نے بارہا چھوا تھا۔ اس گھر کے درودیوار اسے خوب پہچانتے ہیں۔ اس کے لمس کو جانتے ہیں۔ اس کے قدم کتنی ہی بار اس دروازے سے اندر داخل ہوئے اور باہر آئے ہیں۔

اس کا دل چور ہاتھ یونہی گھر کو تکتا رہے۔ جب پچھلی چھ نومبر انیس سو پچاسی کو وہ یہاں آیا تھا۔ اس وقت باہر سے پورا گھر برقی قمقموں سے جگمگا رہا تھا۔ وہ روا! شادی کے دن تھے۔

☆ ☆ ☆

سارے دن کی دوڑ دھوپ کے بعد وہ تھک کر بستر پر گرا ہی تھا کہ فرحان فون اٹھائے اس کے سر پر مسلط ہو گیا۔

"یہ لو بھائی! آپ کے ابا حضور کا فون ہے۔"

"ارے تو یہ یار گھسیٹتے یہاں کیوں لے آئے؟" اس نے فون لیتے ہوئے کہا۔

"وہاں کچھ مہمان بیٹھے ہیں میں نے سوچا تمہارے لیے اجنبی ہیں۔"

"ہیلو! السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام بیٹے! سب ٹھیک ہے؟ کام ہنا کچھ؟"

"جی' آج دو پارٹیوں سے بات ہوئی ہے' ان شاء اللہ کل فائنل ہو جائے گا۔"

"ٹھیک ہے بیٹے' ذرا دھیان سے۔" ان کے لہجے

میں فکر مندی تھی۔
"آپ اطمینان رکھیے۔ دلاور انکل بہت مدد کر رہے ہیں۔"
"اچھا اچھا۔۔۔ محب بیٹا! ایک کام اور بھی آن پڑا ہے۔" وہ جھجکے۔
"جی ابا بولیے؟"
"بیٹے! وہ تمہاری صائمہ پھپھو مرحومہ۔۔۔ تمہیں شاید یاد نہ ہوں میری چچازاد بہن ہوتی تھیں۔ ان کی بیٹی کی شادی کا کارڈ آیا ہے۔ اب تم وہیں ہو، تو میں سوچ رہا تھا تم شرکت کر لیتے۔"
"ابا! میں؟ میں نے ان لوگوں کو دیکھا تک نہیں، کوئی جان پہچان نہیں، عجیب سا لگتا ہے۔"
"ہاں کہتے تو تم ٹھیک ہو۔ دوسرے شہروں میں رہنے والے رشتے داروں کو تو رسمی بلاوا دیا جاتا ہے۔ پھر بھی صائمہ بہت ہی نیک طبیعت عورت تھی۔ اس لیے میں چاہ رہا تھا تم ہو آتے شادی میں لیکن اگر تم نہیں جانا چاہ رہے تو کوئی بات نہیں۔"
"شادی ہے کب؟"
"ابھی تو کوئی ڈیڑھ دو ہفتے باقی ہیں بائیس نومبر کو شادی ہے۔"
"تو ابا میں شادی تک یہاں کیسے رک سکتا ہوں، اگر کل کام ہو جاتا ہے تو Payment لے کر میں تو پرسوں تک روانہ ہو جاؤں گا۔"
"ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔" وہ مایوسی سے بولے۔
"اچھا ٹھیک ہے میں ایسا کرتا ہوں کل جا کر کوئی گفٹ لے کر ان کو ایڈوانس مبارک باد کے ساتھ دے آتا ہوں۔" وہ ابا کو مایوس نہ کر سکا۔
"چلو یہ ٹھیک رہے گا۔" وہ خوش ہو کر بولے۔
"اور ابا! گھر میں سب خیریت ہے؟"
"ہاں سب ٹھیک ہے۔ تمہاری ماں پڑوس میں گئی ہیں۔"
"او کے ابا! خدا حافظ۔"

☼ ☼ ☼

وہ پیر پٹختی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور فون پر بات کرتی ردا پر تقریباً گویا پڑی۔ ردا نے جلدی سے فون پر موجود شخصیت کو خدا حافظ کہا اور دھکا دے کر اسے بستر پر دھکیلا۔
"کیا ہوا؟ آسمان کیوں سر پر اٹھا رہی ہو؟"
"ردا! میں تھک چکی ہوں، دادی سے کہہ دو رات کی چائے کا ذمہ وہ کسی اور کو دیں۔"
"اچھا؟ تمہارا مطلب کسی اور سے جینا اور صفیہ ہیں نا؟"
"ہاں تو کیا ہوا، موٹی ہو رہی ہیں۔ صرف بیٹھ کر کھاتی ہیں سارا دن، کام کیا ہے ان کا؟ آنے کا فائدہ ہے کچھ؟"
"تمہاری مہمان ہیں۔ بلایا ہے، تو آئی ہیں۔ اب کیا اپنے منہ سے خود ان سے کام کرنے کو کہیں؟ کتنی بری بات ہے۔"
"تو [illegible] کوئی غیر تو نہیں ہیں۔ شادی ہے [illegible] ایک روشن [illegible] ہماری کیا کرے۔۔۔؟ اور دو سری [illegible] غریب دھان [illegible] ہی، دیکھ لینا شادی کی تقریبات کے جتنے کپڑے سلوائے ہیں نا [illegible] سب ڈھیلے ہو جائیں گے۔" وہ سخت ناراض تھی۔
"ہاں تو تمہاری بہن کی شادی ہے۔ کوئی مذاق ہے کیا؟ تم نہیں سنبھالو گی سب تو پھر کون سنبھالے گا۔
You are the most responsible person of the family."
ردا اسے [illegible] باتی تھی۔
"ہاں یہ تو ہے۔ سب مجھے ہی کرنا ہے۔ میرے علاوہ اور کون ہے یہاں ذمہ دار فرد۔" وہ ہار ماننے والے انداز سے بولی۔
"وہی نا!" ردا نے ہاں میں ہاں ملائی۔ اس کی معصومیت کی تو وہ بچپن ہی سے قائل تھی۔
"بس دعا کرو، اللہ میرے بھی جلدی سے ہاتھ پیلے کروا دے تو ابا کو سکون کی سانس لینا نصیب ہو۔"
"ہاں بالکل، ہر نماز میں دعا مانگتی ہوں۔" ردا بالکل سنجیدہ تھی۔

"چلو میں جاتی ہوں، بہت سارے کام پڑے ہیں۔" وہ باتے بات [illegible]
"ویسے تم مجھے زیادہ بتایا نہ کرو میں اتنی ہوں نہیں جتنی کہ تم مجھے سمجھتی ہو۔" ردا قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔
طلبیہ، ردا کے کمرے سے نکل کر لاؤنج کی طرف جا رہی تھی کہ دروازے کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس کے قدم دروازے کی طرف بڑھے۔
"جی آپ کون؟" وہ سامنے کھڑے محب کو بغور دیکھتے ہوئے بولی۔
"وہ انکل سبحان ہوتے ہیں نا یہاں؟"
"وہ ہوتے ہیں یہاں لیکن آپ کون؟" وہ سراپا سوال تھی۔
"ان سے ملنا تھا، پنڈی سے آیا ہوں۔" وہ طلبیہ کے روکھے انداز سے خفا ہو چلا تھا۔
"او اچھا! آئیے۔" وہ ہٹی اور محب اس کے پیچھے اندر داخل [illegible] چھوٹا سا [illegible] ڈرائنگ روم میں لے آئی۔
"آپ [illegible] بیٹھیں میں ابو کو [illegible] بھیجتی ہوں۔"
وہ کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ [illegible] کمرے میں [illegible] مشکل دس منٹ ہوئے تھے بیٹھے ہوئے کہ سبحان انکل آ گئے۔ ان کے پیچھے ایک اور حضرت بھی تھے۔ تعارف کے بعد پتہ چلا یہ ان کے بڑے بھائی نعمان ہیں۔ اس نے اپنے بارے میں بتایا۔ سبحان انکل کے چہرے پر بہت خوشی تھی۔ وہ خوش تھے کہ [illegible] گھر میں ان کے سسرال سے بھی کوئی آیا تھا۔ اس کی صورت دیکھ کر انہیں بار بار اپنی رفیقہ حیات صائمہ کا خیال آ رہا تھا۔ محب نے ایک ڈیڑھ گھنٹہ بازار میں گھوم کر ایک خوب صورت ٹی سیٹ خرید اتھا جسے وہ ساتھ لایا تھا۔ گفٹ دے کر اس نے رخصت چاہی لیکن انہوں نے اسے بہت محبت سے روک لیا۔ ان کا اصرار تھا کہ اب وہ شادی تک وہیں رکے۔ ایسا کرنا اس کے لیے مشکل تھا لیکن سبحان اور نعمان انکل دونوں ہی بضد تھے۔ وہ ان کے آگے اس کی ایک نہ چلی اور وہ اگلے دن سامان لانے کا کہہ کر رخصت ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

"تاؤ! آپ کو اور ابا کو رش لگانے کا بہت شوق ہے!"
وہ تاؤ کے ساتھ مٹر چھلوا رہی تھی۔
"سمجھ رہا ہوں ساری بات تمہاری۔ ارے رونق کسے بری لگتی ہے؟ اور پھر انسان کی پہچان ہے مجھے۔"
"بہت پہچان ہے، سب بہانا ہے۔ ایک پارٹنر اور مل گیا اپنی شطرنج کے لیے آپ کو کیوں؟"
"اب تم کچھ بھی سمجھو، ہمیں تو وہ بانکا سجیلا نوجوان بہت اچھا لگا، کیسی اچھی گفتگو کرتا ہے، ادب تہذیب لحاظ سبھی ہے اس میں اور پھر تمہارا ننھیالی رشتے دار ہے۔ خیال رکھنا اس کا۔"
"ہونہہ، خیال رکھنے والے بہت ہیں یہاں۔"
دادی کمرے میں داخل ہوئیں تو دونوں چپ ہو گئے۔
"اے میں کہتی ہوں۔ آج برسوں بعد یہ تمہاری اماں کے کون سے سوئے ہوئے رشتے دار جاگ پڑے؟"
"پتہ نہیں دادی! دور کے ہیں کوئی، ہم تو جانتے بھی نہیں۔"
"اور تمہارے ابا اور تاؤ ایسا کیا لاڈ آیا؟ بوریا بستر سمیت گھر بلا لیا۔"
"انہی سے پوچھیں، دادی! اسلیم بھائی آئے؟"
"وہ غریب کیسے آئے گا، آج اس کے ابا دفتر نہیں گئے گھر پر ہی ہیں۔" "اور مجھے آج لازمی بازار جانا ہے، تاؤ! چھوڑیں یہ مٹر، چلیں اٹھیں۔" وہ تاؤ کے آگے سے ٹرے اٹھاتے ہوئے بولی۔
"ارے ارے لیکن مجھے تو کٹنگ والے کے پاس جانا ہے بھئی۔"
"ہاں تو دیری نہ، وہاں بھی ہو لیں گے۔"
"لیکن دونوں کے الگ راستے ہیں۔" تاؤ بازار جاتے ہوئے بہت گھبراتے تھے۔
"کون سا بڑا مسئلہ ہے؟ اب اٹھیں۔"
"اچھا بھئی چلو۔" بالآخر انہوں نے ہتھیار ڈال دیے۔

☼ ☼ ☼

وہ بیگ کندھے پر ڈالے تاؤ کے پیچھے پیچھے گاڑی کی طرف بڑھ رہی تھی، تبھی سامنے سے وہ وسیم کے ساتھ آتا دکھائی دیا۔ ہلکے سے آسمانی شلوار کرتے میں ملبوس وہ نظریں جھکائے چل رہا تھا۔

"ارے یہ تم دونوں کہاں سے چلے آ رہے ہو؟"

"بس یونہی ذرا ہوا خوری۔۔۔" وہ بولا۔

"دوپہر کو ہوا خوری؟" تاؤ کب بخشنے والے تھے۔

"ارے تاؤ! یہیں پاس میں وقار رہتا ہے۔ اس سے ملنے گئے تھے، وہ گھر پر تھا نہیں۔" وسیم نے وضاحت کی۔

"اچھا اچھا۔ چلو ہمارے ساتھ۔"

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟" وسیم نے پوچھا۔

"یہ ہماری لاڈو بیٹی کو بازار جانا ہے۔"

"توبہ استغفار، لاحول ولا قوۃ۔۔۔ "بازار؟ وہ بھی؟"

"کیا مطلب ہے تمہارا وسیم؟" وہ تنتنا اٹھی۔

"کچھ نہیں، کچھ نہیں، تاؤ! آپ جائیں، مجھے بڑا ضروری کام ہے۔ تائی نے بلایا ہے۔" اس نے جان چھڑائی۔

"تو محب میاں آپ چلو، ذرہ کراچی کے بازاروں کی رونق بھی دیکھو۔" تاؤ نے بنا اس کی طرف دیکھے محب کو دعوت دے ڈالی۔

"جی۔۔۔ میں؟ وہ کپڑے چینج کرنے پڑیں گے۔"

"ارے یونہی آجاؤ کیا مضائقہ ہے۔ آؤ آؤ اچھے لگ رہے ہو۔" تاؤ اس کے پیچھے پڑ گئے اور اسے گاڑی میں بیٹھنا ہی پڑا۔

☼ ☼ ☼

سارے راستے وہ تاؤ سے خفا بیٹھی رہی اور وہ اس کی کیفیت کو اچھی طرح سمجھتے ہوئے لطف اندوز ہوتے رہے۔ محب کی کیفیت بھی عجیب تھی۔ وہ ابھی اتنا بے تکلف نہیں ہوا تھا کہ یوں ان لوگوں کے ساتھ بازاروں میں گھومتا پھرے۔ مال میں قدم رکھتے ہی اس کا موڈ ٹھیک ہو گیا۔ ڈیڑھ گھنٹہ ہو گیا اور وہ ویسی ہی فریش تھی۔ البتہ تاؤ تھک چکے تھے، یہی تو موقع تھا، بدلہ لینے کا۔ وہ مزے سے چلی جا رہی تھی کہ اسے احساس ہوا کہ بھیڑ میں تنہا ہے، پلٹ کر دیکھا تو تاؤ بڑے مزے سے ٹک شاپ کے کاؤنٹر اسٹول پر بیٹھے تھے اور محب کشمکش کی صورت حال سے دوچار تھا، تاؤ برابر اسے بھی بیٹھنے کا اشارہ کر رہے تھے۔

"تاؤ! یہ کیا؟ بیٹھ کیوں گئے؟" وہ پلٹ کر آ چکی تھی۔

"ارے تو تم جاؤ نا، بچی تھوڑی ہو جو کھو جاؤ گی ہم دونوں ذرا کافی پی لیں۔ یہیں ملیں گے تمہیں، جاؤ۔"

"آپ کو پتا ہے نا، میں اکیلی بازار میں نہیں چل سکتی پھر بھی۔۔۔"

"بھتیجی! اب بڑی ہو جاؤ۔۔۔ اچھا یوں کرو یہ محب کو اپنے ساتھ۔۔۔"

"جی نہیں شکریہ، نہیں میں بھی [illegible] ہوں گی۔ بس آدھے گھنٹے کا اور ہے۔۔۔ پھر چلتے ہیں نا تاؤ۔" وہ ہتھیار ڈال چکی تھی۔

اس نے دیکھا تاؤ کے ساتھ ساتھ وہ بھی زیر لب مسکرا رہا تھا۔

"بات تو ہے کچھ۔" اس نے اس کی خوب صورت مسکراہٹ کو دیکھ کر سوچا۔

☼ ☼ ☼

رات گھر میں خوب رونق رہی۔ نسیم پھوپھو تو اپنے تینوں بچوں سمیت ایک ہفتے سے ڈیرے ڈالے ہوئے تھیں۔ سبحان صاحب کے فرسٹ کزن کے بیٹے سلیم بھی وارد ہو چکے تھے اور محلے کی نوجوان لڑکیوں کی پوری لاٹ کو طلبہ نے بلایا ہوا تھا اور اس وقت وہ گلے پھاڑ پھاڑ کر ڈھولک پر گیت گانے میں مصروف تھیں۔

وہ خود مزے سے ردا سے باتیں کر رہی تھی۔ گانے سے اس کا دور دور کا تعلق نہ تھا۔ گھر کی ملازمہ روشن سب کو چائے دینے میں مصروف تھی۔ لڑکوں کا ٹولا ایک طرف بیٹھا خوش گپیوں میں مصروف تھا۔ انہی میں وہ بھی بیٹھا تھا۔ جس سے اس کی اچھی خاصی دوستی ہو چکی تھی۔ نسیم پھوپھو کے بیٹے وسیم کی مہربانی سے وہ سب ہی سے متعارف ہو چکا تھا۔ طلبہ نے اشارے سے سلیم بھائی کو بلایا۔

"ہاں بولو کیا ہوا؟"

"سلیم بھائی! آج رات یہیں رکنا ہے۔ رات کو ہم سب دلہن کو لے کر آئس کریم کھانے جائیں گے۔"

"پاگل ہوئی ہو۔ سردی میں آئسکریم؟ اور بھئی مجھے تو معاف ہی رکھو، میں تو اب تھوڑی دیر میں نکلتا ہوں۔"

"جی نہیں اب ردا کی جتنی راتیں اس گھر میں باقی ہیں ہم ان سب کو انجوائے کریں گے۔ آپ ٹھہرے ابا کے منظور نظر آپ کے ساتھ تو وہ بلا تکلف ہمیں جانے کی اجازت دے دیں گے۔"

"سمجھا کرو بات کو، تم جاؤ گی "موشیتا" کیوں دہیں [illegible] نام؟"

"ہاں تو؟" اس کے لہجے میں حیرانی تھی۔

"تو یہ کہ رات کو "موشیتا" کے برابر والی بلیو رن بیری" سے نعیم بھائی انڈے ڈبل روٹی لینے آتے ہیں۔ اگر نظر پڑ گئی تو وہ خوب لتے لیں گے۔"

"ارے بھئی کیسی بے تکی بات کرتے ہیں۔ ان کی اور ہماری ٹائمنگز کیا same ہوں گی؟ اچھا وہ تو ساڑھے نو دس تک آتے ہیں نا؟ کیونکہ گیارہ بجے کے بعد تو آپ کے ڈر سے کوئی باہر قدم رکھ ہی نہیں سکتا، تو بس ہم گیارہ کے بعد چلیں گے۔"

"آدھی رات کو؟ دماغ صحیح ہے؟"

"یا خدا! آپ کراچی کی پیداوار ہو کر کیسی باتیں کرتے ہیں؟"

"بڑی مشکل سے ابا نے چچا کی مدد کروانے کا کہہ کر یہاں رکنے کی اجازت دی ہے۔ کہہ رہے تھے، دو بلاک کا فرق ہے رات رکنے کی ضرورت کیا ہے؟ لیکن اب سوچ رہا ہوں گھر چلا جاؤں ورنہ تم تو مروا ہی دو گی۔"

"چپ، چپ آپ کہیں نہیں جا رہے۔ خاموشی سے جا کر اپنے بونگے دوستوں کے ٹولے میں بیٹھ جائیں۔" اس نے منہ پھلا کر گویا حکم دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اور پھر وہ رات اس کی زندگی کی یادگار رات بن گئی۔ ابا نے سلیم بھائی کے ساتھ جانے کی اجازت "فوراً" دے دی تھی۔ اصل مسئلہ ردا کو دادی سے چھپا کر لے جانا تھا۔ چنانچہ ردا کے بستر پر روشن کو لٹا کر کمبل اوڑھا دیا گیا۔ اگرچہ دادی حیران تھیں کہ رات دو ڈھائی بجے تک جاگنے والی ردا آج اتنی جلدی کیسے سو گئی مگر طلبہ نے فوراً "نزلے اور سر درد کا بہانا کر کے ان کی تشویش کسی حد تک کم کر دی۔ من چلوں کا یہ ٹولہ دو گاڑیوں میں ٹھنس کر "موشیتا" پہنچا اور پھر ہنسی، دل لگی اور قہقہے۔

کیوں ایسا ہوتا ہے کہ ہم اکثر خود کو ٹھیک سے پہچان نہیں پاتے؟ اپنے اندر اپنی ہی بھول بھلیوں میں خود کو ڈھونڈتے ہیں اور اگر کبھی خود سے ملاقات ہو جائے تو اپنا آپ اجنبی سا محسوس ہوتا ہے۔ طلبہ نے بھی خود کو خود سے جدا پایا، جب غیر محسوس طریقے سے اس نے اپنے دل و نظر کو اس کا طلب گار پایا۔ وہ بہت ہنس رہا تھا۔ اس دن پہلی بار وہ مہمان نہیں بلکہ اپنا لگا تھا وہ بہت ہی عمدہ بولتا تھا۔

دادی نے ہمیشہ امی کے میکے کو جاہل گنوار کہا تھا۔ امی جب تک زندہ رہیں، دادی کے طعنوں سے ان کا جگر چھلنی ہوتا رہا اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ابا نے امی کو ایک شادی میں دیکھ کر پسند کیا تھا اور دادی کو ان کے گھر زبردستی بھیجا تھا۔ امی کا خاندان متوسط درجے کا کھاتا پیتا گھرانہ تھا مگر دادی تو پھنے خاں بنی پھرتی تھیں۔ انہیں نہ امی پسند آئیں نہ ان کے گھر والے۔ چھوٹا سا گھرانہ تھا امی کا۔ وہ اکلوتی تھیں، زیادہ رشتے دار بھی نہیں تھے۔ نانا نانی کی حادثاتی موت کے بعد تو جیسے ردا اور طلبہ کی ننھیال تھی ہی نہیں۔ دادی چاہتی بھی یہی تھیں۔ اب اتنے عرصے بعد امی کے رشتے دار کو دیکھ کر سبھی خوش تھے سوائے دادی کے۔

واپسی میں ایک کار کا ٹائر پنکچر ہو گیا۔ ردا کو دوسری گاڑی سے گھر روانہ کر کے وہ سلیم بھائی اور دو تین کزن کے ساتھ وہیں رہ گئی۔ گاڑی سے اتری تو ہوا کے ٹھنڈے جھونکے سردی کا احساس دلانے لگے۔ وہ کوئی گرم کپڑا بھی لے کر نہیں آئی تھی۔

"اُفوہ سلیم بھائی! جلدی کریں، سردی لگ رہی ہے۔"

"سوئٹر پہن کر آنا تھا نا اب ٹائم تو لگے گا ہی۔"

"آپ یہ لے لیں۔" محب نے اپنی گرم شال اس کی طرف بڑھائی۔

"ارے نہیں بس تھوڑی دیر کی ہی بات ہے، رہنے دیں۔"

"آپ کو ویسے بھی فوراً چھینکیں آنے لگتی ہیں۔ آپ اوڑھ لیں۔" وہ مسکرا رہا تھا۔

طلبہ نے شال اوڑھ لی۔ وہ اس کے جسم کی حدت سے اب بھی گرم تھی۔ اسے بے پناہ راحت محسوس ہوئی۔

"وسیم! چلو کافی شاپ تک چلتے ہیں۔" محب بولا۔

"ہاں آئیڈیا تو اچھا ہے، مگر جیب خالی ہے۔" وسیم کافی کا سن کر تڑپ اٹھا مگر حسب معمول کنگلا تھا۔

"او تو میری طرف سے۔" محب نے دعوت دی۔

"اوہ بھائی! یہ بندہ ناچیز بھی ہے۔" سلیم بھائی قدرے اونچی آواز سے بولے۔

"ہاں تو آیئے نا، کس نے آپ کی موجودگی کی نفی کی ہے سرکار!" محب نے مسکرا کر کہا۔

"لو بھائی لگ گیا ٹائر، اور اب اس ٹھنڈ میں کافی تو ہونی ہی چاہیے۔" سلیم بھائی کھڑے ہوتے ہوئے بولے۔

کافی شاپ میں خاصا رش تھا۔ ویک اینڈ تھا اور کراچی میں سردی مہمان کی طرح آتی ہے۔ لوگ تفریح کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ وسیم کی نظریں حسب معمول حسین چہروں کے طواف میں مصروف تھیں، سلیم بھائی بھی اپنے گھر کے گھٹن زدہ ماحول سے باہر نکل کر خاصے سوشل ہو جایا کرتے تھے۔ دونوں حسب توفیق آنکھوں کے رنگ سے لے کر کپڑوں کی بناوٹ تک پر اظہار خیال کر رہے تھے۔

اس دن کافی شاپ میں واقعی کئی حسین چہرے موجود تھے۔ مگر وہ بہت مختلف تھا۔ طلبہ نے اس کی نظروں کو بھٹکتے نہیں پایا۔ وہ خاموشی سے کافی پی رہا تھا۔

"آپ کیا سوچ رہے ہیں؟ حضور!" سلیم بھائی نے پوچھا۔

"کچھ نہیں، کافی بہت اچھی ہے۔"

"ہمیں تو ہر مفت کی چیز اچھی لگتی ہے۔" وسیم چہکا۔

"تم تو کنجوس ہو، جب تمہارے پاس پیسے ہوتے ہیں۔ تب تم کون سا خرچ کرتے ہو۔" طلبہ کو وسیم پر غصہ آ رہا تھا۔

"بھئی محب کی آفر تھی انکار کیوں کرتے، دوست ہے یار!"

"مہمان ہیں وہ۔ شاید بھول گئے آپ۔" طلبہ نے یاد دلایا۔

"میں بھئی مہمان نہیں ہوں۔ آپ لوگ اپنا ہی سمجھیں۔"

"ہاں بھئی بالکل اپنے ہو تم کیوں طلبہ؟" سلیم بھائی کو بے تکے سوال پوچھنے کی عادت تھی۔

"اب چلیں بھی دیر ہو رہی ہے۔" اس نے بات ٹالی۔

☼ ☼ ☼

"ردا! اٹھو بھئی کیا سچ مچ سو گئیں؟" وہ ردا کا کندھا ہلا کر بولی۔

"کیا مصیبت ہے؟ دو بجے رات کو صرف تمہیں ہی مسئلے پیش آ سکتے ہیں۔"

"چلو اٹھو... اٹھو۔" طلبہ بستر سے نکلتے ہوئے بولی۔

"کیوں... ؟ کیا ہوا؟ طبیعت ٹھیک ہے؟" ردا فکرمندی سے بولی۔

"اٹھو تو۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے بولی۔

"اُف کیا قیامت آ گئی؟" ردا کو اٹھنا ہی پڑا۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر چھت پر لے آئی۔ ردا کو غصہ آ رہا تھا۔

"اس ٹھنڈ میں تمہیں ہوا خوری سوجھ رہی ہے، وہ بھی اتنی رات گئے۔ تمہیں پتہ ہے صبح مجھے فیشل کے لیے پارلر جانا ہے۔ مجھے سونا ہے بھئی۔" ردا پلٹ کر جانے لگی۔

"کتنی خود غرض ہو تم ادھر آؤ۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر دیوار کے پاس کھڑی ہو گئی۔

"وہ دیکھو چاند...!"

"ہاں تو کیا پہلی بار نکلا ہے؟ کم آن طلبہ! کیا ہوا ہے تمہیں؟"

"آج اس طرح ہم دونوں آخری بار اس پورے چاند کو دیکھ رہے ہیں۔" اس کی نظریں چاند پر تھیں۔

"کیوں؟ کل قیامت آ رہی ہے کیا؟" ردا نے تعجب سے اسے دیکھا۔

"شادی کے بعد تمہاری زندگی بدل جائے گی۔"

"کیوں؟ شادی کے بعد میں تمہارے ساتھ چاند نہیں دیکھ پاؤں گی؟" ردا ہنس رہی تھی۔ مگر طلبہ سنجیدہ تھی۔ ردا کو بھی خاموش ہونا پڑا۔

"چاند دیکھ پاؤ گی مگر صرف اور صرف میری بہن بن کر نہیں، تم کسی اور کی زندگی سے منسوب ہو چکی ہو گی اور یہ دن یادیں بن جائیں گے۔" ردا خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"یاد کرو اس چھت پر میں، تم، ابا اور تاؤ گرمیوں کی شاموں میں بیٹھ کر کتنی باتیں کیا کرتے تھے۔ امی ہماری فرمائشوں پر کیا کیا مزیدار چیزیں پکا پکا کر ہمیں لے آیا کرتی تھیں۔ دادی سے چھپ کر ہم اوپر کورٹ پیس کھیلا کرتے تھے۔ میرے پارٹنر ہمیشہ تاؤ ہوا کرتے تھے اور تمہارے ابا۔ ردا تمہیں پتا ہے تاؤ اور میں بہت بے ایمانی کیا کرتے تھے۔"

"پتہ ہے مجھے۔" ردا کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔

"تمہیں یہ سب دن یاد رہیں گے نا؟"

"پاگل کوئی اپنوں کو بھول سکتا ہے کیا؟" ردا کی آواز بھرا گئی۔

"ردا! جب امی کا انتقال ہوا تھا تو میں ڈر کے مارے چھت پر بھاگ آئی تھی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں اکیلی ہوں پوری دنیا میں۔ اب کوئی مجھے پیار نہیں کرے گا۔ میرے الجھے بال آہستگی سے نہیں سلجھائے گا، کوئی میری پروا نہیں کرے گا۔ میں یہاں اس ستون کے پیچھے...!" وہ ستون کی طرف مڑی اور جیسے پتھر کی ہو گئی۔

"کیا ہوا؟" ردا اس کی شکل دیکھ رہی تھی۔ وہ بالکل ہونق لگ رہی تھی۔ ردا کو خود ستون کے پیچھے جانا پڑا، یہ دیکھنے کے لیے کہ آخر اس نے کیا بلا دیکھ لی ہے۔

"اوہ... وہ ہنسی تو یہ آپ ہیں جنہوں نے خاتون کو ڈرا دیا۔" ردا نے گھبرائے ہوئے محب کو دیکھا۔

"جی بس یہ سب ابھی سونے کے لیے لیٹے تھے میں نے سوچا ذرا چاندنی رات...!" اس نے کن انکھیوں سے طلبہ کو دیکھا۔

"اچھا تو آپ کو بھی پورا چاند پسند ہے، طلبہ کی طرح... آپ نے تو سب سنا ہی ہو گا۔"

"ہاں نہیں... میرا مطلب ہے میں تو بس یونہی...!" وہ سخت گھبرایا ہوا تھا۔

"کوئی بات نہیں، آئیں بیٹھتے ہیں۔" ردا نے خوشدلی کا مظاہرہ کیا اور پاس پڑی کرسیوں کی طرف بڑھی۔

"میرا خیال ہے مجھے آپ کو تم کہنا چاہیے۔ بڑی ہو ہوں۔" ردا اس کی خجالت دور کرنا چاہتی تھی۔

"لیکن میں آپ کو آپ نہیں تم کہوں گا ڈن؟"

"اوکے ڈن۔" ردا ہنسی۔

"تم لوگ بیٹھو میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔"

"ارے نہیں آپ... میرا مطلب ہے تم کیوں بس دو چار دن تو باقی ہیں رخصت ہونے میں۔ ان سے کہیں۔" اس نے طلبہ کو دلچسپی سے دیکھا۔

"ہاں میں ہی جاتی ہوں۔ آپ لوگ بیٹھیں۔" وہ بدستور سنجیدہ تھی۔

"خبردار! تم بیٹھو میں جا رہی ہوں چائے بنانے۔"

روا کے لہجے میں تحکم تھا۔
"کیا کرتی ہیں آپ؟" روا کے جانے کے بعد اس نے پوچھا۔
"کیا کرتی ہیں مطلب؟"
"کیا پڑھتی ہیں؟"
"بی اے کا فائنل ایئر ہے۔"
"سائنس کیوں نہیں لی؟"
"مجھے آرٹس پسند ہے۔"
"یہ تو اچھی بات ہے۔ پھر تو شاعری سے بھی لگاؤ ہو گا؟"
"ہاں بہت مجھے فیض، منیر نیازی، پروین شاکر بہت پسند ہیں۔"
"فیض تو مجھے بھی بہت پسند ہیں۔"
"اچھا۔"
"آپ مجھ سے خفا سی لگتی ہیں؟"
"نہیں تو آپ تو۔۔۔"
"آپ تو کیا؟"
"کچھ نہیں بس۔۔۔" وہ گھبرا گئی تھی۔
"آپ کچھ کہتے کہتے رک گئیں۔"
"کچھ بھی نہیں۔" وہ نظریں جھکا کر بولی۔
"میں ولیمہ والے دن پنڈی واپس جا رہا ہوں۔"
"کیوں؟ اسی دن کیوں؟" اسے دھکا سا لگا۔
"میں یہاں ابا کے بہت ضروری کام سے آیا تھا۔ کام تو تین دن پہلے ہو گیا اب تو صرف انکل کے کہنے پر رک گیا ہوں۔ وہاں کافی کام ہیں۔"
"آپ نے ایم بی اے کیا ہے؟"
"ہاں ایگزام دیا ہے رزلٹ بھی آنے والا ہے۔ آپ دعا کیجیے گا۔"
"جب روا سے "تم" سے بات کرتے ہیں تو مجھ سے "آپ" کیوں؟"
"اوہ خیال ہی نہیں رہا۔" وہ مسکرایا۔
"میں ضرور دعا کروں گی۔ ویسے وہ آپ کی شال میرے پاس رکھی ہے میں لاتی ہوں۔" وہ اٹھنے لگی۔
"رہنے دو اپنے پاس ہی رکھ لو۔

دیکھ کر۔"
"ایسے ہی اسے دیکھ کر میرا خیال آئے گا۔"
"آپ پھر آئیے گا نا!"
"آؤں گا تو ضرور، تم فون کرو گی مجھے؟"
"ہاں ہاں ضرور۔"
"یہ لو بھئی چائے گرم۔" روا ٹرے لیے چلی آئی۔

☼ ☼ ☼

شادی کے ہنگامے شروع ہوتے ہی جیسے وقت کو پر لگ گئے۔ سارے خوب صورت لمحات تتلی کے پروں کے رنگوں کی مانند ہاتھوں میں کچھ دیر کو آئے اور پھسل گئے۔ محب کو ہوش آیا اس وقت جب اسے احساس ہوا کہ وہ طلبیہ کے وجود کے دائرے میں کہیں گھوم رہا ہے۔ وہ خود پر حیران تھا۔ محلے میں، یونیورسٹی میں، خاندان میں اس کے اردگرد بیشتر وجود رہتے تھے مگر اسے کبھی ایسی دلچسپی، ایسی جستجو اپنی ذات میں کشش کسی کے لیے محسوس نہیں ہوئی تھی۔ وہ معصوم تھی، صاف دل سی تھی، بے حد حسین نہیں تھی پھر بھی اس کے چہرے میں عجیب سی کشش تھی۔
وہ یہاں ابا کے بہت ضروری کام سے آیا تھا۔ کراچی کی نئی آبادیوں میں انہوں نے کبھی دو پلاٹ خریدے تھے۔ اب ان کو بزنس میں مستقل نقصان کا سامنا تھا، چنانچہ انہوں نے محب کو دونوں پلاٹ بیچنے کے لیے کراچی بھیجا تھا۔ وہ تمام کام نمٹا چکا تھا اب صرف ایک ہی بے حد ضروری کام باقی تھا "واپسی" کا جو اسے بہت مشکل لگ رہا تھا۔ وہ خاموش تھا۔ زندگی کی اس تبدیلی کو محسوس کر رہا تھا۔ وہ نوعمر تھی تو وہ بھی کم عمر تھا۔ اس عمر میں زندگی کی رنگینیاں اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ بہت رنگین دھاگے ہوتے ہیں جیسے ریشم کا لچھا ہاتھ میں لیتے ہی مٹھی میں سمٹ آئے۔ امیدیں، تمنائیں، آرزوئیں اور پھر وقت کی مدھم مدھم آہٹیں، بار بار دل کو گدگداتی ہیں۔
اس نے بارہا اپنے دل کو ٹٹولا۔ وہاں طلبیہ کے لیے ایک پاکیزہ سی لگن تھی، پیار تھا، اپنا پن تھا اس لیے

اور وہ مسرور تھے۔ بہت مختلف تھا۔ اس کی سوچ اس کی عمر سے مختلف تھی۔ اس کے کردار کی پختگی اس کی تربیت کا غماز تھی۔ وہ مسکرا اٹھا۔
"میں ضرور واپس آؤں گا۔ تمہیں لینے، تمہاری تمنا میری زندگی کا مقصد ٹھہری۔" وہ پرعزم تھا۔

☼ ☼ ☼

ولیمہ کی رات اسے کسی نے نہیں جانے دیا۔ وہ رات بہت اداس تھی، کل سبھی اپنے اپنے ٹھکانوں کو لوٹ رہے تھے۔ آخری محفل۔ ماؤ سب کو دل و جان سے اچھے موڈ میں لانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ سلیم بھائی کو بھی زبردستی روکا گیا تھا۔ شادی کی تقریبات کے واقعات دہرائے جا رہے تھے۔ چھوٹی چھوٹی باتیں اور وہ چھوٹے موٹے کام جو ادھورے ہی رہ گئے تھے۔
"محب بیٹا! اب کب آنا ہو گا؟" ابا اسے بغور دیکھتے ہوئے بولے۔
"ان شاء اللہ بہت جلد۔" وہ مسکرا کر بولا۔
"وہاں سب کو سلام کہنا اور بہت شکریہ ادا کرنا۔" ہمدان صاحب کو بھی وہ بہت اچھا لگنے لگا تھا۔
"جی انکل!"
روشن چائے کی بھری ٹرے لیے آئی اور سب کے آگے کارپٹ پر چائے رکھتی گئی۔
"روشن! تم جاؤ آرام کرو۔" طلبیہ نے تھکی ہوئی روشن کو چھٹی دے دی۔
"چائے کے برتن دھو کر چلی جاؤں گی۔" روشن ہنس کے بولی۔
"تم رہنے دو۔ آرام کرو، وسیم یہ کام کر لے گا۔" طلبیہ نے وسیم کو دیکھا۔
"یا اللہ خیر، طلبیہ بی بی! دماغی توازن ٹھیک ہے آپ کا؟" وسیم سراپا احتجاج تھا۔
"کیوں کیا ہوا میرے دماغ کو۔ تم مرد کچن کا کام کرنا بے عزتی کیوں سمجھتے ہو اور تم تو رہنے ہی دو وسیم! اپنے مرضی اکثر کچن میں گھسے ہوئے ہوتے ہو۔ کافی تم اندازاً بناتے ہو، ڈسٹنگ تم اچھی کر لیتے ہو۔ آملیٹ کا

تو تمہارے جواب ہی نہیں۔" وہ بولے گئی۔
"ارے خاتون! میں تو دماغی توازن کی بات اس لیے کر رہا تھا کہ یہ آپ محب کی ٹوٹی پی ہوئی چائے کیوں پی گئیں؟ وہ شریف انسان چپ بیٹھا ہے۔" وسیم مسکرایا۔
"کیا؟" وہ سخت شرمندہ تھی۔
"کوئی بات نہیں، لائیں آپ کی چائے میں پی لیتا ہوں۔" اس نے آگے بڑھ کر کپ اٹھا لیا۔
"نہیں یہ جھوٹی ہے لائیں میں دوسری بنا کر لاتی ہوں۔" وہ اٹھنے لگی۔ مگر وہ کپ اٹھا کر چائے پینے لگا۔ اس کے چہرے کے گلاب جلنے لگے اور یہ حدت محب کو صاف محسوس ہوئی۔

☼ ☼ ☼

پچیس نومبر کی صبح اس نے کراچی کو الوداع کہہ دیا۔ وہ اسلام آباد ایئرپورٹ کے باہر کھڑا ٹیکسی لے رہا تھا اور ایک ہی سوچ اس کے دماغ پر مسلط تھی۔ کراچی میں اس گھر میں کیا ہو رہا ہو گا۔
اور جب وہ اپنے گھر پہنچا تو سب کے فق چہرے دیکھ کر اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ گھر میں چند جان پہچان والے اور دو چار رشتے دار بھی تھے۔ امی کا چہرہ شدت غم سے تپ رہا تھا مگر وہ ضبط کیے ہوئے تھیں۔
اس کی چھوٹی بہنیں ثناء اور جویریہ بڑو ن حسینہ خالہ سے جڑی بیٹھی سسکیاں لے رہی تھیں۔ اسے اپنا پھوپھا بھائی صائم کہیں نظر نہیں آیا۔ باہر لاؤنج کا فرنیچر نکال کر دری اور چاندنیاں بچھا دی گئی تھیں۔ اس کے ہاتھ سے بیگ چھوٹ کر گر پڑا۔ اس کی ماں کی نظر جونہی اس پر پڑی، ضبط کے تمام بندھن ٹوٹ گئے۔ دوڑ کر وہ اس کے گلے لگ گئیں اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ انہیں دیکھ کر بہنیں بھی دوڑی چلی آئیں۔
"تم آ گئے بیٹے، دیر ہو گئی بیٹا! دیر ہو گئی۔" وہ سسک رہی تھیں۔
"امی! امی کیا ہوا ہے بولیں۔" وہ ان سے سننا چاہتا

تھا۔ اگرچہ ماحول نے اسے بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔

"تمہارے ابا۔۔۔ نہیں رہے۔ چھوڑ گئے سب کو۔"

"کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ تین دن پہلے تو میری ان سے بات ہوئی تھی۔"

"بہت جلدی تھی انہیں۔۔۔ وہ' وہ فرید قریشی۔۔۔" رونے کی وجہ سے الفاظ ان کے گلے میں پھنس رہے تھے۔

"کیا؟ کیا کیا فرید انکل نے؟" اس نے بے تابی سے پوچھا۔ تب ہی فصیح خالو آگے بڑھے۔

"آؤ بیٹے محب! اپنے ابا کو غسل دلواؤ۔ خدا کا شکر ہے تم ٹھیک وقت پر پہنچ گئے۔" وہ اسے کندھے سے پکڑ کر گھر کے پچھلے حصے کی طرف لے گئے۔ اس نے جاتے جاتے مڑ کر دیکھا امی بے ہوشی کے عالم میں گرنے لگی تھیں اور خواتین انہیں تھام کر صوفے پر لٹا رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

محب کے دادا تقسیم سے پہلے ہندوستان میں کپڑے کا کاروبار کرتے تھے۔ پاکستان بنا تو پورا خاندان پنڈی آکر آباد ہو گیا۔ کچھ جمع پونجی پاس تھی جس سے انہوں نے یہاں ایک کپڑے کی دکان کھول لی اور پھر ان کے بیٹے محب کے ابا نے اپنی محنت اور لگن سے کاروبار کو خوب وسعت دی اور بالآخر گارمنٹ فیکٹری کے مالک بن گئے۔ وہ قناعت پسند آدمی تھے اس لیے اپنے کاروبار کو زیادہ پھیلایا نہیں۔ فرید قریشی ملتان سے پنڈی نوکری کی تلاش میں آیا تھا۔ پڑھا لکھا تھا۔ ابا کے سامنے اپنی پریشانیوں کو اس طرح بیان کیا کہ نرم دل انسان نے اسے نوکری پر رکھ لیا۔ کچھ ہی عرصے میں اس نے ان کو جانے کیا گھول کر پلایا کہ وہ اسی کے گن گانے لگے۔ وہ اس پر باقاعدہ انحصار کرنے لگے۔ ایک ڈیڑھ سال تک فیکٹری کا کام زبردست رہا۔

مگر پھر دھیرے دھیرے جما جمایا کاروبار گرنے لگا۔ کبھی روئی کو گھن لگا ہوتا تو کبھی دھاگے کی قیمتیں چڑھ جاتیں۔ آرڈر وقت پر پورے نہ ہو پاتے۔ محب کے ابا مسعود صاحب کافی پریشان تھے۔ انہوں نے اپنے والے گھر کو بینک کے ہاتھوں گروی رکھ کر قرض لیا تاکہ فیکٹری کو کھڑا رکھ سکیں' مگر نقصان ہوتا ہی رہا۔ وہ پرانے انجائنا کے مریض تھے' بے حد پریشان رہنے لگے۔ سود بڑھ رہا تھا اور وہ قرض کی قسطیں بھی دینے کے لائق نہ رہے تھے۔ وقت گزرتا رہا اور پریشانیاں بڑھتی رہیں۔ محب کو انہوں نے اچھے وقتوں میں خریدے دو پلاٹ بیچنے کے لیے کراچی بھیجا تھا۔ اگرچہ وہ ناتجربہ کار تھا' کم عمر تھا' مگر سمجھ دار تھا انہیں یقین تھا کہ وہ یہ کام کر لے گا۔ نئی آبادیوں میں زمین کی قیمت بہت زیادہ تو نہیں تھی' پھر بھی دس سال پہلے پچاس ہزار میں خریدی ہوئی زمین تین لاکھ بیس ہزار میں بکی تھی۔

مسعود احمد کا ارادہ تھا کہ وہ فیکٹری بیچ کر گھر کا قرض چکا دیں گے۔ اب بینک سے تقاضے کے نوٹس آنے لگے تھے اور زمین کی قیمت سے وہ کپڑے کی چھوٹی موٹی دکان کھولنے کے بارے میں سوچ رہے تھے اور جب انہوں نے فیکٹری بیچنے کی شروعات کیں تو پتہ چلا کہ فیکٹری تو ان کی رہی نہیں۔ جانے کیسے' کیونکر فرید قریشی سیاہ سفید کا مالک بن بیٹھا تھا۔ انہیں خبر نہیں کہ کیسے انہوں نے پیپر زر سائن کیے۔ کب انہوں نے یہ لکھا کہ میرے بیٹے کو بزنس سے کوئی دلچسپی نہیں اور میری صحت ٹھیک نہیں رہتی اس لیے میں فرید قریشی جو میرے اعتبار کے انسان ہیں فیکٹری فروخت کر رہا ہوں۔ وہ اپنی دنیا کو یوں لٹتا نہیں دیکھ پائے ان کے دل نے دھڑکنے سے انکار کر دیا اور وہ اپنے محبوب ترین بیٹے سے ملے بغیر ہی چلے گئے۔

محب کی امی شوہر کے صدمے سے باہر نہیں نکل پائیں۔ وہ گم صم اور خاموش ہو گئیں' علاج مستقل رہا تھا مگر نتیجہ کچھ نہیں تھا۔ ہر وقت بیٹھی در و دیوار تکا کرتیں۔ کھانا کھلا دو تو کھا لیتیں ورنہ خود سے تو انہیں بھوک پیاس لگتی ہی نہیں تھی۔ ثناء پندرہ سال کی تھی جبکہ جویریہ کی عمر بارہ برس تھی اور صائم تو صرف

سال کا تھا۔ شروع شروع میں محلے کی خواتین آکر امی کے کپڑے بدلواتیں، بال بنا جاتیں پھر بہت جلد ثناء نے وہ سارے کام سیکھ لیے۔ اب وہ گھر کے ہر کام کو سمجھ چکی تھی۔ محب کے سامنے بہت سے سوالات تھے جن کے جواب وہ خود سے مانگتا تھا۔ کون کب تک ساتھ دیتا ہے پھر بھی چند فرشتہ صفت لوگوں نے اس کا بہت ساتھ دیا۔ انہی کے مشوروں سے اس نے گھر کا سامان فروخت کرنا شروع کر دیا۔ مہنگے داموں خریدا ہوا سامان اونے پونے بکا۔ چھوٹے موٹے اور بھی کئی قرضے تھے۔ اس نے کار بیچ کر ایک سیکنڈ ہینڈ موٹر سائیکل خرید لی۔ اسے معلوم تھا کہ ان کے پاس وقت کم ہے اور جلد ہی اسے گھر کا بندوبست کرنا ہے۔ اسٹیٹ ایجنسی والے رحمان انکل ابا کے پرانے واقف کار تھے انہی کی مدد سے سبزہ زار ٹاؤن ڈی بلاک میں ایک چھوٹا سا کرائے کا گھر مل گیا۔ دونوں زمینوں کی رقم ابھی اس کے پاس تھی۔ گھر کا ایڈوانس اسی رقم سے جمع کرا کر وہ سب کو لے کر شفٹ ہو گیا۔

زندگی کے کھیل عجیب ہیں جب آنکھیں چکا چوند روشنی کا سامنا کر رہی ہوتی ہیں تو پیچھے سے آنے والی تاریکی کا پتا ہی نہیں چلتا۔ جب تاریکی کا لبادہ چھا جاتا ہے تو قدم ڈگمگانے لگتے ہیں، ایسے میں جو سنبھل کر چلے وہ ٹھوکر نہیں کھاتا اور جو گرا سو گرتا ہی چلا جاتا ہے۔ یہ تاریکی زیادہ لمبی نہیں ہوتی روشنی کی لکیر نمودار ہوتے ہی اجالے پھیلنے لگتے ہیں اور سب کچھ صاف صاف دکھائی دینے لگتا ہے۔ محب کے قدم بھی نہیں ڈگمگائے اور اجالا پھیلنے لگا۔ ایک پرائیویٹ کمپنی میں اسے اچھی جاب مل گئی، زندگی کی گاڑی چل پڑی تھی۔ البتہ مقاصد بدل چکے تھے۔ منزل کا تعین مشکل تھا۔ تصور کی آنکھ اسے طلبہ کا چہرہ دکھاتی تھی تو وہ متفکر ہو جاتا۔ اس کے سامنے مسائل تھے، ذمہ داریاں تھیں، ایسے میں اپنے بارے میں سوچنا بھی مضحکہ خیز لگتا تھا۔ لیکن آخر کار اس نے حل سوچ ہی لیا۔

☆ ☆ ☆

آج یونیورسٹی میں غیر معمولی چہل پہل تھی۔ مئی کی تپتی دھوپ کے بجائے آج آسمان ابر رحمت سے ڈھکا ہوا تھا۔ بہت خوشگوار موسم تھا۔ جوان خون کی حدت چہروں سے عیاں تھی اور دل امنگوں سے بھرپور۔

ساریہ کینٹین میں پچھلے آدھے گھنٹے سے بیٹھی بور ہو رہی تھی۔ یوں تو وہ بور ہونے والوں میں سے تھی نہیں کیونکہ جہاں وہ ہوتی وہاں زندگی قہقہے لگاتی، لیکن اس وقت وہ اکیلی تھی اور مسلسل صائم کو موبائل پر پیغامات دیے جا رہی تھی، اگرچہ جانتی تھی کہ کلاس کے دوران وہ موبائل فون بند رکھتا ہے۔

"جب سارے پیغامات اکٹھے پڑھے گا تو کتنا جلے گا۔" وہ سوچ کر خوش ہوئی۔

کلاس تو اس کی بھی تھی مگر چونکہ پروفیسر خاور اسے قطعی پسند نہ تھے اس لیے وہ کلاس سے غائب تھی۔ ساریہ کی طبیعت [illegible] سے صائم سے پتا چل ہی جاتی تھیں، وہاں بور ہونے سے بہتر وہ کینٹین میں بور ہو، زیادہ [illegible] تھی۔ یونیورسٹی کا آخری سال تھا۔ صائم کو نوکری کرنی تھی اور ساریہ کو شادی۔ صائم تنہا تھا، ہی کون اکیلا رہتا تھا۔ بچپن ہی میں والدین کا انتقال ہو گیا تھا، بھائی بہن کوئی تھا نہیں، تھوڑے بہت دور پرے کے رشتے دار تھے جن سے بس واجبی سا ملنا جلنا تھا۔ ہمیشہ سے وہ اپنے ایک قریبی دوست کی فیملی کے ساتھ رہا تھا۔ ساریہ تو جیسے اللہ میاں کے ہاں سے ساری خوشیاں اپنے نام لکھوا کر لائی تھی۔ اس کی زندگی میں بھی کبھی غم کا گزر ہوا ہی نہیں تھا۔ زندگی بے حد حسین تھی، پیار کرنے والے ماں باپ اور ہر آسائش۔ علامہ اقبال ٹاؤن میں اس کا شاندار بنگلہ تھا، جہاں اس کی زندگی خوشیوں کے جھولے میں ہمکتی تھی۔

صائم اس کے لیے صرف ایک دوست یا محبوب نہیں تھا، وہ اس کے لیے آکسیجن کی طرح تھا۔ وہ اسے دیکھ کر جیتی تھی۔ یونیورسٹی کے چار سال پر لگا کر اڑ گئے تھے اور اب روز ملنے کے دن ختم ہو رہے تھے۔ صائم نے اسے کبھی نہ اپنا گھر دکھایا تھا اور نہ ہی اپنے اس دوست کی فیملی کے بارے میں بتایا تھا جن کے ساتھ وہ رہتا تھا۔ وہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی۔

"میں ہوسٹل شفٹ ہو رہا ہوں۔" صائم نے بتایا۔

"کیوں؟" وہ اتنے زور سے چلائی جیسے پہاڑ ٹوٹ پڑا ہو۔

"یونہی، کب تک رہوں گا ان کے ساتھ۔ نوکری لینی ہے۔ اپنے لیے گھر کا بندوبست کرنا ہے۔" اس نے تفصیل پیش کی۔

"بھئی یہ سب تو بہت دیر والے کام ہیں۔" وہ پریشان ہونے لگی۔

"دیر والے؟ کیا مطلب؟" اس نے پوچھا۔

"مطلب اب تم جاب تلاش کرو گے، پتہ نہیں کب ملے، پھر پیسے جمع کر کے گھر لو گے، تب جا کر اسے بسانے کے بارے میں سوچو گے۔"

"تم اتنی جلد باز کیوں ہو؟"

"یہ سب چھوڑو، میرے بابا سے تمہاری جاب کی بات [illegible]"

"بالکل نہیں۔" اس کا لہجہ خوفناک حد تک سرد ہو گیا۔

"کیا ہوا؟" وہ حیران تھی۔

"جاب کی تم فکر نہ کرو، وہ تقریباً ہو گئی ہے۔"

"لیکن ۔۔۔ اچھا ٹھیک ہے۔" اسے پتا تھا وہ زیادہ تفصیلات میں جانا پسند نہیں کرتا تھا۔

وہ اسے بغور دیکھے گئی۔ وہ ایسا ہی تھا۔ سنجیدہ، بردبار [illegible] دنیا سے لاتعلق لڑکیوں سے اسے کوئی دلچسپی [illegible] ساریہ اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتی تھی [illegible] صائم نے خود اس سے دوستی میں پہل کی تھی اور [illegible] کے علاوہ اس کی کسی دوسری لڑکی سے دوستی نہیں [illegible] یہاں تک کہ جب وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ [illegible] وہ کبھی ان کے ساتھ آکر نہیں بیٹھتا تھا۔ اس کی [illegible] خوبیوں کی وجہ سے وہ اس سے قریب ہوتی چلی گئی اور اب تو اس کے بغیر جینے کے تصور سے اسے اپنا [illegible] محسوس ہوتا تھا اور ابھی جانے کتنا انتظار باقی

☆ ☆ ☆

"آپا اٹھو، اٹھو آپا!" صغریٰ نے انہیں شانے پر ہاتھ رکھ کر دھیرے سے ہلایا۔

"ہاں، بولو۔" وہ اٹھ بیٹھیں۔

"عصر ہونے کو ہے، وضو کر لو۔"

"میرا بیٹا آ گیا؟" انہوں نے نظریں چاروں طرف دوڑائیں۔

"آ گیا ہے، نہا رہا ہے۔ چائے بنوائی ہے تمہارے ساتھ پیے گا۔"

"ہاں، ہاں ٹھیک ہے۔ میں بھی وضو کر لوں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔

نماز پڑھ کر ان کے ہاتھ دعا کے لیے اٹھ گئے۔ برسوں پہلے قدرت نے جو ستم ڈھایا تھا، وہ اس کا آخری گھاؤ تھا، اس کے بعد زندگی کی حقیقت کو انہوں نے کھلی آنکھوں سے یوں پہچانا کہ کوئی مشکل، مشکل نہ رہی۔ بہت دن وہ ہوش و خرد سے بیگانہ رہی تھیں۔ وقت مہربان دوست ہے اور نسیان خدا کا بہترین تحفہ۔ ڈاکٹری علاج بھی ساتھ ساتھ چلتا رہا اور دھیرے دھیرے وہ زندگی کی طرف لوٹ آئیں۔ لیکن اب کی بار زندگی کے ڈھنگ ہی الگ تھے۔ بارہ برس بعد وہ زندگی کی طرف لوٹی تھیں۔ ان بارہ برسوں میں بہت کچھ ہو چکا تھا۔ ان کی دونوں بیٹیاں اپنے اپنے گھروں کی ہو چکی تھیں اور بہت خوش و خرم زندگی گزار رہی تھیں۔ چھوٹا بیٹا بھی جوان ہو گیا تھا۔ پڑھ لکھ کر لاہور میں نوکری کر رہا تھا۔

"السلام علیکم۔" وہ تولیے سے بال خشک کرتا ماں کے برابر آ بیٹھا۔

"وعلیکم السلام، جیتے رہو۔"

"طبیعت ٹھیک ہے امی؟" حسب عادت اس نے پوچھا۔

"ہاں بیٹا! سب اللہ کا کرم ہے۔"

صغریٰ مسکراتی ہوئی چائے لے کر آئی اور اسی تخت پر رکھ دی جس پر محب کی ماں بیٹھی تھیں۔

"لو بیٹا! چائے آ گئی۔"

"جی شکریہ، آپ بھی بیٹھیں۔" صغریٰ خاموشی سے

بیٹھ گئی۔

”امی! مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔“

”ہاں بولو۔“

”مجھے صائم کے بارے میں بات کرنی ہے۔“

”صائم کے بارے میں؟ کیا ہوا' کیا ہوا اسے؟“ وہ گھبرانے لگیں۔

”وہ بالکل ٹھیک ہے۔ مزے میں ہے۔“

”اچھا' اچھا تو۔۔۔ تو پھر؟“ وہ اب بھی بے خود سے لہجے میں بولتی تھیں۔

”امی! وہ شادی کر رہا ہے۔“

”ہیں؟ ہاں تو اچھا ہے۔ اسے کوئی لڑکی پسند ہے؟“

”جی!“

”ہاں تو ٹھیک ہے نا۔ چلیں گے ہم سب۔ تمہاری بہنیں وغیرہ۔“

”نہیں امی! کوئی نہیں جائے گا۔“ اس نے سر جھکا کر کہا۔

”کیوں؟ کیا وہ شادی کر چکا ہے؟“ وہ حیرت زدہ تھیں۔

”بالکل نہیں آپ سے پوچھے بنا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”تو کیا بات ہے۔ صاف کہو بیٹا! میرا دل گھبرا رہا ہے۔“

اور پھر وہ نشست لمبی ہو گئی۔ وہ جانے کیا کیا ماں کو سمجھاتا رہا اور ان کا سر نفی میں ہلتا رہا۔ صغریٰ بھی ان کا ساتھ دے رہی تھی۔ مگر ماں کے چہرے پر پریشانی تھی اور افسردگی بھی مگر وہ محب تھا' جو زندگی کی کڑی دھوپ میں آنکھیں کھول کر چلا تھا اور اس کے ہر نشیب و فراز کو سمجھتا تھا۔ بیس سال اس نے اپنے گھر کو بیٹا بن کر نہیں باپ بن کر سنبھالا تھا۔ گھر کا ہر فرد اس کے ایک اشارے کا منتظر رہتا تھا۔ کوئی اس کی بات رد نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ اس سے ڈرتے تھے بلکہ اس لیے کہ وہ اس سے بے حد محبت کرتے تھے۔

جب انسان اپنی ذات سے باہر نکل کر سوچتا ہے تو یہ زندگی اپنے معنی خود بتانے لگتی ہے اور بھی زیادہ حسین و دلچسپ لگنے لگتی ہے۔ اس نے خاموشی کی آہٹیں سنی تھیں' بڑی بڑی مصیبتوں کو معمولی سمجھ کر جھیلا تھا۔ اپنے ضمیر کو اپنے اندر سمو کر رکھا تھا۔ اپنے اندر کے خوب صورت انسان کو مرنے نہیں دیا تھا۔ گھر کے ہر فرد کو اس پر پورا بھروسہ تھا۔ پھر ماں کیسے نہ مانتی۔

☼ ☼ ☼

چھوٹے سے دو کمروں کے اس فلیٹ کے ایک بارہ بائی بارہ سائز کے کمرے میں وہ بستر پر خاموش بیٹھی تھی۔ کمرے میں دیکھنے والی تو کوئی چیز نہیں تھی۔ ایک پرانی سیکنڈ ہینڈ سنگھار میز' ایک الماری اور یہ بستر جس پر وہ بیٹھی تھی۔ اس سامان کے علاوہ وہاں ایک کرسی رکھنے کی بھی جگہ نہیں تھی۔ کمرہ سجا ہوا نہیں تھا۔ صرف دیوار پر چند گلاب کے پھول چپکا دیے گئے تھے اور سنگھار میز پر صائم کے دوست کا دیا ہوا گلدستہ رکھا تھا۔

امی پاپا تو اسے دنیا کی ہر شے دینا چاہتے تھے لیکن صائم نے جہیز لینے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

سارہ کے پاپا اس شادی پر سخت ناراض تھے۔ نکاح کے دن صرف اس کی امی ہی موجود تھیں۔ لیکن بعد میں شادی کے ریسیپشن پر ان کو ان کی بیگم نے منا ہی لیا۔ ویسے بھی اب جب نکاح ہو ہی چکا تھا تو ناراض ہو کر کیا کرنا تھا۔ شادی سے زیادہ وہ اس بات پر زیادہ ناراض تھے کہ صائم نے گھر گاڑی اور کیش لینے سے انکار کیوں کیا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ صائم محب کا بھائی ہے۔ اسی کا پرتو' اسی کے سانچے میں ڈھلا ہوا عادات و اطوار کے علاوہ وہ شکل و صورت میں بھی اس سے بہت زیادہ مماثلت رکھتا تھا' وہی لانبا قد' مضبوط بدن' گھرے بھورے بال اور وہی دل میں ہلچل مچا دینے والی گہری بھوری آنکھیں۔ سارہ کو چونکہ اس کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا تھا اس لیے وہ اس کے ساتھ کسی بھی طرح رہنے کو تیار تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس وقت اس معمولی کمرے میں بیٹھی بے حد خوش لگ رہی تھی۔

صائم چائے بنانے کچن میں گیا ہوا تھا۔ دو چار دست تھے' وہ جا چکے تھے۔ صائم چھوٹی سی ٹرے میں دو کپ رکھے کمرے میں داخل ہوا اور وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔

”ارے یہ کیا؟ تم ابھی تک یونہی بیٹھی ہو؟“ وہ مسکرایا اور ٹرے سنگھار میز پر رکھ دی۔

”اٹھو بھئی' بہت اچھی لگ رہی ہو اب اتار دو یہ لہنگے جھومر۔“

”پہلے مجھے میرا گفٹ تو دے دو۔ تمہیں کسی نے بتایا نہیں؟“ اسے خود ہی کہنا پڑا۔

”گفٹ؟ ارے ہاں۔“ وہ یاد کرتے ہوئے بولا پھر جیب میں ہاتھ ڈال کر چاکلیٹ کا بڑا سا پیکٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔

”لو تمہاری فیورٹ۔“

”یہ کیا؟ آج بھی چاکلیٹ؟ آج یہ تھوڑی دیتے ہیں۔“ وہ مایوسی سے بولی۔

”کیوں؟ تو پھر کیا دیتے ہیں؟“

”یہ سب تمہیں معلوم ہے لیکن شادی کے دن کوئی اچھی چیز دی جاتی ہے۔“ وہ اپنی دوست سیمین کی شادی کا تحفہ ڈائمنڈ رنگ کو یاد کرتے ہوئے بولی۔

”چلو پھر خاص تحفہ بھی دے ہی دیتے ہیں' تم بھی کیا یاد کرو گی۔“

وہ مسکراتے ہوئے بولا اور شیروانی کی جانب بڑھا جو اس نے کب کی اتار کر کھونٹی پر ہینگر کر کے لٹکا دی تھی۔ شیروانی کی اندرونی جیب سے ایک ڈبیہ نکال کر وہ اس کی طرف بڑھا۔

”یہ لو۔“ اس نے ڈبیہ کھول کر اس کی طرف بڑھایا۔ ایک خوب صورت نازک سا سونے کا بریسلٹ تھا۔ وہ کھل اٹھی۔

”واؤ بہت خوب صورت ہے۔“

”اچھا اب اٹھو۔ تمہیں دیکھ کر الجھن ہو رہی ہے اور کپڑے بدلو اور اپنی اصلی صورت میں لوٹ آؤ۔“

”ہاں جا رہی ہوں نا۔“ وہ سوٹ کیس کی طرف بڑھی جس میں اس کے کپڑے ابھی تک جوں کے توں رکھے تھے۔

وہ کپڑے بدل کر کمرے میں آئی تو وہ مزے سے لیٹا فون پر باتیں کر رہا تھا۔ سفید کرتے پاجامے میں اس کا صاف رنگ اور بھی اچھا لگ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر اس نے فون بند کر دیا۔

”کس سے باتیں ہو رہی تھیں اس وقت؟“

”اس وقت کیا؟ صرف ایک ہی تو بجا ہے۔“

”میں صبح الماری سیٹ کر لوں گی۔ میرے کپڑوں کی جگہ ہے نا اس میں؟“

”جگہ بہت ہے لیکن کپڑے نکالنے کی فی الحال ضرورت نہیں۔“

”کیوں؟“

”وہ میں صبح بتاؤں گا۔ ابھی سو جاؤ بڑی نیند آ رہی ہے۔“ اس نے روانی سے کہا اور کروٹ لے کر لیٹ گیا۔

وہ چند لمحے حیران سی اسے دیکھے گئی مگر وہاں تو خاموشی تھی اس نے لائٹ بند کی اور دوسری جانب ہٹ گئی۔ نیند آنکھوں سے دور تھی۔ شادی کے بارے میں تو اسے معلوم تھا کہ ایسی ہی ہونی تھی لیکن اس وقت یہ یادگار رات ایسے گزرے گی' اسے قطعی اندازہ نہ تھا۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ اس کی شادی کسی غیر معمولی شخص سے ہوئی ہے۔ دیر تک جاگنے کے بعد بالآخر وہ سو ہی گئی۔

☼ ☼ ☼

اگلی صبح بہت خوشگوار تھی' اس کی آنکھ صائم کی آواز سے کھلی جو دھیرے دھیرے اس کا نام پکار رہا تھا۔

”سارہ' سارہ! اٹھو نو بج گئے۔“

”اچھا! نو ہی تو بجے ہیں۔ میں تو چھٹی کے دن بارہ بجے سے پہلے سو کر نہیں اٹھتی۔“ اس نے بال سمیٹ کر کلپ لگایا اور پیر چپلوں میں ڈال دیے۔

”اطلاع دینے کا شکریہ فٹافٹ فریش ہو کر دوسرے کمرے میں آ جاؤ۔ ناشتہ تیار ہے۔“ وہ کہتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

ہاتھ منہ دھو کر وہ دوسرے کمرے میں پہنچی۔ جہاں

پلاسٹک کی چار کرسیاں اور ایک سینٹر ٹیبل پڑی تھی، جس پر ناشتہ رکھا تھا۔ صائم نے انتہائی سگھڑاپے کا مظاہرہ کیا تھا۔ ابلے ہوئے انڈے اور بریڈ سلائس۔ اس کے ساتھ صبح کا پہلا ناشتہ وہ بہت خوش تھی۔

"تم چائے بہت اچھی بناتے ہو۔" وہ خوش دلی سے بولی۔

"تمہیں بھی سکھا دوں گا۔ آخر کو تم ہی کو یہ سب سنبھالنا ہے۔ میں تو نئی نویلی دلہن ہونے کا ایڈوانٹیج دے رہا ہوں تمہیں۔" وہ ہنس پڑی۔

"اچھا اب جلدی سے تیار ہو جاؤ ہم آدھے گھنٹے میں نکل رہے ہیں۔" وہ ناشتے کے برتن سمیٹتے ہوئے بولا۔

"کہاں جا رہے ہیں؟"

"پنڈی۔" اس کا جواب مختصر تھا۔

"پنڈی؟ اچھا تبھی وہاں سے مری وغیرہ جائیں گے نا؟"

"ایسا ہی سمجھ لو۔"

"مگر وہ ولیمہ کا کیا ہوگا؟"

"وہ بعد میں فی الحال سب سے ضروری پنڈی جانا ہے۔" وہ کچن میں کھڑا چائے کے کپ دھو رہا تھا۔

"میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ اچھا میں امی کو فون کر کے بتا دوں کہیں وہ مجھے لینے کے لیے گھر سے نہ نکل جائیں۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے ان کو بتا دیا ہے۔"

"لیکن میں امی سے بات تو کر لوں۔"

"میں نے کہا نا! ابھی تم جا کر کپڑے بدلو، میں تیار ہوں۔" اس کا لہجہ سنجیدہ تھا۔ ساریہ خاموشی سے کمرے میں چلی گئی۔

ایک گھنٹے بعد وہ موٹروے پر محو سفر تھے۔ ساریہ کو یہ سفر بے حد خوشگوار لگنے کے علاوہ کچھ پراسرار بھی لگ رہا تھا۔ مگر صائم پر اس کا بھروسہ ہر وسوسے اور اندیشے سے بالاتر تھا۔ عورت کسی بھی عمر کی ہو محبت کی خوشبو پہچانتی ہے۔ ساریہ جانتی تھی کہ صائم اس سے بہت محبت کرتا ہے اور محبت دھوکہ نہیں دیتی۔ اسے فضا میں محبت کے انوکھے گیت سنائی دے رہے تھے۔ اسے اپنے قدم زمین پر نہیں بلکہ ہوا میں محسوس ہو رہے تھے۔ بس میں وہ کھڑکی کے پاس والی سیٹ پر بیٹھی تھی مگر بجائے باہر دیکھنے کے وہ صائم کو زیادہ دیکھ رہی تھی اور یونہی سفر ختم ہو گیا۔ بس سے اتر کر صائم نے سامان اتروایا اور ایک ٹیکسی لی۔ ساریہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ وہ کہاں جا رہی ہے اور اسے کچھ ایسی فکر بھی نہیں تھی۔

ٹیکسی بیس منٹ کے سفر کے بعد ایک خوب صورت گھر کے آگے رک گئی۔ کرایہ دے کر صائم نے سامان اتار کر دروازے کے قریب رکھا اور ڈور بیل پر انگلی رکھ دی۔ چند سیکنڈز بعد دروازہ کھلا اور ساریہ نے کئی جھانکتے چہرے ایک ساتھ دیکھے۔

"السلام علیکم۔" صائم اندر داخل ہو رہا تھا۔ وہ اس کے پیچھے تھی۔

"وعلیکم السلام۔" کئی آوازوں نے جواب دیا۔

"آ گئے بیٹا خیر سے؟ ارے تم بھی آ گئے نا!" ایک معمر خاتون کہہ رہی تھیں۔

"ماموں! یہ مامی ہیں نا؟ ایک چھ، سات سالہ بچہ پوچھ رہا تھا۔

"ماموں؟" وہ حیران تھی۔

"یہ کون لوگ ہیں؟" اس نے خود سے پوچھا۔

"ہاں فیصل! یہ مامی ہیں۔ سلام کیا تم نے؟" صائم ہنس کر بولا۔

"کیا تھا، میں نے سلام کیا تھا۔" بچہ بہت معصوم تھا۔

اندر لاؤنج میں پہنچ کر اس نے بغور دیکھا۔ وہاں دو نوجوان لڑکیاں تھیں جو شادی شدہ لگ رہی تھیں، دو بچے تھے ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ ایک پختہ عمر شخص جو شکل و صورت میں صائم سے بے حد مشابہہ تھا اور وہ خاتون جن کی آنکھیں بالکل صائم جیسی تھیں۔

"آیئے بیٹھیے۔" ایک لڑکی آگے بڑھی اور ساریہ کو صوفے پر بٹھا دیا۔ قیمتی سامان سے آراستہ لاؤنج میں بیٹھ گئے تو چند لمحوں کے لیے عجیب خاموشی چھا گئی۔ اس خاموشی کو شوہر نے توڑا۔

"سفر کیسا رہا؟" اس کا سوال ساریہ سے تھا۔

"اچھا۔" جواب مختصر تھا۔ وہ صائم کو سوالیہ انداز سے دیکھ رہی تھی۔

"ساریہ! یہ میری امی ہیں۔ یہ بڑی بہنیں شاہ آپا اور نور آپا اور یہ میرے بڑے بھائی محب ہیں۔ یہ فیصل آپا کا بیٹا ہے اور یہ ہماری چھٹکی دعا، جو ریہ کی بیٹی ہے۔"

اس کے الفاظ ایٹم بم کی طرح ساریہ کے دل و دماغ کو بھسم کر رہے تھے۔ وجہ؟ وجہ؟ کیا وجہ ہے اس جھوٹ کی جو وہ آج تک خود کو یتیم کہہ کر بولتا آیا تھا۔ کیوں کیا اس نے ایسا؟ اسے اس بات کا کوئی دکھ نہیں تھا کہ اس کا ایک خاندان ہے۔ مگر اتنا بڑا جھوٹ؟ کیا وجہ؟ نہیں یہ ممکن نہیں۔

"تو کیا میرے ساتھ کچھ بہت برا ہونے والا ہے۔" کسی کی بے ربط آوازیں اس کے ذہن میں گونج رہی تھیں اور پھر وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گئی۔

دوبارہ وہ جاگی تو خود کو ایک آراستہ بیڈ روم میں پایا۔ خاصا بڑا کمرہ تھا۔ کمرے میں صرف صائم تھا اور اس کی طرف متفکر نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اپنے لیے فکرمندی دیکھ کر ساریہ کو قدرے سکون ملا۔

"ساریہ کیا ہوا! طبیعت ٹھیک ہے تمہاری اب؟"

"تم نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا؟ مجھے پہلے اس بات کا جواب دو۔" وہ ضد کرنے لگی۔

"سب بتا دوں گا۔ ابھی تم یہ پیو اور آرام کرو۔" اس نے گلوکوز کا گلاس اس کی طرف بڑھایا۔

"مجھے کچھ نہیں پینا۔ میں سچ جاننا چاہتی ہوں ورنہ۔۔"

"ورنہ؟ ورنہ کیا ساریہ؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ تم مجھے سچ بتاؤ اور بس۔"

"سچ تم سے برداشت نہیں ہوگا، پھر بھی تمہیں اس کا جاننا ضرور اور ضروری ہے بتانا۔"

"تو پھر بتاؤ نا؟" وہ بے تاب تھی۔

"غور سے سنو۔ یہ دنیا ہے اور یہاں مکافات عمل ہوتا ہے۔ میری اور تمہاری زندگی اگرچہ اب ایک ہے۔ مگر علیحدہ علیحدہ دوسروں کی زندگیوں سے بھی جڑی ہوئی ہے۔"

وہ پتھر بنی سن رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ وہ اس شخص فرید قریشی کی بیٹی ہے جو ایک احسان فراموش، خود غرض اور دھوکے باز انسان ہے۔ جس نے اپنے مالک کی مہربانیوں کا بدلہ بے وفائی سے چکایا۔ جس کی وجہ سے اس کی ماں بارہ سال اپنے بچوں سے ذہنی طور پر دور رہی۔

وہ کرب، وہ تکلیف، وہ اذیت جو ان سب نے اٹھائی صرف اور صرف اس کے باپ کی وجہ سے اٹھائی۔ اس نقصان کی بھرپائی کبھی نہیں ہو پائے گی۔ لیکن رب جلیل نے ان کی مدد کی اور اپنے نافرمان بندے کو سزا دینے کی ٹھانی۔ اگر خدا کی مدد شامل حال نہ ہوتی تو کبھی آج اس شخص کی بیٹی اس کی بیوی بن کر یہاں نہ بیٹھی ہوتی۔ وہ اپنی بات ختم کر چکا تھا۔

"تو کیا اب تم مجھے۔۔۔۔ تم مجھے چھوڑ دو گے؟"

"نہیں! بالکل نہیں۔ بس آج سے تم اپنے ماں باپ کے لیے لاپتہ ہو۔" اس نے فیصلہ سنایا۔

"لیکن صائم! میرا تو کوئی قصور نہیں ہے۔" وہ رونے لگی۔

"قصور تو ہمارا بھی نہیں تھا۔ مگر ہم نے جھیلا۔"

"آج کے دور میں کوئی گم شدہ نہیں ہو سکتا۔ وہ مجھے میڈیا کے ذریعے ڈھونڈ لیں گے۔"

"وہ سب دیکھا جائے گا۔ ابھی تو انہیں جھٹکے لگنے دو۔ تم بتاؤ تمہارے اختیار میں ہوتا تو کیا تم یہاں سے چلی جاتیں؟"

بہت مشکل سوال تھا۔ وہ جنہوں نے بے حد پیار سے پال پوس کر بڑا کیا تھا، کوئی خواہش اسے یاد نہیں تھی کہ جسے پورا نہ کیا ہو۔ اپنی امی کا چہرہ اس کی نگاہوں میں گھوم رہا تھا۔

"نہیں نہیں مجھے یہاں سے فوراً چلے جانا چاہیے۔" اس نے سوچا۔ پھر اس کی نگاہ صائم پر پڑی۔

"بولو' جواب دو ساریہ!" وہ پوچھ رہا تھا۔

وہ خاموش رہی شاید اسی میں عافیت تھی۔ اگلے دو تین دن اس کی زندگی میں کئی تبدیلیاں لائے۔ اس نے اس گھر کے مکینوں کو سمجھا' ان کا رویہ بالکل بھی دشمنوں والا نہیں تھا۔ وہ سب بہت اچھے تھے۔ گھر کا نظام صائم کی امی بس ظاہری طور پر چلاتی تھیں' ورنہ اصل اور اہم شخصیت تو محب بھائی کی تھی جنہوں نے زندگی کی بد صورتیوں کو نہایت مشاقی سے خوب صورتی کا لبادہ اوڑھایا تھا اور اب سونا کندن بن چکا تھا۔ زندگی واقعی حسین ہو چکی تھی۔ صرف اس زخم کا بھرنا باقی تھا جو اس کے باپ نے لگایا تھا۔ وہ محب بھائی سے بے انتہا متاثر ہو چکی تھی۔ ثناء اور جویریہ تین چار دن کے قیام کے بعد اپنے اپنے گھروں کو جا چکی تھیں اور اب وہ تھی اور اس کی الجھی الجھی سوچیں جن کی گرہیں وہ دھیرے دھیرے کھول رہی تھی۔ صائم اور اس کے درمیان کا فاصلہ بھی برقرار تھا' جو صائم نے خود قائم رکھا تھا۔ وہ اس کی تمام تر قبولیت کا منتظر تھا۔ اپنے جھوٹ کی معافی کا طلب گار تھا۔ بلاشبہ وہ بہت مضبوط قوتِ ارادی اور کردار کا مالک تھا۔ ساریہ کے دل میں اس کی محبت کی کونپل پھوٹ چکی تھی اور اب اس کی تپش اسے بے قرار کر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

سائرہ اور مینا دروازے پر پڑا تالا دیکھ کر ششدر رہ گئیں۔

"ارے یہ کیا تالا؟" سائرہ نے حیرانی سے کہا۔

"فون کرو۔" سائرہ نے فون ملانا شروع کیا۔

"دونوں کے فونز بند ہیں۔ چلو پڑوس سے پوچھتے ہیں۔" دونوں عورتیں پڑوس کی طرف بڑھیں' گھنٹی بجانے پر ایک نوجوان لڑکے نے گیٹ کھولا۔

"جی۔"

"بیٹا! یہ برابر والے گھر میں صائم صاحب رہتے ہیں نا' تو کچھ پتہ ہے آپ کو کہیں گئے ہیں؟"

"صائم؟ نہیں جی صائم صاحب تو یہاں کوئی نہیں رہتے۔ یہاں تو حیات خان اپنی فیملی کے ساتھ رہتے ہیں' آج کل کراچی گئے ہوئے ہیں۔"

"حیات خان؟" سائرہ حیران تھی۔

"شکریہ۔" مینا نے کہا۔

نوجوان گیٹ بند کر کے اندر چلا گیا۔

گاڑی میں بیٹھ کر سائرہ نے صائم کے ان ایک دو دوستوں کو فون کیا جن کے نمبرز اس کے پاس تھے مگر کسی کو کچھ پتہ نہ تھا۔

"تم اتنی پریشان نہ ہو۔ ہو سکتا ہے کہیں گئے ہوں آ جائیں گے کچھ دیر میں۔"

مینا نے تسلی دی۔ لیکن سائرہ کو بہن کی تسلی مطمئن نہ کر سکی۔ وہ بیٹی کی صورت دیکھنے کے لیے بے قرار تھی۔ اس نے فرید قریشی کا نمبر ملایا اور انتظار کرنے لگی۔

☆ ☆ ☆

آٹھ ماہ گزر گئے۔ فرید قریشی خاموشی سے اپنی بیٹی کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ اس نے پولیس میں رپورٹ درج نہیں کرائی۔ سارے خاندان کو یہی بتایا کہ ساریہ دبئی شفٹ ہوئی ہے۔ مگر ہر دل میں شکوک تھے جن سے دونوں میاں بیوی بخوبی واقف تھے۔ چھ ستمبر کو انہیں موبائل فون پر ایک چھوٹا سا پیغام ملا کہ "ساریہ ... میں" اور ساتھ ایک پنڈی کے گھر کا پتہ لکھا تھا۔ اب تک کئی بار ایک ہی بات سوچ چکے تھے کہ شاید کبھی کوئی فون آئے جس میں ان سے بھاری رقم کا مطالبہ کیا جائے گا۔ اب اس پیغام کو بھی وہ اسی سلسلے کی کڑی سمجھ رہے تھے۔ فرید نے خاموشی سے اپنی سیٹ بک کرائی لیکن سائرہ بضد تھی کہ وہ ضرور ساتھ جائے گی بالآخر اسے اس کی بات ماننی ہی پڑی۔ دل ہزاروں اندیشوں میں گھرا ہوا تھا۔ ہر گزرتا لمحہ کسی انجانے خطرے کا پتا دے رہا تھا۔

سارے راستے دونوں میاں بیوی تقریباً" خاموش ہی رہے۔ ایئر پورٹ سے ٹیکسی لے کر وہ مطلوبہ ایڈریس پر پہنچ گئے۔ اچھا خاصا بڑا بنگلہ تھا اور ساؤنڈ پروف ... دستانہ ... ش تھا۔ دونوں باہر کھڑے دیکھتے رہے۔

"... پولیس ... لانا ہے؟"

"کیا ان کو پولیس لے کر آنی چاہیے تھی؟" لیکن جب پولیس میں رپورٹ بھی درج نہیں کرائی تو پھر اب تماشا بننے کا کیا فائدہ؟ وہ بیک وقت کئی باتیں سوچ رہے تھے۔ بالآخر فرید قریشی نے اطلاعی گھنٹی پر انگلی رکھ دی۔ دروازہ کھولنے والا صائم تھا۔ اف وہ آٹھ مہینے' وہ رت جگے' وہ مہیب سناٹوں بھرے دن' جاگتی آنکھوں کے ڈراؤنے خواب۔ صائم کو دیکھ کر سائرہ کو پل بھر میں اذیت بھرا ایک ایک پل یاد آ گیا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ قریب جا کر وہ صائم کو زور کا تھپڑ رسید کرے۔

"آیئے۔" صائم نے بغیر سلام کیے کہا۔

وہ دونوں کسی روبوٹ کی طرح اس کے پیچھے ... لیکن انہیں احساس ہوا کہ ان کے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔ ... نے لان کو عبور کر کے وہ گھر میں داخل ہو گئے۔ اب وہ ایک خوب صورتی سے سجائے ہوئے لاؤنج میں تھے۔

"بیٹھیے۔" صائم نے کہا۔

"ساریہ کہاں ہے؟" فرید قریشی کا لہجہ خاصا ترش تھا۔

"آپ بیٹھیے۔" صائم کا لہجہ تحکمانہ تھا۔

دونوں خاموشی سے بیٹھ گئے۔ گیند صائم کے کورٹ میں تھی۔ "ایک بار ساریہ اس کی قید سے رہا ہو جائے پھر اس سے نبٹتا ہوں۔" فرید قریشی دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔

"جانے کیا حال کیا ہو گا میری بیٹی کا۔" سائرہ اپنی جگہ یہی سوچ رہی تھی۔

انہیں بیٹھے تین منٹ ہی ہوئے تھے کہ قدموں کی آہٹ ہوئی اور ایک باوقار ادھیڑ عمر خاتون کمرے میں داخل ہوئیں۔ ان کے بالکل پیچھے پختہ عمر شخص بھی داخل ہوا۔ فرید قریشی کو پہچاننے میں ذرا بھی دیر نہ لگی دونوں کو تھیں۔

"اوہ آپ؟" اس کے منہ سے جیسے آہ نکلی۔

"پہچانتے ہو مجھے؟" لہجہ طنزیہ تھا۔

"کیسی' کیسی ہیں آپ؟"

"کیوں؟ تم میری خیریت کیوں پوچھ رہے ہو؟ کیا تم میرے خیر خواہ ہو؟" سائرہ سارے معاملے سے لاعلم تھی اس لیے حیرت کی تصویر بنی ہوئی تھی۔

"صائم؟" فرید قریشی کی بات ادھوری رہ گئی۔

"میرا بیٹا ہے۔"

"آپ کا بیٹا؟" سائرہ حیران تھی۔

"محب! مجھے غلط مت سمجھو' بے شک مجھ سے غلطی ہوئی۔" فرید قریشی کے لفظ اس کا ساتھ چھوڑ رہے تھے۔

"غلطی؟ بہت چھوٹا لفظ ہے۔" محب کا لہجہ دھیما تھا۔

"میری بیٹی کا کوئی قصور نہیں۔ میں تمہیں سب واپس کر دوں گا۔ بس میری بیٹی واپس کر دو۔" وہ گڑگڑایا۔

"میں نے کب کہا کہ اس کا کوئی قصور ہے۔ وہ آزاد ہے۔ جانا چاہے تو جا سکتی ہے آپ کے ساتھ۔" محب کا رویہ بے حد سرد تھا۔

اور اسی وقت کمرے میں ساریہ داخل ہوئی۔ وہ سرخ رنگ کے خوب صورت لباس میں تھی۔ اس کے چہرے پر بے پناہ نکھار تھا' تندرستی کی شفق گالوں پر پھوٹ رہی تھی۔ سائرہ نے سر تا پیر اسے دیکھا اور ایک لمحہ میں بھانپ لیا کہ وہ امید سے تھی۔ ساریہ دوڑ کر ماں سے لپٹ گئی۔

"ساریہ کی ڈلیوری کے بعد میں اسے چھوڑ دوں گا۔ ویسے آپ کی مرضی ہے آپ اسے ابھی لے جائیں یا بعد میں۔" صائم نے نرمی سے کہا۔

ساریہ نے بے یقینی سے پہلے صائم کو پھر امی اور محب کو دیکھا۔

"کیا کہہ رہے ہو صائم؟"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ساریہ! میں ایسا ہی کروں گا۔"

"نہیں' نہیں۔ تم نے کہا تھا میرا کوئی قصور نہیں۔

پھر کیوں؟" وہ رو پڑی۔
"میں آپ سب سے شرمندہ ہوں۔ معافی مانگتا ہوں۔ میری بچی کی خوشیاں نہ چھینیں۔" فرید قریشی کو اپنے جملوں کے کھوکھلے پن کا احساس تھا۔
"یہ تم کہہ رہے ہو؟ واہ میرے بچوں کی خوشیاں جو تم نے نوچ ڈالی تھیں؟ لیکن ہم تم جیسے نہیں۔ تمہاری بیٹی بہت اچھی ہے۔ ہمیں بیٹیوں کی طرح پیاری ہے۔ تم اولاد کی جدائی میں تڑپے اور اب زندگی بھر جب بھی اولاد کو دیکھو گے، شرمسار رہو گے۔ کافی ہے تمہارے لیے۔ تم نے دولت چھینی تھی نا! اس کی اہمیت میری اور میرے بچوں کی نظر میں کچھ بھی نہیں اس صدمے سے میری شوہر کی جان گئی، سو وہ خدا کی امانت تھی، وقت مقرر تھا اس کا۔ البتہ جو دھوکہ، جو فریب تم نے ہمارا اعتبار توڑ کر ہمیں دیا وہ واقعی قابل سزا تھا۔ سزا اور جزا کا فیصلہ تو خدا کرتا ہے۔ اسی کی مدد تھی جو آج تم سر جھکائے یہاں موجود ہو۔ سارہ اب اس گھر کی بہو ہے اور رہے گی۔"
انہوں نے اپنی بات ختم کی اور کمرے سے اٹھ کر چلی گئیں۔ اب وہاں صرف خاموشی اور ندامت تھی۔

☆ ☆ ☆

محب چونکا تو شام ڈھل رہی تھی۔ شفق کی لالی آسمانوں پر پھیل رہی تھی۔ دائیں طرف سے نمازی عصر کی نماز سے فارغ ہو کر نکل رہے تھے۔ محب کو معلوم تھا اس طرف جامع مسجد ہے۔ اس نے سیٹ کی بیک پر پڑا اپنا سوئیٹر اٹھا کر پہنا، سردی بڑھنا شروع ہو گئی تھی۔ اس نے کار اسٹارٹ کرنے کے لیے اگنیشن کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اسی وقت اس کی نظر سامنے سے آتی روشن پر پڑی۔
اسے پہچاننے میں اس نے ایک لمحہ کی دیر بھی نہیں کی تھی۔ اگرچہ وہ کافی موٹی ہو گئی تھی، پہلے وہ نازک سی لڑکی ہوا کرتی تھی اور اب گزرتے وقت نے اسے ایک مکمل عورت بنا دیا تھا۔ اس نے باہر سے چابی گھما کر دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئی۔ محب کا دل بے چین ہو رہا تھا۔
"کیا میں وہاں جاؤں؟" اس نے خود سے پوچھا۔
"وہاں انکل اور تائی تو ضرور ہوں گے۔" روشن کی موجودگی سے اسے اندازہ ہو گیا تھا۔ پھر بھی اتنے سال، پلٹ کر نہیں آیا۔ اگرچہ آسکتا تھا۔ مگر اس نے ایسا نہیں چاہا تھا۔ وہ طلبیہ کے دل میں کسی خلش کو بیدار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ امی نے اس بار اس سے گھر بسانے کا وعدہ لیا تھا۔ یہاں کا کام نبٹا کر اسے گھر جا کر امی کی پسند کی لڑکی سے شادی کرنی تھی۔ وہ خوش تھا۔
"طلبیہ اپنے گھر میں خوش ہو گی۔ فیض منیر اور پروین کو پڑھنے کی اسے فرصت نہیں ہو گی۔ اس کے بچے بھی جوان ہو گئے ہوں گے وہ کیسی لگتی ہو گی جوان بچوں کی ماں بن کر؟ ویسی ہی معصوم سی، کچھ پاگل پاگل سی۔" اس کے تصور سے وہ مسکرانے لگا۔
اس نے گاڑی بند کی اور باہر نکل آیا۔ دھیرے دھیرے چلتا ہوا وہ دروازے تک پہنچا۔ گاڑی سے دروازے تک کا فاصلہ اسے بائیس سال کے سفر سے زیادہ طویل لگا۔
"کیا واقعی اس گھر میں جاؤں؟" وہ تذبذب کا شکار تھا۔
اس نے اطلاعی گھنٹی بجا دی۔ سرد ہوا کا تیز جھونکا اس کے چہرے سے ٹکرایا تو اسے احساس ہوا کہ اس کا ہاتھ نم ہے۔ دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور اس نے دیکھا ہاں واقعی اس نے دیکھا وہی تھی۔ ہمیشہ کی طرح سائیڈ کی مانگ نکالے، نگاہوں میں بے پناہ معصومیت لیے وہ اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ گنگ زبان کے ساتھ کھڑا اسے تک رہا تھا۔
"آپ؟" وہ حیرانی سے پوچھ رہی تھی۔ وہی آواز اس کے ترسے ہوئے کانوں نے سنا۔
"ہاں۔ وہ۔" اس کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کہے۔
"آئیے۔" وہ مڑ گئی۔ وہ اس کے پیچھے اندر داخل ہو گیا۔ ڈرائنگ روم نقشہ کچھ زیادہ بدلا ہوا نہیں تھا۔
"کیسے ہیں آپ؟" وہ بالکل پرسکون تھی۔
"ٹھیک ہوں۔ یہاں کراچی ایک کام کے سلسلے میں آیا تھا۔ سوچا انکل سے ملتا چلوں۔ یہ تو سوچا ہی نہیں تھا کہ یہاں تم سے بھی ملاقات ہو گی۔ تم کب آئیں؟" وہ دونوں صوفوں پر بیٹھ چکے تھے۔
"میں تو یہیں رہتی ہوں۔"
"کیا مطلب؟ یہاں کیوں رہتی ہو؟ میاں کو گھر داماد بنا دیا ہے؟" وہ خوش دلی سے بولا۔
وہ خاموش رہی۔ محب کو اندازہ ہوا کہ شاید بات کچھ اور ہے۔
اسی وقت کمرے میں روشن داخل ہوئی اس کے ہاتھوں میں ایک سوٹ کیس تھا جسے اس نے دیوار سے لگا کر رکھ دیا۔
"یہ لو طلبیہ! اب بس اور دو بیگ اور ہیں۔" کہتے کہتے اس کی نظر محب پر پڑی اس کی آنکھیں پہچان کی چمک سے دمکنے لگیں۔
"السلام علیکم محب بھائی! آپ؟" وہ خوش ہونے کے ساتھ حیران بھی تھی۔
"وعلیکم السلام روشن! کیسی ہو؟"
"بالکل ٹھیک۔ آپ بڑے عرصے بعد؟"
"ہاں بس جب خدا لے آیا آگیا ہوں۔"
"میں چائے لاتی ہوں۔" وہ بغیر کچھ اور کہے مڑ گئی۔
"انکل کہاں ہیں؟" اس کی آنکھیں کسی مقبرے کی مانند سوگوار ہو گئیں اور پھر ان میں نمی گھل گئی۔
"ردا کی شادی کے دو سال بعد ابا کا انتقال ہو گیا۔"
"اوہ لیکن۔ کیسے؟"
"کینسر ہو گیا تھا بہت بعد میں پتا چلا۔ دیر ہو گئی تھی۔"
"جی۔ جی۔ بہت افسوس ہوا۔" وہ بھی اداس ہو گیا۔
"آتی ہوں۔" وہ اٹھ کر چلی گئی۔ محب کی نگاہوں میں سبحان انکل کا چہرہ گھوم رہا تھا، کچھ دیر وہ اکیلا کمرے میں بیٹھا پرانے وقت کی بازگشت سنتا رہا پھر روشن چائے لیے اندر آ گئی۔
"آپ کو دیکھ کر محب بھائی! بڑی خوشی ہو رہی ہے۔" وہ واقعی خوش لگ رہی تھی۔
"طلبیہ یہاں رہتی ہے؟"
"ہاں جی ان کو کہاں جانا ہے۔" وہ اداسی سے بولی۔
"کیوں؟ اس کا شوہر؟ کیا بات ہے روشن؟" اس نے فکرمندی سے پوچھا۔
"شوہر کیا جی، جس سال آپ کی شادی ہوئی، اسی سال طلبیہ کا نکاح بھی ہو گیا تھا۔ رخصتی ڈیڑھ دو سال بعد ہونی تھی جب اس کے کاغذات پورے ہو جاتے۔"
"کاغذات؟"
"ہاں جی وہ امریکہ میں تھا نا تو مجھے تو پتا نہیں وہ کاغذ لے کے جاتے ہیں نا تو وہی پورے ہونے تھے مگر۔" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔
"مگر کیا۔؟"
"بس محب بھائی! کیا بتاؤں، ردا بھی اب امریکہ میں رہتی ہے اس وقت تو صرف اس کا شوہر گیا تھا اس نے

وہاں سے پتا کر کے بتایا کہ طلبیہ کے شوہر نے وہاں انگریز عورت سے پیپر والی شادی کی ہوئی ہے۔ مگر اسی کے ساتھ رہتا ہے ایک بیٹی بھی ہے۔"

"اوہ! پھر؟"

"پھر جی ابا کو بڑا غصہ آیا' حالانکہ وہ لڑکا تو کہتا تھا کہ وہ انگریز عورت کو چھوڑ رہا ہے۔ مگر ابا نہیں مانے اور طلبیہ نے بھی انکار کر دیا۔ بس پھر طلاق ہو گئی' مطلب خلع لے لیا طلبیہ نے۔"

"چہ چہ چہ بہت افسوس ہوا۔ پھر طلبیہ نے شادی نہیں کی؟"

"نہیں جی پھر ابا بیمار پڑ گئے اور طلبیہ بس ان کی خدمت ہی میں لگی رہتی تھی۔"

محب گم صم سن رہا تھا۔ تب ہی طلبیہ کمرے میں چلی آئی۔ اس کے ہاتھ میں محب کی شال تھی۔ روشن چائے کا کپ ٹرے میں رکھ کر لے گئی۔

"یہ لیں آپ کی شال۔" اس نے شال اس کی طرف بڑھائی۔ لیکن محب کے ہاتھ آگے بڑھے' اس نے دھیرے سے شال صوفے کی سائڈ پر رکھ دی۔

"تاؤ کہاں ہیں؟" اسے تاؤ کا خیال آیا۔

"انہوں نے میرا بہت ساتھ نبھایا۔ ابا اور دادی کے بعد بس تاؤ ہی تھے جنہوں نے گھر کے تمام معاملات بھی سنبھالے اور میرا کسی بچی کی طرح خیال رکھا۔" وہ مسکرانے لگی۔

"کہاں ہیں بلاؤ تو یا میں وہیں چلا جاؤں ان کے کمرے میں؟"

"تین مہینے ہوئے چھوڑ گئے مجھے وہ بھی۔" اس کی مسکراہٹ اداسی میں ملفوف ہو گئی۔

محب خاموش رہا۔ اس کے پاس الفاظ کہاں تھے۔ پھر اس کی نظر دیوار سے لگے رکھے سوٹ کیس پر پڑی۔

"یہ سامان؟ تم کہیں جا رہی ہو؟"

"ہاں کافی عرصے سے ردا یو ایس اے بلا رہی ہے۔ مگر تاؤ اور میں ایک دوسرے کے عادی ہو چکے تھے اور میں بھی وہاں بالکل نہیں جانا چاہتی تھی مگر اب کوئی آپشن نہیں رہا۔ اب تو جانا ہی پڑے گا۔ صبح چار بجے کی فلائٹ ہے۔"

وہ ہنستی کھیلتی لڑکی اداس تھی' پچھلی زندگی کی گرد اس کے چہرے کی دمک کو دھندلا رہی تھی۔ جن آنکھوں میں کبھی خواب بستے تھے وہاں گمنام یادوں کا سوز تھا' ٹوٹے ہوئے خوابوں کا غبار تھا' زندگی کی ہمک اور جستجو نہیں تھی۔ پختہ عمری نے اس پر کچھ زیادہ اثر نہیں ڈالا تھا۔ بے شک جوانی کی رعنائی اور چمک مدھم پڑ چکی تھی مگر وہ چھب' وہ دلربائی' وہ بھول پن جوں کا توں تھا۔

"آپ کی فیملی کیسی ہے؟ کون کون ہے' بچے کتنے ہیں؟"

"بچہ تو کوئی نہیں ہے میرا' البتہ چھوٹے بھائی صائم کا ایک بیٹا ہے وہی سارے گھر کا لاڈلا ہے۔"

"وہ' ہمم تو خیال تھا اب آپ کے بچے بھی جوان ہو چکے ہوں گے۔"

"ہاں' ہو تو جاتے۔ شادی ہوتی تو بچے بھی ہوتے اور جوان بھی ہو جاتے۔"

"کیا مطلب؟ شادی نہیں ہوئی آپ کی؟" وہ محو حیرت تھی۔

"ارے کہاں؟ فرصت ہی نہیں ملی۔"

"نہیں' مطلب وہ آپ کا تو شادی کا کارڈ ملا تھا ہمیں۔"

"اچھا وہ۔ وہ تو بس ایک ہی چھپا تھا۔" وہ ہنس دیا۔

"آپ مذاق کر رہے ہیں؟" وہ بہت سنجیدہ تھی۔

"میں یہاں سے گیا تو وہاں زندگی بدل چکی تھی۔ ابا کا اسی دن انتقال ہوا تھا' اور پھر زندگی اور اس کے مسائل' مجھے پیچھے دیکھنے کی فرصت نہیں تھی۔ تم میرا انتظار نہ کرو۔ صرف اس لیے وہ کارڈ۔" وہ بت بنی سن رہی تھی۔ تب ہی روشن کمرے میں چلی آئی۔

"طلبیہ! وہ بشیر کا فون آیا ہے۔ پوچھ رہا ہے صبح کتنے بجے گاڑی لاؤں ایئرپورٹ جانے کے لیے؟"

"ہاں ایک بجے رات کا کہہ دو۔"

"اچھا۔" روشن چلی گئی۔ اب کمرے میں مکمل خاموشی تھی۔

"مجھے ردا کا فون نمبر دو گی؟"

"ردا کا؟ ہاں دے دوں گی۔"

"پوچھو گی نہیں کیوں مانگ رہا ہوں؟" اس نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔

"اس کی کیا ضرورت ہے۔"

"مجھے اس سے اجازت لینی ہے۔"

"اجازت؟ کس بات کی؟"

"تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کی۔" وہ فیصلہ کن انداز سے بولا۔

اس کی جھکی نظریں اٹھیں تو ان میں ہزاروں سوالات تھے۔

"پہلے آپ کو مجھ سے پوچھنا چاہیے ویسے بھی بہت فضول سی بات ہے۔"

"کیا پوچھنا ہے تم سے ہی پوچھ رہا ہوں۔ میرے ساتھ چلو گی؟ وہاں سب ہیں' میری امی' بھائی' بہنیں..."

"لیکن میں کیوں؟"

"انجان مت بنو۔"

"نہیں اب نہیں۔"

"کیوں اب کیا ہوا؟ زندگی باقی ہے۔ تم ہو' میں ہوں' خدا نے ہمیں آمنے سامنے لا کھڑا کیا ہے کیا وجہ ہو سکتی ہے؟"

"میں نہیں جانتی۔ لیکن یہ مناسب نہیں لگتا۔" روشن کمرے میں داخل ہوئی اور ایک چھوٹا سا پرزہ محب کی طرف بڑھایا۔

"محب بھائی! یہ لیں ردا کا نمبر۔" طلبیہ نے خشمگیں نظروں سے روشن کو دیکھا۔

"اوہ شکریہ۔" وہ فون ملانے لگا۔ اور اٹھ کر برآمدے کی طرف چلا گیا۔ دس پندرہ منٹ گزر گئے۔ واپس آیا تو بہت سنجیدہ تھا' فون طلبیہ کی طرف بڑھایا۔

"لو' تم سے بات کرنا چاہتی ہے۔" طلبیہ نے فون کان سے لگایا۔

"ہیلو ردا!"

"ہاں طلبیہ...!" اس کی آواز میں بے پناہ خوشی تھی۔

"محب جو کہہ رہا ہے وہی کرو۔ اس کی امی مجھے فون کریں گی۔ دیکھو میں ڈیڑھ مہینہ پہلے ہی تو پاکستان ہو کر گئی ہوں اب اتنی جلدی میرا آنا ممکن نہیں۔ تم محب کے ساتھ چلی جاؤ۔ غیر نہیں ہیں ہمارے رشتے دار ہیں۔ باقی معاملات وہیں طے ہو جائیں گے۔ ہائے طلبیہ! میں کتنی خوش ہوں' اس کا اندازہ تمہیں اتنی دور سے نہیں ہو سکتا۔ دیکھو اب دیر نہ کرنا..."

وہ جانے کیا کیا کہتی رہی اور پھر اس نے اللہ حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔ محب منتظر تھا اس کے فیصلے کا۔

"میری دس بجے کی فلائٹ ہے۔ اٹھو' تمہیں سیٹ مل جائے گی ورنہ دوسری فلائٹ لے لیں گے۔"

طلبیہ بے بس سی بیٹھی تھی۔ وقت نے اسے ایک دم سے دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا۔ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔ محب نے صوفے پر پڑی شال اٹھا کر دھیرے سے اس کے شانوں پر ڈال دی۔

"اٹھو طلبیہ!"

وہ کسی روبوٹ کی طرح کھڑی ہو گئی۔

گاڑی میں بیٹھ کر محب نے فون ملایا۔

"ہاں فرحان! دیکھو میں ڈائریکٹ ایئرپورٹ جا رہا ہوں' کانسٹل میرا بیگ لے کر تم وہیں آ جاؤ اور اپنی گاڑی بھی پک کر لو... تم آؤ تو پھر بتاؤں گا۔ اوکے۔"

فون رکھ کر اس نے طلبیہ کی طرف دیکھا' وہ شال کو اچھی طرح لپیٹ کر بیٹھی سامنے دیکھ رہی تھی۔ گاڑی اسٹارٹ کر کے وہ مین روڈ پر نکل آیا۔ تمام اسٹریٹ لائٹس جل رہی تھیں' راستہ بہت روشن اور صاف دکھائی دے رہا تھا۔

نمرہ احمد

محمل ابراہیم' آغا ابراہیم اور مسرت بیگم کی خوب صورت اور طرح دار بیٹی ہے۔ بچپن میں ہی آغا ابراہیم کے انتقال کے بعد تایا آغا کریم اور چچاؤں کے رحم و کرم پر ہے۔ مسرت سیدھی سادھی خاتون تھیں۔ اس لیے اپنی سسرال کو گھر اور کاروبار پر قبضہ کرنے سے روک نہیں پائیں۔ جس کا قلق محمل کو ہے۔ گھر والوں "خصوصا" تائی مہتاب کا رویہ ماں بیٹی کے ساتھ بے حد ناروا ہے۔ اپنے تعلیمی اخراجات و ضروریات کے لیے محمل ٹیوشن سینٹر میں پڑھاتی ہے۔

آغا ابراہیم کے اس محفل نما گھر میں آغا کریم اور مہتاب تائی' فواد' حسان' وسیم' سدرہ اور مہرین کے ساتھ مقیم ہیں۔ آغا ابراہیم کے جڑواں بھائی آغا غفران اور فضہ چچی کے تین بچے حسن' ندا اور سامیہ ہیں۔ سب سے چھوٹے آغا اسد اور ناعمہ بالائی منزل پر رہائش پذیر ہیں۔ جن کے تین بچے آرزو' معیز اور معاذ ہیں۔ جبکہ رضیہ پھپھو کی ایک صاحبزادی فائقہ بھی ہیں۔ خاندان بھر میں تائی مہتاب اور آغا کریم کے فرزند فواد کو خاص مقام حاصل ہے۔ آرزو' فائقہ اور ندا اس کے لیے خاص جذبات رکھتی ہیں۔ محمل کو تائی مہتاب کے خاندان کی اس دلی رنگ کا بخوبی اندازہ ہے۔ فواد کی توجہ حاصل کرنے کے لیے اسے نظر انداز کرتی ہے تو وہ اس پر چونک جاتا ہے۔ آرزو' سدرہ اور فائقہ کو اس کی خوب صورتی اور ذہانت سے حسد ہے۔

کالج جاتے ہوئے ہر روز اسے ایک پراسرار سیاہ فام لڑکی ملتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں سیاہ جلد کی کتاب محمل کی توجہ کھینچتی ہے۔ وہ لڑکی محمل کو بتاتی ہے کہ اس کتاب میں ماضی' حال' مستقبل کا احوال ہے۔ اور اس میں حالات اپنے گرفت میں کرنے کا نسخہ ہے۔ محمل اسے سمجھ نہیں پاتی ہے۔ وہ لڑکی محمل سے کہتی ہے کہ ایک دن اسے اس کتاب کی ضرورت ضرور پڑے گی۔

محمل' آغا کریم کو بتاتی ہے کہ بہترین تعلیمی ریکارڈ پر اسے جلد ہی برٹش کونسل کی جانب سے لندن کی' اسکالرشپ مل

جائے گی۔ وہ راستہ صاف ہو جانے کی اس نوید پر سکون کا سانس لیتے ہیں۔ ایروناٹیکل انجینئر فرقان کا رشتہ سدرہ کے بجائے محمل کے لیے دے دیا جاتا ہے تو سب کو سانپ سونگھ جاتا ہے۔ تائی مہتاب فوراً انکار کر دیتی ہیں۔ جس پر محمل اور مسرت کو بہت رنج ہوتا ہے۔ فواد اس سے ہمدردی جتاتا ہے اور اسے فیکٹری میں انٹرن شپ دینے اور جاب کرنے کے لیے آغا جان سے بات کرتا ہے۔ جس پر وہ انکار کر دیتے ہیں۔ حالات سے تنگ آ کر محمل اس پر اسرار لڑکی سے سیاہ جلد والی کتاب لے آتی ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے سے قبل ہی تائی مہتاب سب کے ساتھ اسے رنگے ہاتھوں پکڑتی ہیں۔ لیکن پتہ چلتا ہے کہ یہ تو قرآن مجید ہے۔ محمل سمیت سب دنگ رہ جاتے ہیں۔ تائی مہتاب اپنی بے عزتی پر بے حد تلملاتی ہیں۔ محمل غصے میں آ کر سیاہ فام لڑکی کو قرآن شریف واپس کر آتی ہے اور اسے سخت سست بھی سناتی ہے۔ اس ردعمل پر وہ لڑکی بجھ سی جاتی ہے۔

آغا فواد سب سے چھپ کر محمل کو فیکٹری لے جانے لگتا ہے اور اسے منع کرتا ہے کہ اس کا ذکر کسی سے نہ کرے۔ وہ اسے بیش قیمت ملبوسات بھی دلواتا ہے تاکہ سدرہ کی منگنی پر وہ اپنی حیثیت کے مطابق نظر آئے۔ محمل اپنی سادگی میں اسے فواد کی محبت سمجھتی ہے۔ حسن، محمل کو فواد کے سائے سے بھی دور رہنے کی تنبیہ کرتا ہے تو محمل کو برا محسوس ہوتا ہے۔ میریٹ میں ڈنر کا جھانسہ دے کر فواد، محمل کو اپنے ساتھ جانے پر آمادہ کرتا ہے۔ راستے میں کسی ڈیل کے نہ ہونے پر نقصان کا ڈراما رچا کر محمل کو کلائنٹ کے پاس بھیجتا ہے۔ وہاں جا کر محمل کو آغا فواد کے اصل چہرے کا ادراک ہوتا ہے۔ فواد نے اے ایس پی کے سامنے محمل کو بطور چارہ استعمال کیا تھا۔ اس صورت حال پر محمل چکرا کر رہ جاتی ہے۔ وہ اسے بتاتی ہے کہ آغا فواد اس کا بھائی ہے۔

انسپکٹر ہمایوں، محمل کی آغا فواد سے بات کرواتا ہے تو وہ اسے رات [illegible] کہتا ہے۔ محمل [illegible] پر ششدر رہ جاتی ہے۔ اس صدمے سے وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔ [illegible] لیکن [illegible] بذریعہ چھت بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اس کوٹھی کے برابر میں مدرسہ ہے۔ جہاں اس کی ملاقات فرشتے نامی لڑکی سے ہوتی ہے جو وہاں دین کی تعلیم دیتی ہے۔ فرشتے بتاتی ہے کہ محمل اس وقت جس مشکل میں ہے۔ انسپکٹر ہمایوں اس کا کزن ہے۔ ہمایوں کے وہاں پہنچنے پر محمل کو مشورہ دیتی ہے کہ وہ اپنے گھر انسپکٹر ہمایوں کے ساتھ جائے۔ کچھ سوچ کر محمل فرشتے کی بات مان لیتی ہے۔ گھر پہنچنے پر اس کے ساتھ روایتی سلوک ہوتا اور آغا کریم اور تمام چچا اسے گھر سے نکال دینے کے درپے ہوتے ہیں کہ انسپکٹر ہمایوں کی آمد سب کو چونکا دیتی ہے۔ محمل سب کو بتاتی ہے کہ کس طرح آغا فواد نے دھوکے سے اسے ڈیل کا حصہ بنایا۔ سوائے حسن اور مسرت (ماں) کے سب اسے جھٹلاتے ہیں۔ وہ آغا فواد کی سرگرمیوں کے خلاف پولیس میں رپورٹ کروا دیتی ہے۔ تائی جان اسے مارنے کو لپکتی ہیں تو سب انہیں روک دیتے ہیں۔ آغا فواد گرفتار ہو جاتا ہے۔ مصلحتاً محمل کو گھر میں رہنے کی اجازت مل جاتی ہے۔ مسرت سے محمل کی بات چیت بند ہے۔ وہ اس واقعے میں محمل کو بھی قصوروار سمجھتی ہیں۔ محمل فرشتے سے ملنے دوبارہ مدرسے جاتی ہے تو وہ اسے قرآن مجید کی تعلیم حاصل کرنے کا مشورہ دیتی ہے۔ وہ اس بات کو خاص اہمیت نہیں دیتی، لیکن مصروفیت کے لیے اس کا مشورہ مان لیتی ہے۔ دینی تعلیم اسے ذہنی و روحانی سکون بخشتی ہے۔ اس دوران انسپکٹر ہمایوں سے اس کی ملاقات ہوتی ہے تو وہ اسے رابطے کے لیے اپنا سیل نمبر دیتا ہے۔ وہ آغا فواد کے خلاف محمل کو وعدہ معاف گواہ بنانا چاہتا ہے۔ یہ بات جب گھر والوں کے علم میں آتی ہے تو وہ محمل کو بری طرح زدوکوب کرتے ہیں۔ وہ رو رو کر ان سب کو بددعا دیتی ہے۔ حسن گھر والوں کے اس سلوک پر ششدر ہے۔ مسرت، محمل کو آغا فواد کے خلاف وعدہ معاف گواہ بننے کا کہتی ہیں۔ محمل، انسپکٹر ہمایوں کو تمام صورت حال بتاتی ہے تو وہ اسے مصلحتاً جھوٹ بولنے کا مشورہ دیتا ہے۔ تایا کریم اسے جائیداد میں حصہ دینے کا جھانسہ دیتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ شرط رکھتے ہیں کہ وہ انسپکٹر ہمایوں داؤد کے خلاف کورٹ میں بیان دے تو اسے اس کا حصہ مل جائے گا۔ وہ ان کا ساتھ دینے کی [illegible] ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

۵

پانچویں قسط

"ہرگز نہیں۔" فرشتے نے غصے میں تڑپ کر اسے دیکھا۔ "میں محمل کی شادی تمہارے بھائی سے نہیں ہونے دوں گی۔ تم لوگ یہ سب صرف اس کی جائیداد ہتھیانے کے لیے کر رہے ہو۔ میں جانتی ہوں تم شادی کے بعد اس سے جائیداد اپنے نام لکھواؤ گے اور اسے طلاق دلا کر گھر سے نکال دو گے۔"

"ہاں بالکل، ہم یہی کریں گے۔" وہ بہت سکون سے بولا۔ گو کہ یہ بات فرشتے نے خود کہی تھی مگر اسے فواد سے اعتراف کی توقع نہ تھی۔ وہ اپنی جگہ ششدر رہ گئی۔

"تو تم ہو [illegible]"

"ہاں۔ ہم اسی لیے محمل کی شادی [illegible] سے [illegible]"

"فواد!" آغا جان نے تنبیہی نظروں سے اسے ٹوکنا چاہا۔

"مجھے بات کرنے دیں آغا جان!" "ہاں تو محمل! ہم اسی لیے تمہاری شادی وسیم سے کر رہے ہیں۔ [illegible] ہے نا؟ کیونکہ فرشتے کے ساتھ تو تم جا نہیں سکتیں، اب تمہیں شادی تو کرنا ہی ہوگی۔"

"نہیں، نہیں۔" وہ بے اختیار وحشت سے چلائی۔ "میں نہیں کروں گی یہ شادی۔"

"محمل! تمہارے پاس کوئی راستہ نہیں ہے۔ تمہیں شادی کرنا پڑے گی۔" وہ بغور اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہتا آہستہ آہستہ اسے چاروں طرف سے گھیر رہا تھا۔

"کاش میں تمہیں بددعا دے سکتی آغا فواد! میں ان میں سے ہوں، ایسا نہیں کروں گی۔ کیا تمہیں اللہ سے ڈر نہیں لگتا؟" فرشتے نے تنفر سے اسے دیکھا۔

"میں نے کچھ غلط تھوڑی کہا ہے۔"

"تم غلط کر رہے ہو ایک یتیم لڑکی کے ساتھ۔"

"یہ تو ہم کئی سالوں سے کر رہے ہیں۔ یقین کیجیے ہم پر کبھی کوئی طوفان نوح نہیں آیا۔"

"تمہیں اس طوفان کی خبر تب ہوگی جب وہ تمہارے سر پر پہنچ چکا ہوگا۔ اللہ سے ڈرو۔ تمہیں اس یتیم پر ظلم کر کے کیا ملے گا؟"

"تو آپ اس ظلم کو اپنے حق میں کیوں نہیں بدل لیتیں؟"

"کیا مطلب؟" وہ چونکی۔

وہ جواب دیے بنا اس پر ایک نظر ڈالتا محمل کی طرف متوجہ ہوا جو زمین پر بیٹھی سر اٹھائے اسے ٹکر ٹکر دیکھ رہی تھی۔

"ایک صورت میں میں تمہاری شادی وسیم سے رکوا دوں گا، اور چاہو تو تم اپنی بہن کے ساتھ چلی جاؤ۔ ہم خاندان والوں کو کچھ نہیں بتائیں گے۔ پھر فرشتے جہاں چاہے تمہاری شادی کروا دے، ہم کیا پورا خاندان ترک ہوگا۔ کیا تم وہ صورت اختیار کرنا چاہو گی؟"

محمل کے چہرے پر بے یقینی اتر آئی۔ وہ بنا پلک جھپکے فواد کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"سدرہ! میری بیڈ سائیڈ ٹیبل پر جو کاغذ پڑا ہے، وہ لے کر آؤ اور ساتھ پین بھی۔" اس نے مہرین اور ندا کے ساتھ دیوار سے لگی خاموش کھڑی سدرہ کو اشارہ کیا جو اس کی بات سن کر سر ہلاتے ہوئے تیزی سے سیڑھیوں کی طرف لپکی۔

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" خطرے کا الارم دور کہیں بجتا فرشتے کو سنائی دے رہا تھا۔

"یہی کہ محمل کی شادی رک سکتی ہے۔ وہ تمہارے ساتھ جا سکتی ہے اگر..." اس نے سیڑھیوں سے اترتی

سدرہ کو دیکھا جو بھاگتی ہوئی آئی اور اسے کاغذ قلم پکڑا دیا۔

"اگر تم دونوں یہ پیپرز سائن کر دو۔"

"یہ کیا ہے؟" فرشتے کا لہجہ محتاط تھا۔

"مجھے معلوم تھا کہ آپ نکاح کے وقت ڈرامہ کرنے ضرور آئیں گی اسی لیے ہم نے پہلے سے انتظام کر رکھا تھا۔ آپ کو کیا لگتا ہے ہمیں علم نہیں تھا کہ آپ محمل سے مل کر اسے کیا پٹیاں پڑھاتی ہیں، ہمیں سب پتا تھا محترمہ! یہ بھی کہ محمل کب کب آپ کے کزن سے ملتی رہی ہے مگر اس وقت کے لیے ہم نے آنکھ بند رکھی۔"

"آپ کی کیا شرط ہے وہ بات کریں۔" وہ سرد لہجے میں بولی۔

"یہ فرشتے ابراہیم اور محمل ابراہیم کا اعلان دستبرداری ہے۔ اس گھر، فیکٹری اور آغا ابراہیم کی تمام منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد سے یہ دونوں بہنیں دستبرداری کا اعلان کرتی ہیں اور ہر چیز ہمارے حوالے کرتی ہیں۔ یہ کبھی بھی ہم سے کسی بھی موروثی ملکیت سے حصہ مانگنے نہیں آئیں گی اور آپ جانتی ہیں کہ بدلے میں ہم وسیم کی شادی محمل سے نہیں کریں گے۔ آف کورس! یہ آخری بات اس کاغذ میں نہیں لکھی گئی۔"

فرشتے کے چہرے پر پہلے الجھن ابھری پھر حیرت اور پھر واضح بے یقینی۔

"تم..... تم ہمیں ہمارے حق سے، ہمارے گھر سے بے دخل کرنا چاہتے ہو؟"

"بالکل صحیح۔"

"تم ایسا کیسے کر سکتے ہو آغا فواد! تم...!" اس کی بے یقینی اور تحیر غصے میں بدل گیا۔

"تم ہمیں ہمارے گھر سے بے دخل کیسے کر سکتے ہو؟ یہ ہمارا گھر ہے۔ ہمارے باپ کا گھر ہے، اس پر ہمارا حق ہے۔ ہمیں ضرورت ہے پیسوں کی، محمل کی پڑھائی ہے اور پھر اس کی شادی کے لیے..... ہمیں ان سب کے لیے پیسوں کی ضرورت ہے۔"

"یہ ہمارا دردِ سر نہیں ہے۔ تم یہ سائن کر دو تو محمل کی جان وسیم سے چھوٹ جائے گی۔"

"مگر ہم تمہیں اپنا حق کیوں دیں؟"

"کیونکہ ان سب پر میرے شوہر اور بیٹوں کا حق ہے۔"

تائی مہتاب چمک کر کہتی آگے بڑھیں۔ "ابراہیم کی وفات کے وقت یہ بزنس دیوالیہ ہو چکا تھا۔ میرا شوہر دن رات محنت نہ کرتا تو یہ بزنس کبھی اسٹیبلش نہ ہو سکتا تھا۔"

"اگر اتنے ہی محنتی تھے آپ کے شوہر اور بیٹے تو میرے ابا کی ڈیتھ کے وقت بے روزگار کیوں پھر رہے تھے؟ اور تم؟" وہ فواد کی طرف پلٹی۔ "وروارث تو اللہ نے بنائے ہیں، ہم کیسے اپنا حق نہ لیں۔"

"فرشتے بی بی، یہ پراپرٹی تو آپ کو چھوڑنا ہی پڑے گی ابھی کچھ دیر میں مہمانوں کی [illegible] شروع ہو جائے گی۔ شادی والا گھر ہے، ذرا سی بات کا بتنگڑ بن جائے گا اور بدنامی کس کی ہو گی؟ صرف محمل کی! اور تب اس کو وسیم سے شادی کرنی ہی پڑے گی، لیکن اگر آپ یونہی اڑی رہیں تو ٹھیک ہے، ہم خاندان میں کہہ دیں گے کہ محمل کسی کے ساتھ بھاگ گئی۔ کس کا خاندان چھوڑے گا، کس کا میکا بدنامی کے باعث چھوٹے گا، آپ خود فیصلہ کر سکتی ہیں۔"

وہ کہتے کہتے ذرا دیر کو رکا۔ وہ تاسف سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"آغا فواد! تمہیں اللہ سے ڈر نہیں لگتا؟"

وہ ہولے سے مسکرا دیا۔ "ہم کوئی غلط بات تھوڑی کر رہے ہیں؟ اپنا حق ہی مانگ رہے ہیں۔ خیر، دوسرا آپشن یہ ہے کہ آپ اور محمل اس پہ دستخط کریں اور اپنے حصے سے دستبردار ہو جائیں۔ ہم باعزت طریقے سے شادی کینسل کر دیں گے، آپ محمل کو اپنے ساتھ لے جائیے گا، آپ جس سے چاہیں جب چاہیں اس کا نکاح کرا دیں، ہم بھرپور شرکت کریں گے، بلکہ پورا خاندان شرکت کرے گا۔ یہ گھر محمل کا میکا رہے گا، وہ جب چاہے ادھر آ سکتی ہے، مگر اس کی ملکیت میں [illegible] نہ دونوں میں سے کسی کا کوئی حصہ نہیں ہو گا، لیجیے۔" اس نے کاغذ قلم اس کے سامنے کیے۔ "کر دیجیے سائن۔"

"مگر فواد....." آغا جان نے کچھ کہنا چاہا لیکن تائی مہتاب نے ان کا بازو تھام لیا۔

"اسے بات کرنے دیں، وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔"

"ہونہہ۔" فرشتے نے سر جھٹکا۔ "آپ نے سوچ بھی کیسے لیا کہ میں آپ کی اس بلیک میلنگ میں آ جاؤں گی؟ بلکہ آپ کو تو....."

اس کی بات ابھی ادھوری تھی کہ اسے اپنے دائیں ہاتھ پہ دباؤ محسوس ہوا۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ محمل اس کا ہاتھ پکڑ کر کھڑی ہو رہی تھی۔

اس کا کام دار دوپٹہ سر سے ڈھلک گیا تھا، بکھری بکھری لٹیں گالوں کو چھو رہی تھیں۔ آنسوؤں نے جس زخم ڈالا تھا۔ وہ [illegible] فرشتے کا سہارا لے کر [illegible] ہوئی۔ اس کے انداز میں کچھ تھا [illegible] اور اس سے پہلے کہ فرشتے اس کو روک پاتی اس نے جھپٹ کر فواد کے ہاتھ سے کاغذ قلم چھینا۔

"کدھر کرنے ہیں سائن؟ بتاؤ مجھے!" وہ ہذیانی کیفیت میں چلائی تھی۔ فواد ذرا سا مسکرایا اور اپنی انگلی کاغذ پہ ایک جگہ رکھی۔

"نہیں محمل!" فرشتے کو جھٹکا لگا تھا۔ "ہمارے پاس راستے ہیں، ہمیں ان کی بلیک میلنگ میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"مر گئے ہے فرشتے! میں اب تنگ آ چکی ہوں۔ مجھے نہیں چاہیے مجھے کوئی جائیداد، کوئی مال دولت۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے، لے لیں، سب لے لیں۔" وہ ادھر ادھر سائن کرتی جا رہی تھی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے برابر گر رہے تھے۔

فرشتے ساکت سی اسے دیکھے گئی۔ اس نے تمام سائن کر کے کاغذ اور قلم فواد کی طرف اچھال دیا۔

"لے لو سب کچھ۔ تم لوگوں کو اللہ سے ڈر نہیں لگتا۔ میں اب تم سے اپنا کوئی حق نہیں مانگوں گی۔ چھوڑتی ہوں میں اپنے سارے حقوق۔" وہ کہتے کہتے نڈھال سی صوفے پہ گر گئی اور گہری سانسیں لینے لگی۔ وہ واقعی تھک چکی تھی، ٹوٹ چکی تھی۔

فواد نے کاغذ سیدھا کر کے دیکھا، پھر فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ اردگرد خاموش اور بے یقین بیٹھے حاضرین پہ ایک نگاہ دوڑائی، پھر فرشتے کی طرف پلٹا۔

"محمل نے دستخط کر دیے ہیں۔ اب آپ بھی کر دیں۔"

اس نے کاغذ قلم اس کی طرف بڑھایا مگر فرشتے نے اسے نہیں تھاما۔ وہ ابھی تک سکتے کے عالم میں محمل کو دیکھ رہی تھی۔

"دستخط کرو بی بی اور اسے لے جاؤ۔" تائی مہتاب نے آگے بڑھ کر اس کا شانہ ہلایا تو وہ چونکی، پھر ناگواری سے ان کا ہاتھ ہٹایا اور فواد کے بڑھے ہاتھ کو دیکھا۔

"نہیں۔ تم محمل کو نفسیاتی طور پر گھیر کر بے وقوف بنا سکتے ہو۔ یہ چھوٹی ہے، کم عقل ہے مگر فرشتے ایسی نہیں ہے۔ میں تمہاری بلیک میلنگ میں نہیں آؤں گی۔ میں ہرگز سائن نہیں کروں گی اور میں کیوں کروں سائن؟ مجھے ضرورت ہے اپنے حصے کی، مجھے پی ایچ ڈی بھی کرنا ہے۔ مجھے باہر جانا ہے، میں....."

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ فواد نے کاغذ قلم میز پر پھینکا اور صوفے پر بیٹھی محمل کو گردن سے دبوچ کر اٹھایا اور اپنے سامنے ڈھال کی طرح رکھتے ہوئے جانے کہاں سے پستول نکال کر اس کی گردن پر رکھا۔

"اب بھی نہیں کرو گی تم سائن؟" وہ غرایا۔

فرشتے سناٹے میں آ گئی۔

فواد نے بازو کے حلقے میں اس کی گردن دبوچ رکھی تھی۔ وہ شاک کے باعث کچھ کہنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ سخت گرفت کے باعث اس کی آنکھیں ابل کر باہر آنے لگیں۔ بے اختیار وہ کھانسی۔

"اپنی بہن سے کہو کہ شرافت سے سائن کر دے ورنہ میں واقعی گولی چلا دوں گا اور تم جانتی ہو کہ میں قانون کی بے بسی کا منہ بولتا ثبوت ہوں۔ یہی کہا تھا نا تم نے میرے بارے میں؟" اس کے کان کے قریب

منہ لے جا کر اس نے بظاہر سرگوشی میں کہا مگر سب کے کانوں تک اس کی سرگوشی پہنچ گئی۔

سب کو گویا سانپ سونگھ گیا۔ حسن نے آگے بڑھنا چاہا مگر فضہ نے اس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔

"کیا کر رہے ہو، اگر اس نے گولی چلا دی تو وہ مر جائے گی۔ کیا تم یہی چاہتے ہو؟" انہوں نے بیٹے کو گھورا تو وہ بے بسی سے کھڑا رہ گیا۔

"بولو فرشتے بی بی! تم سائن کرو گی یا نہیں؟"

اس نے پستول کی ٹھنڈی نال محمل کی گردن پر چبھوئی۔ وہ سسک کر رہ گئی۔

"بولو فرشتے!" وہ زور سے چیخا۔

"نہیں!" وہ جیسے ہوش میں آئی۔ "میں سائن نہیں کروں گی۔" اس کا لہجہ اٹل تھا۔

"میں تین تک گنوں گا فرشتے! اگر میں نے گولی چلا دی تو تمہاری بہن کبھی واپس نہیں آئے گی۔"

"فرشتے پلیز...!" محمل بلک پڑی۔ "پلیز میری خاطر فرشتے! آج آپ اپنا حق چھوڑ دیں۔ میں وعدہ کرتی ہوں، اگر ضرورت پڑی تو میں بھی آپ کے لیے اپنا حق چھوڑ دوں گی۔ آئی پرامس۔"

"نہیں! میں سائن نہیں کروں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ میں تین تک گنوں گا۔"

فرشتے نے دیکھا، اس کی انگلی ٹریگر پر مضبوط ہوئی اور وہ واقعی گولی چلانے والا تھا۔

"ایک..."

لمحہ بھر کو اس کا دل کانپا۔ اگر وہ گولی چلا دے تو محمل مر جائے گی پھر بھلے وہ ہمایوں کو بلا لے، کورٹ کچہری میں گواہیاں دیتی پھرے، کچھ بھی کر لے، اس کی بہن واپس نہیں آسکے گی۔

"دو..."

بھلے فواد کو پھانسی ہو جائے اور وہ ساری جائیداد کی مالک بن بیٹھے، اس کی بہن واپس نہیں آئے گی۔

"تین...!"

"رکو... ! میں سائن کر دوں گی۔" وہ شکست خوردہ لہجے میں بولی "لیکن آپ کو محمل کی شادی اسی وقت وہاں کرانا ہو گی جہاں میں کہوں گی اور اس میں نہ صرف آپ سب بلکہ آپ کا پورا خاندان شریک ہو گا۔ محمل اسی گھر سے رخصت ہو گی۔"

"منظور ہے۔" فواد جھٹ بولا تھا۔ محمل پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی، فرشتے کیا کہنا چاہ رہی ہے، وہ نہیں سمجھ پائی تھی، پھر اس نے حسن کو دیکھا جو اسی طرح بے بس سا کھڑا تھا، فضہ نے سختی سے اس کا بازو تھام رکھا تھا۔ بے بس اور کمزور مرد۔ وہ جو اتنے دعوے کرتا تھا، سب بے کار گئے تھے۔

"ٹھیک ہے، پھر نکاح خواں کو بلایئے، میں ہمایوں کو بلاتی ہوں۔" اس نے جھک کر میز پہ رکھا موبائل اٹھایا۔

"ہمایوں؟ ہمایوں داود؟" فواد کو گویا کرنٹ لگا تھا۔

"جی، وہی۔" فرشتے تلخی سے مسکرا کر سیدھی ہوئی۔ "ہونہہ، اب آپ کو یہ معاہدہ قبول نہیں ہے؟"

"ہمایوں داود، وہ اے ایس پی؟"

"وہ پولیس والا!؟"

"نہیں، ہرگز نہیں۔" بہت سی حیران، غصیلی آوازیں ابھری تھیں جن میں سب سے بلند آغا جان کی تھی۔

"وہ شخص اس گھر میں قدم نہیں رکھ سکتا جس نے میرے بیٹے کو جیل بھجوایا تھا، تمہیں دستخط نہیں کرنا تو نہ کرو، مگر میں محمل کی شادی کبھی اس سے نہیں کروں گا۔"

"میں آپ سے بات نہیں کر رہی کریم چچا! میں یہ معاہدہ آغا فواد کے ساتھ کر رہی ہوں، ان ہی کو بولنے دیجیے نا۔"

"مگر..."

"نہیں آغا جان! کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ آپ بلایئے اس کو۔ ہمیں قبول ہے۔" وہ سنبھل چکا تھا، چہرے کی مسکراہٹ واپس آگئی تھی۔

"مگر فواد! یہ کل کو مکر گئی تو؟" آغا جان نے پریشانی سے اس کا شانہ پکڑ کر اپنی جانب کیا۔

"یہ نہیں مکریں گی، یہ تو ماشاءاللہ سے مسلمان ہیں۔ یہ وعدے سے نہیں پھریں گی۔" مسلمان کو توڑ کرتے ہوئے اس نے استہزائیہ مسکراہٹ فرشتے کی جانب اچھالی۔ وہ لب بھینچے تنفر سے اسے دیکھتی رہی۔

"ٹھیک ہے۔ آپ بلایئے اپنے کزن کو۔ فنکشن تو آج ہونا ہی ہے۔ اسد اب تک نکاح خواں کا بندوبست کر چکا ہو گا۔" غفران چچا مصروف سے لہجے میں کہتے دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ ان کی جیسے جان چھوٹ گئی تھی۔ فضہ سے بھی اپنا اطمینان و خوشی چھپانا مشکل ہو رہی تھی۔ ان دونوں کو گویا اپنا بیٹا واپس مل گیا تھا، پھر بھی وہ حسن کا بازو مضبوطی سے تھامے کھڑی تھیں، مگر اب شاید وہ رسی تڑا کر بھاگنے کے قابل نہ رہا تھا۔ اس کا تو آسرا ہی ختم ہو گیا تھا۔

"آؤ اندر چلو۔" فرشتے نے تھکے تھکے انداز میں محمل کا ہاتھ پکڑا اور اسے اپنے ساتھ لیے اس کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ [illegible] بیٹھے رہ گئے تھے۔ پورے گھر میں عجیب سی [illegible] در آئی تھی۔

☆ ☆ ☆

سب کسی خواب کی سی کیفیت میں ہوا تھا۔ شاید وہ ایک حسین خواب ہی تھا جس کی تعبیر کی اسے بہت بھاری قیمت چکانی پڑی تھی۔ بہت سارے خواب ٹوٹ پڑے تھے، مگر اسے اس وقت وہی صحیح لگا تھا۔ [illegible] کرتی تو وہ لوگ اسے خاندان بھر میں بدنام کر دیتے۔ [illegible] کے مرحوم ماں باپ کا نام اچھالا جاتا، پھر سب سے بڑی وجہ وہ تھی جو فواد کو بھی معلوم تھی اور جس کو اس نے استعمال کیا تھا۔ محمل کی دکھتی رگ، کہ اس کا خاندان اس کو عزت سے بیاہ دے۔ اسے دولت سے زیادہ اپنا مقام اور عزت چاہیے تھی اور فواد نے اسی دکھتی رگ کو دبا دیا تھا کہ اس کا دل تڑپ اٹھا تھا۔ وہ فیصلہ جذباتی تھا مگر اسے صحیح لگا تھا۔

پھر جو بھی ہوا، جیسے نیند کی حالت میں ہوا۔ فرشتے اس کا چہرہ کلینزر سے صاف کر کے بیوٹیشن کے ساتھ اس کا دوپٹہ سیٹ کر رہی تھی، مگر وہ تائی مہتاب کے

زیور اتار کر اس کی ماں کے زیور پہنا رہی تھی، پھر وہ اس کا میک اپ کر رہی تھی، پھر وہ اس کے سینڈل کے اسٹرپ بند کر رہی تھی، پھر وہ مسکراتے ہوئے کچھ کہہ رہی تھی اور پھر وہ بہت کچھ کر رہی تھی، مگر اسے آواز نہیں آ رہی تھی۔ ساری آوازیں بند ہو گئی تھیں۔ سارے منظر دھندلا گئے تھے، بس وہ اپنے ہاتھوں کو دیکھتی بت بنی بیٹھی تھی۔

وہ خواب حسین تھا، مگر اس کا دل خالی تھا۔ سارے جذبات گویا مر سے گئے تھے۔ خواہش کے جگنو کھو گئے تھے۔

یا شاید ہمیں خوشی سے محبت نہیں ہوتی، خوشی کی "خواہش" سے محبت ہوتی ہے۔ ہماری سب محبتیں "خواہشات" سے ہوتی ہیں، کبھی کسی کو پانے کی تمنا، کبھی کوئی خاص چیز حاصل کرنے کی آرزو۔۔۔ شاید محبت صرف خواہش سے ہوتی ہے، چیزوں یا لوگوں سے نہیں۔

اس نے اپنی خواہش کو اپنے پہلو میں بیٹھتے دیکھا، مگر اس کا اپنا سر جھکا تھا، سو زیادہ دیکھ نہ پائی اور اسی جھکے سر کے ساتھ نکاح نامے پہ دستخط کرتی گئی، کرتی گئی، کرتی گئی۔

جب اس کا ہاتھ تھام کر فرشتے اسے اٹھا رہی تھی تو اس نے لمحے بھر کو اسے دیکھا، جو سامنے لب بھینچے کھڑا تھا۔ براؤن شلوار کرتے میں ملبوس سنجیدہ اور وجیہہ۔ اس نے نگاہیں جھکا لیں۔ اسے اس کی سنجیدگی سے خوف آیا تھا۔ کیا وہ اس پہ مسلط کی گئی تھی؟ ان چاہی، بے وقعت بیوی؟

اس نے بے عزتی اور توہین محسوس کرنا چاہی، مگر دل اتنا خالی تھا کہ کوئی احساس بیدار نہ ہوا۔

ارد گرد لوگ بہت کچھ کہہ رہے تھے مگر اس کی سماعتیں بند ہو گئی تھیں۔ وہ سر جھکائے ہمایوں کی گاڑی کی بیک سیٹ پہ بیٹھ گئی۔ اسے لگا اب زندگی کٹھن ہو گی، بہت کٹھن۔

☼ ☼ ☼

وہ اس جہازی سائز بیڈ کے وسط میں سر گھٹنوں پہ رکھے گم صم سی بیٹھی تھی۔ فرشتے چند دیر ہوئی اسے وہاں بٹھا کر جانے کہاں چلی گئی تھی اور ہمایوں کو تو اس نے گاڑی سے نکل کر دیکھا ہی نہ تھا۔ وہ تیزی سے اندر چلا گیا تھا اور پھر دوبارہ سامنے نہیں آیا تھا۔

اس کے دل میں عجیب عجیب سے خیال آ رہے تھے۔ وہ بار بار "اعوذ باللہ" پڑھتی مگر وسوسے اور وہم ستانے لگے تھے، شاید وہ اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا، شاید وہ اس پہ مسلط کی گئی تھی، شاید وہ خفا تھا، شاید وہ اسے پسند ہی نہیں کرتا تھا، اب شاید اس کے پاس نہیں آئے گا، بلکہ شاید وہ بات تک نہ کرے، شاید وہ اسے چھوڑ دے، شاید وہ۔۔۔ شاید۔

بہت سے شاید تھے جن کے آگے سوالیہ نشان لگے تھے۔ بار بار وہ شاید اس کے ذہن کے پردے پہ ابھرتے اور اس کا دل ڈوبنے لگتا۔ وہ مایوس ہونے لگی تھی جب دروازہ کھلا۔

بے اختیار سب کچھ بھلا کر وہ سر اٹھائے دیکھنے لگی۔

وہ اندر داخل ہو رہا تھا۔ اس کا دل دھڑکنا بھول گیا۔ جانے وہ اب کیا کرے؟ وہ دروازہ بند کر کے اس کی طرف پلٹا، پھر اسے یوں بیٹھے دیکھ کر ذرا سا مسکرایا۔

"السلام علیکم، کیسی ہو؟" آگے بڑھ کر بیڈ کی سائیڈ ٹیبل دراز کھولی، وہ خاموشی سے کچھ کہے بنا اسے دیکھے گئی۔ وہ اب دراز میں چیزیں الٹ پلٹ کر رہا تھا۔

"تم تھک گئی ہو گی، اتنے بڑے ٹراما سے گزری ہو۔ پریشان مت ہونا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ اب نچلے دراز میں کچھ تلاش کر رہا تھا۔ لہجہ متوازن تھا اور الفاظ۔۔۔ الفاظ پہ تو اس نے غور ہی نہیں کیا، وہ بس اس کے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی جو دراز میں اِدھر اُدھر حرکت کرتے یک دم رکے تھے اور پھر اس نے ان میں ایک میگزین پکڑے دیکھا۔

(کیا اس میں گولیاں بھی ہیں؟ کیا یہ مجھے مار دے گا)

وہ عجیب سی باتیں سوچ رہی تھی۔

وہ میگزین نکال کر سیدھا ہوا۔

"آئی ایم سوری محمل! ہمیں سب بہت جلدی میں کرنا پڑا اور میں جانتا ہوں، تم اس سب کے لیے تیار نہیں تھیں۔"

وہ کہہ رہا تھا اور وہ سانس روکے اس کے ہاتھ میں پکڑا میگزین دیکھ رہی تھی۔

"میں ابھی آن ڈیوٹی ہوں اور مجھے ریڈ کے لیے کہیں جانا ہے۔ رات فرشتے تمہارے ساتھ رک جائے گی، میں پرسوں شام تک واپس آ جاؤں گا، تم پریشان نہ ہونا۔"

وہ خالی خالی نگاہوں سے اسے دیکھے گئی۔ عجیب شادی، عجیب سی دلہن، اور عجیب سا دولہا، اسے اس کی باتیں بہت عجیب لگی تھیں۔

"تم سن رہی ہو؟" وہ اس کے سامنے بیڈ پہ بیٹھا بغور اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ وہ ذرا سی چونکی۔

"ہوں جی، جی۔" بے ساختہ نگاہیں جھکا لیں۔

پھر پتا نہیں وہ کیا کیا کہتا رہا، محمل نظریں نیچی کیے سنتی رہی۔ الفاظ اس کے کانوں سے ٹکرا ٹکرا کر واپس پلٹ رہے تھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ کب خاموش ہوا، کب اٹھ کر چلا گیا، اسے تب ہوش آیا جب پورچ سے گاڑی نکلنے کی آواز آئی۔

اس نے ویران نظروں سے کمرے کو دیکھا۔ یہی وہ کمرہ تھا جس میں کبھی ہمایوں نے اسے بند کیا تھا۔ تب وہ سیاہ ساڑھی میں ملبوس تھی۔

آج اس نے سرخ شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ عروسی جوڑا، عروسی زیورات، وہ دلہن تھی اور پتا نہیں کیسی دلہن تھی۔ اس نے تو سوچا بھی نہ تھا کہ وہ اس کمرے میں یوں کبھی ہمایوں کی دلہن بن کر آئے گی۔ ہاں فواد کے خواب اس نے دیکھے تھے، مگر وہ اس کے دل کا ایک چھپا ہوا راز تھا، جس کی خبر شاید خود فواد کو بھی نہ تھی۔

"اور حسن؟" اندر سے کسی نے سرگوشی کی۔

حسن کے لیے اس کے دل میں کبھی کوئی جذبہ نہیں ابھرا تھا اور اچھا ہی ہوا۔ شام کو جب فواد نے اس کے نام کے ساتھ ہمایوں کا نام لیا تو کیسے وہ بالکل چپ ہو گیا تھا۔ وہ جو ہر موقع پہ محمل کے حق کے لیے بولتا تھا، لڑتا تھا، اتنے اہم موقع پہ یوں کیوں پیچھے ہو گیا تھا؟ وہ فیصلہ نہ کر سکی اور فرشتے، اس نے کتنی بڑی قربانی دی تھی اس کے لیے۔ وہ کبھی بھی اس کا احسان نہیں اتار سکتی، وہ جانتی تھی، اس نے اپنا حق چھوڑ دیا، کاش فرشتے کبھی اسے موقع دے اور وہ اس کے لیے اپنا حق چھوڑ سکے۔

اس نے تھک کر سر بیڈ کراؤن سے ٹکا دیا اور آنکھیں موند لیں۔ اس کا دل اداس تھا، روح بوجھل تھی۔ اب اسے راحت چاہیے تھی، سکون چاہیے تھا۔ اپنے خاندان والوں کی قید سے نکلنے کے احساس کو محسوس کرنے کی حس چاہیے تھی۔ اسے غم سے نجات چاہیے تھی۔ اس نے ہولے سے لبوں کو حرکت دی اور آنکھیں موندے دھیمی آواز میں دعا مانگنے لگی۔

"یا اللہ، میں آپ کی بندی ہوں اور آپ کے بندے کی بیٹی ہوں اور آپ کی بندی کی بیٹی ہوں۔ میری پیشانی آپ کے قابو میں ہے، میرے حق میں آپ کا حکم جاری ہے، آپ کا فیصلہ میرے بارے میں انصاف پہ مبنی ہے۔ میں آپ سے سوال کرتی ہوں آپ کے ہر اس نام کے واسطے سے جو آپ نے اپنے لیے پسند کیا، یا اپنی کتاب میں اتارا، یا اپنی مخلوق میں سے کسی کو سکھایا، یا اپنے علم غیب میں آپ نے اس کو اختیار کر رکھا ہے، اس بات کو کہ آپ قرآن عظیم کو میرے دل کی بہار اور میری آنکھوں کا نور بنا دیں اور میرے فکر اور غم کو لے جانے کا ذریعہ بنا دیں۔"

وہ دعا کے الفاظ بار بار دہراتی گئی، یہاں تک کہ دل میں سکون اتر آیا، اس کی آنکھیں بوجھل ہو گئیں اور وہ نیند میں ڈوب گئی۔

☼ ☼ ☼

وہ دو دن فرشتے اس کے ساتھ رہی۔ ان دو دنوں میں انہوں نے بہت سی باتیں کیں، سوائے اس شام کے ڈرامے کے۔ وہ ایسا موضوع تھا کہ دونوں ہی کسی خاموش معاہدے کے تحت اس سے احتراز برت رہی

تھیں۔
فرشتے نے اسے بہت کچھ بتایا۔ ابا کے بارے میں، اپنی ماں کے بارے میں، ہمایوں کی امی کے بارے میں، اپنی زندگی، گھر اور پرانی یادوں کے بارے میں۔ وہ دونوں چائے کے مگ تھامے گھنٹوں لان میں بیٹھی باتیں کرتی رہتیں، چائے ٹھنڈی ہو جاتی، شام ڈھل جاتی مگر ان کی باتیں ختم نہ ہوتیں۔
"پتا ہے محمل! ادھر لان میں ..." وہ دونوں برآمدے کی سیڑھیوں پہ بیٹھی تھیں، چائے کے مگ ہاتھ میں تھے، جب فرشتے نے بازو لمبا کر کے انگلی سے سامنے اشارہ کیا۔ "وہاں ایک جھولا تھا، بالکل کونے میں۔"
محمل گردن موڑ کر اس طرف دیکھنے لگی جہاں اب صرف گھاس اور کیاریاں تھیں۔
"ہم بچپن میں اس جھولے پہ بہت کھیلتے تھے اور اس کے اس طرف طوطوں کا پنجرہ تھا۔ ایک طوطا میرا تھا اور ایک ہمایوں کا۔ اگر میرا طوطا اس کی ڈالی گئی چوری کھا لیتا تو ہمایوں بہت لڑتا تھا۔ وہ ہمیشہ سے ہی اتنا غصے والا تھا، مگر غصہ ٹھنڈا ہو جائے تو اس سے بڑھ کر لونگ اور کیئرنگ بھی کوئی نہیں ہے۔"
محمل مدھم مسکراہٹ لیے سر جھکائے سن رہی تھی۔
"جب میں بارہ سال کی ہوئی تو ابا نے مجھ سے پوچھا کہ میں ان کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں یا اماں کے ساتھ؟ میں وقتی طور پہ ابا کے ساتھ جانے کے لیے راضی ہو گئی، مگر اس دن ہمایوں مجھ سے بہت لڑا۔ اس نے اتنا ہنگامہ مچایا کہ میں نے فیصلہ بدل دیا۔" چائے کا مگ اس کے دونوں ہاتھوں میں تھا اور وہ کہیں دور کھوئی ہوئی تھی۔
"پھر جب ہم بڑے ہوئے اور میں نے قرآن پڑھا تو ہمایوں سے ذرا دور رہنے لگی۔ وہ خود بھی سمجھ دار تھا، مجھے زیادہ آزمائش میں نہیں ڈالتا تھا۔ پھر میری اماں کی ڈیتھ ہوئی تو ..."
دفعتاً گاڑی کا ہارن بجا۔ وہ دونوں چونک کر اس طرف دیکھنے لگیں۔ اگلے ہی لمحے گیٹ کھلا اور وہاں سے سیاہ گاڑی اندر داخل ہوئی۔
"چلو تمہارا میاں آ گیا، تم اپنا گھر سنبھالو، میں اپنا سامان پیک کر لوں۔" وہ ہنس کر کہتے ہوئے اٹھ کر اندر چلی گئی۔
محمل متذبذب سی بیٹھی رہ گئی۔ وہ گاڑی سے نکل کر اس طرف آ رہا تھا۔ یونیفارم میں ملبوس، کیپ ہاتھ میں لیے تھکا تھکا سا۔ اسے دیکھ کر مسکرا دیا۔
"تو تم میرے انتظار میں بیٹھی ہو، ہوں؟" وہ مسکرا کر کہتا اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تو وہ گڑبڑا کر کھڑی ہو گئی۔ گلابی شلوار قمیص پہ بھورے بالوں کی اونچی پونی ٹیل بنائے وہ اداس شام کا حصہ لگ رہی تھی۔
"وہ میں ..."
"کہہ دو کہ تم میرا انتظار نہیں کر رہی تھیں۔"
"نہیں ... چائے لا دوں؟"
"[illegible]" اس نے محمل کے ہاتھ سے مگ لیا۔ ایک گھونٹ بھرا اور مگ لیے دروازے کی طرف بڑھ گیا، پھر جاتے جاتے پلٹا۔ "فرشتے ہے؟"
"جی، وہ اندر ہیں۔"
"او کے۔ میں شاور لے کر کھانا کھاؤں گا، تم ٹیبل لگا دو۔" وہ کہہ کر دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔
وہ چند لمحے خاموش کھڑی کھلے دروازے کو دیکھتی رہی، وہ دروازہ بند کر کے نہیں گیا تھا، کیا اس کا مطلب تھا کہ وہ اندر آ جائے؟ پہلے بھی تو وہ بغیر اجازت اس کی زندگی میں داخل کر دی گئی تھی۔ اب بھی چلی جائے تو کیا مضائقہ ہے؟
اس نے تلخی سے سر جھٹکا اور کھلے دروازے سے اندر چلی آئی۔
لاؤنج کے سرے پہ سیڑھیوں کے قریب فرشتے اور ہمایوں کھڑے تھے۔ وہ اپنے بیگ کا ہینڈل تھامے، سیاہ حجاب چہرے کے گرد لپیٹتے ہوئے انگلی سے ٹھوڑی کے نیچے اڑس رہی تھی۔
"نہیں بس، اب میں چلتی ہوں، کل مجھے کلاس ہے۔"
"تم آرام سے [illegible] تمہیں ادھر رہنا چاہیے۔"
وہ دونوں باتیں کر رہے تھے۔ ان کی آواز بے حد مدھم تھی، محمل کو اپنا آپ ادھر بے کار لگا تو وہ سر جھکائے کچن میں چلی آئی۔
بلقیس جا چکی تھی۔ کچن صاف ستھرا پڑا تھا۔ اس نے چولہا جلایا اور کھانا گرم کرنے لگی۔ شاید وہ بھی اس گھر میں بلقیس کی طرح تھی۔ ایک نوکرانی۔
"محمل!" فرشتے نے کھلے دروازے سے جھانکا۔ محمل نے ہاتھ روک کر اسے دیکھا۔ وہ جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔
"آپ مت جائیں فرشتے، پلیز!" وہ بے اختیار روہانسی سی ہو کر اس کے قریب آئی۔
"او ہو، میرا کزن بہت اچھا انسان ہے۔ تم کیوں پریشان ہو رہی ہو، پاگل!"
[illegible] محمل چند لمحے اسے دیکھتی رہی، پھر [illegible] آنکھیں [illegible]
"محمل! کیا ہوا ہے؟ تم مجھے پریشان لگ رہی ہو۔" وہ ذرا فکر مند سی اس کے پیچھے آئی۔ محمل کی اس کی طرف پیٹھ تھی، فرشتے اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔
"کسی کی شادی ایسے بھی ہوتی ہے جیسے میری ہوئی؟" بہت دیر بعد وہ بولی تو آواز میں صدیوں کی یاس تھی۔ فرشتے ... کچھ نہ بولی تو وہ پلٹی۔
فرشتے بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اسے لگا، اس نے کچھ غلط کہہ دیا ہے۔
"کیا؟" وہ گڑبڑا گئی۔
"محمل! تم!" حیرت کی جگہ خفگی نے لے لی۔
"کیا ہوا؟"
"تم بہت ... بہت ناشکری ہو محمل! بہت زیادہ!"
وہ جیسے غصہ ضبط کرتے ہوئے تیزی سے مڑ گئی۔
"فرشتے! رکیں۔" محمل بوکھلا کر اس کے پیچھے لپکی۔ وہ تیزی سے باہر نکل رہی تھی۔ اس نے اسے بازو سے تھاما تو وہ رک گئی، چند لمحے ... کھڑی رہی، پھر گہری سانس لے کر اس کی طرف گھومی۔
"تمہیں ہمایوں مل گیا محمل! اور اب بھی ناخوش ہو؟"
وہ بہت دکھی سی ہو کر بولی تھی۔ محمل نے بے چینی سے لب کچلا۔ فرشتے اسے غلط سمجھ رہی تھی۔
"نہیں، میں صرف اس خوشی کو محسوس کرنا ..."
"جسٹ اسٹاپ اٹ!" وہ بہت خفا تھی۔ محمل چپ سی ہو گئی۔ چند لمحے دونوں کے درمیان خاموشی حائل رہی، پھر فرشتے نے آگے بڑھ کر اس کے دونوں شانوں پہ اپنے ہاتھ رکھے اور اسے اپنے بالکل سامنے کیا۔
"تم واقعی ناخوش ہو؟"
"نہیں۔ مگر اس سب سے میرا دل کٹ کر رہ گیا ہے۔"
"لوگوں کی روح تک کٹ جاتی ہے محمل! سب قربان ہو جاتا ہے، وہ پھر بھی راضی ہوتے ہیں اور تم ... تم اب بھی شکر نہیں کرتیں؟" اس کی سنہری آنکھوں میں سرخ سی نمی ابھری تھی۔ اس کے ہاتھ ابھی تک محمل کے شانوں پہ تھے۔
"نہیں، میں بہت شکر کرتی ہوں، مگر ... مگر بس سب کچھ بہت عجیب لگ رہا ہے جیسے ..."
"بس کرو محمل!" اس نے [illegible] سے سر جھٹک کر اپنے ہاتھ ہٹائے اور تیزی سے جاتی ہوئی باہر نکل گئی۔ اسے یونہی شک سا گزرا، وہ رو رہی تھی۔
وہ دل مسوس کر رہ گئی۔ اس نے شاید فرشتے کو ناراض کر دیا تھا، لیکن وہ ٹھیک کہتی تھی، وہ واقعی ناشکری کر رہی تھی۔ صرف زبان سے الحمدللہ کہنا کافی نہیں ہوتا، اصل اظہار تو رویے سے ہوتا ہے۔
"کدھر گم ہو؟"
آواز پہ وہ چونکی۔ ہمایوں سامنے کاؤنٹر سے ٹیک لگائے کھڑا بغور اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ جھینپ سی گئی۔
"فرشتے چلی گئی؟" وہ کاؤنٹر سے ہٹ کر فریج کی طرف بڑھا اور اسے کھول کر پانی کی بوتل نکالی۔
"جی۔"
"فرشتے بہت اچھی بہن ہے نا؟" اس نے

ڈھکن کھول کر بوتل منہ سے لگائی۔

"بیٹھ کر پئیں پلیز۔" وہ خود کو کہنے سے روک نہ سکی۔ وہ بوتل منہ سے ہٹا کر ہنس دیا۔

"فرشتے نے تمہیں بھی اچھی لڑکی بنا دیا ہے۔"

"تو کیا پہلے میں بری تھی؟" وہ برا مان گئی۔

"ارے نہیں، تم تو ہمیشہ سے اچھی تھیں۔" مسکرا کر کہتے اس نے پھر بوتل لبوں سے لگائی۔ محمل نے دیکھا، وہ بیٹھا نہیں تھا، اب بھی کھڑا ہو کر پی رہا تھا۔ خود کو بدلنا بھی آسان نہیں ہوتا مگر دوسرے کو بدلنا بہت ہی کٹھن ہوتا ہے۔

"اچھا یہ بتاؤ، تمہارا دل کیوں کٹ کر رہ گیا؟"

اف! وہ بری طرح چونکی۔ وہ تو شاور لینے گیا تھا کب آکر سب سن گیا؟ اسے تو پتا ہی نہ چلا تھا۔

"وہ... دراصل..." اس کا دل زور سے دھڑکا۔

"گھر سے کسی نے کال نہیں کی تو میں..."

"وہ کیوں کریں گے کال؟ ان کی اس شادی میں مرضی شامل نہیں تھی۔ فرشتے نے بہت مشکل سے انہیں راضی کیا تھا، وہ اس بات پہ ابھی تک غصہ ہیں، آئی تھنک۔"

وہ یکدم ٹھٹک گئی۔

"فرشتے نے..." اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"اس نے کتنی مشکل سے ان کو راضی کیا... تم جانتی ہو!" وہ پھر بوتل سے گھونٹ بھر رہا تھا۔

وہ دم بخود سی اسے دیکھے گئی۔ کیا وہ کچھ نہیں جانتا؟ اسے نہیں معلوم کہ کیسے ان دونوں نے فواد کے لیے کاغذ پہ دستخط کیے تھے؟ فرشتے نے اسے کچھ نہیں بتایا؛ مگر کیوں؟

"تم فکر مت کرو، ہم نے یہ شادی ان سے زبردستی کروائی ہے، ان کو کچھ عرصہ ناراض رہنے دو۔ ڈونٹ وری۔"

تو وہ واقعی کچھ نہیں جانتا۔ وہ بتائے یا نہیں؟ اس نے لمحے بھر کو سوچا اور پھر فیصلہ کر لیا۔ اگر فرشتے نے کچھ نہیں بتایا تو وہ کیوں بتائے؟ چھوڑو، جانے دو۔

"صرف ان کے ساتھ زبردستی ہوئی ہے یا آپ کے ساتھ بھی؟"

"تو تم اس لیے پریشان تھیں؟" اس نے مسکرا کر سر جھٹکا۔ "تمہیں لگتا ہے کوئی ہمایوں داؤد کو مجبور کر سکتا ہے؟"

"مجبوراً" قائل تو کر سکتا ہے!"

"نہیں کر سکتا۔ قطعاً "نہیں۔"

"پھر آپ نے... آپ نے کیوں شادی کی مجھ سے؟"

"اگر تم چاہتی ہو کہ میں یہ کہوں کہ میں تم سے بہت محبت کرتا تھا، وغیرہ وغیرہ، تو میں ایسا نہیں کہوں گا، کیونکہ واقعی مجھے تم سے کوئی طوفانی قسم کی محبت نہیں تھی۔ ہاں، تم مجھے اچھی لگتی ہو اور میں نے اپنی مرضی سے تم سے شادی کی ہے اور میں اس فیصلے پہ بہت خوش ہوں۔"

اس کا انداز اتنا نرم تھا کہ وہ آہستہ سے مسکرا دی۔ دل پہ پڑا بوجھ ہلکا ہو گیا۔

"یعنی آپ خوش ہیں؟"

"آف کورس محمل! ہر بندہ اپنی شادی پہ خوش ہوتا ہے۔ بنیادی طور پہ میں بہت پریکٹیکل انسان ہوں۔ لمبی بات نہیں کرتا اور مجھے بے کار کی مبالغہ آرائی نہیں پسند۔ میں کوئی دعویٰ کروں گا نہ وعدہ۔ یہ تم وقت کے ساتھ دیکھ لو گی کہ تم اس گھر میں خوش رہو گی۔"

وہ جیسے کھل کر مسکرا دی۔ اطمینان اور سکون اس کے رگ و پے میں دوڑ گیا تھا۔

"تم اس پہ کچھ نہیں کہو گی؟"

"میں کیا کہوں؟"

"میں بتاؤں؟"

"جی بتائیے۔" وہ بہت دھیان سے متوجہ ہوئی۔

"سالن جل رہا ہے۔"

"اوہ۔" وہ بوکھلا کر پلٹی۔ دیگچی میں سے دھواں اٹھنے لگا تھا۔ مدھم سی جلنے کی بو بھی سارے میں پھیل رہی تھی۔ اس نے جلدی سے چولہا بند کیا۔

"ویلکم ٹو پریکٹیکل لائف!" وہ مسکرا کر کہتا باہر نکل گیا۔ وہ گہری سانس لے کر دیگچی کی طرف متوجہ

ہوئی۔ سالن جل گیا تھا مگر اس کے اندر ہر سو بہار چھائی تھی۔ وہ مسکراہٹ دبائے دیگچی اٹھا کر سنک کی طرف بڑھ گئی۔

✡ ✡ ✡

"محمل... محمل!" وہ نیچے لاؤنج میں کھڑا سر اٹھائے مسلسل اسے آوازیں دے رہا تھا۔ "جلدی کرو، دیر ہو رہی ہے۔"

"آ رہی ہوں، بس ایک منٹ۔" اس نے ڈریسنگ ٹیبل سے لپ گلوس اٹھایا اور سامنے آئینے میں دیکھتے ہوئے اسے لپ اسٹک پہ لگایا، لپ اسٹک چمک اٹھی تھی۔

"محمل!" وہ پھر چلایا تھا۔

"بس آ گئی۔" اس نے ایک عجلت بھری نگاہ سنگھار میز کے آئینے میں دیکھتے اپنے وجود پہ ڈالی۔ پنک [illegible] ملبوس [illegible] سر پہ [illegible] کانوں میں چمکتے ڈائمنڈ کے ایئر رنگز، گردن سے چپکا نازک سا ہیروں کا سیٹ جو ہمایوں نے اسے تیمور کی پیدائش پہ دیا تھا اور کلائی میں وائٹ گولڈ کے موتی جڑے کنگن، ساتھ مناسب سا میک اپ۔ وہ مطمئن ہو گئی۔ بیڈ پہ لیٹے تیمور کو اٹھایا اور باہر نکل آئی۔

"تم اتنی دیر کر رہی ہو، کیا ارادہ بدل گیا ہے؟" آخری فقرہ کہتے ہوئے وہ زیر لب مسکرایا۔ وہ جو تیمور کو اٹھائے سج سج سیڑھیاں اتر رہی تھی، مسکرا اٹھی۔

"ہرگز نہیں۔ آخر کو اپنے میکے جا رہی ہوں، ارادہ کیوں بدلوں گی؟" وہ سیڑھیاں اتر آئی... وہ مسکرا کر اسے دیکھ رہا تھا۔ بلیک ڈنر سوٹ میں ملبوس، بالوں کو جیل سے پیچھے کیے، وہ بہت شاندار لگ رہا تھا۔

"اچھے لگ رہے ہیں۔"

"تم بھی!"

"بس اتنی سی تعریف؟" اس کا چہرہ اتر گیا۔

"شادی کے ایک سال بعد اب میں اور کیا کہوں؟"

وہ دونوں ساتھ ساتھ باہر آ گئے تھے۔

"ایک سال گزر گیا ہمایوں! پتا ہی نہیں چلا ہے نا؟"

وہ فرنٹ ڈور کھولتے ہوئے وہیں کھو سی گئی تھی۔

"ہاں، وقت بہت جلدی گزر جاتا ہے۔" وہ گاڑی سڑک پہ ڈال کر بہت دیر بعد بولا تھا۔ "یوں لگتا ہے جیسے کل ہی کی بات ہے۔"

"ہوں۔" محمل نے سیٹ کی پشت سے سر ٹکا دیا اور آنکھیں موند لیں۔

ایک سال گزر بھی گیا، یوں جیسے پتا ہی نہ چلا ہو۔ پورے ایک برس پہلے وہ بیاہ کر اس گھر سے ادھر آئی تھی، آج ایک برس بعد ہمایوں نے شادی کی سالگرہ پر اسے اسی گھر لے جانے کا تحفہ دیا تھا۔

پورا سال نہ انہوں نے اس کی خبر گیری کی، نہ ہی محمل نے کوئی فون کیا۔ شروع میں اسے غصہ تھا، پھر آہستہ آہستہ وہ غم میں ڈھل گیا اور اب... اب اسے اپنے فرائض یاد آئے۔ صلہ رحمی کے احکامات یاد آئے تو اس نے تہیہ کر لیا کہ اپنے رشتہ داروں سے پھر سے تعلق جوڑے گی۔ پہلے بھی یہ خیال کئی بار آیا مگر ہمایوں جانے پہ راضی نہ ہوتا تھا، لیکن گزرتے وقت کے ساتھ فواد کا کیس اندر ہی اندر دبتا گیا اور پھر ہمایوں نے ہی ایک دن اسے بتایا کہ فواد ملک سے باہر چلا گیا ہے۔ شاید آسٹریلیا۔ وہ بھی کسی حد تک سکون میں آ گئی، نہ جانے کیوں۔

ہفتہ پہلے ہمایوں کو کسی جگہ آغا کریم ملے، اس نے محمل کو بتایا کہ وہ بہت خوش دلی سے ملے اور اسے گھر آنے کی دعوت بھی دی۔ منافقت، دنیاداری اور پھر اب وہ کس چیز کا بغض چہروں پہ سجائے رکھتے؟ فواد تو باہر چلا گیا اور جائیداد انہیں مل گئی، پھر ہمایوں داؤد جیسے بندے کو داماد کہنے میں کیا مضائقہ تھا؟ بلکہ فخر ہی تھا۔

ایک تبدیلی اور بھی آئی تھی۔ فرشتے اسکاٹ لینڈ چلی گئی تھی۔ اسے قرآن سائنسز میں پی ایچ ڈی کرنا تھی، خوب سارا علم حاصل کرنا تھا، پھر اس کا تھیسز اور... بہت کچھ۔ وہ چلی گئی تو مدرسے میں اس کی جگہ کسی اور نے لے لی۔

اور رہی محمل تو وہ آج بھی تیمور کو لے کر فجر کی نماز

کے ساتھ ہی مدرسہ جاتی تھی۔ اس کے علم الکتاب کا بھی آدھا سال رہتا تھا۔

گاڑی رکی تو وہ چونک کر حال میں آئی۔ وہ آغا ہاؤس کے پورچ میں موجود تھی۔

وہ تیمور کو اٹھائے باہر نکلی اور گم صم سی اردگرد نگاہ دوڑائی۔

لان کے کونے میں مصنوعی آبشار بن چکی تھی، گھر کا پینٹ بدل چکا تھا، پورچ کے ٹائلز بھی نئے اور قیمتی تھے۔

لاؤنج کے دروازے پہ مہتاب تائی اور آغا جان کھڑے تھے۔ محمل اور ہمایوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر جیسے گہری سانس لے کر ان کی طرف بڑھے۔ شال اس نے ایک کندھے پہ ڈال لی تھی۔ بھورے سیدھے بال دونوں کانوں کے پیچھے اڑسے تھے۔ پورچ کی مدھم لائٹ میں بھی اس کے ڈائمنڈ سیٹ کے جگر جگر کرتے ہیرے چمکے تھے۔

"محمل! یہ تم ہو؟ کیسی ہو؟" تائی مہتاب پرتپاک استقبال کے ساتھ آگے لپکی تھیں۔

"محمل! میری بیٹی......" آغا جان نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگنے لگے۔ شاید انہیں احساس ہو گیا تھا کہ انہوں نے اس کے ساتھ کتنا ظلم کیا۔

دونوں چچیاں اور دوسری لڑکیاں بھی وہیں آگئیں۔ وہ ان کے ساتھ ان کے سوالوں کے جواب دیتی اندر آئی تھی۔

ایک تو ہمایوں کی شاندار پرسنالٹی، اوپر سے محمل کا بدلا، سجا سنورا، دولت اور آسائشوں کی فراوانی ظاہر کرتا سراپا۔ فضہ نے تو ازلی میٹھے انداز میں تعریف کی، البتہ ناعمہ کے ماتھے کے بلوں میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ وہ اپنی جلن چھپا نہ پا رہی تھی۔

لاؤنج کا بھی حلیہ بدلا ہوا تھا۔ قیمتی فانوس، پردے، بیش قیمت ڈیکوریشن پیسز، گو کہ پہلے بھی وہاں ہر چیز قیمتی ہوتی تھی، مگر اب تو جیسے پیسے کی ریل پیل ہو گئی تھی۔ ایک ایک کونا چمک رہا تھا۔ شاید اب انہیں کھلا اختیار جو مل گیا تھا۔

"سدرہ باجی کدھر ہیں اور آرزو؟" صوفے پہ بیٹھتے ہوئے اس نے متلاشی نگاہ ادھر ادھر دوڑائی۔

"سدرہ کی تو دسمبر میں شادی ہو گئی، وہ کینیڈا چلی گئی۔" تائی مہتاب نے فخر سے بتایا۔ چہرے پہ اسے نہ بلانے کی کوئی ندامت نہ تھی۔ اس کا دل اندر ہی اندر ڈوب کر ابھرا۔ وہ غلط تھی، ان کو کوئی شرمندگی نہ تھی بلکہ نعمتوں کی بے پناہ بارش نے انہیں مزید مغرور کر ڈالا تھا۔

"مہرین کا نکاح پچھلے ماہ ہوا ہے، لڑکا ڈاکٹر ہے، انگلینڈ میں ہوتا ہے، اسی سال شادی کریں گے۔"

"اچھا۔ ماشاء اللہ!" وہ دل سے خوش ہوئی مگر الجھن بہرحال تھی۔ انہوں نے اس کے ساتھ کتنا ظلم کیا، پھر بھی ان کی خوشیوں میں اضافہ کیوں ہوتا چلا گیا؟

"ندا کی بھی منگنی ہو گئی۔" فضہ چچی کیوں پیچھے رہتیں۔ "وہ بھی ڈاکٹر ہے، مسعود بیگ کی رائل فیملی کے ڈاکٹرز میں سے ہے۔ سامیہ کی بھی آج کل بات چل رہی ہے۔"

"اور آرزو؟" یونہی اس کے لبوں سے پھسل پڑا۔ نگاہ سب سے الگ بیٹھی ناعمہ چچی پہ جا پڑی۔ ان کی کوفت میں جیسے اضافہ ہوا تھا۔

"رشتوں کی لائن لگی ہے میری بیٹی کے لیے، ہر دوسرے دن کسی شہزادے کا رشتہ آجاتا ہے۔" وہ ہاتھ نچا کر بہت چمک کر بولی تھیں۔

"مگر وہ مانے بھی تو۔" فضہ چچی نے دھیمی سرگوشی کی، آواز یقیناً ناعمہ چچی تک نہیں گئی تھی۔ مخاطب محمل ہی تھی، جو سن کر ذرا سی چونکی تو فضہ چچی معنی خیز انداز میں مسکرائیں۔

"آرزو باجی کدھر ہیں؟ نظر نہیں آرہیں؟" اس نے دوسری دفعہ پوچھا تو ناعمہ چچی اٹھیں اور پیر پٹختی ہوئی وہاں سے نکل گئیں۔

"انہیں کیا ہوا؟" اس نے حیرت سے تائی مہتاب

کو دیکھا، جنہوں نے استہزائیہ مسکراہٹ کے ساتھ سر جھٹکا۔

"بیٹی کا دل آیا کسی پہ، اب مان کے نہیں دے رہی۔"

"اچھا!" اسے حیرت ہوئی۔ اسی پل سیڑھیوں سے اترتے ہوئے کوئی رکا۔ آہٹ پہ محمل نے نگاہ اٹھائی، اور پھر بے اختیار شال کا پلو سر پہ ڈال لیا۔

حسن مبہوت سا ادھر کھڑا تھا۔ کف کا بٹن بند کرتے اس کے ہاتھ وہیں رک گئے تھے۔

"السلام علیکم حسن بھائی!" وہ خوش دلی سے مسکرائی تو وہ چونکا، پھر سر جھٹک کر آخری زینہ اترا۔

"وعلیکم السلام، کیسی ہو محمل، کب آئیں؟" وہ ان کی طرف چلا آیا تھا۔ "یہ تمہارا...... بیٹا ہے یا بیٹی؟"

"بیٹا ہے، تیمور۔" اس نے جھک کر تیمور کو پیار کیا، پھر سیدھا ہوا۔

"اکیلی آئی ہو؟"

"ارے نہیں، ہمایوں اس کے ساتھ آیا ہے، تمہارے آغا جان کے ساتھ ڈرائننگ روم میں بیٹھا ہے۔ جاؤ مل لو۔" تائی مہتاب کے کہنے پہ وہ سر ہلاتا ڈرائننگ روم کی طرف بڑھ گیا۔

"حسن بھائی کی ابھی منگنی وغیرہ نہیں کی تائی؟" وہ [illegible] لہجے میں فضہ سے مخاطب ہوئی۔ اسے لگا وہ ان کا روگ لیے ابھی تک بیٹھا ہوگا۔

"ارے نہیں، حسن کی تو شادی بھی ہو گئی۔ میری بھانجی طلعت یاد ہے تمہیں؟ اسی سے۔ آج کل وہ میکے گئی ہوئی ہے۔ سامیہ، سامیہ" انہوں نے بیٹی کو پکارا۔ "جاؤ حسن کی شادی کا البم لے آؤ۔"

محمل کو واقعتاً جھٹکا لگا تھا مگر پھر سنبھل گئی۔ وہ روگ لینے والا بندہ تو نہ تھا، کمزور مرد جو کبھی اس کے لیے مضبوط سہارا نہ بن سکتا، لیکن بھلا اسے اس کا سہارا چاہیے بھی کیوں تھا؟ کبھی بھی نہیں۔ اس کی تو حسن کے ساتھ کبھی بھی کوئی جذباتی وابستگی نہ رہی تھی، سو افسوس بھی نہ تھا۔

پھر انہوں نے اسے حسن اور سدرہ کی شادیوں کے البم دکھائے۔ وہ تو سجاوٹ اور دھوم دھام دیکھ کر حق دق رہ گئی۔ دلہنوں کے عروسی لباس اور زیورات تو ایک طرف محض ایونٹ ڈیزائننگ پہ پیسہ پانی کی طرح لٹایا گیا تھا۔ انہیں محمل نے وہ سب کچھ خود دیا تھا، اب بھلا وہ کیوں اس کا پرتپاک استقبال نہ کرتے؟

ڈنر بہت پرتکلف تھا۔ آغا جان اور ہمایوں کے انداز سے لگ رہا تھا ان کی گہری دوستی رہی ہے۔ کون کہہ سکتا تھا، کبھی آغا جان اس شخص کا نام نہیں سن سکتے تھے؟

بس اس کے ایک دستخط نے ساری دنیا ہی بدل ڈالی تھی، پھر بھی وہ خوش تھی۔ اسے میکے کا مان جو مل گیا تھا، چاہے منافقت کا ملمع اوڑھے، جھوٹا ہی سہی مگر مان تو تھا نا۔

بس چند لمحوں کے لیے وہ تیمور کا بیگ لینے گاڑی تک آئی تھی اور تب اس نے لان میں کرسی پہ بیٹھی آرزو کو دیکھا تو رک گئی۔ وہ بھی اسے دیکھ چکی تھی، سو تیزی سے اٹھ کر اس کے پاس چلی آئی۔

"بہت خوب مسز ہمایوں! خوب عیش کر رہی ہو۔" اس کے قریب سینے پہ بازو لپیٹے کھڑی وہ سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لیتے بہت طنز سے بولی تھی۔ اس نے بمشکل خود کو کچھ سخت کہنے سے روکا۔

"اللہ کا کرم ہے آرزو باجی! ورنہ میں اس قابل کہاں تھی؟"

"قابل تو تم خیر اب بھی نہیں ہو، یہ تو اپنی اپنی چالاکی کی بات ہوتی ہے۔"

"مجھے چالاکیاں آتی ہوتیں تو اس گھر سے ایسے ہی رخصت ہوتی جیسے سدرہ باجی ہوئیں۔"

"اوہ ڈونٹ پریٹنڈ ٹو بی انوسنٹ۔" (زیادہ معصوم بننے کی کوشش نہ کرو) وہ تیزی سے جھڑک کر بولی۔ "تم جانتی تھیں کہ ہمایوں صرف اور صرف میرا ہے، پھر بھی تم نے اس سے شادی کی۔ تمہیں لگتا ہے میں تمہیں یونہی چھوڑ دوں گی؟"

"یہ ہمایوں آپ کے کب سے ہو گئے آرزو باجی؟

نام تک تو آپ ان کا جانتی نہیں تھیں۔ وہ بھی مجھ سے ہی پوچھا تھا۔"

"اپنی چھوٹی سی عقل پہ زیادہ زور نہ دو محمل ڈیئر۔" اس نے انگلی سے اس کی تھوڑی اٹھائی۔ "اور یاد رکھنا' آرزو ایک دفعہ کسی کو چاہ لے تو اسے حاصل کر کے ہی چھوڑتی ہے۔"

"کیوں؟ آرزو خدا ہے کیا؟" اس کے اندر غصہ ابلا تھا۔ بے اختیار اس نے اپنی تھوڑی تلے اس کی انگلی ہٹائی۔

"یہ تو تمہیں وقت بتائے گا کہ کون خدا ہے اور کون نہیں۔" وہ تمسخرانہ انداز میں کہتی مڑی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتی اندر چلی گئی۔

"عجیب لڑکی ہے یہ' کسی کے شوہر پہ حق جمار ہی ہے۔ اونہہ!" وہ غم و غصے سے کھولتے ہوئے واپس اندر آگئی۔

☆ ☆ ☆

"یہ تمہاری کزن آرزو۔۔۔ اس کے ساتھ کوئی دماغی مسئلہ ہے کیا؟" واپسی پہ ڈرائیو کرتے ہوئے ہمایوں نے پوچھا تھا۔ وہ بری طرح چونکی۔

"کیوں؟ کچھ کہا اس نے؟" اس کا دل ایک دم ڈر سا گیا۔

"ہاں عجیب سی باتیں کر رہی تھی۔"

"آپ کو کب ملی؟ لاؤنج میں تو آئی ہی نہیں۔"

"پتا نہیں' عجیب طریقے سے سب مردوں کے درمیان آکر بیٹھ گئی اور مجھ سے پے در پے سوالات شروع کر دیے۔ بہت آکورڈ لگ رہا تھا مگر اس کے باپ کو تو فرق ہی نہیں پڑا۔"

"پھر؟" وہ دم بخود سی سن رہی تھی۔

"پھر حسن کو برا لگا اور اس نے اسے جھڑکا کہ اندر جاؤ' بٹ شی واز لائیک کہ میں تمہاری نوکر ہوں جو اندر جاؤں' عجیب سی سچویشن بن گئی تھی۔ میں تو فون کا بہانہ کر کے اٹھ گیا' واپس آیا تو وہ نہیں تھی۔ کوئی مسئلہ ہے اس کے ساتھ؟"

"پتا نہیں۔" وہ بس یہی کہہ سکی۔

"ایک بات کہوں محمل!"

"ہوں' کہیے۔"

"تم یہ مت سمجھنا کہ میں لالچی ہوں مگر حق حق ہوتا ہے۔ تم نے دیکھا وہ لوگ کس طرح تمہاری جائیداد پہ عیش کر رہے ہیں۔ تمہیں ان سے اپنا حصہ مانگنا چاہیے۔"

"رہنے دیں' مجھے کچھ نہیں چاہیے۔" وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی' ہمایوں شانے اچکا کر ڈرائیو کرنے لگا۔

وہ ہمایوں کو کیسے بتاتی کہ اس کے لیے وہ اپنا حق بہت پہلے ہی چھوڑ چکی ہے۔ اگر فرشتے نے چھپایا تو اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوگی۔

وہ اندر سے ایک دم ہی بہت افسردہ ہو گئی تھی۔ سو بیگ میں رکھا ہوا قرآن نکالا جس کے سفید کور پہ "م" لکھا تھا۔

میں نے یہ ادھر کیوں لکھا ہے؟ وہ ہر دفعہ قرآن کھولتے ہوئے "م" پڑھ کر سوچتی اور کچھ یاد نہ آنے پہ شانے اچکا کر آگے پڑھنے لگتی۔

اس نے صبح کی تلاوت پہ لگائے گئے بک مارک سے کھولا۔ سب سے اوپر لکھا تھا۔

"اور اس نے عطا کیا تم کو ہر اس چیز سے جو تم نے اس سے مانگی تھی۔ اور اگر تم شمار کرو اللہ کی نعمت کو' اسے تم شمار نہیں کر سکتے۔" بے اختیار اس کے لبوں پہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

"کیوں مسکرا رہی ہو؟" وہ ڈرائیو کرتے ہوئے حیران ہوا تھا۔

"نہیں' کچھ نہیں۔" اس کے دل کی تسلی ہو گئی تھی' سو قرآن بند کر کے رکھنے لگی۔ اسے واقعی ہر وہ چیز مل گئی تھی جو کبھی اس نے مانگی تھی۔

"بتاؤ نا۔"

"اصل میں میرے لیے بڑی پیاری آیت اتاری تھی اللہ تعالیٰ نے' وہی پڑھ کر ان پہ بہت پیار آیا تھا۔" وہ سر جھٹک کر ہنس دیا۔

"ہنسے کیوں؟"

"تم آر محمل! اٹس آل ان یور مائنڈ!"

"کیا؟" وہ حیران ہوئی اور الجھی بھی۔

"محمل! وہ آیت تمہارے لیے نہیں تھی' یہ الہامی کتاب ہے' اوکے؟ اتنا casually ٹریٹ مت کیا کرو اسے۔ یہ قرآن پاک ہے۔ اس میں نماز روزے کے احکام ہیں۔ اٹس ناٹ اباؤٹ یو۔" اس نے موڑ کاٹا۔ سڑک شاہراہ رات کے اس پہر سنسان پڑی تھی۔

وہ سکتے کے عالم میں اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

"تم دیکھو محمل! ایک ہی تصویر کو ہر شخص اپنے زاویے سے دیکھتا ہے۔ مثلاً" نقاد اس کی خامی ڈھونڈے گا' شاعر اس کے حسن میں کھوئے گا' سائنس دان کسی اور طرح سے اسے دیکھے گا۔ اٹس آل ان یور مائنڈ۔"

"نہیں ہمایوں! قرآن میں وہی لکھا ہے جو میں ۔۔۔ وہی ہوتا ہے۔"

"اس لیے کہ تم وہی پڑھنا چاہتی ہو۔ تمہیں ہر چیز اپنے سے ریلیٹڈ لگتی ہے کیونکہ تم اسے خود سے ریلیٹ کرنا چاہتی ہو۔ محمل! یہ سب تمہارے ذہن میں ہے' یہ الہامی کتاب ہے' اس میں تمہارا ذکر نہیں ہے۔ ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ۔"

دفعتاً" اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ اس نے ڈیش بورڈ پہ رکھا موبائل اٹھایا' چمکتی اسکرین پہ نمبر دیکھا اور پھر بٹن دبا کر کان سے لگا لیا۔

"جی رانا صاحب۔۔۔" وہ محو گفتگو تھا۔

محمل نے گم صم سی نگاہ گود میں سوئے تیمور پہ ڈالی اور پھر ہاتھوں میں پکڑے قرآن کو دیکھا جس کو وہ ابھی بیگ میں رکھنے ہی لگی تھی۔ اسے لگا ہمایوں کی بات نے اس کی جان نکال لی تھی' روح کھینچ لی تھی۔ وہ لمحے بھر میں کھوکھلی ہو گئی۔ اس کا دل کھوکھلا ہو گیا' خیال کھوکھلا ہو گیا۔ امید کھوکھلی ہو گئی۔

تو کیا اتنا عرصہ وہ یہ سب تصور کرتی آئی تھی؟ وہ وہی پڑھتی تھی جو وہ پڑھنا چاہتی تھی؟ اسے وہی دکھائی دیتا جو اس کی خواہش ہوتی؟ وہ ہر چیز کا من چاہا مطلب نکالتی تھی؟

اس کا دل جیسے پاتال میں گر آگیا۔ ہمایوں ابھی تک فون پہ مصروف تھا مگر اسے اس کی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ سب آوازیں جیسے بند ہو گئی تھیں۔ وہ گم صم سی ہاتھوں میں پکڑے قرآن کو دیکھے گئی' پھر درمیان سے کھول دیا۔ دو صفحے سامنے روشن ہو گئے۔

پہلے صفحے کے وسط میں لکھا تھا۔

"بے شک اس (قرآن) میں ذکر ہے تمہارا۔۔۔"

اس سے آگے پڑھا ہی نہ گیا۔ وہ جیسے پھر سے جی اٹھی تھی۔

ساری اداسی' ویرانی ہوا ہو گئی۔ دل پھر سے منور ہو گیا۔ اب اسے کسی کا نظریہ یا رائے خود پہ مسلط نہیں کرنا تھی۔ اسے اس کا جواب نظر آگیا تھا۔ دلیل مل گئی تھی۔

مسکراہٹ لبوں پہ بکھیرے اس نے احتیاط سے قرآن پاک سنبھال کر واپس بیگ میں رکھا اور زپ بند کی' پھر سر سیٹ کی پشت سے ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

اسے ہمایوں سے کوئی بحث نہیں کرنا تھی۔ اسے کچھ نہیں سمجھانا تھا۔ وہ اسے سمجھا ہی نہیں سکتی تھی کہ اکثر لوگ نہیں جانتے' نہیں مانتے۔

☆ ☆ ☆

صبح نئی سی اتری تھی۔ چڑیاں چہچہاتے ہوئے اپنی منزلوں کی طرف اڑ رہی تھیں۔ رات بارش کھل کے برسی تھی' سو سڑک ابھی تک نم تھی۔ سیاہ بادل اب نیلی چادر سے قدرے سرک گئے تھے اور موسم خاصا خوشگوار ہو گیا تھا۔

وہ گیٹ پار کر کے باہر نکلی تو درختوں کی باڑ کے ساتھ کاشف سائیکل دوڑاتا آ رہا تھا۔ وہ تیمور کی پرام دھکیلتی سڑک پہ آگے بڑھنے لگی۔ اس کا رخ کاشف کی طرف تھا۔

"محمل باجی! السلام علیکم۔" کاشف اسے دیکھ کر چہک اٹھا۔ تیزی سے سائیکل بھگاتا اس تک آیا۔ وہ کالونی کے ان بچوں میں سے تھا جنہیں شام کو محمل

اپنے گھر جمع کر کے ناظرہ پڑھاتی تھی۔

"وعلیکم السلام۔ صبح ہی صبح کدھر جا رہے ہو کاشف؟" وہ رک گئی تھی۔

"ہمارے اسکول کی چھٹیاں ہو گئی ہیں نا تو صبح فارغ ہوتا ہوں۔" اس نے اپنی الٹی پی کیپ سیدھی کی۔ اب وہ سائیکل روک کر اس کے ساتھ کھڑا تھا۔

"حنان اور راحم وغیرہ کی بھی؟"

"جی باجی' سب کا آف ہو گیا ہے۔"

"تو پھر یوں نہیں کریں کہ آئندہ فجر کے بعد کلاس رکھ لیں؟"

"باجی! میں تو آجاؤں گا مگر راحم وغیرہ..." اس نے متذبذب سے اپنے ہمسائے کا نام لیا۔

"وہ نہیں آئیں گے؟"

"آپ ان سے خود ہی پوچھ لیجیے گا۔"

کاشف بائیک دوڑاتا دور نکل گیا۔

اس کا ارادہ سامنے مدرسہ جانے کا تھا' مگر پھر نکڑ پہ چھلی والا نظر آگیا۔

بارش کے بعد کا ٹھنڈا سہانا موسم اور بھنے ہوئے دانے۔ وہ رہ نہ سکی اور پرام دھکیلتی نکڑ پہ کھڑی ریڑھی کی طرف بڑھ گئی۔

سڑک سنسان پڑی تھی۔ چھلی والا بھی خاموشی سے سر جھکائے ریت گرم کر رہا تھا۔ وہ پرام دھکیلتی آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہی تھی۔ اسے یاد آیا اس نے آج صبح کی دعائیں نہیں پڑھی تھیں' حالانکہ وہ روز پابندی سے صبح و شام کی دعائیں پڑھتی تھی' مگر آج جانے کیسے رہ گئیں۔ وہ ہولے ہولے تسبیح پڑھنے لگی۔ تب ہی فاصلہ سمٹ گیا اور وہ ریڑھی کے پاس آن پہنچی تو دھیان بٹ گیا۔

"ایک چھلی بنا دو' اور ساتھ میں پانچ روپے کے دانے بھی اور مسالہ بھی ذرا زیادہ ہو۔" اس کی تسبیح ادھوری رہ گئی' بوڑھا چھلی والا سر ہلا کر چھلی بھوننے لگا۔ وہ محویت سے اسے بھونتے دیکھنے لگی۔

ذہن کے کسی گوشے میں اس روز آرزو کی کہی گئی باتیں گونجنے لگیں۔ وہ بار بار انہیں ذہن سے جھٹکنا چاہتی مگر یونہی ایک دھڑکا سا دل کو لگ گیا تھا۔ بس ایسے ہی اس کا دل گھبرا سا جاتا۔ وہ نیند میں ڈر جاتی۔ جانے کیا بات تھی۔

"دس روپے ہوئے بی بی۔"

بوڑھے شخص کی آواز پہ وہ چونکی' پھر سر جھٹک کر ہاتھ میں پکڑا پاؤچ کھولا۔ اندر پیسے اور چند کاغذ' بل وغیرہ رکھے تھے۔ اس نے دس کا نوٹ نکالنا چاہا تو ایک کاغذ' جو نوٹ کے اوپر اڑس کر رکھا گیا تھا' اڑ کر دور سڑک پہ جا گرا۔

"اوہ' ایک منٹ۔" وہ دس کا نوٹ اس کے ہاتھ پہ رکھ کر' تیمور کی پرام وہیں چھوڑے' دوڑتی ہوئی گئی جہاں سڑک کے وسط میں وہ مڑا تڑا سا کاغذ پڑا تھا۔ اس نے جھک کر کاغذ اٹھایا اور اسے کھول کر پڑھا' پھر تحریر دیکھ کر مسکرا دی۔ اگلے ہی پل سامنے سڑک سے کسی گاڑی [illegible] سے آتی گاڑی کی آواز آئی۔ [illegible] گاڑی تیزی سے اس کی طرف بڑھی تھی۔ [illegible] چاہتی تھی' مگر موقع نہ ملا۔

تیز ہارن کی آواز تھی اور کوئی چیخ رہا تھا۔ اس کے ذہن حرکت کرنے سے انکاری تھے۔ اس نے گاڑی کو خود سے ٹکراتے دیکھا' پھر اس نے خود کو پورے قد سے گرتے دیکھا' شور تھا... بہت شور' اس نے اپنی چیخیں سنیں... اپنے سر سے نکل کر سڑک پر گرتا خون دیکھا' بہتا ہوا لال خون' بے حد لال۔

اس کی کلائی وہیں اس کے چہرے کے ساتھ بے دم سی گر گئی' اس نے ہاتھ کھول دیا۔ مڑا تڑا سا کاغذ نکل کر سڑک پہ لڑھک گیا۔ اس نے اردگرد لوگوں کو اکٹھے ہوتے دیکھا۔ کہیں دور کوئی بچہ رو رہا تھا۔ بہت اونچا اونچا حلق پھاڑ کر۔ دور... بہت دور...

جو آخری بات اس کے ڈوبتے ذہن نے سوچی تھی' وہ یہ تھی کہ آج اس نے صبح کی دعائیں نہیں پڑھی تھیں۔

اس کا ذہن گھپ اندھیرے میں ڈوب چکا تھا۔ تاریکی۔۔۔ سیاہ کالی مہیب سی تاریکی، بنا رنگ کے، بنا شور کے، خاموش سی تاریکی۔ اندھیرے پہ اندھیرا، پردے پہ پردہ۔

اس کا ذہن زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو چکا تھا۔ پانی پہ بہہ رہا تھا۔ بادلوں پہ تیر رہا تھا۔

زمین اور آسمان کے درمیان، نہ اوپر، نہ نیچے، ہوا کے بیچ کہیں معلق، کہیں درمیان میں، کسی تیرتے بادل پہ۔

پھر آہستہ آہستہ تیرتے بادل کو قرار آیا۔ ذرا سا جھٹکا لگا اور بادل کسی بلبلے کی طرح پھٹ کر ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ اور ہر طرف روشنی بھرتی گئی تیز، پیلی روشنی۔

اس نے ہولے سے آنکھیں کھولیں۔ دھندلا سا ایک منظر سامنے تھا۔ سفید دیواریں، سفید چھت، چھت سے لٹکا پنکھا، اس کے تین پر تھے، ہولے ہولے وہ ایک دائرے میں گھوم رہے تھے۔ دائرے، دائرے۔۔۔ بار بار دائرے۔

وہ کتنی ہی دیر یک ٹک چھت کو دیکھتی رہی۔ وہ کون تھی؟ کدھر تھی؟ کیوں تھی؟ وہ خالی خالی نگاہوں سے چھت کو تکتی رہی۔ پھر ذرا اِدھر اُدھر دیکھنا چاہا۔

اِدھر اُدھر سفید دیواریں تھیں۔ قریب ہی ایک کاؤچ رکھا تھا۔ تپائی پہ سوتے پودوں کا گلدستہ سجا تھا۔ اس نے کہنیوں کے بل اٹھنا چاہا، مگر جسم جیسے بے جان سا ہو گیا تھا یا شاید وہ بے حد تھک چکی تھی۔ اس نے کوشش ترک کر دی اور اپنے بازوؤں کو دیکھا جن میں بے شمار نالیاں سی پیوست تھیں۔ ہر نالی کسی نہ کسی مشین کے سرے پہ جا رکتی تھی۔ وہ شاید اسپتال کا کمرہ تھا اور وہ خود شاید۔۔۔ شاید "محمل ابراہیم" تھی۔

خود کو کیسے بھولا جا سکتا ہے بھلا؟ آہستہ آہستہ ساری یادداشتیں ذہن کے ہر گوشے سے ابھرنے لگیں۔ ایک ایک بات، ایک ایک چہرہ اسے یاد آتا گیا۔

تھک کر اس نے آنکھیں موند لیں۔ آخری بات بھلا کیا ہوئی تھی؟ کس چیز نے اسے اِدھر اسپتال پہنچایا؟ شاید کوئی ایکسیڈنٹ؟ اور اسے دھیرے دھیرے یاد آتا گیا۔۔۔ [illegible] تھی۔ اس کے ساتھ [illegible] تھا۔ وہ نظروں سے اوجھل ہی ہوا تھا کہ وہ ریڑھی والے کے پاس چلی گئی۔ پھر۔۔۔ پھر کیا ہوا تھا۔ اسے ٹکر لگی تھی۔ خون۔ بکھرے کاغذ، روتا بچہ۔

"بچہ؟" اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ پھر اِدھر اُدھر دیکھا۔ کمرہ خالی تھا۔ وہ اِدھر اکیلی تھی۔ مگر وہ روتا بچہ۔۔۔ وہ آواز جو اسے آخری پل تک سنائی دی تھی؟ تیمور۔۔۔ تیمور رو رہا تھا۔ ہاں اسے یاد تھا کہ [illegible] تیمور؟

اس نے متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا، اسی پل دروازہ کھلا۔

سفید یونیفارم میں ملبوس نرس اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی۔ وہ تیز تیز قدم [illegible] کر وہ اس کے قریب آئی۔ تب ہی کھلے دروازے سے ایک بچہ نظر آیا۔"

چھ سات برس کا خوب صورت سا بچہ، شاید کاشف کا ہمسایہ راحم تھا۔ ہاں وہ راحم ہی تھا یا شاید راحم کا چھوٹا بھائی، وہ فیصلہ نہ کر پائی۔

"آر یو آل رائٹ؟" نرس نے آہستہ سے اس کے ہاتھ کو چھوا، پھر حیرت سے پوچھا۔ [illegible] بچے کا چہرہ دیکھتی رہی، جو عجیب انداز سے اسے دیکھ رہا تھا۔ یہ شاید وہ لڑکا تھا جس کو وہ شام میں ناظرہ پڑھاتی تھی۔

"ہم آپ کی سسٹر کو بلاتے ہیں ابھی۔" نرس خوش دلی سے چہکتی باہر کو گئی۔ وہ ابھی تک بچے کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی، جن میں عجیب سی کوفت تھی اور ننھی پیشانی پہ ذرا سے بل، وہ اس کو عجیب متنفر سی نگاہوں سے دیکھتا کاؤچ پہ آ بیٹھا اور کہنیاں گھٹنوں پہ رکھ کر دونوں ہتھیلیوں میں چہرہ گرا دیا۔

ابھی تک اسی طرح اسے دیکھ رہی تھی۔

"راحم!" اس نے پکارا تو اسے اپنی آواز بہت دور سے آتی سنائی دی۔ بچہ اسی طرح دیکھتا رہا۔

"راحم!" اس نے پھر آواز دی۔ وہ بمشکل بول پا رہی تھی۔

"میں سنی ہوں۔" پھر لمحے بھر کو رک کر عجیب سے لہجے میں بولا۔ "آئی ڈونٹ لائیک یو۔ (تم مجھے اچھی نہیں لگتیں)"

"سنی؟" وہ دنگ رہ گئی، اس بچے کو وہ روز ناظرہ پڑھاتی تھی، وہ شاید راحم کا چھوٹا بھائی تھا۔ پھر وہ ایسے بات کیوں کر رہا تھا؟

اسی پل دروازہ زور سے کھلا۔

محمل نے چونک کر دیکھا۔

دروازے میں فرشتے کھڑی تھی۔ سیاہ عبایا پہ سیاہ نقاب چہرے کے گرد لپیٹے وہ بے یقینی سے بستر پہ لیٹی محمل کو دیکھ رہی تھی۔

"فرشتے۔۔۔" وہ اٹھی بلکہ چلا رہ گئی۔ فرشتے تو [illegible] تیزی سے قریب آئی۔

"یا میرے اللہ! محمل!" اس نے بے اختیار اپنے [illegible] بے یقینی سی [illegible] چہرہ [illegible] ہو گیا تھا۔

"محمل!" [illegible] وہ آگے بڑھ کر اس نے [illegible] اس کا چہرہ چھوا۔

"تم مجھے دیکھ سکتی ہو محمل؟ تم مجھے پہچانتی ہو؟ تم سن سکتی ہو؟"

"میں تمہیں کیوں نہیں پہچانوں گی فرشتے؟ تم کب آئیں؟"

"کب؟" فرشتے متعجب نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ "میں تو۔۔۔ کتنا وقت ہو گیا محمل! تم نے۔۔۔ میں نے تم سے اتنی باتیں کیں، تم نے سنا؟"

"کیا؟" وہ الجھ سی گئی۔ "نہیں، میں نے تو کوئی بات نہیں سنی، میں تو۔۔۔" وہ رک رک کر اٹک اٹک کر بول رہی تھی۔ "میں تو صبح ریڑھی والے کے پاس گئی تھی۔ مجھے گاڑی نے ٹکر مار دی، اور، اور تم نے بتایا بھی نہیں کہ تم آ رہی ہو؟"

فرشتے بے یقینی سے پھیلی آنکھوں سے اسے ٹکر ٹکر دیکھ رہی تھی۔ گویا اس کے پاس کہنے کو کچھ بھی نہ ہو۔

"فرشتے! بولو۔" اسے فرشتے کی یہ حیرت و بے یقینی پریشان کر رہی تھی، کہیں کچھ غلط تھا۔

"محمل تم۔۔۔" وہ کچھ کہتے کہتے پھر رک گئی، جیسے سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ کیا کہے۔

"یو اینڈ یور اوور ایکٹنگ! ہونہہ۔" وہ بچہ [illegible] بے زاری کہہ اٹھا تھا۔ فرشتے نے چونک کر اسے دیکھا۔

سیاہ حجاب میں دمکتے فرشتے کے چہرے پہ ہلکی سی ناگواری ابھری۔

"سنی پلیز بیٹا! جاؤ یہاں سے، مجھے بات کرنے دو۔"

"میں کیوں جاؤں؟ میری مرضی، آپ دونوں چلی جائیں۔"

"فرشتے! یہ کون ہے؟ کیوں ضد کر رہا ہے؟" وہ اٹھ کر پوچھ رہی تھی، مگر فرشتے دوسری طرف متوجہ تھی۔

"آئی ڈونٹ وانٹ ٹو گو۔" وہ بدتمیزی سے چیخا تھا۔

"شٹ اپ تیمور! اینڈ گیٹ آؤٹ، تم دیکھ نہیں رہے میں ماما سے بات کر رہی ہوں۔"

فرشتے کہہ رہی تھی اور اسے لگا کسی نے اس کے اوپر ڈھیروں پتھر لڑھکا دیے ہوں۔

"تم نے۔۔۔ تم نے تیمور کہا فرشتے؟" وہ ساکت رہ گئی تھی۔

"ہاہ! شی از ناٹ مائی مام!" وہ سر جھٹکتا اٹھ کر باہر گیا اور اپنے پیچھے زور سے دروازہ بند کیا۔

"تم نے تیمور کہا؟ نہیں، یہ تیمور۔۔۔ نہیں۔۔۔ میرا تیمور کہاں ہے؟" اس کا دل بند ہو رہا ہے، کہیں کچھ غلط تھا، کہیں کچھ بہت غلط تھا۔

فرشتے نے آہستہ سے گردن اس کی طرف موڑی۔

اس کی سنہری آنکھوں میں گلابی سی نمی ابھر آئی تھی۔
"محمل! تمہیں کچھ یاد نہیں؟"
"کیا۔ کیا یاد نہیں؟ میرا بچہ کہاں ہے؟" وہ گھٹی گھٹی سی سسک اٹھی۔ کچھ تھا جو اس کا دل ہولا رہا تھا۔
"محمل۔" اس کی آنکھوں سے آنسو نکل کر گال پہ لڑھکنے لگے، بے اختیار اس نے محمل کے ہاتھ تھام لیے۔ "تمہارا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔"
"فرشتے میں پوچھ رہی ہوں کہ میرا بیٹا کہاں ہے؟"
"تمہارے سر پہ چوٹ آئی تھی، تمہارا اسپائنل کارڈ ڈیمج ہوا تھا۔"
"فرشتے! میرا بچہ۔" اس کی آواز ٹوٹ گئی۔ وہ بے قراری سے فرشتے کی بھیگی آنکھوں کو دیکھ رہی تھی۔
"محمل۔ محمل! تم بے ہوش ہو گئی تھیں، تم کوما میں چلی گئی تھیں۔"
"مجھے پتا ہے، صبح میرا ایکسیڈنٹ۔"
"وہ صبح نہیں تھا۔ وہ سات سال پہلے تھا۔"
وہ سکتے کے عالم میں اسے دیکھتی رہ گئی۔
"وقت۔ سات سال آگے بڑھ گیا ہے۔ تمہیں کچھ یاد نہیں؟ وہ ساری باتیں جو میں اتنے برس تم سے کہتی رہی؟ وہ دن، وہ راتیں جو میں نے ادھر تمہارے ساتھ گزاریں، تمہیں کچھ یاد نہیں؟"
وہ پتھر کا بت بن گئی تھی۔ فرشتے کو لگا وہ اس کی بات نہیں سن رہی۔
"ڈاکٹرز کہتے تھے۔ تم کبھی بھی ہوش میں آ سکتی ہو۔ ہم نے بہت ویٹ کیا تمہارا محمل، بہت زیادہ۔"
آنسو متواتر اس کے دمکتے چہرے پہ گر رہے تھے۔
وہ گم صم سی اسے دیکھے گئی۔ گویا وہ وہاں تھی ہی نہیں۔
"میں نے تمہارے اٹھ جانے کی بہت دعائیں کیں محمل! میں نے اپنا پی ایچ ڈی بھی چھوڑ دیا، تمہارے ایکسیڈنٹ کے دوسرے مہینے میں آ گئی تھی، دو ماہ رہی، پھر واپس گئی مگر دل ہی نہیں لگ سکا۔ میں پڑھ ہی نہیں سکی، پھر میں نے سب پڑھائی چھوڑ دی اور تمہارے پاس آ گئی۔ اتنے برس محمل، اتنے

برس گزر گئے، تمہیں کچھ بھی یاد نہیں؟ محمل۔"
فرشتے نے ہولے سے اس پتھر کے مجسمے کا شانہ ہلایا۔ وہ ذرا سی چونکی، پھر اس کے لب کپکپائے۔
"میرا۔ میرا تیمور؟"
"یہ تیمور تھا، ناسی ہم اسے تنی کہتے ہیں۔"
مگر وہ کیسے مانتی؟ وہ جسے کوئی [illegible] کا بچہ سمجھی تھی، وہ اس کا اپنا بچہ تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا؟ اسے تو لگ رہا تھا کہ وہ بس ایک دن کے لیے سوئی ہے یا پھر شاید دن کا ایک حصہ۔ پھر صدیاں کیسے بیت گئیں؟ اسے کیوں نہیں پتا چلا؟ اور تیمور۔ نہیں۔
اسے کاٹ میں لیٹا اپنا نومولود بچہ یاد آیا۔
"فرشتے، وہ میرا بچہ۔ [illegible]" اس نے بے یقینی سے آنکھیں موند کر کھولیں۔ "وہ اتنا بدل گیا ہے؟"
"بہت کچھ بدل گیا ہے محمل، [illegible] وقت بدل جاتا ہے۔ وقت [illegible] جاتا ہے۔"
"ہمایوں؟" اس کے لب پھر پھڑپھڑائے۔ "ہمایوں کہاں ہے؟"
"[illegible] کرتا تھا۔ مگر۔" وہ لمحے بھر کو [illegible]۔ "وہ میٹنگ میں تھا، رات تک آئے گا۔"
"نہیں فرشتے، تم اس کو بلاؤ، پلیز بلاؤ، اس سے کہو محمل جاگ گئی ہے۔ محمل اس کا انتظار کر رہی ہے۔ [illegible] میرے ایک فون پہ بھی دوڑا آتا تھا۔"
"وہ سات سال پہلے کی بات تھی محمل! وقت کے ساتھ یہاں بہت کچھ بدلتا ہے، لوگ بھی بدل جاتے ہیں۔"
"وہ کیوں نہیں آیا؟" وہ کھوئی کھوئی سی بولی تھی۔ عجیب بے یقینی سی، بے یقینی تھی۔
"محمل! پریشان مت ہو۔ پلیز ریلیکس۔"
وقت ہمایوں کو نہیں بدل سکتا۔ میرا ہمایوں ایسا نہیں ہے، میرا تیمور ایسا نہیں ہے۔
وہ ہذیانی انداز سے چلائی۔ اتنی بے یقینی تھی کہ اسے رونا بھی نہیں آ رہا تھا۔

فرشتے تاسف سے اسے دیکھتی رہی۔ ابھی اسے سنبھلنے میں وقت لگے گا، وہ جانتی تھی۔

☆ ☆ ☆

فرشتے چلی گئی اور وہ منہ پہ چادر ڈالے آنکھیں موندے لیٹی رہی۔ اسے یقین نہ تھا کہ فرشتے نے اس سے سچ بولا ہے، اسے لگ رہا تھا کہ یہ سب ایک بھیانک خواب ہے اور ابھی وہ آنکھ کھولے گی تو وہ خواب ٹوٹ جائے گا۔
پھر اس نے آنکھ ہی نہ کھولی، اسے ڈر تھا کہ اگر خواب نہ ٹوٹا تو وہ ٹوٹ جائے گی۔
جانے کتنا وقت گزرا، وہ لمحوں کا حساب نہ رکھ پائی۔ اور اب کون سے حساب باقی رہ گئے تھے؟
دروازے پہ ہولے سے دستک ہوئی۔ اس نے لمحے بھر کو آنکھیں کھولیں۔ ہولے سے چہرے پہ پڑی چادر سرکی [illegible]
[illegible] دروازے سے [illegible] کھڑا تھا۔
[illegible]
لمبے سائن [illegible] اور شان [illegible] جذبات سے عاری چہرہ اس پر چھائی سنجیدگی، نہیں وہ شاید ویسا نہیں رہا تھا۔
وہ آہستہ سے قدم اٹھاتا بیڈ کے قریب آیا اور پائنتی کے ساتھ رک گیا۔
"ہمایوں!" تڑپ کر رہ گئی۔ بے اختیار آنکھوں سے آنسو [illegible]۔
"ہوں، کیسی ہو؟" وہ پائنتی کے قریب کھڑا رہا، اس سے آگے نہیں بڑھا، آواز میں بھی عجیب سرد مہری تھی۔
"ہمایوں!" وہ رونے لگی تھی۔ "یہ سب کیا ہے؟ یہ کہتے ہیں کہ اتنے سال گزر گئے، میری نیند اتنی لمبی کیسے ہو گئی؟"
"معلوم نہیں۔ ڈاکٹرز کب تمہیں ڈسچارج کریں گے؟" وہ کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھ رہا تھا۔ جیسے جانے کی جلدی ہو، اس کے لہجے میں کوئی ناراضی کا عنصر نہ

تھی، بلکہ بہت ہموار لہجہ تھا۔ لیکن شاید ان کے درمیان کچھ بھی باقی نہ رہا تھا۔
"میں ٹھیک ہو جاؤں گی نا ہمایوں؟" جیسے وہ تسلی کے دو بول سننا چاہتی تھی۔
"ہوں۔" وہ اب جیبوں میں ہاتھ ڈالے تنقیدی نظروں سے اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔
یہ سب کیا ہو رہا تھا اس کے ساتھ؟ ہمایوں۔ اور تیمور۔ وہ اس کے ساتھ یوں کیوں کر رہے تھے؟
"ہمایوں۔ مجھ سے بات تو کریں۔"
"ہاں کہو، میں سن رہا ہوں۔" وہ متوجہ ہوا، لمحے بھر کو نگاہ اس پہ جھکائی۔
اس کے آنسو تھم گئے۔ وہ بالکل چپ ہو کر رہ گئی۔
یہ تو محبت کی نگاہ نہ تھی، یہ تو خیرات تھی، بھیک تھی۔
وہ چند لمحے منتظر سا اسے دیکھتا رہا، پھر واپس جانے کو مڑا۔
اسی پل دروازے میں فرشتے کا سراپا ابھرا۔ وہ ہاتھ میں فروٹ باسکٹ پکڑے تیزی سے اندر آ رہی تھی۔
ہمایوں اس کے [illegible]
فرشتے نے پلٹ کر اسے جاتے دیکھا۔
"ہمایوں ابھی تو آیا تھا؟ چلا بھی گیا! کیا کہہ رہا تھا؟" اچنبھے سے کہتے ہوئے اس نے گردن اس کی جانب موڑی۔ محمل کے چہرے پہ کچھ تھا کہ وہ لمحے بھر کو چپ سی ہو گئی۔
"فکر مت کرو، وہ ہر کسی سے [illegible] کرتا ہے۔" وہ ماحول کو خوشگوار کرنے کے لیے آگے بڑھی اور فروٹ باسکٹ سائیڈ ٹیبل پہ رکھی۔
"مگر میں کسی تو نہیں تھی فرشتے۔" وہ ابھی تک نم آنکھوں سے کھلے دروازے کو دیکھ رہی تھی۔
"ٹھیک ہو جائے گا سب کچھ، تم کیوں فکر کرتی ہو؟"
"مگر وہ مجھ سے بات کیوں نہیں کر رہا تھا؟" اس کی آنکھیں پھر سے ڈبڈبائیں۔
"محمل دیکھو، اس تبدیلی نے وقت لیا ہے تو اس کو ٹھیک ہونے میں بھی وقت لگے گا۔ تم اس کو کچھ وقت

دو۔" وہ اس کے ریشمی بھورے بال نرمی سے ہاتھ میں پکڑے برش کر رہی تھی۔

وقت' وقت' وقت..... وہ ایک ہی تکرار ہر جگہ دہرائی جا رہی تھی۔ اس وقت نے کیا کچھ بدل دیا تھا' اسے اس کا اندازہ آہستہ آہستہ ہو رہا تھا۔

وہ اپنے نچلے دھڑ کو حرکت نہیں دے سکتی تھی' وہ اپنے پاؤں نہیں ہلا سکتی تھی۔ اٹھ کر بیٹھ نہیں سکتی تھی۔ خود کھانا نہیں کھا سکتی تھی۔ اپنے پاؤں پہ کھڑی ہونے کے قابل نہیں رہی تھی۔ یہ سب کیا ہو گیا تھا۔

"اس دن' اس دن جب میں گھر سے نکلی تھی تو میں نے صبح کی دعائیں نہیں پڑھی تھیں۔ یہ سب اسی لیے ہوا ہے فرشتے کہ میں دعا پڑھے بغیر گھر سے نکلی تھی' ہے نا۔" وہ نرمی سے اس کے بال سنوار رہی تھی' جب وہ بھیگی آنکھوں اور رندھے گلے سے کہنے لگی۔ فرشتے نے گہری سانس لی' کہا کچھ نہیں۔

"نہ تھا کہ اس کو اللہ سے کام آتا کچھ بھی' مگر ایک حاجت تھی یعقوب علیہ السلام کے دل میں' تو اس نے اسے پورا کیا۔" بہت دھیرے سے اس کے دل میں کسی نے سرگوشی کی تھی۔ وہ یکلخت چونک سی گئی۔

"نہ تھا کہ اس کو اللہ سے کام آتا کچھ بھی' مگر ایک حاجت تھی یعقوب علیہ السلام کے دل میں' تو اس نے اسے پورا کیا۔"

اس نے سننے کی کوشش کی۔ کوئی اس کے اندر مسلسل یہ الفاظ دہرا رہا تھا۔ دھیمی' مدھر آواز' ترنم اور سوز سے پر۔ اس کا دل دھڑکنا بھول گیا۔ وہ ایک دم سناٹے میں آ گئی۔

یہ الفاظ' یہ بات' یہ سب بہت جانا پہچانا تھا۔ شاید یہ ایک آیت تھی۔

ہاں' یہ آیت تھی' سورۃ یوسف' تیرہواں سپارہ' جب یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو غالبا" نظر بد سے بچاؤ کے لیے احتیاطا" شہر کے مختلف دروازوں سے داخل ہونے کی تاکید کی تھی' تو اس پہ اللہ تعالیٰ نے جیسے تبصرہ کیا تھا کہ ان بھائیوں کو اگر اللہ کی مرضی نہ ہوتی تو پھر اللہ کے فیصلے سے کوئی بھی نہ بچا پاتا' مگر وہ احتیاط تو یعقوب علیہ السلام کے دل کی ایک حاجت تھی تو یعقوب علیہ السلام نے اسے پورا کیا۔

ایک خاموش لمحے میں اس پہ کچھ آشکار ہوا تھا۔ جو ہوا تھا' اسے ایسے ہی ہونا تھا۔ وہ جو کر لیتی' یہ اللہ کی مرضی تھی' ہو کر رہی تھی' یہ اس کی تقدیر تھی' شاید اس کی دعاؤں نے اسے کسی بڑے نقصان سے بچا لیا ہو' مگر کیا اس سے بھی کوئی بڑا نقصان ہو سکتا تھا؟ کوما' معذوری' بیزار شوہر' بدکتا ہوا بچہ۔ اب کیا رہ گیا تھا زندگی میں۔

"کتنا کم تم شکر ادا کرتے ہو!"

کسی نے پھر اس کو ذرا خفگی سے مخاطب کیا تھا۔ وہ پھر سے چونکی اور قدرے مضطرب ہوئی۔ یہ کون اسے بار بار اندر ہی اندر مخاطب کرتا تھا؟ یہ کون تھا؟

"فرشتے' پلیز مجھے کچھ دیر کے لیے' پلیز مجھے اکیلا چھوڑ دو۔" وہ بہت بے بسی سے بولی تو فرشتے جو اس کے بالوں میں برش کر رہی تھی' رک گئی' پھر اس نے جیسے سمجھ کر سر ہلا دیا۔

"او کے۔" اس نے برش سائیڈ پہ رکھا اور اٹھ کر باہر نکل گئی۔

"ہم نے بسایا تم کو زمین میں اور ہم نے تمہارے لیے اس میں زندگی کے سامان بنائے' کتنا کم تم شکر ادا کرتے ہو۔" (سورۃ اعراف)

کوئی اس کے اندر ہی اندر اسے جھنجوڑ رہا تھا' پکار رہا تھا۔ اس کے اندر باہر اتنا شور تھا کہ وہ سن نہ پا رہی تھی' سمجھ نہ پا رہی تھی' فرشتے گئی تو اس نے آنکھیں موند لیں۔

اب اس کے ہر سو اندھیرا اتر آیا' خاموشی اور تنہائی۔ اس نے غور سے سننا چاہا' چند ملی جلی آوازیں بار بار گونج رہی تھیں۔

"ہم تم میں سے ہر ایک کو آزمائیں گے' شر کے ساتھ اور خیر کے ساتھ۔"

"کہہ دو' بے شک میری نماز اور میری قربانی' اور میرا جینا اور میرا مرنا' سب اللہ ہی کے لیے ہے' جو رب ہے تمام جہانوں کا۔"

اس کے ذہن میں جیسے جھماکا سا ہوا' ایک دم اندر باہر روشنی بکھر گئی' اس نے جھٹکے سے آنکھیں کھولیں۔

"میرا قرآن... میرا کلام پاک' میرا مصحف۔"

وہ کبھی قرآن کے بغیر گھر سے نہیں نکلتی تھی۔ اس روز بھی وہ اس کے ہاتھ میں تھا۔ بلکہ بیگ میں رکھا تھا۔ جب وہ ایکسیڈنٹ کے بعد ادھر لائی گئی ہو گی تو یقینا" وہ بھی ساتھ آیا ہو گا' پھر اسے ادھر ہونا چاہیے۔

مگر سات سال' اسے یاد آیا' وہ سات سال درمیان میں آ گئے تھے۔ ان کے پیچھے تو ہر شے گویا دھول میں گم ہو گئی تھی۔ "[illegible]"

اس نے تھک کر آنکھیں موند لیں۔ یہ ایک عجیب سی بات تھی' جس پہ اسے یقین ہی نہیں آتا تھا۔ وہ جتنا سوچتی اور الجھتی جاتی۔

تب ہی دروازہ ہولے سے کھلا' اس نے چونک کر [illegible] آنکھیں کھولیں۔

تیمور دروازے میں ایستادہ تھا' جینز شرٹ پہنے' اس کے بھورے بال ماتھے پہ کٹ کر گر رہے تھے۔ اس کی ناک بالکل ہمایوں کی طرح تھی' کھڑی' مغرور ناک اور آنکھیں محمل کی سی' سنہری چمکتے کانچ جیسی۔ اور ماتھے کے وہ بل' وہ جانے کس جیسے تھے!

"تیمور۔" اس کو دیکھ کر محمل کی آنکھیں جگمگا اٹھی تھیں۔ وہ اس کا بیٹا تھا۔ اس کا تیمور تھا۔

"ادھر آؤ بیٹا۔"

"ویئر از مائی ڈیڈ؟" (میرے ڈیڈ کہاں ہیں؟) وہ اسی تنفر سے کھنچتے ہوئے انداز میں بولا تھا۔ منہ پھٹ' اکھڑ' بدتمیز' اگر وہ اس کی ماں نہ ہوتی تو یہ تین الفاظ اس کے ذہن میں اس کے متعلق فورا" ابھرتے۔

"وہ ابھی آئے تھے' پھر چلے گئے۔ تم ماما سے نہیں ملو گے؟" اس نے ممتا سے مجبور اپنے بازو پھیلائے۔

"نہیں۔" اس نے باہر نکل کر زور سے دروازہ بند کر دیا۔

وہ سن ہو کر رہ گئی۔ بازو آہستہ سے پہلو میں آن گرے۔

یہ سات سال کا بچہ۔ اس کے دل میں اتنی نفرت' اتنی کڑواہٹ کیسے آ گئی؟ کیا قصور تھا اس کا کہ وہ یوں اس سے متنفر تھا؟ اور صرف اس سے نہیں' بلکہ فرشتے سے بھی۔

بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ اور پھر وہ کب روتے روتے سو گئی اسے پتا بھی نہ چلا۔

☆ ☆ ☆

فزیو تھراپسٹ اسے ایکسرسائز کرانے کی ناکام کوشش کر کے جا چکی تھی۔ وہ اسی طرح دنیا سے بیزار آنکھوں پہ بازو رکھے لیٹی تھی۔ دایاں بازو تو بالکل ٹھیک کام کرتا تھا۔ بایاں البتہ ذرا سا ڈھیلا تھا' مگر امید تھی کہ وہ بھی جلد ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ ٹانگوں کے متعلق کچھ کہنے سے ڈاکٹرز ابھی قاصر تھے۔ کبھی وہ کہتے کہ فزیو تھراپی سے آہستہ آہستہ وہ ٹھیک ہو جائے گی اور بعض اوقات وہ اس سب کا انحصار اس کی اپنی قوت ارادی پہ گردانتے۔ وہ قوت ارادی' جس کو استعمال کرنے کی سعی ابھی وہ نہیں کر پائی تھی۔

ایک دم سے پھولوں کی مہک نتھنوں سے ٹکرائی تو اس نے دھیرے سے بازو ہٹایا اور آنکھیں کھولیں۔ فرشتے بڑا سا مہکتے سرخ گلابوں کا بوکے لیے اندر داخل ہوئی تھی۔ اس کے سیاہ اسکارف میں مقید چہرے پہ وہی مخصوص نرم سی مسکراہٹ تھی۔

"السلام علیکم' کیسی ہو؟ اور یہ فزیو تھراپسٹ کو کیوں تم نے بھگا دیا؟" وہ کانچ کے گلدان میں گلدستہ لگاتے ہوئے بولی تھی۔

"مجھے کسی فزیو کی ضرورت نہیں ہے' میں ٹھیک ہوں' یہ لوگ مجھے گھر کیوں نہیں جانے دے رہے؟"

"میں نے ڈاکٹر سے بات کی ہے' وہ کہہ رہے ہیں کہ تمہیں عنقریب گھر شفٹ کر دیں گے۔" شاید ایک ہفتے تک تم مینٹلی بالکل ٹھیک ہو اور تمہیں مزید اسپتال میں رکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

وہ پھول سیٹ کر کے شاپر سے کچھ اور نکالنے لگی۔

"اور تیمور نہیں آیا؟"

"اسے آنا تھا کیا؟" اس کا دل ڈوب کر ابھرا۔

"ہاں، میں اسے روز ساتھ ہی لاتی ہوں، پتا نہیں، شاید لان میں بیٹھا ہو، ابھی آجائے گا۔" وہ کہہ کر خود ہی شرمندہ ہوئی۔

محمل نے پھر سے چہرے پہ بازو رکھ لیا۔ وہ اب یوں ہی ساری دنیا سے چھپ جانا چاہتی تھی۔

فرشتے روز صبح آتی تھی۔ پھر دوپہر میں چلی جاتی، اور گھنٹے بھر بعد تیمور کو ساتھ لیے آتی۔ وہ باہر ہی پھرتا رہتا، اندر نہ آتا، پھر عصر کے وقت فرشتے چلی جاتی، غالباً اسے مسجد جانا ہوتا تھا، رات کو وہ پھر ایک چکر لگا لیتی۔ چھٹی کے دن وہ تیمور کو صبح سے ہی ساتھ لے آتی اور باقی دنوں میں اس کے اسکول کے باعث دوپہر میں لاتی۔ ہاں رات کو تیمور اس کے ساتھ نہیں آتا تھا۔ اور ہمایوں، وہ تو بس ایک ہی دفعہ آیا تھا۔ پھر اس کے بعد ہمیشہ وہ شاید بزی ہوگا، واللہ اب فرشتے خوب شرمندہ ہو کر دیتی۔

وہ دن میں تین، تین چکر لگاتی گویا تھن چکر بنی رہتی۔ محمل کا چھوٹا بڑا کام کرتی اور نہیں تو اس کے ساتھ بیٹھی تسلی اور پیار کی باتیں کیے رکھتی۔ اب بھی وہ جانے کیا چیز الٹ پلٹ کر رہی تھی۔ محمل کو کھٹ کھٹ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ مگر وہ یوں ہی بیزار سی منہ پہ بازو رکھے لیٹی رہی۔ اور پھر آہستہ سے وہ مترنم آواز پورے کمرے میں گونجنے لگی۔

"سب تعریف اس اللہ کی، وہ ذات جس نے اپنے بندے پہ کتاب اتاری اور اس میں کوئی ٹیڑھ نہیں بنائی۔"

اس نے جھٹکے سے بازو ہٹایا۔

فرشتے ٹیپ ریکارڈر سیٹ کر کے ہاتھ میں پکڑے کیسٹ کور بند کر رہی تھی۔ محمل کی طرف اس کی پشت تھی۔ "درست کرنے والی" (کتاب) تاکہ وہ اپنے پاس موجود سخت عذاب سے ڈرائے، اور خوش خبری دے ان مومنوں کو جو اچھے کام کرتے ہیں کہ بے شک ان کے لیے اچھا اجر ہے۔"

وہ یہ آواز لاکھوں میں پہچان سکتی تھی۔ قاری مشاری کی سورۃ الکہف۔

"وہ رہنے والے ہیں اس میں ہمیشہ ہمیشہ اور ڈرائے ان لوگوں کو جنہوں نے کہا کہ اللہ نے بیٹا بنا لیا ہے۔"

لفظ بوند بوند اس کی سماعت میں اتر رہے تھے۔ آج جمعہ تھا اور وہ ہمیشہ جمعے کو سورۃ کہف پڑھا کرتی تھی۔

"نہ ان کے پاس اس کا کوئی علم ہے اور نہ ہی ان کے آباؤ اجداد کے پاس ہے۔ ان کے منہ سے یہ بہت بڑی بات نکلتی ہے وہ جھوٹ کے سوا کچھ نہیں کہتے۔"

کھٹ سے فرشتے نے اسٹاپ کا بٹن دبایا تو آواز رک گئی۔ اس نے تڑپ کر فرشتے کو دیکھا۔

"لگا میں نا۔ بند کیوں کر دی؟"

"اوہ تم جاگ رہی تھیں۔" وہ چونک کر پلٹی۔ "میں [illegible]

[illegible]

"وہی قاری مشاری کی سورۃ کہف [illegible] ہو سکتا ہے [illegible] آپ کو یاد ہے [illegible] کو کس [illegible] سورۃ کہف شروع [illegible] تھی تو الحمد للہ [illegible]" [illegible]

"تمہارے [illegible] محمل۔" آہستہ سے اس کے قریب [illegible] بیٹھی اور اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

محمل کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ تھا۔

"میں جانتی ہوں تم تیمور اور ہمایوں کی وجہ سے اپ سیٹ ہو۔ بھول جاؤ ان کی [illegible] نا سمجھ ہیں ان کی وجہ سے اپنا [illegible] مت کرو، وقت کے ساتھ ساتھ سمجھ جائیں گے، مگر ایک بات تمہیں ذہن میں بٹھا لینا چاہیے کہ تمہاری زندگی ان پہ انحصار نہیں کرتی، تم ان کے بغیر نہیں مر جاؤ گی، ان کے بغیر جینا سیکھو محمل! خود کو اسٹرانگ کر لو۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے تیزی سے بات کاٹی۔ "ابھی آپ سورۃ کہف [illegible] مجھے سننا ہے۔"

فرشتے ذرا سی حیران ہوئی، پھر گہری سانس لے

اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اچھا، ٹھیک ہے، میں آ جاتی ہوں۔"

"اور میرا قرآن؟"

"ہاں۔ وہ میں کل ڈھونڈ کے لے آؤں گی، ابھی تم یہ سنو، میں تیمور کو ڈھونڈتی ہوں۔" اس نے پلے کا بٹن دبایا اور خود باہر نکل گئی۔

"بس شاید تم ان کے پیچھے اپنے آپ کو ہلاک کرنے والے ہو، اگر وہ اس کلام کے ساتھ ایمان نہ لائے، بہت افسوس کے ساتھ، بے شک جو بھی زمین پہ ہے، ہم نے اسے اس کی خوب صورتی کے لیے بنایا ہے، تاکہ ہم ان لوگوں کو آزمائیں کہ ان میں سے کون سب سے اچھے کام کرتا ہے اور بے شک ہم اس کو بنجر صاف میدان بنانے والے ہیں۔"

اس نے آنکھیں موند لیں۔ آنسو آہستہ آہستہ اس کے تکیے کو بھگونے لگے تھے۔

سورۂ کہف کے ساتھ اسے وہ تمام مناظر یاد آنے لگے جو کبھی اس کی زندگی کا حصہ تھے۔

سنگ مرمر کی چمکتی راہداریاں، روشندانوں سے گھرا ہال، جو اونچے سفید ستونوں پہ کھڑا تھا۔ مسجد کے برآمدے کے سامنے گھاس سے بھرا لان، وہ پنک اسکارف میں لپٹے بہت سے جھکے سر، جو تیزی سے نوٹس لینے میں مصروف ہوتے تھے، بڑی بڑی اونچی گلاس ونڈوز جن سے فیصل مسجد دکھائی دیتی تھی۔ وہ کالونی کی سڑک پہ درختوں کی گھنی باڑ، یادوں کا ایک طویل سلسلہ تھا جو امڈ کر اس کے ذہن میں آیا تھا۔ ڈاکٹرز ٹھیک کہتے تھے وہ ذہنی طور پہ بالکل فٹ تھی۔

سورۂ کہف ختم ہوئی تو کیسٹ رک گئی۔ اس نے بے بسی سے ٹیپ کو دیکھا۔ وہ اس سے خاصے فاصلے پہ تھا۔ وہ اٹھ کر اس کو ری پلے بھی نہیں کر سکتی تھی۔ کیسی بے بسی تھی، کیسی لاچاری تھی۔

اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ ہر راہ بند ہوتی دکھائی دینے لگی، ہر دروازے کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ اسے لگا وہ اب ہمیشہ کسی اندھیرے بند کہف میں مقید رہے گی۔

تیمور اور ہمایوں سے دور... بہت دور...

☆ ☆ ☆

صبح وہ سو کر خاصی دیر سے اٹھی، رات بھر سو نہ سکی تو فجر کے قریب ہی آنکھ لگی تھی۔

سسٹر میرین بیڈ سائیڈ ٹیبل پہ دوائیں رکھ رہی تھی، اسے جاگتے دیکھ کر مسکرائی۔

"گڈ مارننگ مسز ہمایوں، ہاؤ آر یو؟"

"فائن۔" وہ جبراً مسکرائی۔ کس کا نام اس کے نام کے ساتھ جڑتا تھا، وہ جو خود ہی اس سے دور بھاگ گیا تھا۔

"آپ کی سسٹر صبح آئی تھیں، آپ سو رہی تھیں، وہ یہ بک دے کر گئی ہیں۔" اس نے سائیڈ ٹیبل پہ رکھی کتاب کی طرف اشارہ کیا۔

"فرشتے آئی تھی؟" وہ چونکی، پھر اس کی اشارہ کردہ کتاب کی طرف دیکھا، تو ٹھہر سی گئی۔

سیاہ سادہ جلد والی بیز کتاب، اس کا سانس رک گیا، دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔

"مصحف قرآنی۔" وہ زیر لب بڑبڑائی۔ [illegible]

"یہ آپ کا قرآن ہے میڈم؟" سسٹر میرین نے اسے متوجہ پا کر احتیاط سے قرآن اٹھا کر اس کے سامنے کیا۔ اس نے بے قراری سے اسے تھاما اور پھر سینے سے لگا لیا۔

"یو لو یور ہولی بک ٹو مچ، رائٹ؟" (آپ کو اپنی مقدس کتاب بہت عزیز ہے نا؟) وہ مسکرا کر کہتی اسے بیٹھنے میں مدد دینے لگی۔

"آف کورس سسٹر!" وہ بہت خوش تھی۔

پھر وہ بیٹھ گئی تو سسٹر میرین نے اس کے پیچھے تکیے سیٹ کر دیے۔

پھر سسٹر جانے کب وہاں سے گئی۔ اسے پتا بھی نہیں چلا، وہ بس اپنے قرآن میں گم تھی۔

اس نے دھیرے سے پہلا صفحہ کھولا تو عربی عبارات سے مزین اوراق سامنے آئے، اس کا دل ایک دم رعب سے بھر گیا۔ ہاتھ ذرا سے کپکپائے، لب لرزے، آنکھوں کے گوشے بھیگتے چلے گئے۔

اوہ خدایا، وہ کتنی نوازی گئی تھی۔ اسے اللہ نے اپنے کلام کو تھامنے کا موقع دے دیا تھا۔ وہ اس کی سن لیتا تھا، اور اس کو مخاطب بھی کرتا تھا۔ برسوں کا یہ ساتھ بھلا کیسے ٹوٹ سکتا تھا؟

اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

وہ اسے بھولا نہیں تھا، اس نے اسے یاد رکھا ہوا تھا۔

محمل ابراہیم اپنے رب تعالیٰ کو یاد تھی۔ کیا اسے واقعی اب کچھ اور چاہیے؟

اس نے شروع کے چند صفحات پلٹے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کدھر سے پڑھنا شروع کرے۔ پھر اس نے آغاز میں رکھے ایک بک مارک سے کھولا۔ وہ سورۂ بقرہ کے درمیان سے کھلا تھا۔ دوسرے سیپارے کے اوائل میں۔ برسوں پرانا بک مارک، جانے کب اس نے اور رکھا تھا؟

اس نے وہیں سے آیات پڑھنا شروع کیں۔

"بس تم مجھے یاد رکھو، میں تمہیں یاد رکھوں گا اور میرا شکر ادا کرو اور میری ناشکری مت کرو۔"

آنسو اس کے رخساروں سے پھسل کر گردن پہ لڑھک رہے تھے۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ میں نے آپ کو خوشی میں یاد رکھا، آپ مجھے غم میں مت بھولیے گا، مگر لب ہل نہ پائے۔

اس نے آگے پڑھا۔

"اے ایمان والو، تم صبر اور نماز کے ساتھ مدد مانگو، بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

ساتھ ہی حاشیے میں پین سے چھوٹا چھوٹا کچھ لکھا تھا۔ اس نے قرآن قریب کر کے پڑھنا چاہا۔ وہ اس کے اپنے لکھے تفسیر نوٹس تھے۔

"مصیبت میں صبر اور نماز وہ دو کنجیاں ہیں جو آپ کو اللہ تعالیٰ کا ساتھ دلاتی ہیں۔ ان کے بغیر یہ ساتھ نہیں ملتا۔ اس لیے کوئی مصیبت آئے تو نماز میں زیادہ توجہ اور لگن ہونا چاہیے۔ مصیبت میں خاموشی کے ساتھ اللہ کی رضا پر راضی ہو کر جو کچھ موجود ہے اس پر شکر کرنا اور اللہ سے آگے اچھی امید رکھنا صحیح معنی میں صبر ہے۔"

یہ سب اس نے لکھا تھا؟ وہ اپنے لکھے پہ حیرت زدہ سی رہ گئی۔ کلاس میں آگے بیٹھنا، ٹیچر کی ہر ایک بات نوٹ کرنا، وہ سب اسے کتنا فائدہ دے گا اس نے تو کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔

اس نے قدرے آگے سے پڑھا۔

"اور البتہ ہم تمہیں کچھ چیزوں کے ساتھ ضرور آزمائیں گے۔ (یعنی) خوف سے اور بھوک سے جانوں اور مالوں کے نقصان سے — اور خوش خبری دے دو ان کو جو صبر کرنے والے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے، یہ کہتے ہیں بے شک ہم اللہ کے لیے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں، ان ہی لوگوں پہ ان کے رب کی طرف سے عنایتیں اور رحمت ہے اور یہ ہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔"

اس نے ساتھ حاشیے میں لکھے اپنے الفاظ پڑھے۔

"صابرین کا مصیبت پہ بس انا للہ وانا الیہ راجعون کہہ دینا کافی نہیں ہے، بلکہ دراصل یہ الفاظ ان دو عقائد کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن پہ جمے بغیر کوئی صبر نہیں کر سکتا۔ انا للہ (بے شک ہم اللہ کے لیے ہیں) عقیدہ توحید ہے اور وانا الیہ راجعون (بے شک ہم اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے) عقیدہ آخرت۔ یہ ایمان ہے کہ ہر دکھ اور مصیبت ایک دن ختم ہو جائے گی اور اگر کچھ ساتھ رہے گا تو صرف آپ کے صبر کا اجر۔"

اس نے اگلی آیت پڑھی۔

"بے شک صفا اور مروہ شعائر اللہ میں سے ہیں تو جو کوئی حج کا ارادہ کرے۔"

صبر کے فوراً بعد صفا مروہ اور حج کا ذکر؟ وہ ذرا حیران ہوئی، پھر اپنے ہاتھ کے لکھے نوٹس پڑھے۔

"صفا اور مروہ دراصل ایک عورت کے صبر کی نشانی ہیں، جب آپ کو بے قصور کسی تپتے صحرا میں چھوڑ دیا جائے اور آپ اس توکل پہ کہ اللہ ہمیں کبھی ضائع نہیں کرے گا صبر کریں تو پھر زم زم کے میٹھے چشمے

پھوٹتے ہیں۔"

اس کے بے قرار دل کو جیسے ڈھیروں ٹھنڈک مل گئی تھی۔ آنسوؤں کو قرار مل گیا۔ اندر باہر سکون سا اتر گیا۔ اور اس کے بعد جیسے گہری خاموشی چھا گئی۔

سارے ماتم دم توڑ گئے تھے۔ اسے صبر آ ہی گیا تھا۔ اب رونے کا پہر تمام ہوا تھا۔ کتاب اللہ اس کے پاس تھی، وہ رسول اللہ کی امتی تھی، دین کا علم اسے عطا کیا گیا تھا۔ اب کسی شکوے کی گنجائش باقی نہ تھی۔ دورِ جاہلیت سے نکلنے والے انسان کی زندگی میں مکہ کی سختیاں، مدینہ کی ہجرت، بدر کی جیت اور احد کی شکست آتی ہے۔ طائف کے پتھر بھی آتے ہیں، اور اسریٰ اور معراج کی بلندیاں بھی۔ مگر آخر میں ایک فتح مکہ ضرور آتا ہے اور اس سفر میں کسی کا مکی دور بعد میں آتا ہے، اور مدنی دور پہلے آ جاتا ہے۔

وہ ایک سال جو اس نے ہمایوں کے ساتھ اپنے گھر میں گزارا، ایک پرسکون من چاہی ریاست میں، وہ دور ختم ہو چکا تھا۔ اس کا مکہ اب شروع ہوا تھا۔ طائف کے پتھر اب لگنے لگے تھے۔ مگر وہ جانتی تھی کہ اگر وہ کمزوروں کا رب اس کے ساتھ ہے تو اسے بھی کسی عتبہ اور شیبہ کے باغ میں پناہ مل جائے گی۔ اسے بھی انگور کے خوشے مل جائیں گے۔ اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طائف کی دعا یاد آئی اور اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ تب ہی دروازہ کھول کر سسٹر اندر داخل ہوئی۔ اسے جاگتا دیکھ کر ذرا سا مسکرائی اور آگے بڑھی۔

"کیسا فیل کر رہی ہیں آپ؟" وہ اس کے ساتھ لگی ڈرپ کو چیک کرنے لگی تھی۔

"ہوں۔" وہ جیسے کسی خیال سے جاگی۔ "فائن۔۔۔ الحمد للہ۔"

"آپ کو بہت ٹائم بعد ہوش آیا ہے۔ ڈاکٹرز ہوپ کھو چکے تھے۔"

"معلوم نہیں۔" وہ قدرے بے بسی سے مسکرائی۔ "میں نے تو وقت کا تعین بھی کھو دیا تھا۔"

"مایوسی کی باتیں مت کریں میم! خداوند آپ کی مدد کرے گا۔"

وہ ذرا سی چونکی۔ یہ انگور کے خوشے لے کر ہمیشہ نینوا کے عداس کیوں آتے ہیں۔ اس نے بے اختیار سوچا تھا۔

"ہاں، مجھے یقین ہے وہ میری مدد کرے گا۔" وہ کھل کر مسکرا دی۔ شاید پہلی دفعہ وہ یوں مسکرائی تھی۔

"تمہارا اس کی مدد پہ کتنا ایمان ہے سسٹر؟"

"بہت زیادہ، میم! گرانسٹ مدد مانگنے والوں کو خالی نہیں لوٹاتا۔"

"ہوں۔" وہ نرمی سے مسکراتی اس کا پُریقین چہرہ دیکھے گئی۔ "تم جانتی ہو عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں یہ قرآن کیا کہتا ہے؟"

سلکی کو تھامے سسٹر میرین کے ہاتھ لمحے بھر کو تھمے۔ اس نے پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا، اس کی سیاہ آنکھوں میں حیرت بھرا ہوا ابھرا تھا۔

محمل نے ایک ثانیے کو اس کی آنکھوں میں دیکھا، پھر آہستہ سے بولی۔

"ہینڈسم، اے ویری ہینڈسم مین ہی واز، مسیح عیسیٰ بن مریم۔"

"رئیلی؟" سسٹر میرین کی آنکھوں میں دیپ سے جل اٹھے۔

"آف کورس، ہماری کتاب میں لکھا ہے کہ وہ بے حد ہینڈسم تھے، بہت وجیہہ، صرف بیان نہیں ان کے پاس رائٹنگ پاور بھی تھی۔ قلم کی طاقت، وہ بہت اچھا لکھتے تھے اور جانتی ہو وہ اپنے ان مہکلز اور ٹیلنٹس کے بارے میں کیا کہا کرتے تھے؟"

"کیا؟" وہ دم بخود بنا پلک جھپکے سن رہی تھی۔

"وہ کہتے تھے، یہ مجھے میرے رب نے سکھایا ہے۔" وہ سانس لینے کو رکی، پھر جیسے یاد کر کے بتانے لگی۔ "جب سے مجھے یہ پتا چلا میں اپنی کوئی بھی تعریف سن کر عیسیٰ علیہ السلام کو کوڈ کرتی تھی، کوئی میری تعریف کرتا تو میں کہتی یہ مجھے میرے رب نے سکھایا ہے۔"

"بیوٹی فل!" سسٹر میرین بے خود سی کہہ اٹھی۔ پھر آہستہ سے چیزیں سمیٹنے لگی۔

"مسز ہمایوں! آپ پکی مسلم ہو جس نے بتایا ہے کہ آپ کی ہولی بک یسوع مسیح کے بارے میں کیا کہتی ہے۔ ورنہ مسلم ہمیشہ بہت سختی سے کہتے ہیں کہ تمہارا عقیدہ غلط ہے۔"

"السلام علیکم!" فرشتے نے جھانکا۔ "تم اٹھ گئیں؟"

"ہاں، کب کی۔" وہ چونکی، پھر سنبھل گئی۔ فرشتے اندر چلی آئی۔ عبایا اور سیاہ حجاب کو چہرے کے گرد لپیٹے ہمیشہ کی طرح تازہ اور خوب صورت۔

"آپ نے شادی نہیں کی فرشتے!" محمل نے کہا اور پھر اس نے دیکھا کہ فرشتے کی سنہری آنکھوں میں سایہ سا لہرایا۔

"قسمت ہی میں کیا رکھا ہے محمل؟" وہ پھیکا سا مسکرائی۔

"قسمت سمجھ کے کر لیں نا۔"

وہ سر جھکائے چادر پہ انگلی سے نادیدہ لکیریں کھینچنے لگی۔

"پھر آپ شادی کر لیں گی نا؟"

"جب تک تم ٹھیک نہیں ہوتیں میں شادی نہیں کروں گی۔"

"اور اگر میں کبھی ٹھیک نہ ہوئی تو؟"

"تو میرے لیے تم، ہمایوں اور تیمور بہت ہو، مجھے کسی اور کی ضرورت نہیں ہے۔ چلو تمہاری فزیو تھیراپسٹ آنے والی ہوگی۔ اس سے بنا کر رکھو، اب اس کو بھگانا نہیں ہے۔ گھر شفٹ ہو کر بھی روز اس کی شکل دیکھنا تو ہوگی نا۔" فرشتے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھی۔

اور وہ ایک خیال اسے اطمینان بخش گیا۔

گھر۔۔۔ اس کا گھر۔۔۔ اپنا گھر۔ اس ہفتے وہ واپس چلی جائے گی۔

اس نے طمانیت سے سوچا تھا۔

سسٹر میرین فائل ہاتھ میں پکڑے پین سے اس میں کچھ اندراج کر رہی تھی۔

محمل تکیوں کے سہارے ٹیک لگائے خاموش گم صم سی بیٹھی تھی۔ اس کے بھورے سیدھے لمبے بال شانوں پہ پھسلتے کمر پہ گر رہے تھے۔ یہ بال کبھی بے حد گھنے اور سلکی ہوتے تھے۔ مگر طویل بیماری نے انہیں بے حد پتلا اور مرجھائے پھول کی پتیوں جیسا کر دیا تھا۔

"میڈم!" لکھتے لکھتے ایک دم سسٹر نے سر اٹھایا۔ اس کے چہرے پہ یکایک ڈھیروں تفکر امڈ آیا تھا۔

"ہوں۔" وہ چونکی۔ آج کل وہ پکارے جانے پہ یوں ہی چونک اٹھتی تھی۔

"کافی دن ہو گئے وہ نہیں آئے۔"

"کون؟"

"وہ کوئی صاحب ہیں، کافی عرصے سے آپ کو دیکھنے آ رہے ہیں۔ کافی بڑی عمر کے ہیں، اتنی لمبی داڑھی بھی ہے۔ بہت کانفیڈنٹ اور جینٹل سے ہیں۔"

"کب سے آ رہے ہیں؟"

"میں تین سال سے ادھر ہوں، جب سے انہیں آتا دیکھتی ہوں۔ عموماً فرائی ڈے کو آتے ہیں۔ بس ادھر سے جھانک کر۔" اس نے دروازے کی طرف اشارہ کیا "اور مجھ سے آپ کا حال پوچھ کر چلے جاتے ہیں، کبھی آپ کے پاس رکے نہیں۔"

"کیا میرے کوئی رشتہ دار ہیں؟" سوال کرنے کے ساتھ ہی اس کے ذہن کے پردے پہ بہت سے چہرے ابھرے۔ آغا ہاؤس کے خوش حال، مطمئن چہرے۔ ایک کسک سی دل میں اٹھی۔ کیا ان کو وہ یاد ہوگی؟ کیا کبھی اپنے عیش و آرام سے فرصت پا کر انہوں نے اس کے لیے چند لمحے نکالے ہوں گے؟

"نہیں، وہ کہتے تھے کہ وہ آپ کے رشتہ دار نہیں ہیں۔ بس یوں ہی جاننے والے ہیں۔"

"فرشتے اور میرے ہزبینڈ ان کو جانتے تھے وہ؟"

"ان کے ہوتے ہوئے تو وہ کبھی نہیں آئے، ہمیشہ ان کی غیر موجودگی میں آتے ہیں۔ مگر اب کافی دن ہو گئے نہیں آئے۔"

"کوئی نام، کا پتا؟"

"کبھی بتایا نہیں۔" سسٹر اب دوبارہ فائل پہ جھکی اندراج کرنے لگی۔ وہ مایوس سی ہو گئی۔ جانے کون تھا،

کیوں آتا تھا۔
رات میں فرشتے آئی تو اس نے یوں ہی پوچھ لیا۔
"مجھے ادھر دیکھنے کون کون آتا ہے فرشتے؟"
"ہم سب۔" وہ اس کے بھورے بالوں میں برش کر رہی تھی۔
"آغا جان لوگ کبھی نہیں آئے؟"
"پتا نہیں۔" دونوں ہاتھوں میں اس کے بال پکڑ کر اس نے اونچے کیے اور پونی باندھی، پھر سیدھی لمبی پونی ٹیل کو احتیاط سے آہستہ آہستہ اوپر سے نیچے برش کرنے لگی۔
"کوئی تو آیا ہو گا۔"
"میں ان لوگوں کے بارے میں بات نہیں کرنا چاہتی محمل۔ پلیز مجھے دکھ مت دو۔" اس کے انداز میں منت بھرا احتجاج تھا، پھر محمل کچھ نہ پوچھ سکی۔ سر جھکائے بال بنواتی رہی۔
"یہ دیکھو۔" فرشتے نے پاکٹ مرر اس کے چہرے کے سامنے کیا۔ اس نے جھکا سر اٹھایا، آئینے میں اپنا عکس دکھائی دیا تو لمحے بھر کو وہ پہچان ہی نہ پائی۔
بے حد کمزور چہرہ، اندر کو دھنسے ہوئے گال، زردی مائل پھیکی رنگت، آنکھوں کے نیچے گہرے جامنی حلقے، پژمردہ، بیمار، روکھا پھیکا سا چہرہ اور اونچی پونی ٹیل، جو کبھی اس تروتازہ سی محمل ابراہیم پہ بہت اچھی لگتی تھی، اس بیمار لاغر محمل پہ بہت بری لگ رہی تھی۔
"رہنے دیں، مجھے یہ بال نہیں بنانے۔" اس نے ہاتھ سے پونی پکڑ کر کھینچی۔ بال شکنجے سے نکل کر شانوں پہ بکھر گئے اور پونی اس کے ہاتھ میں آگئی۔
"کیوں کھول دیے؟" فرشتے کو تاسف ہوا۔
"میں ایسے بال نہیں بنانا چاہتی، پلیز مجھے دکھ مت دیں۔" نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اس کے الفاظ لوٹا گئی۔
فرشتے چپ سی ہو گئی اور پھر کمرے سے نکل گئی۔ شاید وہ جانتی تھی کہ اس وقت محمل کو تنہا چھوڑ دینا ہی بہتر ہو گا۔

☼ ☼ ☼

ہمایوں کا گھر... محمل کا گھر۔ ہمایوں اور محمل کا گھر۔
وہ ویسا ہی تھا جیسا وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ خوب صورتی سے آراستہ کونا کونا چمکتا ہوا، فانوس کی روشنیاں، جگر جگر کرتی بتیاں، قیمتی پردے، یہ ہی سب پہلے بھی اس کے گھر میں تھا، اب بھی تھا، مگر رنگ بدل گئے تھے۔ لاؤنج کے صوفے، پردے یہاں تک کہ گملے بھی بدل گئے تھے۔ چیزیں رکھی گو اسی ترتیب میں تھیں، مگر ان کا رنگ پہلے جیسا نہ تھا۔ ہر شے نئی تھی، جیسے ہمایوں تھا۔ اپنی جگہ پہ ویسے ہی موجود، مگر پھر بھی بدل چکا تھا۔
"کیا لگا تمہیں اپنا گھر؟" اس کی وہیل چیئر پیچھے سے دھکیلتی فرشتے خوش دلی سے پوچھ رہی تھی۔
وہ گم صم سی، خالی خالی آنکھوں سے در و دیوار کو دیکھے گئی۔ سات سال پہلے وہ اس کا گھر تھا، اب شاید وہ صرف ہمایوں کا تھا۔
ڈاکٹرز نے اس کا مزید اسپتال میں رہنا بے کار کہہ کر اسے گھر شفٹ کروا دیا تھا۔ اس کی بیماری ویسی کی ویسی تھی۔ دایاں ہاتھ ٹھیک، بایاں ہاتھ ذرا کمزور، اور ٹانگیں مکمل طور پر مفلوج۔ وہ کہتے تھے کہ وہ اچانک سے بھی ٹھیک ہو سکتی ہے اور ساری عمر بھی اس طرح رہ سکتی ہے۔ بس آپ دعا کریں۔ اب وہ کیا کہتی، آپ کو لگتا ہے کہ ہم دعا نہیں کرتے؟ مگر ایسی باتیں کبھی کہاں جاتی ہیں۔
فرشتے اسے لاؤنج کے ساتھ بنے کمرے کی طرف لے گئی۔ اس نے وہ اس کے مطابق سیٹ کروا دیا تھا۔
"مگر میرا کمرہ تو اوپر تھا فرشتے۔"
"محمل... سیڑھیاں چڑھنا اس وہیل چیئر کے ساتھ۔" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ اس نے سمجھ کر سر ہلا دیا۔
"اور ہمایوں کا سامان؟" کچھ دیر بعد چیزوں کا جائزہ لیتے ہوئے وہ پوچھ بیٹھی۔ "ان کا سامان کدھر ہے؟"
"ہمایوں تو... میں نے اسے کہا تھا۔ مگر... آئی تھنک وہ اپنے کمرے میں زیادہ کمفرٹیبل ہے۔"
"تو وہ یہاں نہیں آئیں گے؟" محمل ششدر رہ گئی۔
"کوئی بات نہیں محمل! وہ اسی گھر میں رہتا ہے، کسی بھی وقت آ جا سکتا ہے۔" فرشتے خواہ مخواہ شرمندہ ہو رہی تھی۔
"نہیں فرشتے! تم ان سے کہو کہ وہ مجھے یوں اکیلا تو نہ کریں۔"
اس نے بے اختیار فرشتے کے ہاتھ پکڑ لیے۔ اس کے ہوش میں آنے کے بعد وہ صرف ایک دفعہ اس سے ملنے آیا تھا، پھر کبھی نہیں آیا۔
"محمل، پلیز، میرے لیے تم دونوں بہت عزیز ہو، وہ کزن ہے اور تم بہن، اس لیے میں نہیں چاہتی کہ میری کسی بات سے وہ یا تم ہرٹ ہو۔ پلیز مجھے اچھا نہیں لگتا کہ میں تم دونوں کے پرسنلز میں دخل دوں، مجھے اس کا کوئی حق نہیں ہے۔" اس نے بہت نرمی سے اسے سمجھایا۔ وہ اس کے ہاتھ تھامے گھٹنوں کے بل اس کے سامنے بیٹھی تھی۔ محمل لاجواب سی ہو گئی۔
"اور تیمور؟ اس کا کمرہ کدھر ہے؟" بے اختیار اسے یاد آیا۔
"لاؤنج کے اس طرف والا کمرہ۔"
"تو آپ اسے اپنے ساتھ نہیں سلاتے؟ وہ اتنا چھوٹا ہے، وہ اکیلا کیسے سو سکتا ہے؟" اس کا دل تڑپ کر رہ گیا۔
"جن بچوں سے بچپن میں ہی ان کے ماں، باپ دونوں چھن جائیں وہ عادی ہو جاتے ہیں محمل! اگر وہ مجھے پسند کرتا ہوتا تو میں اسے ساتھ سلا لیتی مگر... وہ مجھے پسند نہیں کرتا۔"
"کیوں؟" وہ بنا سوچے بول اٹھی۔ جواباً فرشتے اداسی سے مسکرائی۔
"وہ تو تمہیں بھی پسند نہیں کرتا، کیا اس میں تمہارا قصور ہے؟"
محمل کا سر آہستہ سے نفی میں ہل گیا۔
"سو اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے، اگر وہ مجھے پسند نہیں کرتا۔ تم بیٹھو، میں کچھ کھانے کے لیے لاتی ہوں۔ اب تم نارمل فوڈ لے سکتی ہو۔ میں نے ڈاکٹر سے بات کر لی تھی۔" وہ جانے کے لیے مڑی، دفعتاً محمل بے اختیار کہہ اٹھی۔
"آپ بہت اچھی ہیں فرشتے! میں کبھی آپ کی اس کیئر کا بدلہ نہیں دے سکتی۔"
"میں نے بدلہ کب مانگا ہے؟" وہ نرمی سے اس کا گال تھپتھپا کر باہر نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

دن پژمردگی سے گزرنے لگے۔ وہ سارا دن کمرے میں پڑی رہتی، یا فرشتے کے زبردستی مجبور کرنے پہ باہر لان میں آتی اور وہاں بھی گم صم سی رہتی، فرشتے ہی کوئی نہ کوئی بات کر کے اس کا ذہن بٹا رہی ہوتی اور یہ باتیں عموماً فرشتے اس سے نہیں کرتی تھی۔ بلکہ اس کی وہیل چیئر دھکیلتے ہوئے کبھی وہ کیاری میں گوڈی کرتے مالی سے مخاطب ہوتی، تو کبھی برآمدے کا فرش دھوتی ملازمہ سے۔ فرشتے اب اتنا نہیں بولتی تھی جتنا پہلے بولتی تھی۔ اس کا انداز پہلے سے زیادہ سنجیدہ ہو گیا تھا اور یہ وقت کا اثر تھا، وہ اثر جو نہ چاہتے ہوئے بھی وقت ہر انسان پہ چھوڑ ہی جاتا ہے۔
فرشتے نے گھر کو اچھی طرح سے سنبھالا ہوا تھا۔ گو کہ ہر کام کی جزوقتی ملازمائیں رکھی ہوئی تھیں مگر تمام انتظام اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے باوجود وہ نہ کسی پہ حکم چلاتی تھی، نہ اس گھر کی پرائیویسی میں دخل دیتی تھی۔ محمل یا ملازموں سے بات کرنے کے علاوہ وہ زیادہ کلام بھی نہ کرتی تھی۔ تیمور اور ہمایوں کے کمرے کے اندر وہ نہیں جاتی تھی، بلکہ دروازے پہ کھڑے ہو کر صفائی کرواتی۔ ملازموں کو تنخواہ ہمایوں دیتا تھا۔
فرشتے گیسٹ روم میں ہی قیام پذیر تھی۔ ہمایوں سے بات وہ بہت کم کرتی تھی، وہ بھی شدید ضرورتاً اور تیمور تو ویسے بھی ہر شے سے چڑا ہوا لڑکا تھا۔ سو وہ اسے مخاطب نہیں کرتی تھی۔ کبھی جو کر لے تو تیمور اس بدتمیزی سے پیش آتا کہ الاماں۔
محمل نے نوٹ کیا تھا کہ تھوڑی دیر بدتمیزی کر کے تیمور چیخنے چلانے پہ آ جاتا تھا اور اگر مزید کچھ کہا

جائے تو وہ چیزیں اٹھا کر توڑ پھوڑ کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا تھا۔ فرشتے بہت محتاط طریقے سے اس گھر میں رہ رہی تھی، جیسے اس کے ذہن میں تھا کہ اسے جلد ہی یہاں سے چلے جانا ہے۔ ملازمہ تہمینہ نے اسے بتایا تھا کہ فرشتے اپنے پیسوں سے ماہانہ راشن کی چیزیں لے آتی تھی، خصوصاً چکن اور گوشت ہمیشہ وہ خود ہی خریدتی تھی۔ جب ہمایوں کو پتا چلا اور اس نے اسے روکنا چاہا تو فرشتے نے صاف کہہ دیا کہ اگر اس نے اسے روکا تو وہ واپس اسکاٹ لینڈ چلی جائے گی۔

نتیجتاً ہمایوں خاموش ہو گیا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ ان پہ بوجھ نہیں بننا چاہتی تھی اور شاید اس کے ذہن میں یہ ہو کہ کہیں کوئی اسے مفت خورا نہ سمجھے۔ اپنی عزت نفس اور وقار کو اس نے ہمیشہ قائم رکھا تھا، محمل خود کو اس کا زیر بار محسوس کرنے لگی تھی۔

ہمایوں سے اس کی ملاقات نہ ہونے کے برابر ہوتی تھی۔ وہ کبھی دوپہر میں گھر آتا تو کبھی رات کو۔ کھانا وہ اپنے کمرے میں کھاتا۔ اور پھر وہیں رہتا۔ اکثر بہت رات گئے گھر آتا۔ وہ انتظار میں لاؤنج میں وہیل چیئر پہ بیٹھی ہوتی۔ وہ آتا سرسری سا حال پوچھتا اور اوپر سیڑھیاں چڑھ جاتا اور وہ اس کی پشت کو نم آنکھوں سے دیکھتی رہ جاتی۔

تیمور دوپہر میں اسکول سے آتا تھا۔ وہ کھانا [illegible] اکیلا کھاتا تھا۔ اگر محمل کو ادھر بیٹھے دیکھتا تو فوراً واپس چلا جاتا۔ نتیجتاً تہمینہ اسے اس کے کمرے میں کھانا دے آتی۔ وہ جنک فوڈ کھاتا تھا۔ برگر پیٹیز کے ڈبوں سے فریزر اور فرنچ فرائز کے لیے آلوؤں سے سبزی والی ٹوکری بھری رہتی۔ کھانے پینے کا وہ بہت شوقین نہ تھا۔ اسکول سے لائے چپس کے پیکٹس اور چاکلیٹس عموماً کھاتا نظر آتا۔ شام کو ٹی وی لاؤنج میں کارٹون لگائے بیٹھا رہتا۔ اگر محمل کو آتے دیکھتا تو اٹھ کر چلا جاتا۔

وہ جان ہی نہ پا رہی تھی کہ وہ اتنا ناراض کس بات پر ہے؟ آخر اس نے کیا ہی کیا ہے؟

اس گھر کے وہ تینوں مکین اجنبیوں کی طرح رہ رہے تھے اور اب وہ جو تھی اجنبی ان کی اجنبیت بڑھانے آ گئی تھی۔

فرشتے شام میں مدرسے جاتی تھی۔ وہ غالباً "اب تک" میں کلاسز لے رہی تھی۔ محمل نے ایک دفعہ پوچھا تو وہ اداسی سے مسکرا دی تھی۔

"صبح کی کلاسز لینا اسپتال کی وجہ سے ممکن نہ تھا۔" مختصراً بتا کر وہ حجاب درست کرتی باہر نکل گئی تھی۔

وہ محمل کا بہت خیال رکھتی تھی۔ اس کی دوا، مساج، مفلوج اعضاء کی ایکسرسائز، فزیو تھراپسٹ کے ساتھ اس پہ محنت کرتا، پھر غذا کا خیال، وہ [illegible] رہتی بلا کسی اجر کی تمنا کے، یا احسان جتائے۔

اس شام بھی فرشتے مدرسے گئی ہوئی تھی، جب سیاہ بادل آسمان پہ چھانے لگے۔ ہمایوں تو کبھی بھی شام میں گھر نہیں ہوتا تھا۔ تیمور جانے کہاں تھا۔ وہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر منظر دیکھ رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے [illegible] رہ گیا [illegible] زور سے گرجنے [illegible] گرنے نہیں [illegible] تو ایک خوف ناک سی روشنی بکھر جاتی۔

اسے بارش سے پہلے کبھی ڈر نہیں لگا تھا۔ مگر آج لگ رہا تھا۔ ہمایوں نہیں تھا، فرشتے بھی نہیں تھی، اسے [illegible] بہت اکیلی ہے، تنہا ہے۔

بجلی بار بار کڑک رہی تھی۔ ساتھ ہی اس کی دھڑکن بھی تیز ہو رہی تھی۔ بے اختیار [illegible]؟

وہ تیزی سے وہیل چیئر کے پہیے دونوں ہاتھوں سے چلاتی لاؤنج میں آئی۔ فون ایک طرف تپائی پہ دھرا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک چٹ بھی تھی جس پر ہمایوں اور فرشتے کے نمبر لکھے تھے۔ وہ غالباً تیمور کے لیے لکھے گئے تھے۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے ریسیور اٹھایا اور فرشتے کا نمبر ڈائل کیا، پھر ریسیور کان سے لگایا۔

گھنٹی جا رہی تھی، مگر وہ اٹھا نہ رہی تھی۔ غالباً کلاس میں تھی۔ اس نے مایوسی سے فون رکھ دیا، تب ہی نگاہ دوبارہ اس چٹ پہ پڑی۔

کچھ سوچ کر اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ ریسیور دوبارہ اٹھایا۔ نمبر ڈائل کرتے ہوئے اس کی انگلیاں لرز رہی تھیں۔

تیسری گھنٹی پہ ہمایوں نے ہیلو کہا تھا۔

"ہے... ہما... ہمایوں۔" وہ بمشکل بول پائی تھی۔

"کون؟"

"میں محمل۔"

دوسری جانب ایک لمحے کو سناٹا چھا گیا۔

"ہاں بولو۔" مصروف، سرد مہری سی آواز ابھری۔

"آپ... آپ کدھر ہیں؟"

"[illegible]" بیزاری۔

"وہ... وہ باہر اسٹورم (طوفان) آ رہا ہے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے، پلیز آپ گھر آ جائیں۔" اس کا گلا رندھ گیا۔ آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

"اوہو۔ میں میٹنگ میں بیٹھا ہوں۔ ابھی کہاں [illegible]"

"مجھے [illegible]، پلیز آ جائیں، جیسے بھی ہو۔" باہر طوفان کا شور [illegible] اتنا سا کہتے ہی اس کے آنسوؤں میں شدت آ گئی تھی۔

"نہیں نہیں [illegible]، فرشتے یا کسی ملازمہ کو بلا لو۔" وہ جھلایا تھا۔

"فرشتے گھر پہ نہیں ہے، آپ آ جائیں ہمایوں، پلیز۔"

"[illegible] کہ تم [illegible] میری ہمدردی حاصل کر سکتی ہو تو اس خیال کو دل سے نکال دو اور مجھے میری زندگی جینے دو، خدا کے لیے اب پیچھا چھوڑ دو میرا۔" اور ٹھک سے فون بند ہو گیا۔

وہ سکتے کے عالم میں ریسیور ہاتھ میں لیے سن سی بیٹھی رہ گئی۔ کتنے لمحے گزرے، کتنے بادل گرجے، کتنی بجلی چمکی، کتنے قطرے برسے، وہ ہر شے سے غافل، بنا پلک جھپکے شل سی بیٹھی تھی۔ لب ادھ کھلے، آنکھیں پھٹی پھٹی اور ہاتھ میں پکڑا ریسیور کان سے لگا... وہ کوئی مجسمہ تھا جو ٹیلی فون اسٹینڈ کے ساتھ اس وہیل چیئر پہ بے حس و حرکت پڑا تھا۔

پھر کتنی ہی دیر بعد ریسیور اس کے ہاتھ سے پھسلا اور نیچے لڑھک گیا۔ اس کے زمین سے ٹکرانے کی آواز پہ بے اختیار اس نے پلکیں جھپکیں اور آن کی آن میں اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ اس کی ہچکی بندھ گئی تھی اور پورا وجود لرز رہا تھا، وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہی تھی۔

ہمایوں نے اسے وہ سب کہا تھا؟ اتنے غصے اور بے زاری سے، جیسے وہ اس سے اکتا چکا تھا۔ ہاں وہ مرد تھا۔ وجیہہ، شاندار سا مرد، کب تک ایک کومے میں بے ہوش پڑی نیم مردہ بیوی کی پٹی سے لگا رہتا؟ اس کو اب محمل کی ضرورت نہ تھی۔ اسے اب محمل کے وجود سے بھی اکتاہٹ ہوتی تھی۔ شاید وہ اب اس سے شادی کرنے پہ پچھتا رہا تھا۔ اپنی وقتی جذباتیت پہ نادم تھا۔

دفعتاً آہٹ پہ اس نے آنکھیں کھولیں۔

تیمور سامنے صوفے کے اس طرف کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ [illegible] خاموش [illegible] عجیب سا تنفر تھا۔

"تیمور!" اس کی زخمی مامتا بلبلائی۔ "ادھر میرے پاس آؤ بیٹا!" اس نے دونوں ہاتھ پھیلائے۔ شاید وہ اس کے گلے سے لگ جائے، شاید کہ ہمایوں کے رویے کی تپش کچھ کم پڑ جائے۔

"آئی ہیٹ یو۔" وہ تڑخ کر بولا اور الٹے قدم چلتے ہوئے دو قدم پیچھے ہٹا۔ ہمایوں کے انداز کیا کم تھے جو اوپر سے اس سات سالہ لڑکے کا انداز، اس کی روح تک چھلنی ہو گئی۔

"میں نے کیا کیا ہے تیمور؟ تم ایسے کیوں کر رہے ہو میرے ساتھ؟ کیوں ناراض ہو مجھ سے؟"

"یو لیفٹ می وین آئی نیڈڈ یو۔" (آپ نے مجھے اس وقت چھوڑ دیا جب مجھے آپ کی ضرورت تھی۔)

وہ زور سے چیخا تھا۔ "آئی ہیٹ یو فار ایوری تھنگ۔"

اور مڑ کر بھاگتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ لمحے بھر

بعد اس نے زوردار آواز سے تیمور کے کمرے کے دروازہ کو بند ہوتے سنا۔

"کیا تمہیں چھوڑنے میں میرا اپنا اختیار تھا تیمور؟ تم اتنی سی بات پہ مجھ سے ناراض نہیں ہوسکتے۔ شاید تمہارے باپ نے تمہیں مجھ سے بدظن کیا ہے۔" وہ دکھی دل سے سوچتی واپس کمرے تک آئی تھی۔ اس کے ripple بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ سیاہ کور والا قرآن رکھا تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ اسے اٹھایا اور دونوں ہاتھوں میں تھامے اپنے سامنے کیا۔

سیاہ کور پہ مدھم سا مٹا مٹا سا "م" لکھا تھا۔ جانے اس نے کیوں اور کب ادھر لکھا تھا؟ وہ کوشش کے باوجود یاد نہ کرپائی، پھر سر جھٹک کر اسے وہاں سے کھولا جہاں سے فجر کے بعد تلاوت چھوڑی تھی۔ اس نے وہ آیت دیکھی جہاں بک مارک لگا تھا، پھر تعوذ و تسمیہ پڑھا اور اگلی آیت سے پڑھنا شروع کیا۔

"ہم جانتے ہیں کہ تمہیں ان کی بات غمگین کرتی ہے۔"

اس نے بے یقینی سے اس آیت کو دیکھا۔

"ہم جانتے ہیں کہ تمہیں ان کی بات غمگین کرتی ہے، پس بے شک وہ تمہیں نہیں جھٹلاتے، بلکہ وہ ظالم تو اللہ کی نشانیوں کا انکار کرتے ہیں۔" اس نے پھر سے پڑھا اور پھر دم بخود سی ہوکر ایک ایک حرف کو انگلی سے چھونے لگی۔ کیا وہ واقعی ادھر لکھا تھا؟

"اوہ اللہ تعالیٰ۔" اس کے آنسو پھر سے گرنے لگے تھے۔ "آپ کو... آپ کو ہمیشہ پتا چل جاتا ہے، میں... میں کبھی بھی آپ سے کچھ نہیں چھپا سکتی۔" وہ بری طرح رو دی تھی۔ اب کی بار یہ دکھ کے آنسو نہ تھے، بلکہ خوشی کے تھے۔ سکون کے تھے، رضا کے تھے۔

"اگر آپ مجھ سے یوں ہی بات کرتے رہیں تو پھر مجھے جس حال میں بھی رکھیں، میں راضی! میں راضی! میں راضی!" اس نے چہرہ اٹھایا اور ہتھیلی کی پشت سے آنسو صاف کیے۔

اب اسے رونا نہیں تھا۔ اب اسے صبر کرنا تھا، طائف کے پتھر دراصل اب آنے شروع ہوئے تھے۔

صبر اور شکر۔ اس نے ان دو سہاروں کو [illegible] ہی لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

شام بہت سہانی سی اتری تھی۔ کالونی کی صاف سڑک کے اطراف سبز درختوں کے تازہ پتوں کی مہک، ٹھنڈی ہوا سے ہر سو بکھر گئی تھی۔

بلقیس اس کی وہیل چیئر دھکیلتی سڑک کے کنارے آگے بڑھ رہی تھی۔ وہ ساتھ ساتھ ادھر ادھر کی چھوٹی موٹی باتیں بھی کر رہی تھی، مگر محمل کا دھیان کہیں اور تھا۔ وہ گم صم سی دور افق کو دیکھ رہی تھی، جہاں پرندوں کے غول اڑ رہے تھے۔ اس روز کے طوفان کے بعد موسم بہت ٹھنڈا ہوگیا تھا اور اس ٹھنڈی ہوا میں باہر نکلنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔

بلقیس باہر کی [illegible] وہیل چیئر دھکیلتی پارک تک لے آئی تھی۔ اس سے آگے ان کے سیکٹر کا مرکز تھا۔ وہاں بوتیکس، شاپس اور ریسٹورنٹ کی چہل پہل ہوتی تھی اور ایسی جگہوں پہ جاتے ہوئے اس کا دل گھبراتا تھا سو اس نے بلقیس کو آگے جانے سے منع کردیا۔

"بس یہیں پارک تک ٹھیک ہے، اسی میں چلتے ہیں۔"

بلقیس سر ہلا کر وہیل چیئر اندر لے جانے لگی۔

"جب آپ کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا نا محمل بی بی! تو صاحب بہت روئے تھے۔ میں نے خود انہیں روتے دیکھا تھا۔ بہت دھچکا لگا تھا ان کو۔"

"کون؟ ہمایوں؟" وہ چونکی تھی۔

"ہاں جی! انہوں نے چھٹی لے لی تھی، کئی ماہ تو وہ اسپتال میں آپ کے پاس ہی رہے تھے۔ تیمور بابا کو تو بھلا ہی دیا تھا، میں نے بڑا کیا ہے جی تیمور بابا کو۔ بڑا پیارا بچہ تھا ہمارا بابا، جب چار سال کا تھا تو آپ کے لیے پھول لے کر جاتا تھا، اور وہاں اسپتال میں آپ کے سرہانے بیٹھ کر گھنٹوں بولا کرتا تھا۔"

"پھر اب کیا ہوا ہے اسے بلقیس؟" اس نے پوچھا تھا۔ بلقیس آہستہ آہستہ پارک کی پتھریلی روش پہ وہیل چیئر چلا رہی تھی۔ دور گھاس پہ بچے کھیل رہے تھے۔ ایک طرف ایک بچہ ماں کی انگلی پکڑے رو رہا تھا۔ اسے ہر بچے میں اپنا تیمور نظر آرہا تھا۔

"تیمور بابا ایسا نہیں تھا بی بی! وہ تو بہت پیار کرنے والا بچہ تھا، مگر پھر اب پچھلے دو ایک سالوں میں وہ بہت چڑچڑا ہوگیا ہے۔ صاحب بھی تو اسے توجہ نہیں دیتے، بچہ تو چھوٹا ہے، پر اب بہت سمجھ دار ہوگیا ہے، ساری باتیں سمجھتا ہے، اسی لیے سب سے ناراض رہتا ہے۔"

"اور تمہارے صاحب؟ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟"

"پتا نہیں بی بی! وہ شروع میں آپ کا بہت خیال رکھتے تھے، پھر آپ کے حادثے کے چوتھے برس ان کی کراچی پوسٹنگ ہوگئی [illegible] وہاں سے واپس آئے تو بہت بدل گئے تھے جی۔ اب تو ڈیڑھ سال ہوگیا ہے ان کو واپس آئے ہوئے، مگر اب تو وہ آپ کا یا تیمور بابا کا حال بھی نہیں پوچھتے۔"

"کراچی میں ایسا کیا ہوا جو وہ بدل گئے؟" وہ کھوئی کھوئی سی بولی تھی۔

"معلوم نہیں بی بی، مگر..." وہ لمحے بھر کو ٹھٹکی۔ "ان کے کراچی جانے سے کوئی دو ہفتے پہلے کی بات یاد ہے، ادھر آپ کے گھر آپ کے کوئی رشتے دار آئے تھے، ان سے بہت... بہت لڑائی ہوئی تھی صاحب کی۔"

"کون؟ کون آیا تھا؟" اس نے وحشت زدہ سی ہوکر گردن گھمائی۔ بلقیس کے چہرے پہ تذبذب کے آثار تھے۔

"اصل میں بی بی! آپ کے رشتے دار کبھی آئے نہیں، تو وہ جو بس ایک ہی دفعہ آئے تو مجھے یاد رہ گیا، آپ کے تایا کے بیٹے تھے۔"

"کون؟ فو... فواد؟" اس کا دل زور سے دھڑکا تھا۔

"نام وام تو نہیں معلوم، مگر صاحب نے ان سے بہت جھگڑا کیا تھا۔ دونوں بہت دیر تک اونچا اونچا لڑتے رہے تھے۔"

"مگر کیا ہوا تھا؟ جھگڑا کیوں ہوا ان کا؟" وہ مضطرب اور بے چین سی ہوگئی تھی۔

"میں کچن میں تھی بی بی! کچھ سمجھ میں تو نہیں آیا کہ وہ کیوں جھگڑ رہے تھے، مگر شاید کوئی کچہری وغیرہ کا معاملہ تھا اور دونوں آپ کا نام بار بار لیتے تھے۔ پھر صاحب نے فرشتے بی بی کو بھی ادھر بلوالیا۔ وہ پتا نہیں کچھ بولیں یا نہیں، ان کی آواز ہی نہیں آئی مجھے، پھر وہ آپ کے تایا زاد چلے گئے اور صاحب دیر تک فرشتے بی بی پہ چیختے رہے۔ میں کھانے کا پوچھنے گئی تو دیکھا کہ فرشتے بی بی رو رہی تھیں اور اپنا سامان پیک کر رہی تھیں۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ وہ جا رہی ہیں، میں نے پوچھا کہ کدھر تو بولیں پتا نہیں اور روتی جا رہی تھیں، پھر اگلے دن رشید نے بتایا کہ صاحب اپنا ٹرانسفر کراچی کروا رہے ہیں، پھر صاحب چلے گئے اور فرشتے بی بی رک گئیں۔"

وہ دم سادھے ساری تفصیلات سن رہی تھی۔ اس کے پیچھے کیا کیا ہوتا رہا، اسے خبر ہی نہیں ہوسکی۔ کیا فواد نے ہمایوں کو اس کے خلاف بھڑکایا تھا؟ اور فرشتے کو اس نے ایسی کیا بات کہی کہ وہ روئی؟ وہ تو بہت مضبوط لڑکی تھی، یوں کبھی نہیں روتی تھی۔ اس نے تو اس کی آنکھوں میں کبھی آنسو نہیں دیکھے تھے۔" اوہ خدایا!" اس نے سر دونوں ہاتھوں میں گرا لیا۔

وہ کیا کرے؟ کس سے پوچھے؟ فرشتے تو کبھی نہ بتاتی، ہمایوں سے امید بھی نہیں تھی اور تیمور تو اسے دیکھنے کا روادار نہ تھا، پھر کیا کرے؟ صبر اور نماز کا سہارا۔ اس کے دل سے آواز آئی تھی۔

بلقیس کو کوئی جاننے والی مل گئی تو وہ اس سے باتیں بگھارنے ذرا فاصلے پہ جا کھڑی ہوئی تھی۔

محمل نے قرآن اٹھالیا، وہ قرآن لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتی تھی، اسے آہستہ سے کھولا۔ کل جدھر سے تلاوت چھوڑی تھی ان آیات پہ نشان لگا تھا۔ وہ بہت غور سے دھیان سے آگے سے پڑھنے لگی۔

"اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! تم ان چیزوں کے

بارے میں سوال نہ کرو جو اگر ظاہر کردی جائیں تو تمہیں ناگوار ہوں۔" (مائدہ 10)

لمحے بھر کو اس کا دماغ چکرا کر رہ گیا۔ مگر پھر فوراً "خود کو سرزنش کی۔

"یہ کوئی فال نکالنے کی کتاب تو نہیں ہے' اسی لیے اس نے ایسے سوال کرنے سے منع کیا ہے' میں بھی خوامخواہ۔" وہ سر جھٹک کر آہستہ سے آگے تلاوت کرنے لگی۔

اگلی آیات دوسری چیزوں سے متعلق تھیں۔ اس کی سوچوں پہ بالکل خاموش لب ــــ جیسے کسی اور طرف توجہ مبذول کرواتیں۔۔۔ اس کے الجھے دماغ کو سکون آنے لگا۔ جو بھی ہوا' ابھی نہ کبھی کھل ہی جائے گا' اسے پریشان ہونے کی ضرورت نہ تھی۔

وہ زیر لب ترنم سے تلاوت کرنے لگی۔

☼ ☼ ☼

رات کے دو بج چکے تھے اور ہمایوں ابھی تک گھر نہیں آیا تھا۔ وہ مضطرب سی لاؤنج میں بیٹھی تھی۔ بار بار نظر اٹھا کر گھڑی کو دیکھتی اور پھر دروازے کو۔ گھڑی کی سوئیاں آگے بڑھتی جارہی تھیں۔ مگر دروازہ ہنوز ساکت و جامد تھا۔ باہر بھی خاموشی تھی۔

اس کے دل میں وسوسے سے آنے لگے۔ نہ جانے وہ ٹھیک بھی ہے یا نہیں' کیا پتا اس کی گاڑی خراب ہوگئی ہو' کیا پتا کسی مشکل میں پھنس گیا ہو۔ اس نے بے اختیار اس کے لیے دعا کی تھی۔

دفعتاً "گاڑی کا ہارن سنائی دیا اور پھر گیٹ کھلنے کی آواز' وہ مڑ کر دروازہ کو پیاسی نظروں سے دیکھنے لگی۔

قدموں کی آواز اور پھر۔ بھاری چرچراہٹ کے ساتھ دروازہ کھلا' کیپ اور اسٹک ہاتھ میں لیے وہ تھکا تھکا سا یونیفارم میں چلا آرہا تھا۔ اندر داخل ہو کر اس نے مڑ کر دروازہ بند کیا اور پھر چند قدم آگے آیا۔ دفعتاً "اسے بیٹھا دیکھ کر ہمایوں کے قدم تھمے۔ چہرے پہ حیرت بھری ناگواری امڈ آئی۔

"تم ادھر کیوں بیٹھی ہو؟"

"السلام علیکم' آپ کا ویٹ کررہی تھی۔ آپ نے بہت دیر لگادی۔" وہ آہستہ سے بولی تھی۔

"میں دیر سے آؤں یا جلدی آؤں' خدا کے لیے میرے انتظار میں ادھر مت بیٹھا کرو۔"

اس نے بہت تحمل سے اس کا بیزار لہجہ سنا' پھر دھیرے سے بولی۔ "میں پریشان ہوگئی تھی کہ خیریت۔۔۔"

"مر نہیں گیا تھا میں' سو کام ہوتے ہیں' اگر آئندہ تم مجھے ادھر بیٹھی ملیں تو میں گھر ہی نہیں آیا کروں گا۔ خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دو محمل!" وہ جھڑک کر کہتا تیزی سے اوپر سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا۔

اس نے بڑے صبر و ضبط سے آنسو پی لیے' یہاں تک کہ وہ اپنے دروازے کے پیچھے گم ہوگیا۔ تب اس نے گود میں دھرے ہاتھ اٹھائے اور اپنی وہیل چیئر کو کمرے کی طرف موڑنے لگی۔

کبھی تو اسے احساس ہوگا کہ یہ وہی محمل ہے جو کبھی اس کی من چاہی بیوی تھی' اور جب وہ یہ محسوس کرے گا تو پلٹ آئے گا' اسے یقین تھا اور یہ ہی یقین اس کے دل میں اٹھتے درد کو دوا کردیا کرتا۔

☼ ☼ ☼

وہ تارکول کی سڑک پہ آج پھر بلقیس کے ساتھ اپنی وہیل چیئر پہ جارہی تھی۔ باہر کا موسم اس کی طبیعت پہ بہت اچھا اثر ڈالتا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ اس کی معذوری میں رتی برابر بھی فرق نہ آیا تھا۔

بلقیس ادھر ادھر کی باتیں کرتی اس کی وہیل چیئر دھکیل رہی تھی۔ وہ آج بھی اسے نہیں سن رہی تھی' بس خاموش مگر پرسکون نگاہوں سے دور افق کو دیکھ رہی تھی۔ آہستہ آہستہ یہ ٹھہراؤ اس کی شخصیت کا حصہ بنتا جارہا تھا۔

"بلقیس۔۔۔ تمہیں میرے تایا کے گھر کا پتا ہے؟"

ایک دم ہی کسی خیال کے تحت وہ چونکی اور پھر پوچھ لیا۔

"نہ بی بی! میں تو ادھر کبھی نہیں گئی۔"

"اچھا۔۔۔ مگر مجھے راستہ یاد ہے' تم مجھے ادھر لے چلو

گی؟"

"پیدل؟" وہ حیران ہوئی۔

"ہاں زیادہ دور نہیں ہے' جتنا فاصلہ یہاں سے مرکز تک کا ہے اتنا ہی ہے' میں پیدل بھی آجایا کرتی تھی۔"

اسے بے اختیار وہ شام یاد آئی جب وسیم سے اپنے رشتے کا سن کر وہ روتی ہوئی پیدل ہی مدرسے کے سامنے سڑک پہ آگئی تھی' اور اس نے ہمایوں سے کہا تھا کہ وہ بیچ راہ میں چھوڑ دینے والوں میں سے نہیں ہے اور پھر۔۔۔

"چلیں پھر ٹھیک ہے' آپ راستہ بتائیں۔" بلقیس کی آواز پہ وہ یادوں کے ہجوم سے نکلی اور راستہ بتانے لگی۔ چھوٹی سڑک سے ایک راستہ پل سے ہوتا ہوا ان کے سیکٹر میں جا اترتا تھا' جس سے وہ بیس منٹ میں ادھر پہنچ سکتی تھیں۔

آج وہ بیس منٹ ایک پوری صدی لگ رہے تھے۔ وہ اس راستے پہ چونے سے دور کہیں کھوئی تھی۔ نہ جانے وہ سب کیسے ہوں گے؟ اتنے سال عیش و آرام سے رہ رہے ہوں گے جیسے پہلے رہتے تھے؟ یا ان میں سے کسی نے اس کو یاد بھی کیا ہوگا؟ کبھی وہ اپنے تایا بھی آئے ہوں گے یا نہیں؟ اور نہ جانے فواد نے جاکر ہمایوں سے کیا کہا تھا جس پہ فرشتے روتی رہی؟ بہت یاد کرنے پہ بھی ایسی کوئی بات ذہن میں نہیں آئی جو وہ ہمایوں سے یوں کہہ سکتا تھا یا شاید اس کی سوچنے کی صلاحیت اب سست ہوتی جارہی تھی۔

"یہ آپ کا گھر ہے بی بی؟ بڑا سوہنا ہے۔"

بلقیس کہہ رہی تھی اور وہ چونک کر اس اونچے عالیشان محل نما گھر کو دیکھنے لگی اس کا پینٹ' کھڑکیوں کے شیشے اور بیرونی گیٹ بدل گیا تھا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ خوب صورت ہوگیا تھا۔

یہ وہ گھر تھا جہاں اس نے اپنی زندگی کے اکیس سال گزارے تھے اور پھر اسی سے وہ ایک رات نکالی گئی تھی۔ بظاہر رخصتی کی آڑ میں اسے اس گھر سے بے دخل کردیا گیا تھا۔

"بیل بجاؤ بلقیس!"

بلقیس آگے بڑھی اور گھنٹی بجائی۔ چند ہی لمحوں بعد قدموں کی چاپ سنائی دی' جیسے کوئی دوڑتا ہوا گیٹ کھولنے آرہا ہو۔ اس کے دل کی دھڑکن ٹھہری گئی۔ وہ اتنے سالوں بعد کسے دیکھنے جارہی تھی؟ فواد؟ حسن؟ آغا جان؟

دروازہ آہستہ سے کھلا اور کسی نے سر باہر نکال کر دیکھا۔

"جی کس سے ملنا ہے؟" وہ حلیے اور لہجے سے ملازم لگتا تھا۔

بلقیس نے جواباً "محمل کو دیکھا تو وہ ہمت مجتمع کرکے بولی۔

"آغا کریم گھر پہ ہیں؟"

ملازم کے چہرے پہ ذرا سی الجھن ابھری۔

"کون آغا کریم؟"

"آغا۔۔۔ آغا کریم جو اس گھر کے مالک ہیں' جن کا یہ گھر ہے۔۔۔ اور یہ ہاؤس نمبر تو ٹھیک ہے نا؟"

"آہو جی یہ تو ٹھیک ہے' مگر یہ تو چوہدری نذیر صاحب کا گھر ہے۔ ادھر تو کوئی آغا کریم نہیں رہتے۔"

"جی بی بی کہیں ہم غلط گھر میں تو نہیں آگئے؟" بلقیس نے ہولے سے کہا تو اس نے سختی سے نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں' یہ ہی گھر ہے' آغا کریم سات سال پہلے ادھر ہی رہتے تھے۔"

"سات سال تو بڑا لمبا عرصہ ہوتا ہے میڈم جی' خدا جانے وہ اب کدھر گئے ہوں۔ اچھا آپ ٹھہرو' میں بیگم صاحبہ سے پوچھ کر آتا ہوں۔" وہ انہیں وہیں چھوڑ کر اندر چلا گیا۔ چند لمحوں بعد اس کی واپسی ایک نوجوان کے ہمراہ ہوئی۔

"جی فرمایئے؟" وہ بیس اکیس برس کا مہذب اور شائستہ سا نوجوان تھا۔

"وہ۔۔۔ ادھر آغا کریم اور ان کی فیملی رہتی تھی۔ وہ لوگ کدھر گئے؟"

"میم! ہم دو سال سے ادھر رہ رہے ہیں' دو سال پہلے ہم نے ایک شیخ عامر صاحب سے یہ گھر خریدا تھا۔ ہوسکتا ہے ان کو آغا کریم نے یہ بیچا ہو' مگر میں ان کے

بارے میں قطعی لاعلم ہوں۔"

"آغا جان نے یہ گھر بیچ دیا؟ مگر کیوں؟" وہ شاکڈ سی رہ گئی۔

"معلوم نہیں میم! کیا میں آپ کے لیے کچھ کر سکتا ہوں؟"

اس کا سر نفی میں دائیں سے بائیں ہلا۔ لڑکا معذرت کر کے واپس چلا گیا اور وہ پریشان سی بیٹھی رہ گئی۔

"بی بی! ہمسایوں سے پوچھتے ہیں۔" اور اس کے منع کرنے سے قبل ہی بلقیس ساتھ والے گھر کی گھنٹی بجا چکی تھی۔ اس گھر میں کون رہتا تھا؟ خاصا جانا پہچانا سا گھر تھا مگر یاد نہیں آ رہا تھا۔

بمشکل ایک منٹ بعد ہی گیٹ کھل گیا۔ محمل نے گردن اٹھا کر دیکھا۔

ادھ کھلے گیٹ کے اس پار بریگیڈیئر فرقان کھڑے تھے۔

شلوار قمیص میں ملبوس، چہرے پہ نفاست سے تراشیدہ داڑھی اور بھرپور مسکراہٹ لیے وہ اسے دیکھ رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر اسے بہت کچھ یاد آنے لگا۔

"السلام علیکم لٹل گرل! میں کافی دیر سے آپ کو ٹیرس سے دیکھ رہا تھا۔ آیئے اندر آ جائیں۔" انہوں نے گیٹ پورا کھول دیا اور ایک طرف کو ہٹ گئے۔

بلقیس اس کی وہیل چیئر دھکیلتی اندر روش پہ لے آئی۔

"ادھر آ جایئے۔" وہ لان میں گھاس پہ رکھی لان چیئرز کو جوڑنے لگے، یوں کہ وہیل چیئر کی جگہ بن جائے۔

"کیسی ہیں آپ؟" وہ اس کے سامنے والی کرسی پہ بیٹھے اور بہت شائستگی سے پوچھنے لگے۔ ان کا مخصوص لب و لہجہ اسی طرح بھاری تھا، البتہ سختی کی جگہ نرمی نے لے لی تھی۔

"ٹھیک ہوں، الحمدللہ۔" وہ ذرا سا مسکرائی اور سر جھکا لیا، پھر کچھ سوچ سوچ کر اسی جھکے سر کے ساتھ کہنے لگی۔ "میرا کچھ سال پہلے ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا، تو۔۔۔"

"میں جانتا ہوں، میں آپ کو دیکھنے اسپتال آتا تھا۔"

اس نے ہولے سے سر اٹھایا۔ سنہری آنکھوں میں حیرت اتر آئی تھی۔

"اچھا؟" اور پھر اسے یاد آ گیا۔ "ہاں مجھے نرس نے بتایا تھا۔ تو وہ آپ تھے؟"

"جی ہاں۔" وہ دھیمے سے مسکرائے۔ "آپ کی امانت نے میری زندگی بدل دی بیٹا۔"

وہ یک ٹک حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"میں نے دو سال وہ پمفلٹ نہیں کھولے، پھر زندگی میں ایک موڑ ایسا آیا کہ ہر جگہ اندھیرا دکھنے لگا تو نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے ان کو کھول لیا۔ میرا خیال تھا، ان میں کسی [illegible] کا منشور [illegible] تو صرف قرآن کی آیات تھیں اور ان کا سادہ ترجمہ۔ میں پڑھتا گیا اور پھر۔۔۔ پھر سب بدل گیا، سب ٹھیک ہو گیا۔"

مختصر الفاظ میں انہوں نے ساری بات سمیٹ دی۔ وہ چپ چاپ انہیں سنتی گئی۔

"آپ کچھ عرصہ پہلے گھر شفٹ ہو گئی تھیں، مجھے پتا چلا تھا۔ اب طبیعت کیسی ہے آپ کی؟"

"الحمدللہ۔" پھر لمحے بھر کے توقف کے بعد بولی۔ "آغا جان وغیرہ کدھر گئے؟ انہوں نے گھر کیوں بیچ دیا؟"

"جن دنوں وہ گئے تھے میں ملک سے باہر تھا، بس ملازم سے ہی تھوڑا بہت سنا تھا کہ شاید تینوں بھائیوں نے جائیداد کا بٹوارہ کیا ہے اور گھر بیچ کر رقم تقسیم کر کے الگ الگ جگہوں پہ شفٹ ہو گئے ہیں۔ آپ کے ایکسیڈنٹ کا بھی میرے ملازم نے ہی بتایا تھا۔"

"کب کی بات ہے یہ؟ کب بیچا انہوں نے گھر؟"

"آپ کے ایکسیڈنٹ کے تقریباً سال ڈیڑھ بعد۔"

"اوہ!" اس کے لب سکڑے اور پھر اس نے گہری سانس لی۔ "کوئی اندازہ ہے آپ کو کہ وہ کہاں گئے؟ میں ان سے کبھی ملی۔"

"اونہوں، قطعی نہیں۔" انہوں نے معذرت خواہانہ انداز میں سر نفی میں ہلایا۔ "ہمارے کبھی اتنے تعلقات تھے ہی نہیں، ہاں آغا اسد کے بارے میں میں نے ایک دوست سے سنا تھا۔ وہ کلب میں آغا اسد کے ساتھ ہوتا تھا۔"

ان کے الفاظ پہ وہ چونکی، دل زور سے دھڑکا۔

"کیا؟ کیا سنا تھا؟"

"یہی کہ ان کو کینسر ہو گیا تھا، اور پھر ان کی ڈیتھ ہو گئی۔ آپ کو نہیں پتا چلا؟"

وہ سانس روکے ہکا بکا سی بیٹھی رہ گئی۔

"آئی ایم ویری سوری محمل۔" "نہیں افسوس ہوا۔"

"کب؟ کب ہوا یہ؟" چند لمحے بعد اس کے لب پھڑپھڑائے، آنکھیں بھرائی ہوئی تھیں۔

"غالباً پانچ سال ہوا، ان کے گھر بیچنے کے چھ ماہ بعد۔"

"اور۔۔۔ اور ان کے بچے؟ معاذ اور معیز تو بہت چھوٹے تھے۔"

"معلوم نہیں۔ یتیم بچے تو پھر مجبوراً رشتہ داروں کے تسلط میں ہی رہتے ہیں۔ اللہ ان پہ رحم کرے۔"

اور وہ لفظ "یتیم بچے" محمل کے دل میں کھب گیا۔ بہت پہلے پڑھی گئی ایک آیت ذہن میں گونجی۔ "ان لوگوں کو اس بات سے ڈرنا چاہیے کہ اگر وہ اپنے پیچھے کمزور یتیم اولاد چھوڑ جاتے۔" (النساء 9)

"یتیم بچے؟ اسد چچا کے بچے یتیم ہو گئے؟ آرزو، معاذ، معیز۔" وہ ابھی تک بے یقین تھی۔

اور پھر کب وہ بریگیڈیئر فرقان کو خدا حافظ کہہ کر بلقیس کے ہمراہ باہر آئی، اسے کچھ پتا نہ چلا۔ دل و دماغ بس ایک ہی نقطے پہ منجمد ہو گئے تھے۔ اسد چچا کے بچے یتیم ہو گئے۔

بے اختیار اسے اس لاؤنج کا وہ منظر یاد آیا۔ صوفے پہ گری محمل اور اس کو تھپڑوں اور جوتوں سے مارتے اسد چچا اور غفران چچا۔

غفران چچا۔۔۔ نہ جانے وہ کہاں گئے؟ اور آغا

جان۔۔۔ سب کدھر چلے گئے؟ وہ ان لوگوں کو کدھر ڈھونڈے؟

مگر وہ ان کو کیوں ڈھونڈنا چاہتی تھی؟ اس نے خود سے پوچھا۔ کیا وہ یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ ان کو ان کے کیے کی سزا ملی یا نہیں کہ آخر یہ قانون فطرت ہے۔ یا وہ ان خون کے رشتوں کی محبت میں ان کو یاد کر رہی تھی؟ شاید خون کی محبت غالب آ گئی تھی یا شاید اپنے سب سے قریبی رشتوں شوہر اور بیٹے کے ٹھکرائے جانے کے بعد اسے کسی رشتے کی ضرورت تھی، ہاں شاید یہ ہی بات تھی۔

وہ ان ہی سوچوں میں الجھتی گھر واپس آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

سارے میں فجر اتری تھی جب وہ وہیل چیئر کو خود گھسیٹتی، کھینچتی لان میں آئی۔ شبنم کے قطرے گھاس پہ بکھرے تھے۔ دور کہیں پرندوں کی حمد کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ مختلف بولیاں، مگر ایک ہی بات انسانوں کی سمجھ میں نہ آئے، وہ اور بات ہے۔

تب ہی وہ آہستہ آہستہ وہیل چیئر چلاتی دیوار کے ساتھ آگے بڑھنے لگی۔ دیوار کے اس پار مدرسے کی عمارت تھی۔ صبح کے وقت مدرسے کے صحن میں بچوں کی ناظرہ کلاس ہوتی تھی۔ وہاں بچے بلند آواز میں قرآن پڑھا کرتے تھے۔ ان کی تجوید کی ہلکی ہلکی آواز ان کے لان میں بھی سنائی دیتی تھی۔

وہ آواز آج بھی آ رہی تھی۔ وہ وہیں، دیوار کے ساتھ وہیل چیئر روکے کان لگا کر سننے لگی۔

وہ سب مل کر بلند آواز سے پڑھ رہے تھے۔

ترجمہ: "اور داخل ہو جاؤ دروازے سے سجدہ کرتے ہوئے اور کہو حطۃ۔ ہم تمہارے گناہ بخش دیں گے اور عنقریب ہم احسان کرنے والوں کو زیادہ دیں گے۔"

آج اس نے بہت عرصے بعد وہ آیت سنی تھی۔

بے اختیار وہ گود میں رکھے قرآن کے صفحے پلٹنے لگی۔

وہ بنی اسرائیل کے ہیکل میں داخل ہونے کا قصہ تھا۔ سورۃ البقرہ کی 58 آیت جب انہوں نے حطۃ کے بجائے حنطۃ کہا تھا۔ محمل کو کبھی یہ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ اب بھی نہ آیا، جب اس نے اردو ترجمہ پڑھا۔

اس میں اس نے کوئی خاص نوٹس نہیں لکھے تھے۔ شاید پرانے رجسٹر میں ہوں جو الگ سے تھے۔ اس نے اپنی وہیل چیئر کا رخ موڑا اور اندر لے گئی۔ اسٹڈی میں ایک جگہ اس نے اپنے پرانے نوٹس رکھے تھے۔ وہ ان ہی کو ڈھونڈتے اسٹڈی میں آئی۔ دروازہ ادھ کھلا تھا، وہ اندر آ گئی۔

ہمایوں اس کی طرف پشت کیے ریک میں سے کوئی کتاب نکال رہا تھا۔ آہٹ پہ پلٹا۔ ایک نظر اسے دیکھا اور پھر واپس کام میں لگ گیا۔ اجنبیت، سرد مہری، بے حسی، مگر زیادہ دل جلائے بغیر وہ کمرے کے مطلوبہ حصے کی طرف بڑھ گئی۔

[illegible] رکھے تھے۔ [illegible] کی صفائی کی جانی رہ گئی ہو۔ فاطمہ بی تو ہر ہفتے کیا کیا کرتی تھیں۔ اسے کسی دن اسٹڈی کی صفائی کروانا چاہیے۔ وہ سوچتی ہوئی مطلوبہ رجسٹر ڈھونڈنے لگی۔

بغیر کسی دقت کے اسے وہ رجسٹر سامنے ہی مل گیا۔ اس پہ بھی ہلکی سی گرد کی تہہ جمی تھی۔ محمل نے رجسٹر چہرے کے سامنے کیا اور پھونک ماری۔ گرد اڑ کر دور بکھر گئی۔

"میں تمہیں چھوڑنا چاہتا ہوں۔" وہ بنا کسی تمہید کے کھڑے کھڑے کتاب کے صفحے الٹ پلٹ کرتے بولا تھا۔

لمحے بھر کو محمل کو لگا وہ دھول مٹی رجسٹر سے اڑ کر ہر طرف چھانے لگی ہے۔ اس نے بمشکل رخ موڑ کر اسے دیکھا۔ وہ بے نیاز سا کتاب کے ورق پلٹ رہا تھا۔

"میرا مطلب مکمل علیحدگی سے ہے۔ میں اب یہ رشتہ مزید نہیں نبھانا چاہتا۔ سو مجھے اپنے پیروں کی زنجیر کھولنے دو۔ سنی ہم دونوں کا بیٹا ہے اور سات سال کا ہو چکا ہے۔ اس کی کسٹڈی اسے خود ڈیسائیڈ کرنے دو۔"

گرد دھول شاید اس کی آنکھوں میں بھی پڑ گئی تھی۔ وہ سرخ پڑنے لگی تھیں۔ وہ لب کچلتی اس کی بات سن رہی تھی۔

"اگر سنی تمہارے ساتھ رہنا چاہے تو میں اسے مجبور نہیں کروں گا کہ وہ میرے ساتھ رہے اور اگر وہ میرے ساتھ رہنا چاہے تو تم اسے مجبور مت کرنا، جو بھی فیصلہ کرو، مجھے بتا دینا، لیکن میں فیصلہ کر چکا ہوں۔" اس نے کتاب ریک میں واپس رکھی اور بنا اس کو دیکھے لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔

وہ شدید صدمے کے زیر اثر پتھرائی وہیں بیٹھی رہ گئی۔

کیا ہمایوں اس طرح اسے اپنی زندگی سے دور کر سکتا ہے؟

"اگر کرتا ہے تو کرنے دو، میں مر نہیں جاؤں گی اس کے بغیر۔" ایک دم اس نے سر جھٹکا۔

[illegible] اور بنا [illegible] ہے۔

ہم زبان سے وہ ہی کہیں گے جس پہ ہمارا رب راضی ہو۔

بے اختیار ہی وہ مدھم سی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔ اس کے دل کو جیسے قرار سا آ گیا۔

اس نے رجسٹر کھولا۔ نوٹس میں اس واقعے کے متعلق بس اتنا لکھا ہوا تھا کہ ہیکل میں داخلے سے قبل جب بنی اسرائیل کو کہا گیا کہ سواریوں پہ جھکتے ہوئے عاجزی سے حطۃ یعنی "بخشش" کہتے ہوئے داخل ہو، تو وہ مسکراتے ہوئے زبانیں موڑ کر حنطۃ حنطۃ (Hinta,tun) کہتے ہوئے دروازے سے داخل ہوئے آگے لکھا تھا۔

"حنطۃ کا مطلب ہوتا ہے گن۔" اس سے آگے صفحہ ختم تھا۔

اس نے ذہن سے تمام سوچوں کو جھٹک کر ان الفاظ پہ غور کیا اور پھر نئے سرے سے الجھ گئی۔ وہ واقعہ اسے بہت عجیب سا لگ رہا تھا۔۔۔ بنی اسرائیل جتنی جینیئس اور عقل مند قوم نے ایسا کیوں کیا؟ انہوں نے گن کس چیز کو کہا؟ جب ان کو سیدھے طریقے سے بتایا گیا تھا کہ وہ بخشش مانگیں تو انہوں نے "گن گن" کیوں کہا؟ ایک طرف وہ اتنے ذہین تھے کہ حطۃ سے ملتا جلتا لفظ ڈھونڈ لائے، اور دوسری طرف اس لفظ کو کہنے کا مطلب ہی نہیں بنتا تھا۔ آخر کیوں انہوں نے صحیح لفظ نہ بولا؟ حنطۃ کیوں کہا؟

وہ سمجھ نہ پائی اور پھر قرآن بند کر کے رکھ دیا۔ دل اتنا خالی تھا کہ تفسیر کھول کر تفصیل پڑھنے کو بھی نہیں چاہا۔ کانوں میں ابھی تک ہمایوں کے الفاظ گونج رہے تھے۔

ایک آنسو اس کی آنکھ سے نکلا اور رخسار پہ پھسلتا گیا۔

"تو جس حال میں بھی رکھے، میرے مالک، میں تجھ سے راضی۔" اور نہایت بے دردی سے اس نے ہتھیلی کی پشت سے آنسو رگڑ ڈالا تھا۔

☼ ☼ ☼

تیمور توس کے چھوٹے چھوٹے لقمے لے رہا تھا۔ ڈائننگ ٹیبل پہ اس کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔

وہ اپنی وہیل چیئر گھسیٹتی ڈائننگ ہال میں داخل

"میں آپ کے باپ کی نوکر ہوں جو یہ کروں؟"

اس کے مخاطب بہت سے چہرے تھے' کبھی ماں' کبھی مہتاب' کبھی مسرت' کبھی کزنز تو کبھی کوئی چچا۔

اسے وہ منہ پھٹ' بدمزاج اور تلخ لڑکی یاد آئی اور اس کا رواں رواں کانپ اٹھا۔

"ہاں... جو اپنے بڑوں سے جیسا کرتا ہے' اس کے چھوٹے بھی اس کے ساتھ ویسا ہی کرتے ہیں۔" کوئی اس کے اندر بولا تھا۔

راستہ ایک ہی ہے' اس پہ انسان ایک وقت تک چلتا ہے' اور پھر آخر وہ واپس اپنے قدموں کے نشانوں پہ لوٹتا ہے' جو ببول اگا کر جاتے ہیں' ان کو لہولہان کرنے والے کانٹے ہی ملتے ہیں اور جنھوں نے پھول بکھیرے ہوں ان کا انتظار گلستان کر رہے ہوتے ہیں۔"

"محمل!" کسی نے پکارا تو وہ خیالوں سے جاگی' اور پھر سختی سے اپنی آنکھیں رگڑیں۔

"کیا میں نے ٹھیک سنا؟" فرشتے جیسے بے یقینی سی اس کے سامنے آئی۔

"کیا؟" اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے سر اٹھایا۔

"محمل! تم اور ہمایوں... تم الگ ہو رہے ہو؟" وہ متحیر سی کہتی اس کے سامنے زمین پہ گھٹنوں کے بل بیٹھی اور دونوں ہاتھ اس کے گود میں دھرے ہاتھوں پہ رکھے۔

"ہاں... شاید۔"

"تو... مگر تم نے ایسا فیصلہ کیوں کیا؟" وہ مضطرب سی اس کی آنکھوں میں دیکھتی جواب تلاش کر رہی تھی۔

"میں نے نہیں کیا... ہمایوں نے کیا ہے۔"

"کیا اس نے خود تمہیں ایسا کہا ہے؟"

"ہاں..."

"تو... تم نے مان لیا؟" وہ بے یقین تھی۔

"میرے پاس چوائس بچی ہے کیا؟"

فرشتے ٹکر ٹکر اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ہوئی تو وہ آہٹ پہ چونکا۔ لقمہ توڑتے چھوٹے چھوٹے ہاتھ رکے اور سر اٹھایا۔ محمل کو آتے دیکھ کر اس کے ماتھے پہ بل پڑ گیا۔ اس نے توس کا بچا ٹکڑا زور سے پلیٹ میں واپس پھینکا اور کرسی پیچھے کو دھکیلی۔

"بیٹھو تیمور! مجھے تم سے بات کرنا ہے۔"

"آئی ڈونٹ وانٹ ٹو ٹاک ٹو یو۔" (میں آپ سے بات نہیں کرنا چاہتا) وہ کرسی دھکیل کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"مگر مجھے کرنا ہے اور یہ تمہارے ڈیڈ کا میسج ہے' میرا نہیں۔"

"واٹ؟" وہ لمحے بھر کو رکا' ماتھے پہ بل اور بھنویں تنی ہوئی۔

"شاید میں اس گھر سے چلی جاؤں' شاید اب ہم ساتھ نہ رہیں' میں اور تمہارے ڈیڈی۔"

"آئی ڈونٹ کیئر!"

"تیمور! تم کس کے ساتھ رہنا چاہو گے؟ میرے ساتھ یا ڈیڈی کے ساتھ؟" وہ جانتی تھی کہ تیمور کا جواب کم از کم اس کے حق میں نہیں ہو گا' پھر بھی پوچھ لیا۔

"کسی کے بھی ساتھ نہیں۔" اس نے بے زاری سے شانے اچکائے تھے۔

"مگر بیٹا! آپ کو کسی کے ساتھ تو رہنا ہی ہو گا۔"

"میں آپ کا نوکر ہوں جو کسی کے ساتھ رہوں؟ جسٹ لیو می الون۔" وہ ایک دم زور سے چیخا تھا اور پھر کرسی کو ٹھوکر مارتا اندر چلا گیا۔

وہ تاسف سے اسے دور جاتے دیکھتی رہی۔ یہ تلخ لہجہ' یہ بدمزاجی' یہ اندر بھرا زہر۔ یہ کس نے تیمور کے اندر ڈالا۔

اور اس سے پہلے کہ وہ اس کے باپ کو موردِ الزام ٹھہراتی' ایک منظر سا اس کی نگاہوں کے سامنے بننے لگا۔

جینز کرتے میں ملبوس' اونچی پونی ٹیل والی ایک لڑکی چہرے پہ ڈھیروں بے زاری سجائے چلا رہی تھی۔

ہو رہے کا وقت تھا۔

سرمئی آسمان کے چہرے پر نیلاہٹوں کا منظر اتنا کرب ناک نہیں تھا جتنا کہ اس کے بدن سے اٹھنے والی ٹیسوں میں تھا۔ رات ہی وہ یہاں پہنچی تھی۔ اماں نے زخموں کی ٹکور کر دی تھی۔ ظاہری زخموں پر مرہم کے بجائے رکھ کر ان کا دکھ مندمل کیا جا سکتا ہے لیکن روح کے آبلوں کی گنتی کس نے کی تھی اور اس درد کا تو درماں بھی کوئی نہیں تھا۔

اسے ہر بار یہ لگتا تھا کہ اس کی آنکھوں کے سوتے خشک ہو گئے ہیں کناروں پر نمی کی جگہ اب کائی جمنے کو ہے لیکن جیسے ہی روح میں بگاڑ بڑھتا کنارے پھر سے بھیگنے لگتے تھے۔ نو برس ہو گئے تھے اسے قسمت کا لکھا صبر و شکر سے قبول کیے لیکن انسان ہی تھی پتھر تو نہیں... درد بھی ہوتا تھا' آنکھ بھی برس جاتی تھی۔

اس کے بس میں ہوتا تو وہ پتھر بھی بن کے دیکھتی لیکن یہ اس کے کرنے کا کام نہیں تھا۔ اپنے لئے اذیت اور اذیت پسند شوہر کے لیے گئے ہر درد کو سہہ کر بھی وہ مٹی کی مورت ہی رہی تھی جو ذرا سی بے اعتنائی پہ ٹوٹ جاتی اور پھر خود کو سمیٹ کر اپنے آپ جڑ جاتی تھی۔

"ہم مر گئے ہیں کیا؟ اس کم بخت نے تجھے وارث سمجھ رکھا ہے' جو کھلی چھوٹ مل گئی ہے اسے۔" ابا نے اسے میکے آنے کا حکم صادر کر دیا تھا۔ ماں بات کو سنبھالنا چاہتی تھی' تاہم بیٹی کا دکھ بھی نہیں دیکھا جاتا تھا۔ چاروناچار اسے گھر کی دہلیز چھوڑنا پڑی۔

"اپنی مرضی سے جا رہی ہے تو... یہ مت سوچنا کہ میں زن مریدوں کی طرح تیرے پیچھے دم ہلاتا آؤں گا۔ جس منہ سے جا رہی ہے اسی کے ساتھ واپس آنا...۔" ثاقب نے صاف کہہ دیا تھا۔ اس کے اندر اتنے آنسو جمع نہ ہو گئے ہوتے تو وہ ہمیشہ کی طرح اپنا فیصلہ پھر سے بدل دیتی مگر اب وہ راہِ فرار چاہتی تھی۔

اپنے تین چھوٹے چھوٹے بچوں کو چھوڑ کر آنا کس قدر کرب ناک تھا تاہم اس نے بے دردی سے ممتا کا گلا گھونٹ دیا تھا' اس کا چھوٹا بھائی اسے جا کر لے آیا

سدرہ سحر عمران

تھا۔ اس کی بھابھیاں سلام دعا کر کے اپنے اپنے کمروں میں جا کر بند ہو گئی تھیں انہیں خدشات لاحق تھے کہ کہیں وہ یہاں مستقل ڈیرا نہ جما لے... اپنے خرچے نہ پورے ہوتے تھے ہم پیسے میں ایک مستقل اضافی خرچ...

رات سے وہ خاموش سی تھی۔ اماں کی باتوں پر ہوں ہاں کرتی رہی۔ بدن کو آرام کی حاجت تھی' آرام مل گیا تھا' لیکن نیند پھر بھی کروٹیں بدلنے پر اکساتی رہی تھی۔

"ہٹے ہٹے... انسان ہے یا درندہ... ظالم آدم خور نہ ہو تو۔" اماں نے اس کی نیلوں نیل کمر پر دوا لگاتے ہوئے اشک پیے تھے۔

"مرد کا ہاتھ پہلی بار میں ہی روک دینا چاہیے' ایک بار اٹھ جائے تو پھر اٹھتا ہی چلا جاتا ہے۔"

"کیسے روک دیتی اماں! مجھے تو نے دیا ہی کیا تھا' ڈر' خوف کے سوا' ابا بھی ایسے ہی تھے' میں بچپن سے ان سے ڈرتی رہی۔ کبھی کھل کر فرمائش نہ کر سکی۔ یہ ڈر اور خوف میری گھٹی میں پڑ گیا تھا۔ ابا کہتے تھے زیادہ زبان درازی کی تو گدی سے زبان کھینچ لوں گا اور میں اسی زبان کھینچ جانے کے خوف سے گونگی بن گئی۔" وہ رو نہیں رہی تھی لیکن اس کے لفظوں میں بین ضرور تھا۔ "پھر نصیب سے شوہر بھی ایسا ہی ملا... جس نے اپنی مردانگی کا پرچم بلند رکھنے کے لیے مجھے قدموں میں رول دیا۔ پہلی بار میری ساس نے معمولی سی بات پر ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا کہ میں نے اس کی پسند کے کپڑے کیوں نہ پہنے دعوت میں۔ بات کچھ بھی نہیں تھی لیکن اس کے واویلے... ابھی سے اپنی مرضیاں کرنے لگی ہے دو دن ہوئے اس گھر میں آئے... اور ثاقب نے وہیں مجھے سب کے سامنے گالم گلوچ سے نوازنا شروع کر دیا۔ میں نے صفائی پیش کرنا چاہی کہ اس کے ساتھ کی تمیز نہیں ملی تجھے... اور جواب میں ثاقب نے تھپڑ رسید کر دیا' میں حیرت سے گنگ ہو گئی تھی اماں کہ اتنی سی بات پر خاندان بھر کے سامنے... لیکن اسے اپنے کیے پر ندامت نہیں تھی۔ دعوت میں تو کیا جانا تھا۔ ساس نے میرا ناطقہ بند کر دیا اور پھر میں دبتی چلی گئی۔ میری شخصیت مسخ ہو کر رہ گئی پر ثاقب کو چین نہیں ملا۔ پرسوں بھی تو چھوٹی سی بات ہوئی تھی۔ میں اس کے سرہانے پانی کا جگ رکھنا بھول گئی تھی۔ اسے خود سے پانی پینا پڑ گیا تھا اٹھ کر... اور اس نے آدھی رات کو مجھے نیند سے اٹھا کر اس غفلت کی توجیہہ مانگی... وہ گھٹنوں میں سر دیے کر سسکنے لگی تھی۔"

"نہ رو میری بچی... ایسے ظالموں کو اللہ کی پکڑ سے پناہ نہیں ملتی۔" وہ اور بھی تسلی و تشفی دیے رہی تھیں لیکن اس کی سماعتوں میں ثاقب کا غلیظ لہجہ گونج رہا تھا بس۔

☼ ☼ ☼

ایک ماہ پلک جھپکتے گزرا تھا۔ اس کا اپنے بچوں سے بھی کوئی رابطہ نہ تھا۔ وہ ممتا کے ہاتھوں مجبور ہو کر تڑپتی کلستی رہتی لیکن ماں باپ بھی بضد تھے کہ ثاقب کو ایک بار ہاتھ لگوانے ہیں تاکہ وہ بندے کا پتر بن سکے' پر جن کے ضمیر میں ہی سنگ دلی ہو وہ نرم خو کب ہوتے ہیں۔

اس روز ان کے ہاں خالہ نفیسہ آئی تھیں۔ وہ اس کی ہمسائی تھیں۔ اسے بچوں کا ہی پیغام دینے آئی تھیں کہ ماں کی جدائی میں وہ بالکل ہی سوکھ کر کانٹا ہو گئے تھے۔ باپ سارا دن نوکری میں کھپا رہتا۔ دادی اور پھوپھیوں کو اپنے ... سے ہی فرصت نہیں تھی۔ انہیں کون پوچھتا۔ اس کا دل مسل کر رہ گیا تھا سینے میں۔

"تو نے گھر چھوڑ کر اچھا نہیں کیا فاطمہ! مائیں تو بچوں کی خاطر زمانے بھر کی تنتیاں جھیلتی ہیں۔ سو بال سب ہی یہ کہتے ہیں کہ تجھے اپنے بچوں کا تو سوچنا چاہیے تھا۔ انہیں تیرے علاوہ کون پوچھے گا؟ باپ تو ہے ہی پتھر دل... ماں بھی چھوڑ کر چلی آئی۔ ان کا کیا قصور... بے چارے دادی پھوپھیوں کی چاکریاں کر رہے ہیں۔ کبھی اسکول چلے جاتے ہیں کبھی نہیں۔ باپ کو کوئی پروا نہیں اور تو بھی..."

اسے ان کی بات سن کر برا نہیں محسوس ہوا تھا کیونکہ کم و بیش ان کے گھر آنے والی تمام خواتین کا تجزیہ و تبصرہ یہ ہی ہوتا تھا کہ اسے گھر چھوڑ کر نہیں آنا چاہیے تھا۔

"کیا میں نے اپنی خوشی سے اپنا گھر چھوڑا ہے؟" وہ خود سے بھی سوال کرتی مگر جواب ندارد...

لوگ تو مشورے دے جاتے ہیں خوشی خوشی...

... پر کیا بیتتی ہے' انہیں کیا سروکار... اپنا دکھ آپ ہی سہنا پڑتا ہے۔ وہ چلی گئی تھیں اور اسے اپنے معصوم بچے یاد آنے لگے۔ واقعی ان کا کیا قصور تھا۔

☼ ☼ ☼

"توبہ توبہ! اس قدر مہنگائی... آگ لگی ہوئی ہے ہر شے کو۔" اس کے بڑے بھائی کا پسندیدہ موضوع مہنگائی تھا جس پر وہ روزانہ گھنٹہ بھر تقریر کرتے اپنے بچوں کے لاڈ نکلے یہ خوشی پورا کرتے اور اس کے لیے یا اماں کے لیے کوئی چیز لے آتے تو مہنگائی نامہ شروع ہو جاتا۔

"یہ سیب لایا ہوں تیرے لیے سو روپے کلو ہیں... کھا کر جان شان بنا تھوڑی سی۔" انہوں نے شاپر تخت پر رکھا تھا اور فاطمہ جانتی تھی کہ اسے ایک آدھ سیب ہی ملے گا' باقی اس کی بھابھی فریج میں سے ... رات کو اپنے کمرے میں چھپا کر رکھ دیں گی۔ اور جتنے دام تھا بھی کون! اس کے منہ میں کون سی زبان تھی اور وہ کہتی بھی کیا۔

"بھائی! آپ نہ لاتے..." اس نے کمزور سے لہجے میں کہا تھا۔

"لے... اتنی تو کمزور ہے تو... بیمار پڑ گئی تو دگنا خرچہ... اس سے بہتر ہے ناکہ تو اپنی صحت کا خیال رکھ... چل شاباش کاٹ کر کھا لے۔"

"حارث کے ابا! کھانا کھا لیں آ کر۔" پانچ منٹ سے زیادہ وقت ہو گیا تھا انہیں یہاں بیٹھے' بیوی کو مروڑ اٹھنے لگے تھے اس لیے بہانے سے بلوا لیا۔

☼ ☼ ☼

"اماں! کیا کرنا ہے فاطمہ کے فیصلے کا... کسی کنارے تو لگنا چاہیے۔" چھوٹے بھائی کو ان دنوں اس کی زیادہ ہی فکر ہو رہی تھی۔

"انہوں نے تو مڑ کر کوئی خیر خبر نہیں لی۔ میں تو خود اس سے ڈری ہوئی ہوں۔ تین بچوں کا ساتھ ہے۔ کوئی چھٹانک تو ہے نہیں جو ہم گھر بٹھا لیں ہمیشہ کے لیے... بچے تو رل جائیں گے۔"

"آپ ابا سے کہیں ان سے بات کریں۔"

"تیرے ابا نے فون کیا تھا ثاقب کو... وہ تو بھرا بیٹھا تھا۔ کم بخت کہتا ہے آپ کی بیٹی اپنی خوشی سے گھر چھوڑ کر گئی ہے۔ جب آپ کا اور اس کا دل بھر جائے تو واپسی کے لیے ٹرین میں بٹھا دیجیے گا۔ میری طرف سے وہ ساری عمر وہیں بیٹھی رہے۔"

"اماں! کچھ بھی تھا فاطمہ کو اس طرح گھر چھوڑ کر نہیں آنا چاہیے تھا۔ لڑائی جھگڑے تو ہر گھر میں ہوتے ہیں۔"

"میں بھی اس سے یہ ہی کہتی ہوں' پر ثاقب نے بھی کم نہیں کی اس کے ساتھ۔"

"وہ اس کا شوہر ہے اماں! بھلا برا کہتا ہے تو اسے ثابت قدمی کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا۔ آخر کب تک وہ ایسا رہتا' کبھی تو بدل جاتا ناں۔"

"بس اب تو جو ہونا تھا ہو گیا' وہ خود بہت پریشان تھیں کہ اس لاینحل مسئلے کا آخر کیا بنے گا۔

اور بظاہر سونے کی اداکاری کرتی فاطمہ کا دل بھی اس مسئلے پر بے حد پریشان تھا۔ اگر علیحدگی اختیار کرتی تو بھی اس کا ٹھور ٹھکانہ کوئی نہ تھا۔ بھائی تو ایک ماہ میں ہی گھبرا گئے تھے۔ ماں باپ خود ان کے دست نگر... انہیں اپنا آسرا چھن جانے کا خوف لاحق تھا اور پھر اس کے بچے۔ ان کا مستقبل تاریک ہو جاتا۔ خود فاطمہ بھی کیا کرتی یہاں رہ کر۔ اسے ہی کوئی آخری فیصلہ کرنا تھا۔ نصیب اس کا تھا جیسا بھی تھا اسے قبول کرنا ہی تھا۔ خواہ دل مانتا کہ نہ... روح تک اندر سے گھائل تھی تو کیا ہوا' اس کے وجود میں دم خم باقی تھا' ابھی جینے کا...

صبح اٹھتے ہی اس نے اماں سے دوٹوک لفظوں میں کہہ دیا کہ اس کی واپسی کی ٹکٹ کٹوا دیں۔ وہ گھر واپس جانا چاہتی ہے اور اس کی ماں... گونگی بن گئی تھی۔ اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔

☼

ناولٹ

بُشریٰ سعید

جام جم سے میرا جام سفال اچھا ہے

انسان شخصی ارتقا کے ابتدائی ادوار میں "گیلی مٹی" کی مانند ہوتے ہیں۔ جنہیں معاشرے کا "کمہار" تربیت کے "چاک" پر دھرتا ہے اور بازار حیات کی "مانگ" کو مدِ نظر رکھ کر اپنی نیت اور چاہت کے ہاتھوں سے ایک خاص سانچے میں ڈھالتا ہے۔ اس قالب سازی کے دوران اس کی "انگلیاں" ہر "برتن" کے بدن پر رشتوں، رواجوں، مذہب، سیاست، جذبوں، خوابوں اور سرابوں کی اَن گنت پیچیدہ تحریریں رقم کرتی ہیں۔

گیلی مٹی کے یہ "سانچے" حالات کے "آوے" میں ڈھلتے ہیں۔ ان مراحل سے گزرتے ہوئے ہر برتن کا "ظرف" اور "نصیب" اس کی ہیئت کا تعین کرتا ہے۔ کچھ "سفال گر" کی بے توجہی کا شکار ہو جاتے ہیں، کچھ اس کے اناڑی پن کی نذر ہوتے ہیں۔ کچھ "آوے" کی "دہک" برداشت نہیں کر پاتے اور ترخ جاتے ہیں، کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو بازار تک تو پہنچتے ہیں مگر انہیں کوئی "خریدار" میسر نہیں آتا۔ ان کا نصیب دربار کا اسلوب، "ظرف" کا مقام طے کرتا ہے۔ گل دان اور پیک دان میں ساخت کا فرق بھلے نہ ہو مگر نصیب کا فرق ضرور ہے۔ یہی میرے ناول کی تھیم ہے۔

محض چند واقعات کو اپنے انداز میں آپ کے سامنے پیش کر رہی ہوں۔ کرداروں کے ساتھ انصاف کرنے کی زحمت میں نے نہیں اٹھائی کیونکہ میرا فہم و ادراک ناقص اور نامکمل ہے۔ میں یہ کام آپ پر چھوڑ رہی ہوں، میں آپ کو خود سے بہتر منصف پاتی ہوں۔ میں اپنی رائے بھی نہیں دے رہی۔ صرف آپ کی رائے مانگ رہی ہوں۔ آپ اس ناول کو جس بھی تناظر میں دیکھیں مگر اسے مٹی کے بے جان برتنوں کی کہانی مت سمجھیے گا۔

یہ جیتے جاگتے وجود رکھنے والے اور جہد کرنے والے انسانوں کی داستان ہے۔

بشریٰ سعید

۹

نویں قسط

وہ بے اختیار آخری بار اسے دیکھنے کی خاطر اندر جانے لگی تھی کہ بروقت خود کو روک لیا۔ اسے یاد آگیا کہ وہ کسی تقریب میں جاتے ہوئے اپنے بچے کو امانتاً ایک دو دن کے لیے کسی کو سونپ کر نہیں جا رہی تھی۔ اس صحن سے باہر جانے والے قدم اسے اس بچے سے لاتعلق بنانے والے تھے۔ آنول تو اب کٹنے جا رہی تھی۔ اس پر نظر ڈالنے کا خیال پرنیاں کو شرمناک لگا۔

نہر کے کنارے کی طرف جاتے ہوئے حکیم بیگم نے تیز چلنے پر اسے ٹوکا تھا۔ "او ورکھا بڑتھاں تے تیزی نال لڑنا تیرے لئی چنگا نئیں۔ ٹھنڈا نہ لگ جائے تجھے۔" (اونچی نیچی جگہ تیزی سے چلنا تیرے لیے ٹھیک نہیں۔ ٹھوکر نہ لگ جائے تجھے۔)

کوئی دھیان دیے بنا وہ اسی رفتار سے چلتی رہی۔ ٹھوکر کھا کر گرنے میں صرف تین باتوں کا ڈر ہوتا ہے، کپڑوں پر گرد لگنے کا، چوٹ کھانے کا اور شرمندگی کا۔ پرنیاں کے دل سے ان تینوں چیزوں کا خوف نکل چکا تھا۔

اسے بیڑی (کشتی) میں بٹھا کر الوداع کہتے ہوئے حکیم بیگم نے ماتھے پر ہاتھ مارا "لے دس میں تے بھلی بیٹھی سی۔ یہ ستھورا اے سنڈھ (سونٹھ) تے میرے پاکے بنایا اے میں نے۔"

(لو بھلا میں بھول ہی گئی یہ ستورا ہے سونٹھ ڈال کے بنایا ہے میں نے)

اس نے بغل میں دبا ایک مرتبان پرنیاں کو دیتے ہوئے کہا۔ "زچہ لئی بڑا کارگر ہوتا ہے۔ ہڈ پیر مضبوط ہو جاتے ہیں۔ اک طرح دی دوا ہے یہ۔"

خاصی دیر تک حکیم بیگم اسے وہیں کھڑی نظر آتی رہی۔ پرلے کنارے تک پہنچنے سے قبل اس نے ملاح کی نظر بچا کر ستھورے والا مرتبان نہر کے پانی میں اچھال دیا۔ سب دوائیں بے فائدہ تھیں۔ وہ صنم گزیدہ تھی۔ اس زہر کا تریاق کسی منہ دھاری (جوگی) کسی وید کسی سنیاسی کے پاس نہ تھا۔

اپنے محلے میں داخل ہوتے ہوئے اس نے جسم اور چہرے کو چادر سے اچھی طرح ڈھانپ لیا تھا۔ تیزی سے جانی پہچانی گلیاں پار کرتے ہوئے وہ حتی الامکان کسی کی توجہ کا مرکز بننے سے بچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کسی شناسا کی نظر میں آئے بنا اپنے گھر تک پہنچنا اس کے لیے اتنا ضروری تھا کہ بسوں کے اڈے سے گھر تک کافی زیادہ فاصلہ ہونے کے باوجود اس نے تانگہ نہیں لیا تھا۔ اکثر تانگے والے اسی آبادی کے رہائشی تھے اور وہاں کے سب ہی مکینوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ اسے خوف تھا کہ کوئی کوچوان اس کے قد کاٹھ یا چال ڈھال سے اسے پہچان نہ جائے۔

"میں ان سے کہوں گی کیا؟ کوئی بھی جملہ ایسا نہیں ہے جو ان کے سامنے بولتے ہوئے میری زبان نہ اٹکے اور میں کسی کی طرف دیکھ بھی نہیں سکتی۔ ان چہروں میں سے کسی پر نظر ڈالنے کے تصور سے میرا دل بند ہوا جاتا ہے۔ میں کچھ نہیں بولوں گی۔ میں کسی کو نہیں دیکھوں گی بس چپ چاپ جا کر برآمدے میں پڑے پلنگ پر بیٹھ جاؤں گی، آنکھیں بند کر کے، چاہے کچھ بھی کہا جائے، میں جواب نہیں دوں گی۔ مجھے آنا نہیں چاہیے تھا۔ میری یہ مجال کہ میں دوبارہ اس گھر کا رخ کروں۔"

اپنے گھر والی گلی میں مڑتے ہوئے اس کا دل اتنی زور سے دھڑکا کہ ایک ایک رگ سنسنا اٹھی۔ وہ الٹے قدموں واپس چل پڑی تھی پھر جی کڑا کر کے پٹی لکڑی کے بڑے پھاٹک پر قفل پڑا دیکھ کر اسے مایوسی ہوئی مگر کہیں اندر ایک طمانیت بھی محسوس ہوئی۔ وہ کچھ اور مدت کے لیے ان سب کا سامنا کرنے سے بچ گئی تھی۔ اس نے نقاب تلے چہرے پر بہتا ہوا پسینہ پونچھا اور آگے کا لائحہ عمل سوچنے لگی۔ کشمکش و پیچ کی کیفیت میں وہیں کھڑے کھڑے اسے کئی لمحے بیت گئے۔ سامنے والے گھر کے دروازے سے سولہ سترہ سال کی لڑکی نے باہر جھانکا۔ اس گھر کے مکینوں سے پرنیاں بخوبی واقف تھی۔ البتہ وہ لڑکی اس سے قبل کبھی دکھائی نہیں دی تھی۔ شاید وہ اس گھر میں مہمان آئی ہوئی تھی۔ چلچلاتی دھوپ میں دیر تک پیدل چلنے سے پرنیاں کا حلق خشک ہو رہا تھا اور بدن پر نقاہت طاری تھی۔ اس نے لڑکی سے ایک گلاس پانی مانگا تھا۔ وہ پانی لے کر آئی تو پرنیاں نے اس سے پوچھا۔

"اس گھر کے افراد کو تم جانتی ہو؟ میرا مطلب ہے آزک صاحب کا خاندان۔ کیا تمہیں معلوم ہے وہ لوگ کہاں گئے ہیں؟ دروازے پر تو تالا لگا ہے۔"

"باجی! کیا آپ ان کی رشتہ دار ہیں؟"

"نہیں۔ میں تو... ان کی ہمسائی تھی۔"

"اب تو وہ یہاں نہیں رہتے۔"

"ہمیں اس محلے میں آئے ہوئے ایک سال ہی ہوا ہے۔ مجھے یاد ہے جب ہم نئے نئے یہاں آئے تھے تو ان کی بیٹی کی شادی ہو رہی تھی۔ شادی سے ایک دو دن پہلے وہ لڑکی بھاگ گئی اور تھوڑے دنوں بعد اس کا باپ بے چارہ مر گیا۔ اس کے بعد وہ لوگ یہ علاقہ چھوڑ کر چلے گئے۔ دروازے کے ساتھ ستون پر برائے فروخت کا اشتہار بھی لگا ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں؟"

پرنیاں کا گلاس والا ہاتھ اس بری طرح لرزا کہ پانی اس کے کپڑوں پر چھلک گیا۔ دیوار کو تھام کر وہ نیچے زمین پر بیٹھ گئی تھی۔

"ہائے اللہ باجی آپ کو کیا ہوا مجھے آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ میں ابھی اپنی امی کو بلا کر لاتی ہوں۔"

وہ لڑکی گھبرا کر اندر بھاگ گئی۔

بسوں کے اڈے پر اسے جو پہلی بس روانگی کے لیے تیار ملی وہ اسی پر سوار ہو گئی۔ اس نے یہ جاننے کا تردد نہیں کیا تھا کہ اس بس کی منزل کیا تھی جب کنڈکٹر نے آکر اس سے کرایہ طلب کیا تو اس نے جھولی میں دھرے بٹوے میں ہاتھ ڈال کر ٹٹولتے ہوئے حکیم بیگم کے دیے ہوئے روپوں میں سے ایک نوٹ نکال کر دیکھے بغیر کنڈکٹر کے حوالے کر دیا۔

"کہاں کا ٹکٹ کاٹ دوں؟"

"ان روپوں میں جہاں تک بنتا ہے کاٹ دو۔"

"بی بی! یہ کیا بات ہوئی؟ تم نے جانا کدھر ہے۔؟" اس نے الجھ کر کہا۔

وہ خاموش رہی تو کنڈکٹر جھنجھلاتے ہوئے بولا۔ "یہ لاری لاہور تک جائے گی۔ لاہور کا ٹکٹ بنا دوں؟"

"کہیں کا بھی بنا دو۔ جب میرے دیے ہوئے روپے ختم ہو جائیں تو مجھے اتار دینا۔"

اگلی نشست پر پیشانی ٹکاتے ہوئے وہ بڑبڑائی تھی۔

وینس کو تلاش کرنا مشکل نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ کہاں گئی ہو گی لیکن اب اسے ڈھونڈنے کی خواہش پرنیاں کے دل میں باقی نہ رہی تھی۔ ایک نافرمان بیٹی سے ملنے پر تو شاید وہ آمادہ ہو جاتی مگر اپنے محبوب شوہر کی قاتل سے ملنا اسے کیونکر گوارا ہو گا۔

☼ ☼ ☼

تیسری یا چوتھی بار دستک دینے کے ارادے سے اس نے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ اسی لمحے دروازہ کھل گیا۔ آنے والا داؤد تھا جو اسے دیکھتے ہی ٹھٹھک کر رک گیا تھا۔ احمد پر نظر پڑتے ہی اس کی رنگت متغیر ہو گئی تھی۔

"کیا پرنیاں بھی تمہارے ساتھ آئی ہے؟"

یہ جملہ سن کر احمد کے اندر جلتی ہوئی امید کی لو بجھ گئی۔ وہ تو اس آس پر وہاں آیا تھا کہ داؤد اور اس کے گھر والوں سے پرنیاں کی کوئی خبر مل جائے گی جبکہ داؤد کا سوال صاف بتاتا تھا کہ اس کی طرح وہ بھی لاعلم تھا۔

"میں سمجھا، تم کچھ جانتے ہو گے۔ کہاں چلی گئی ہے وہ؟ میں اسے کہاں ڈھونڈوں؟" داؤد کی پیشانی پر گہری سلوٹیں نظر آنے لگیں اور اس کی مٹھیاں سختی سے بھنچ گئیں۔

"اس بات کا جواب مجھے تم سے چاہیے۔ اس نے تمہارے کہنے پر گھر چھوڑا تو تمہارے سوا کون جان سکتا ہے وہ کہاں ہے۔"

"میں قسم کھا کر کہتا ہوں مجھے کچھ پتہ نہیں۔ میں تو خود اسے تلاش کر رہا ہوں۔"

"میں بھی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تمہیں کوئی نقصان پہنچاتے ہوئے مجھے ذرا بھی افسوس نہیں ہوگا۔ تمہاری یہ مجال کہ اتنا سب کرنے کے بعد تم میرے سامنے آن کھڑے ہوئے ہو۔ میں تمہارا وہ حشر کروں گا کہ تم اپنے پیدا ہونے پر پچھتاؤ گے۔"

اچانک داؤد نے اسے کندھوں سے دبوچا اور دھکیلتا ہوا پورٹیکو کے سنگی ستون تک لے گیا۔ "تم نے اسے ذلت کا رستہ اپنانے پر مجبور کیا اور معصوم بن کر کہتے ہو کہ میں کچھ نہیں جانتا۔"

وہ دونوں ہاتھوں سے احمد کا گلا دباتے ہوئے مسلسل چلا رہا تھا۔ "میں نے اپنی زندگی میں کسی سے اتنی نفرت نہیں کی جتنی مجھے تم سے ہے۔ تم نے اچھا کیا بہت اچھا کیا کہ خود ہی میرے پاس آ گئے۔ تمہیں ڈھونڈنے میں مجھے اپنی توانائیاں ضائع نہیں کرنا پڑیں۔ تم چل کر یہاں تک آ تو گئے ہو لیکن میں تم سے وعدہ کرتا ہوں واپسی کا سفر تم اپنے قدموں پر نہیں کر سکو گے۔"

دم گھٹنے کے سبب احمد کا چہرہ مسخ ہو رہا تھا اور آنکھیں حلقوں سے باہر ابلنے لگی تھیں۔ میانہ قامت داؤد جسمانی طاقت میں ان سے کہیں کم تھا۔ وہ چاہتا تو با آسانی اس کی گرفت سے گردن آزاد کروا سکتا تھا۔ اس کے باوجود وہ کوئی مزاحمت نہیں کر رہا تھا۔ اس نے اپنے مضبوط دراز بازوؤں کو پشت پر لے جا کر ستون کے گرد لپیٹ دیا تھا۔

شاید داؤد کو بھی احساس ہو گیا تھا کہ وہ اپنے دفاع میں کچھ نہیں کر رہا تھا۔ نفرت سے زمین پر تھوکتے ہوئے اس نے احمد کی گردن چھوڑ دی۔ احمد کو اس کے پیچھے ہٹنے پر افسوس ہوا۔ کاش وہ جو کرنے جا رہا تھا۔ اسے ادھورا نہ چھوڑتا۔ گردن مسلتے ہوئے وہ بے تحاشا کھانس رہا تھا اور رکتے ہوئے خون کے لوتھڑوں جیسی آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔

"میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔ اس بار میں نے خود کو روک لیا ہے۔ اگلی بار شاید خود پر قابو نہ پا سکوں۔ کوشش کرنا کہ دوبارہ کبھی میرے سامنے نہ آؤ۔" داؤد نے تیز تنفس کے دوران کہا اور مڑ کر دروازے کی طرف چل دیا۔

"مجھے تھوڑا پانی مل جائے گا؟" احمد بھی اس کی تقلید میں جانے لگا۔ داؤد نے کوئی جواب نہ دیا لیکن اسے اپنے پیچھے آنے سے منع بھی نہیں کیا۔

کمرے میں داخل ہو کر وہ صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ داؤد نے پانی کا گلاس لا کر اس کے سامنے میز پر رکھا اور خاموشی سے بیٹھ گیا۔ احمد کو گردن کی رگوں میں شدید درد محسوس ہو رہا تھا۔ پانی پیتے ہوئے اس کے حلق سے [illegible] پانی اس کی ٹھوڑی پر بہہ گیا۔

"شکریہ۔" خالی گلاس میز پر رکھتے ہوئے اس نے آہستہ آواز میں کہا۔

سست رو ساعتیں ان کے قدموں میں رینگنے لگیں۔ وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے اور ایک دوسرے کو دیکھتے نہ تھے پھر احمد نے بولنے میں پہل کی۔

"مجھے واقعی نہیں معلوم، وہ کہاں چلی گئی۔ اگر مجھے کوئی خبر ہوتی تو بھلا میں یہاں کیوں آتا؟ ذرا سوچو تو تم سے ملنے میں مجھے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ تمہیں مجھ پر یقین کرنا چاہیے۔"

داؤد نے ہاتھ بڑھا کر میز پر رکھا گلاس اٹھا لیا اور خاصی دیر تک گلاس کو گھورتے رہنے کے بعد بولا۔

"اس نے تم سے شادی کے بارے میں اپنی امی کو بتا دیا تھا۔ انہوں نے کسی سے ذکر نہیں کیا۔ وہ گھر سے چلی گئی تو ہمیں ساری بات پتا چلی۔ اس نے مجھ سے کہا ہوتا تو شاید میں شادی رکوا دیتا۔ اسے بے گھر ہونے سے بچا لیتا۔ میں اس سے اتنی محبت کرتا ہوں کہ اس کے کہنے پر دنیا کا کوئی بھی کام کرنے پر آمادہ ہو جاتا۔ ایک بار مجھے آزماتی تو سہی لیکن میں ــــ یہ باتیں میں اب سوچ رہا ہوں۔ یقین ممکن تھا کہ وہ مجھ سے کہتی تو میں غصے سے پاگل ہو جاتا۔ پاگل تو میں اب بھی ہو گیا ہوں۔ جانے کیوں اس نے تمہارا انتخاب کیا؟ وہ کج فہم ہے، نادان ہے۔ نادان نہ ہوتی تو تمہارے جال میں کیوں پھنستی۔ تم نے اسے بہکایا اور وہ بہک گئی۔ اس کے جانے کے فقط آٹھ دن بعد اس کا باپ مر گیا۔ وہ آخر وقت تک ہم لوگوں کی منتیں کرتے رہے کہ کہیں سے پرنیاں کو ڈھونڈ کر لے آؤ۔"

"تم نے اسے تلاش تو کیا ہوگا؟ کسی رشتہ دار یا کسی دوست کی طرف ہی گئی ہو گی وہ۔"

داؤد نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ کہیں نہیں ملی۔ ہم نے ہر جگہ سے پتا کروا لیا۔ سب بے خبر ہیں۔ اس نے اپنے راز میں کسی کو شریک ہی نہیں کیا۔"

"اچھا میں اب چلتا ہوں۔ تمہارا ٹیلی فون نمبر میرے پاس ہے۔ میں پھر تم سے بات کروں گا اگر اس کا کوئی سراغ [illegible] رابطہ رہتے ہوئے [illegible] بتاؤں گا۔" احمد صوفے سے اٹھ گیا لیکن اس نے قدم دروازے سے رہے۔

داؤد بدستور ہاتھ میں تھامے ہوئے گلاس کو دیکھ رہا تھا۔

"میں تمہیں ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔" کہتے ہوئے احمد کے گلے میں تیز درد اٹھا وہ صوفے کے ہتھے کو پکڑتے ہوئے دوبارہ بیٹھ گیا۔ "اس نے مجھے فون کیا تھا۔"

داؤد نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا اور اضطراب آمیز لہجے میں پوچھا۔ "تو کیا بتایا اس نے؟ کہاں ہے وہ؟"

"وہ چاہتی تھی کہ میں پاکستان جا کر اسے ساتھ لے آؤں۔"

"تو تم نے کیا کہا؟ کب لینے جا رہے ہو اسے؟"

"میں نے۔" وہ اٹکا "میں نے انکار کر دیا۔ میں پاکستان نہیں جا سکتا تھا۔"

"کتے! میں تمہیں جان سے مار ڈالوں گا۔" داؤد اتنے زور سے چیخا کہ اس کی آواز پھٹ گئی۔ اس نے گلاس احمد کے ماتھے پر کھینچ مارا تھا۔ کاٹ دار جلن اس کی پیشانی اور سر میں پھیل گئی۔ اس نے اپنا ماتھا چھو کر دیکھا۔ اس کی انگلیوں نے خون کی چپچپاہٹ محسوس کی تھی۔

"تم کیسے مرد ہو؟ ایک عورت نے تمہاری خاطر اپنے سب رشتوں کو کاٹ کر پھینک دیا اور تم نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اپنے مرد ہونے پر تمہیں شرم آنی چاہیے بزدل! جب تمہیں پیچھے ہٹنا تھا تو اسے امید دلائی ہی کیوں تھی؟ تمہیں وقت گزاری ہی کرنا تھی تو اس سے شادی کا ڈھونگ کیوں کیا؟"

"میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ اسے دھوکا دینے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ میں مجبور تھا اس وقت۔ میں تمہیں سمجھا نہیں سکتا۔ بعد میں کبھی پوری بات سناؤں گا۔"

"اس نے اتنا تو بتایا ہوگا کہ وہ کہاں سے فون کر رہی ہے۔"

"نہیں۔ اسے یہ بتانے کا موقع نہیں ملا اور وہ پریگننٹ ہے۔" احمد نے اٹھتے ہوئے قمیص کی آستین سے رگڑ کر اپنی پیشانی صاف کی اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

داؤد کی بیٹھی ہوئی سی آواز سنائی دی تھی۔ "اگر وہ دوبارہ تم سے بات کرے تو مجھے بتا دینا۔ اپنا پتہ اور ٹیلی فون نمبر مجھے لکھواتے جاؤ۔"

☆ ☆ ☆

البا کے نوکیلی ایڑیوں والے سرخ جوتے ٹک ٹک کرتے اس کے نزدیک آ رہے تھے۔ وہ ساکن آنکھوں سے ان متحرک جوتوں کو دیکھتا رہا۔ جب وہ بالکل پاس آ گئے تو ان کی حرکت تھم گئی۔ احمد کی آنکھیں مسلسل ان پر جمی ہوئی تھیں۔ بھڑکیلے لال رنگ کے ان جوتوں نے کیا کچھ ملیامیٹ کر دیا تھا۔

اس نے البا کے ہاتھ کو اپنے سر کے بالوں میں پھرتے ہوئے محسوس کیا۔ وہ ساکت و صامت رہا۔ پھر اس نے البا کو کہتے سنا تھا۔

"میرا دل غم سے پھٹ رہا ہے۔ مجھے نہیں معلوم،

تمہیں کیسے تسلی دینی چاہیے۔ اتنا صحیح ہوتے ہوتے کیسے سب کچھ غلط ہو گیا۔ اس stinky (بدبودار) صحافی کو یقیناً "تم سے کوئی دشمنی رہی ہوگی۔ کہاں سے اس نے وہ فضول سی باتیں ڈھونڈ کر اخبار میں لکھ ڈالیں۔ حاشیہ آرائی اور مبالغہ ان رزیل صحافیوں کی سرشت میں ہوتا ہے۔ اور اس سے زیادہ غصہ مجھے اسٹوڈیوز کی انتظامیہ پر آرہا ہے۔ انہیں تو گویا تمہیں الگ کرنے کا بہانہ درکار تھا۔ اتنی غیر اہم بات کو بنیاد بنا کر انہوں نے تمہارا معاہدہ منسوخ کر دیا۔ میرے اختیار میں ہو تو میں ان سب کو فائرنگ اسکواڈ کے حوالے کر دوں۔ انہیں زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

البا کا ہاتھ اس کی گردن کی پشت کو سہلا رہا تھا۔ وہ اب بھی ساکت تھا۔

"مجھ سے بڑھ کر کسی کو تمہارے درد کا احساس نہیں ہو سکتا۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اب تمہیں تنہا یہاں نہیں رہنے دوں گی۔ watts والے سائبان پر میں نے لکھوایا ہے۔ گرانٹ اور البا کا love nest سرخ اور سنہری رنگوں میں تم دیکھو گے تو خوش ہو جاؤ گے۔

وہ گھر تمہارا منتظر ہے۔ چلو گرانٹ ہم آج ہی وہاں چلتے ہیں۔ اور تم اس ناکامی پر ہرگز دلبرداشتہ نہ ہونا۔ جب تک میں تمہاری فکر کرنے کے لیے موجود ہوں۔ کسی پریشانی کو تمہارے قریب نہیں آنے دوں گی۔ میں نے تمہارے لیے ایک کردار تلاش کر لیا ہے۔ یہ معمولی نوعیت کا کردار تمہارے شایان شان تو نہیں ہے لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ بات پکی ہو چکی ہے۔ اسسٹنٹ کاسٹنگ ڈائریکٹر بے حد مکروہ آدمی ہے۔ اسے میں نے کیسے ـــــ راضی کیا یہ میں ہی جانتی ہوں خیر تمہارے لیے میں کسی بھی حد تک جا سکتی ہوں۔ تم ہو ہی اتنے خاص۔"

البا کا ہاتھ اس کے ماتھے پر رینگنے لگا۔ وہ اٹھ کر البا کے مقابل کھڑا ہو گیا۔ اور اس کا سر پکڑ کر پچھلی دیوار کی سمت دھکا دیا۔ وہ دور تک لڑکھڑاتی چلی گئی تھی۔ احمد بھاگ کر اس کے قریب پہنچا۔ مٹھی بند کر کے ہاتھ کی پشت سے اس کے جبڑے پر ضرب لگائی پھر گدی سے دبوچ کر اسے فرش پر جھکا دیا اور اس کی پنڈلیوں پر ٹھوکریں مارنے لگا۔ وہ خوف زدہ ہو کر چیخنے لگی تھی۔

پاگلوں کی طرح چلاتی ہوئی البا کو وہ تھپڑوں، مکوں اور ٹھڈوں سے تب تک مارتا رہا تھا جب تک اس کی ناک اور منہ سے خون جاری نہیں ہو گیا اس دوران احمد نے ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا تھا۔ جب مار کھاتے کھاتے البا ادھ موئی ہو گئی اور اس میں ذرا سی بھی ہلنے کی سکت باقی نہ رہی تو احمد اسے وہیں چھوڑ کر اپنی سابقہ جگہ پر جا بیٹھا۔

کچھ دیر البا بے حس و حرکت لیٹی رہی۔ پھر اس نے آہستگی سے کروٹ لی اور کسی اپاہج کی مانند فرش پر گھسٹتے ہوئے اپنے شولڈر بیگ کی طرف ہاتھ پھیلایا۔ بیگ میں سے ایک شیشی برآمد کر کے کانپتے ہاتھوں سے بدقت اس کا ڈھکن ہٹایا اور دبانے میں انگلی ہٹا کر باہر نکالی تو اس کی پوروں سے کچھ سفید ذرات چپکے ہوئے تھے۔ پہلو کے بل لیٹے لیٹے البا انگلی منہ میں ڈال کر مسوڑوں پر وہ ذرات ملنے لگی اس کے حلق سے ایک طویل کراہ نکلی اور اس نے سر کو فرش پر گرا دیا۔

"میں نے تمہارے لیے کسی ایسی ویسی فلم میں کردار حاصل نہیں کیا۔ تمہیں لگا میں پورنو فلم کی بات کر رہی ہوں؟" اس نے حلقوں میں دھلیوں کو عجیب فطری انداز میں گھماتے ہوئے سسکی بھر کر کہا۔

"مجھے اس کاسٹنگ ڈائریکٹر سے کب ملنا ہوگا؟ تمہارے پاس اس کا ٹیلی فون نمبر ہے تو وہ مجھے دے دو اور یہ کیا ہے اس شیشی میں؟"

"یہ میری "دوا" ہے۔ شکر ہے یہ میرے پاس ہے ورنہ تو درد سے میری جان ہی نکل جاتی۔"

"تھوڑی سی مجھے بھی دو۔ اس سے درد کم ہو جاتا ہے کیا؟"

"ہاں شاید کم ہو جاتا ہو۔ مجھے صحیح طرح سے معلوم نہیں۔ مجھے اور نہ مارنا۔ تم خود لے لو۔ ساری لے لو۔"

احمد نے شیشی میں سے ایک چٹکی سفوف ہتھیلی پر منتقل کیا اور اسے زبان سے چاٹ لیا۔ ذرا سے تیکھے ہوئے ذائقے والے سفوف نے اس کی زبان سن کر دی۔ اس کے بدن میں سنسنی سے دوڑ رہی تھی۔

البا بھونڈے پن سے ہنس رہی تھی۔ "دیکھو میرا ایک ایئر رنگ تمہاری آستین کے کف میں اٹکا ہوا ہے اور میری تو لپ اسٹک بھی پھیل چکی ہوگی میں کیسی بے ہودہ نظر آرہی ہوں گی۔ تمہیں زحمت نہ ہو تو میرے پرس سے آئینہ نکال کر مجھے دے دو۔ آہ مجھ سے تو اپنا ہاتھ بھی ہلایا نہیں جا رہا۔"

اس دن ان دونوں نے اپنا اپنا مقام طے کر لیا تھا۔ آنے والی زندگی میں انہیں کون سے کردار نبھانے تھے اس دن اس بات کا تعین ہو گیا تھا۔

ابتدائی کچھ عرصہ اس نے بے گھر عورتوں کے [illegible] اس کا ایک پرائیویٹ ادارے [illegible] کی ناظمہ کے توسط سے ایک پرائمری اسکول میں اسے ملازمت مل گئی۔ یہ ایک نجی تعلیمی ادارہ تھا اور پرنسپل شوکت چوہدری نے حال ہی میں اس کی باگ دوڑ سنبھالی تھی۔ وہ ایک خلیق اور خوش طبیعت کے بے ضرر سے آدمی تھے۔ اسکول کے تمام عملے اور بالخصوص پرنیاں کے ساتھ ان کا رویہ ہمدردانہ تھا۔ اس کی وجہ کچھ تو پرنیاں کی خاموشی اور رکھ رکھاؤ تھا اور کچھ یہ اس کے بارے میں خود ساختہ کہانیاں گھڑنے میں لوگ بہت ہی ولولہ دکھاتے تھے۔

پرنیاں نے ایک سادہ اور ٹھوس حکمت عملی وضع کر لی تھی۔ کوئی بھی سوال جو اس کے ماضی کو کریدنے کی خاطر کیا جاتا، اسے وہ سرے سے نظرانداز کر دیتی۔ اپنے طور پر کوئی جھوٹ یا سچ بتانے کی زحمت اس نے کبھی نہیں کی تھی۔ ایک چپ کا غلاف تھا جو اس کے گرد اسرار کی دھند بن کر لپٹا تھا۔ ایسی صورت میں لوگوں کے پاس کیا چارہ رہ جاتا تھا۔ سوائے یہ کہ وہ خود ہی داستانیں تراش کر اس سے منسوب کر دیں۔

اس مشغلے کا لطف تو اپنی جگہ لیکن چند ہنر مند قصہ گو ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے جھوٹ پر سچ کا گماں ہوتا ہے۔ پرنیاں کے سلسلے میں بھی ایسے ہی کچھ مشاق دماغوں کی صناعی کام آئی تھی اور بہت سے من گھڑت قصے سچ کی مہر لگا کر اس کی ذات سے منسوب کر دیے گئے تھے۔ اس کی طرف سے کسی تردید یا تائید نہ ہونے نے صورت حال کو اس قدر پرکشش بنا دیا تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں اس کی ذات اور معاملات پر بحث کرنا اسکول کی روزمرہ کارروائیوں کا ایک لازمی جزو ٹھہرا تھا۔

عین ممکن ہے شوکت صاحب کی توجہ اس کی جانب مبذول کروانے میں بھی ایسے ہی کسی قصے کا ہاتھ رہا ہو۔ بہر صورت ان کی حوصلہ شکنی نہ کرنے کی پرنیاں کے پاس ایک سادہ سی وجہ تھی۔ وہ سوال بہت کم پوچھتے تھے اور ذاتی معاملات میں مداخلت نہیں کرتے تھے۔

جب اسے اسکول کی ملازمت کرتے ہوئے کچھ

وقت بیت گیا اور اس کی قلیل ماہانہ آمدنی ایک رہائش گاہ کے اخراجات اٹھانے کی متحمل ہو گئی تو شوکت صاحب نے اندرون لاہور کے ایک قدیم محلے میں اسے دو کمروں کا بوسیدہ مکان کرائے پر دلوا دیا۔ اس محلے کے باسیوں نے بھی اس میں ویسی ہی دلچسپی دکھائی جیسی اسکول کی چار دیواری میں اس کے ساتھی اساتذہ اور دیگر انتظامی عملہ ظاہر کرتا تھا۔ چہ میگوئیاں ہوئیں' قیاس آرائیاں کی گئیں۔ کھوجی جبلت نے محلے والوں کو بے چین کر دیا۔ یہاں بھی اس نے خاموشی اور لاتعلقی کا رویہ اپنائے رکھا۔

نتیجہ اس کی منشا کے مطابق برآمد ہوا۔ رفتہ رفتہ لوگوں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ وقت گزاری اور اپنے چھوٹے موٹے اخراجات پورے کرنے کی خاطر اس نے آس پڑوس میں بسنے والے چند بچوں کو معمولی معاوضے پر پڑھانا شروع کر دیا تو بعض نیک طبع لوگ اسے عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ وہ کب 'آپا' کے نام سے پکاری جانے لگی' اسے خبر ہی نہ ہوئی۔ بے نام ہو کر رہنے اور عدم موجود کا مرتبہ پا لینے کی اسے جو تمنا تھی وہ کسی حد تک پوری ہو رہی تھی۔

خدا سے اس کا تعلق محض گلے میں صلیب والا لاکٹ پہننے یا قریبی گرجا گھر میں جا کر معمول کی عبادات میں شامل ہونے تک محدود تھا۔ اس سے آگے بڑھنے کی جرأت اس میں نہیں تھی۔ وہ مناجات کے دوران خاموش رہتی' کبھی مزامیر نہ گاتی۔ پریسٹ کے وعظ پر دھیان نہ دیتی۔ مقدس شبیہوں پر نظر نہ ڈالتی۔ بس کسی نشست پر سر جھکائے بیٹھی سروس کے ختم ہونے کا انتظار کرتی رہتی اور وہاں سے ایسے دبے قدموں اٹھ آتی جیسے کوئی چور' جو گھر کے مالک کے خوف سے آہٹ پیدا کرنے سے گریز کرتا ہے۔

زندگی دردناک حد تک اکتا دینے والی آہستگی کے ساتھ قطرہ قطرہ ٹپکتی تھی نہ برتن خالی رہتا تھا اور نہ بھر ہی پاتا تھا۔

ایک روز اس نے شوکت صاحب کے دفتر میں ایک امریکن فلمی رسالہ دیکھا اور یونہی اس کی ورق گردانی کر رہی تھی کہ ایک ورق پر بہت سے فلمی ناموں کے درمیان لکھے ہوئے ایک نام پر اس کی نظریں یوں ٹھہریں کہ آس پاس کی ہر شے جیسے کسی ان دیکھے پردے کی اوٹ میں چھپ گئی۔ ٹیلی ویژن' ریڈیو اور اخبارات کی بدولت اتنا تو اسے معلوم تھا کہ وہ فلم جس میں ایڈم گرانٹ کو مرکزی کردار میں کاسٹ کیا گیا تھا' بوجوہ نہیں بن سکی تھی لیکن ان دنوں وہ کن حالات میں زندگی بسر کر رہا تھا' اس سے وہ قطعی لاعلم تھی۔

اسے اس بات پر حیرت نہیں تھی کہ گرانٹ بی موویز میں تیسرے درجے کے کردار ادا کرنے لگا تھا۔ وہ حیران تھی تو اس کا نام دیکھنے کے بعد اپنی کیفیت پر۔ اس کے اندر ایسا بھونچال اٹھا تھا کہ خود پر قابو پانا محال ہو رہا تھا۔ اسے ہرگز امید نہیں تھی کہ اتنی مدت گزر جانے کے بعد بھی وہ نام اس پر ایسا اثر ڈال [illegible] تھا۔

کچھ عرصے سے تو اسے یقین سا ہو چلا تھا کہ گرانٹ کے لیے اس کے دل میں کوئی محبت باقی نہیں بچی مگر آج پرنیاں پر منکشف ہوا کہ ایسا سوچنا اس کی حماقت تھی۔ محبت وہ جنس ہے جسے کبھی موت نہیں آتی۔ یہ آب حیات کے چشمے میں کھلنے والا کنول ہے۔ بقا کا بھونرا اس کے روپ کا رسیا ہے۔ فنا سے اس کا ہرگز علاقہ نہیں۔

رسالے کے اس ورق پر کچھ گمنام مگر غیر معمولی اداکاروں کی فنی زندگی کا مختصر احوال بیان کیا گیا تھا۔ گرانٹ کے کریڈٹ پر موجود فلموں کے عنوان اس نے ایک کاغذ پر نقل کر لیے اور ان میں سے جو فلمیں اسے بازار میں دستیاب ہو سکیں' اسی شام خرید لائی۔ پھر اس کا معمول بن گیا کہ گاہے بگاہے فلمی جریدوں کو کھنگالتی رہتی اور اگر کسی فلم کی کاسٹ میں گرانٹ شامل ہوتا تو ہر قیمت پر وہ فلم حاصل کرتی۔ چاہے اسے کسی دوسرے شہر سے ہی خرید کر کیوں نہ لانا پڑے۔

اس نے اپنی تنخواہ میں سے کچھ پس انداز کر کے ایک سیکنڈ ہینڈ ٹیلی ویژن سیٹ اور پرانے ماڈل کا ویڈیو کیسٹ پلیئر خرید لیا تھا۔ وہ پہروں ان فلموں میں سے وہ مناظر ڈھونڈ کر دیکھتی رہتی جن میں گرانٹ شامل ہوتا۔ کبھی کبھی وہ پوری رات کسی کلوز اپ کو ساکت کر کے چھوڑ دیتی اور مسلسل ٹیلی ویژن اسکرین کو گھورتی رہتی۔

کچھ ایسے لمحات بھی آتے تھے جن میں وہ اپنی اس عادت سے متنفر ہو جاتی اور ہفتہ بھر یا اس سے کچھ زیادہ کے لیے اسے ترک کر ڈالتی مگر اس سے مستقل پیچھا چھڑانا اس کے بس کی بات نہ تھی۔

شوکت صاحب اس سے خاص انس رکھتے تھے اور اسے خوش رکھنے کی اپنی سی سعی کرتے رہتے تھے۔ اسے ہنسنے بولنے پر مائل کرنے کی خاطر روز مرہ گفتگو کو مزاح کے رنگ میں رنگنا ان کا معمول تھا۔ [illegible] چھوٹے بڑے کام وہ نافرمائش کیے ہی اپنے ذمے لے لیا کرتے تھے' جیسے کہ اس کے گھر میں نیا فون کنکشن لگوانا' بجلی کے بل کی درستی کروانا۔ بالائی منزل پر بنے اسٹور روم کی برساتوں میں ٹپکنے والی چھت کی مرمت' فرنیچر جو دو چارپائیوں' ایک میز اور دو کرسیوں پر مشتمل تھا تو سال دو سال بعد پالش کروا دینا اور ایسے ہی کئی دوسرے مسائل حل کرنا۔

اس سب کے عوض وہ کچھ مانگتے نہیں تھے لہٰذا پرنیاں کو ان کی مدد لینے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہوتی تھی۔ ان ہی کے اصرار پر کچھ سال قبل اس نے کوئی دلچسپی نہ ہوتے ہوئے بھی چند انعامی بانڈ خریدے تھے اور انہیں شوکت صاحب کے پاس ہی رکھوا دیا تھا۔ وہ ان کے متعلق یکسر بھول چکی تھی کہ ایک دن شوکت صاحب نے اطلاع دی کہ اس کا بیس لاکھ کا انعام نکلا تھا۔ اسے کوئی سنسنی محسوس نہیں ہوئی۔ اس کا سرد ردعمل دیکھ کر شوکت صاحب چیخ اٹھے۔

"حد ہے بھئی۔ آپ پر کوئی اثر ہی نہیں' میں نے تو جب سے یہ خبر سنی ہے میری دھڑکن ہی معمول پر نہیں لوٹ رہی حالانکہ مجھے اس میں سے پھوٹی کوڑی تک ملنے کی امید نہیں ہے۔ آپ استانیاں جو ہوتی ہیں ناں' بڑی ہی کنجوس مخلوق ہوتی ہیں۔ یہ تو میری ایمان داری ہے کہ میں نے آپ کو خبر کر دی۔ آپ تو یقیناً" بھول بھال چکی ہوں گی۔ پانچ سالوں سے میں نے یہ بانڈز سنبھال کر رکھے تھے اگر میں آپ کو نہ بتاتا تو ذرا سوچیے آپ کے فرشتوں کو بھی ہوا لگتی بھلا؟ آپ نے کب نمبر نوٹ کر کے اپنے پاس رکھے ہوئے تھے۔ کاش یہ انعام میرے کسی بانڈ پر نکل آتا تو مزا ہی آ جاتا اور میں تو چھلانگیں مارتا پھر رہا ہوتا۔ آپ کی طرح بے تاثر شکل لیے بیٹھا نہ ہوتا۔ ایمان سے بڑی ہی سرد دل ہیں آپ۔"

"آپ بے شک یہ رقم رکھ لیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" پرنیاں نے بلا تامل کہا تھا۔

"اچھا؟ مذاق مت کریں' ایسے موقع پر مجھ جیسے کمزور دل لوگوں کا ہارٹ بھی فیل ہو جایا کرتا ہے۔ مجھے بس سنجیدگی سے اتنا بتا دیں کہ آپ اس رقم کا کریں گی کیا اور اگر آپ کے دماغ میں کوئی نادر خیال نہیں آ رہا تو بھی مجھے بتا دیجیے۔ میرے پاس ایک نہایت اعلیٰ تجویز ہے۔"

"میری کوئی بھی ایسی خواہش نہیں ہے جسے پورا کرنے میں اس رقم کی ضرورت پیش آئے۔ میں نہیں جانتی' مجھے اس کا کیا کرنا چاہیے۔ ویسے میں نے نہایت سنجیدگی سے کہا ہے کہ آپ یہ ساری رقم خود رکھ لیں یا اس میں سے جتنی چاہے مجھے دے دیں اور باقی آپ لے لیں۔ جیسے بھی آپ مناسب سمجھیں۔ آپ کی کچھ ضرورتیں پوری ہو جائیں گی۔" اس نے بے دلی سے کہا۔

"میری ایسی کیا ضرورت ہے بھلا۔ سب تو معلوم ہے آپ کو۔ اولاد ہے نہیں۔ بیوی کی حالت ایسی کہ اس کا ہونا نہ ہونا ایک برابر۔ بہن بھائی سب اپنے گھروں میں خوش اور صاحب جائیداد ہیں۔ میرے پاس اپنا ذاتی گھر اور کار ہے۔ بینک بیلنس بھی ہے۔ بڑھاپے میں در در ٹھوکریں کھانے کا بہت کم امکان ہے۔ آپ کے حالات البتہ کافی مخدوش ہیں' از تیں

پینتالیس سال کی ہوچکی ہیں اور اتنی عمر کو ہمارے ملک میں بڑھاپے کا آغاز تصور کیا جاتا ہے۔ آپ نے اپنا بڑھاپا عافیت سے گزارنے کی کیا منصوبہ بندی کی ہے اب تک؟ بتایئے مجھے۔ کوئی جواب نہیں ہے ناں آپ کے پاس' تو ثابت یہ ہوا کہ اس رقم کا مصرف سوچنا سمجھ داری کا تقاضا ہے اور اس سلسلے میں بندہ عاجز جو کسی خدائی فوج دار سے کم نہیں' آپ کی مدد کرنے پر تیار ہے بلکہ میں نے تو سوچ بھی لیا ہے۔ اب سنیے ذرا کان کھول کر۔۔۔"

وہ اسے اپنے آبائی مکان کے بارے میں بتانے لگے جو اندرون لاہور واقع تھا اور جو ان کے والد کی وفات کے بعد شوکت صاحب' ان کے دو بھائیوں اور بہن کی مشترکہ ملکیت تھا۔ پچھلے دنوں اس سات مرلے کے دو منزلہ مکان کی بائیس لاکھ قیمت لگی تھی' لیکن وہ پرنیاں کی خاطر اس میں تخفیف پر آمادہ تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ پرنیاں وہ مکان خرید لے۔ پرنیاں نے اس تجویز میں کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ تاہم شوکت صاحب مصر رہے اور دو ہفتے بعد اسے وہ مکان دکھانے لے گئے۔

پرانی طرز پر تعمیر کیے گئے اس مکان کو رنگ روغن اور مرمت کی سخت حاجت تھی۔ البتہ اسے خستہ حال نہیں کہا جاسکتا تھا۔ چھتیں اور دیواریں' بجز کچھ چھوٹی دراڑوں کے مضبوط تھیں۔ کھڑکیوں' دروازوں کا کوئی طاقچہ ٹوٹا اکھڑا نہ تھا اور کہیں بھی گھن کے آثار نہ تھے۔ بالا خانے کے دونوں اطراف جھروکے بنے تھے۔ مختصر صحن میں پیپل کا درخت لگا تھا جو ہرا بھی تھا اور چھتنار بھی۔ مجموعی طور پر اسے وہ گھر اچھا لگا تھا۔ اس نے زیادہ سوچ بچار کا تردد کیے بنا اسے خریدنے کی ہامی بھرلی۔

"چلو' یہ تو طے ہوگیا کہ آپ اس مکان کی بلا شرکت غیرے مالکہ بنیں گی' مگر یہ بتائیں کہ آپ کے انتقال پُرملال کے بعد اس کا وارث کون ہوگا' جیسے کہ میں نے اپنی وصیت میں لکھوا رکھا ہے کہ میرے بعد میری تمام منقولہ و غیر منقولہ جائیداد میرے سب بہن' بھائیوں میں تقسیم کردی جائے تو آپ کس کا نام آگے کریں گی محترمہ؟"

مذاق میں کہی گئی اس عام سی بات نے اسے سوچ میں ڈال دیا۔ بہت دیر تک کشمکش و پیچ میں مبتلا رہنے کے بعد وہ بولی۔

"میرا ایک دور کا رشتہ دار ہے۔ ایک لڑکا' میں یہ مکان اس کے نام کرجاؤں گی۔"

"اس دور کے رشتہ دار سے آپ نے مجھے کبھی نہیں ملوایا۔" شوکت صاحب متجسس ہوئے۔ اس کی زبان سے پہلی بار کسی رشتہ دار کا ذکر سنا تھا۔

وہ خاموش رہی۔

"اچھا کتنی عمر ہے برخوردار کی؟ اور کرتا کیا ہے؟ کہاں ہوتا ہے؟"

"تقریباً اٹھارہ سال کا ہے۔" اس نے دل میں اپنے بیٹے کی عمر کا حساب لگایا۔

"پڑھتا ہوگا میرا خیال ہے اس عمر کے لڑکے عام طور پر کالج میں آجاتے ہیں۔"

"کیا مطلب پڑھتا ہوگا؟" شوکت صاحب نے اعتراض کیا۔ "یعنی آپ لاعلم ہیں کہ درحقیقت وہ کیا کرتا ہے۔ یہ کیا بات ہوئی بھئی؟"

"میں اس سے کافی سالوں سے نہیں ملی دراصل۔ اس لیے نہیں جانتی کہ وہ آج کل کیا کرتا ہے۔" اس نے نظریں نیچی کرتے ہوئے جواب دیا۔

"بہت اعلا' کیا بھولا بسرا وارث ڈھونڈا ہے آپ نے۔" شوکت صاحب نے کندھے اچکائے۔

"والدین حیات ہیں اس کے یا گزر گئے؟"

"دونوں مرچکے ہیں' یتیم ہے وہ لڑکا۔"

"کیا ہوا جو وہ مرگئے۔ آپ تو زندہ ہیں ناں اس بے چارے لڑکے کا بھلا سوچنے کو۔"

اس گفتگو کے بعد حیرت انگیز طور پر پرنیاں کے اندر اس مکان کے مالکانہ حقوق حاصل کرنے کی امنگ پیدا ہوگئی۔

ایک روز وہ سسٹر سوزین اور کچھ دوسری راہباؤں کے ساتھ بیٹھی تھی کہ باتوں کے دوران سسٹر سوزین

نے چرچ کے ایک ممبر کا ذکر چھیڑ دیا جس کی جواں سال بیٹی نے ایک مسلمان مرد سے شادی کرنے کے لیے مسیحی مذہب کو ترک کر دیا تھا۔ سسٹر سوزین ننوں کی اقامت گاہ کی نگران تھیں اور چرچ میں برنیاں کی ان سے واقفیت ہوئی تھی۔ سسٹر سوزین نے اس واقعہ پر شدید تاسف کا اظہار کیا تھا۔

"یہ تو گمراہی کی انتہائی صورت ہے۔ مہربان چرواہا اپنے ریوڑ کو گناہ کی دھوپ سے بچانے کے لیے اپنے جوئے تلے چھپائے اور بھیڑیں اس کے دامن پر ٹھوتھنیاں چلانے لگیں۔ یسوع سے کھلی دشمنی کا اعلان کرنے والوں کے لیے روشنی کہاں ہے؟ وہ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں ماریں گے اور جب گر کر چوٹ کھائیں گے تو بدن سہلانے کو انہیں اپنے ہاتھ نہ ملیں گے اور ذرا سوچو کہ اس بدقسمت لڑکی کی ہونے والی اولاد کا کیا ہوگا۔ جب وہ اندھی گپھا میں اپنے بچوں کو جنے گی تو وہ روشنی کہاں سے پائیں گے؟ وہ آنکھیں ہوتے ہوئے بھی نابینا ہی رہیں گے۔ ان کی بندگی کو ان سے پوشیدہ رکھنے والا کون ہوگا؟ وہ جس نے بچوں کی چابی گم کر دی۔ ذمہ دار وہ ہی ہے۔ جواب اسی سے لیا جائے گا۔"

اس محفل سے اٹھنے کے بعد برنیاں نے چند دن اور چند راتیں بڑی بے چینی میں کاٹیں۔ اس نے اپنی ہونی بات بنا کر فادر آرون سے مشورہ لیا اور پھر اپنے بیٹے کو واپس اپنے پاس لانے کا فیصلہ کر لیا۔ حکیم بیگم کے مدمقابل آنے اور بیٹے کا سامنا کرنے میں برسوں کی جھجک مانع تھی۔ شرمندگی سے اس کا سانس رک رک جاتا تھا، لیکن ایک بار جب فیصلہ ہو گیا تو اس سے پھر جانا برنیاں کے اختیار میں نہ رہا۔ اس کا دماغ آٹھوں پہر ایک ہی نکتہ سمجھائے چلا جاتا۔ لاکھ دامن جھٹکنے پر بھی جب یہ خیال اس کا پیچھا چھوڑنے پر راضی نہ ہوا تو آخرکار اسے اپنے ارادے پر عمل کرنا پڑا۔

حکیم بیگم یا عمر میں سے کوئی بھی اس سے مزاحم نہ ہوا اور اس نے تصور میں خود کو پیش آنے والی جو مشکلات سوچ رکھی تھیں ان میں سے کوئی اس کے سامنے نہ آئی۔

عمر نقش میں بالکل اپنے باپ پر گیا تھا۔ اس کے ہاتھ ویسے ہی بڑے اور پُرشکوہ تھے، جیسے گرانٹ کے تھے، لیکن وہ اپنے باپ کے ہاتھوں کی طرح متحرک نہیں رہتے تھے۔ ان میں بے پناہ ٹھہراؤ تھا۔ وہ کبھی عمر کی گود میں ایک دوسرے کے اوپر دھرے رہتے اور کبھی میز پر پاس پاس رکھے ہوتے اور دونوں انگوٹھوں کے ناخن آپس میں ملے ہوئے ہوتے یا کرسی کے ہتھوں پر موجود ہوتے اور انگلیاں ذرا سی اندر کو مڑی ہوئی ہوتیں۔ وہ دیر تک عمر کے ہاتھوں کو دیکھتی رہتی۔ ایسا کرنے سے اسے عمر کے چہرے پر براہ راست نظر نہ ڈالنے میں مدد ملتی تھی۔ اس کے نچلے ہونٹ میں ذرا سا خم تھا۔ ویسا ہی خم گرانٹ کے ہونٹ میں بھی موجود تھا۔ مسکراتے ہوئے اس کی ناک کے بانسے میں ہلکا سا تناؤ آ جاتا تو وہ ہو بہو گرانٹ کی طرح نظر آتا۔ یہ الگ بات کہ وہ برنیاں کے سامنے شاذ و نادر ہی مسکراتا تھا۔ اس کی آنکھیں البتہ رنگ اور ساخت میں بالکل برنیاں سے مشابہ تھیں۔ کوئی بھی اس کی آنکھ دیکھ کر پہچان سکتا تھا کہ وہ برنیاں کا بیٹا ہے۔ اس کے باوجود برنیاں لوگوں سے اسے اپنا بھانجا ملوانے پر مصر تھی۔ کبھی کبھی اسے یہ حرکت احمقانہ لگتی تھی۔ سب لوگ اتنے بے وقوف کب ہوتے ہیں، جتنا وہ انہیں بنانے پر تلی ہوئی تھی۔ شاید اس کے اپنے علاوہ کوئی بھی بے وقوف نہیں تھا۔

باقی لوگوں کی طرح عمر بھی اسے آپا کہہ کر بلانے لگا تو اس نے ٹوکا نہیں۔ ٹوکنے کی صورت میں اسے کوئی متبادل لفظ بتانا پڑتا۔ کسی تعلق کا عنوان۔۔۔ کوئی رشتہ ظاہر کرتا ہوا ایک نام اور ایسا کوئی نام برنیاں کے پاس کہاں تھا۔

عمر اس سے کھنچا کھنچا رہتا تھا۔ زیادہ تر وقت وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں گزار دیتا۔ وہ خود سے برنیاں کو مخاطب کرنے سے حتی الامکان گریز کرتا اور اگر وہ اس سے کوئی بات کرتی تو وہ ایک سطری جوابوں سے کام چلاتا۔ شاید وہ فطرتاً خاموش طبع بھی ہو مگر اس کا رویہ برنیاں کو انوکھا نہیں لگا۔ اپنی کوتاہی کو دیکھتے ہوئے وہ اس سے زیادہ کی امید کیوں رکھتی۔ عمر کو ایسا ہی کرنا چاہیے تھا اور وہ تو اس کے ساتھ چلے آنے پر بھی جانے کیسے راضی ہو گیا تھا۔

عمر کے معمول سے اسے تاثر قائم کرنے میں دیر نہیں لگی کہ مذہب کی اس کی زندگی میں بہت اہمیت تھی۔ وہ اپنی تمام عبادات باقاعدگی اور اہتمام کے ساتھ ادا کرتا تھا۔ اس کی کتابوں کی الماری میں سب سے اوپر والے خانے میں قرآن رکھا تھا۔ وہ روزانہ دو یا تین بار اس کی تلاوت کرتا تھا۔

ایسے اوقات میں کبھی کبھی برنیاں کو اس کی شفاف آنکھوں میں نمی سی تیرتی دکھائی دیتی تھی۔ یقیناً "اس کلام کی اثرانگیزی اس کے دل کو پگھلاتی ہوگی" لہٰذا جب اس نے عمر کو مسیحی دین اپنانے کو کہا تو اس کا انکار خلاف توقع نہیں تھا لیکن وہ انکار اتنا دو ٹوک اور دلوک تھا کہ وہ ششدر رہ گئی۔

آج اگر عمر پر چرچ نہیں تھا تو قصور وار سراسر وہ خود تھی۔ اپنے ساتھ ساتھ اس نے عمر کی راہ بھی کھوٹی کر ڈالی تھی۔ یا حکیم بیگم جیسی عورت کے متعلق اسے ذرا بھی غلط فہمی تھی کہ وہ اس کے بیٹے کی پرورش ان خطوط پر نہیں کرے گی، جن کا اس نے وعدہ کیا تھا۔ اس نے تو اپنا قول پورا کیا تھا۔ اگر اسے اپنے بیٹے کو پیدا کر کے کہیں چھوڑنا ہی تھا تو وہ اسے کسی چرچ کے حوالے بھی کر سکتی تھی۔ ایسی کوتاہی، ایسی ناقابل تلافی غفلت اس سے کیوں سرزد ہوئی؟

اس نے عمر کو عیسائیت سے متعارف کروانے کے لیے فادر آرون اور سوزین کی خدمات حاصل کیں۔ کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ تاہم اتنا ضرور ہوا کہ اس کے اور عمر کے بیچ دوری کچھ اور بڑھ گئی۔ وہ بالکل اپنے خول میں بند ہو کر رہ گیا۔ برنیاں کو احساس تھا کہ اس عمل نے ان کے درمیان حائل اجنبیت کی دیوار پر چند اینٹیں اور چن دی تھیں۔

دھیرے دھیرے وہ پسپائی اختیار کرنے لگی۔ اس سے زیادہ وہ کیا کر سکتی تھی۔ عمر کوئی پانچویں جماعت کا طالب علم نہیں تھا جس کا پرانا سلیبس منسوخ کر کے نیا سلیبس تھما دیا جاتا اور وہ کوئی احتجاج کیے بنا نئے کورس کی کتابیں رٹنے لگتا۔

ایک مقام پر اسے لگنے لگا کہ عمر کو اپنے ساتھ لے آنے کا فیصلہ ہی غلط تھا۔ اس نے طے کیا کہ زیادہ دن اسے اپنے پاس ٹھہرنے پر مجبور نہیں کرے گی۔ اس کی مرضی کے خلاف اسے باندھ کر رکھنے سے کیا حاصل تھا۔

شوکت صاحب کا آبائی مکان، جو عمر کی ماں کی طرف سے اس کے لیے پہلا اور آخری تحفہ ہوتا۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ مکان کے کاغذات عمر کے حوالے کر کے اسے واپس جانے کی اجازت دے دے گی، پھر اس کی اپنی رضا، وہ اس کے ساتھ رہنا چاہے یا چلا جائے۔

اس مکان کے حصول میں ایک رکاوٹ درپیش تھی۔ اسے بیعانہ دیے ہوئے بھی ایک سال ہونے کو آیا تھا۔ بات یوں آگے نہ چلتی تھی کہ شوکت صاحب اور ان کے دونوں بھائی تو مکان بیچنے پر راضی تھے مگر ان کی اکلوتی بہن کو جو اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ کینیا میں رہتی تھی، اسے مکان کی فروخت پر اعتراض تھا۔ تینوں بھائیوں نے اسے قائل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی اور وہ ٹس سے مس نہ ہوتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اس مکان سے ان کے والدین کی یادیں وابستہ تھیں اور بیس بائیس لاکھ کوئی ایسی بڑی قیمت نہیں تھی جس کے عوض ان انمول لمحات کو بیچ دیا جائے۔

اس کی ضد سے تنگ آ کر شوکت صاحب نے برنیاں کو پیش کش کی تھی کہ وہ بیعانہ کی رقم کو دگنا کر کے لوٹانے پر تیار ہیں، لیکن برنیاں پیچھے ہٹنے پر آمادہ نہ ہوئی۔

اسے ہر حال میں وہ مکان چاہیے تھا۔ شوکت صاحب دونوں طرف سے پھنسے ہوئے تھے۔ بہن کے دستخط لیے بنا مکان کے ملکیتی حقوق منتقل نہ ہو سکتے تھے اور برنیاں سے کیے ہوئے وعدے کا بھرم رکھنا بھی

ضروری تھا۔ اکثر پرنیاں کی اس موضوع پر ان سے بات ہوتی رہتی تھی اور ہر بار وہ کچھ مہلت مانگ کر معاملے کو ٹال دیتے تھے۔

پھر یکایک عمر نے امریکہ جانے کا اعلان کر دیا۔ پرنیاں کو بے پناہ صدمہ ہوا۔ وہ خود بھی ان محسوسات پر حیران رہ گئی۔ کہاں تو وہ اسے واپس بھجوانے کا عزم کیے بیٹھی تھی اور اب اس کے چند ماہ کے لیے ملک سے باہر جانے کا سن کر اس کا دل بیٹھا جاتا تھا۔

اس نے لفظوں میں اپنے دکھ کا اظہار نہیں کیا۔ کیا کہہ کر وہ عمر کو روک لیتی؟ اسے کیا حق تھا اس کی زندگی میں مداخلت کرنے کا۔ عمر نے جب جب وہ تکلیف دہ بات چھیڑی اس نے خاموشی اور پہلو تہی کی ڈھال سے اسے روک لیا۔ ان ہی دنوں شوکت صاحب نے بتایا کہ ان کی بہن کینیا سے اپنے بچوں کے ساتھ پاکستان آئی ہے۔ وہ اسلام آباد میں شوکت صاحب کے بڑے بھائی نصرت چوہدری کے ہاں ٹھہری ہوئی تھی۔ اس کی آمد کے پیچھے کاروباری اغراض تھیں اور فقط پانچ دن بعد اسے واپس کینیا چلے جانا تھا۔

"میں ایک، دو دن میں اسلام آباد جا رہا ہوں۔ ثروت سے ملے ہوئے بھی کوئی تین سال ہو گئے۔ وہ تو بس پانچ دن رکے گی پاکستان میں، لاہور آنے کا وقت نہیں ہو گا اس کے پاس، میرا آپ سے پکا وعدہ ہے کہ میں اسے مناؤں گا۔ فون پر بات کرنے اور روبرو ملنے میں بڑا فرق ہے۔ اپنی باتوں سے ایسا ناک میں دم کروں گا کہ ماننے بنا چارہ نہیں رہے گا۔ ایمان سے بڑا ڈھیٹ ہوں۔ جب تک دستخط نہیں کرے گی، جان نہیں چھوڑوں گا۔ اتنی مدت سے چکنا گھڑا بنی ہوئی ہے۔ سارا دم خم نکال دوں گا میں، آپ بے فکر ہو جائیں۔"

پرنیاں ان کی یقین دہانی سے مطمئن نہ ہوئی۔ "ایسا تو آپ پہلے بھی کئی بار کہہ چکے ہیں۔"

"پہلے کی بات رہنے دیں۔ پہلے تو بس فون پہ ہی پانچ، دس منٹ بات ہوتی تھی۔ اتنا وقت تو کسی بات کی تمہید باندھنے میں ہی کٹ جاتا ہے۔"

"میں چاہتی ہوں کہ عمر کے امریکہ روانہ ہونے سے قبل مکان کے کاغذات اسے دے دوں، میرے لیے یہ بہت ہی ضروری ہے۔" اس نے زور دے کر کہا۔

"ان شاء اللہ ہو جائے گا، ایک ہی بہن ہے ہماری اور سب کی لاڈلی بھی ہے۔ بس اسی وجہ سے نخرے سے جا رہے ہیں، لیکن اب اسے اور ڈھیل نہیں ملے گی۔ آپ حوصلہ رکھیں، میں آپ کا کام پورا کر کے ہی لوٹوں گا، بلکہ یوں سمجھیے کہ اسلام آباد جانے کا اصل مقصد ہی یہ ہی ہے۔ ثروت اور بھانجوں سے ملاقات سے مقدم آپ کا مسئلہ ہے میری نظر میں، ایک سال سے میں نے آپ کو امید دلا کر لٹکا رکھا ہے۔ قسم سے بڑی شرمندگی ہوتی ہے مجھے۔ اللہ نے چاہا تو اس دفعہ آپ کو مایوسی نہیں ہو گی۔" شوکت صاحب نے تسلی دی تھی۔

"مجھے آپ کی نیت پر کوئی شبہ نہیں ہے۔ آپ یقیناً کوشش کریں گے۔ لیکن ایسا [illegible] مناسب ہو گا کہ میں آپ کے ساتھ اسلام آباد چلی جاؤں اور خود آپ کی بہن سے مل کر ان سے درخواست کروں، میرا دل کہتا ہے کہ مجھے اپنے سامنے پا کر وہ اپنے برتاؤ میں نرمی ضرور پیدا کریں گی اور پھر مجھے بھی یہ افسوس نہ رہے گا کہ میں نے پوری کوشش نہ کی۔"

شوکت صاحب نے اختلاف نہیں کیا تھا۔ جوں جوں وہ اس نہج پر سوچتی گئی اس کا یقین پختہ ہوتا چلا گیا کہ شوکت صاحب کی بہن کو منانے میں وہ ضرور کامیاب رہے گی۔ اس امید نے اس کے اندر خوشی بھر دی۔ اسلام آباد جاتے ہوئے وہ بہت پُرجوش تھی۔ وہ اپنے بیٹے کو تحفہ دینے جا رہی تھی۔

نصرت چوہدری کی رہائش گاہ پر جا کر معلوم ہوا کہ ثروت اپنی بیٹیوں کے ساتھ برف باری دیکھنے مری چلی گئی تھی۔ حالانکہ شوکت صاحب اپنی آمد کی پیشگی اطلاع دے چکے تھے۔ مگر ماں، بیٹیوں کو موسم کی اولین برف باری میں ایسی کشش محسوس ہوئی تھی کہ وہ انتظار کیے بنا ہی روانہ ہو گئیں۔

اگلے روز دوپہر تک ان کے لوٹنے کا انتظار کیا اور فون

کرنے پر پتا چلا کہ ابھی وہ مزید وہیں ٹھہریں گی۔ پرنیاں کو ساری بات کھٹائی میں پڑتی محسوس ہوئی، پھر اس نے سوچا جب یہاں تک آ ہی گئی ہوں تو چند میل اور سفر کرنے میں کیا مضائقہ ہے۔ اس نے اصرار کر کے شوکت صاحب کو ثروت کے پیچھے مری جانے پر راضی کر لیا۔

سردی سے اسے ہمیشہ سے چڑ تھی۔ اور برف باری کا تو تصور ہی خوف زدہ کر دینے والا تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ گرم کپڑے بھی ہمراہ نہ لائی تھی۔ لیکن نصرت چوہدری کے گھر مہمان بن کر رہنے کا خیال بھی اسے مناسب نہ لگتا تھا اور کیا خبر تھی کہ ثروت مری سے لوٹنے میں کتنے دن لگا دے گی۔ لہٰذا وہ شوکت صاحب کے ساتھ مری کے مال روڈ پر پہنچ گئی۔

وہ لوگ رات آٹھ بجے کے قریب پہنچے تھے۔ گزرگاہیں، مکانوں کی ڈھلوان چھتیں اور درختوں کی ڈالیاں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ [illegible] ہوتی ہوا میں برف کے ذرات تیر رہے تھے۔ پرنیاں کے ساتھ وہی ہوا، جس کا اسے ڈر تھا۔ بڑی شاہراہ سے ثروت کے موٹیل تک، جو ایک پہاڑی ڈھلان پر بنا تھا، فقط دو سو گز کا راستہ بھربھری برف میں پاؤں دھنسا کر چلنے سے اس کے پیروں کی انگلیوں میں سوجن ہو گئی اور زکام والی کیفیت طاری ہو گئی۔ ثروت کے سامنے جب اس نے زکام کی جلن سے جلتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اپنا مدعا پیش کیا تو خدا جانے ثروت کو اس کی حالت پر ترس آ گیا یا وہ اس کی باتوں سے پسیج گئی۔

اگلی صبح جب وہ لاہور روانہ ہوئی تو اس کے پاس اپنے بیٹے کو دینے کے لیے ایک تحفہ تھا۔ اس نے عمر کو ساری بات سے قطعی بے خبر رکھا تھا۔ تمام سفر میں وہ سوچتی رہی کہ عمر کا اولین تاثر کیا ہو گا۔ زیادہ امکان تو یہ ہی تھا کہ وہ مکان کی ملکیت قبول کرنے سے انکار کر دیتا، مگر ایک اور صورت بھی ہو سکتی تھی، جس کا پیش آنا اگرچہ مشکل تھا، لیکن اس کے تصور نے پرنیاں کی دھڑکن بے ترتیب کر دی۔

اگر وہ شکریہ کہہ دے اور ایسا کہتے ہوئے مسکرا دے تو مسکراتے ہوئے عمر کو ایک نظر دیکھ لینا کیسا تجربہ ہو گا۔ گھر آنے تک وہ امید و بیم کے مابین معلق رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

عمر سیڑھیوں کے نچلے تدمچے پر بیٹھا اس کا منتظر تھا۔ اس کی متورم آنکھیں اور دہکتے ہوئے انگارے سی رنگت گواہ تھی کہ وہ بیمار تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر پرنیاں کے دل پر چوٹ سی لگی۔ صرف تین دنوں میں وہ اتنا ناتواں کیسے نظر آ سکتا تھا۔ بیگ کو برآمدے کے فرش پر رکھتے ہوئے وہ تیزی سے اس کے قریب گئی۔

"کیا ہوا عمر، تم ٹھیک تو ہو؟" وہ ہاتھ بڑھا کر اس کا گال چھونے لگی تو عمر نے چہرہ پرے ہٹا لیا۔

"مجھے دیکھنے تو دو، کہیں تمہیں بخار تو نہیں ہے، ٹھہرو، میں تھرمامیٹر لے کر آتی ہوں۔" اس نے ہاتھ واپس کھینچتے ہوئے کھسیانے انداز میں کہا۔ عمر کے اس طرح سمٹ جانے سے اسے بہت شرمندگی ہوئی تھی۔

"مجھے چھوڑیں، میں ٹھیک ہوں، آپ کا سفر کیسا رہا؟ کافی خوش لگ رہی ہیں۔ یقیناً خوش گوار رہا ہو گا۔"

"ہاں ٹھیک تھا۔ بس میں تھوڑی سی بیمار ہو گئی تھی۔ مگر تمہیں تیز بخار ہے۔ تمہاری حالت صاف بتا رہی ہے۔ لگتا ہے تمہیں ٹھنڈ لگ......"

"مری میں تو یہاں سے دگنی ٹھنڈ ہو گی یا اس سے بھی کچھ زیادہ ہے نا۔"

"میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے چلتی ہوں۔ میں باہر گلی میں رکشا رکواتی ہوں، مجھے پتا ہوتا تو شوکت صاحب کو ہی روک......"

"شوکت صاحب اندر کیوں نہیں آئے؟ آپ نے اصرار تو کیا ہو گا انہیں رکنے کے لیے۔"

"وہ جلدی میں تھے۔ تمہیں باہر جانے سے پہلے کوئی گرم چادر اوڑھ لینا چاہیے۔ میں ابھی اسٹور سے......"

عمر نے مسلسل تیسری دفعہ اس کی بات کاٹی۔

"آپ جس بھی کام سے گئی تھیں' امید ہے پورا ہو گیا ہو گا۔"

اسے لگا وہ طنز کر رہا تھا۔ شاید وہ اس بات پر غصے میں تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں وہ بیمار پڑ گیا تھا اور اس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ ٹین ایجرز عموماً" ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر طیش میں آجایا کرتے ہیں مگر اس کی آنکھوں میں پرنیاں کو جو نظر آتا تھا وہ ناراضی ہرگز نہیں تھی' وہ کھلی نفرت تھی۔

"کیا بات ہے عمر! تم غصے میں لگتے ہو' کسی بات پر خفا ہو؟"

"خفا؟ میں کیوں خفا ہوں گا؟ خفا تو وہ لوگ ہوتے ہیں جن سے کوئی محبت کرتا ہو اور جن کے روٹھ جانے سے کسی کو تکلیف ہوتی ہو۔ میں تو ان لوگوں میں سے نہیں ہوں۔ میرا خفا ہونا تو بے وقوفی ہوگی۔ کیا میں آپ کو بے وقوف لگتا ہوں؟"

اس کے پپڑی جمے ہونٹ ذرا سے کھنچ گئے اور بے اختیار پرنیاں کا جی چاہا کہ عمر کو اس طرح مسکرانے سے روک دے۔

"کیا آپ کو مجھ سے پیار ہے؟"

اس خلاف توقع سوال نے پرنیاں کو گڑبڑا دیا۔ کئی لمحوں تک اسے کوئی لفظ نہ مل سکا۔

"یہ کوئی پوچھنے کی بات تو نہیں ہے' سب ہی ماؤں کو اپنی اولاد سے محبت ہوتی ہے۔ یہ تو قدرت کا دستور ہے۔" اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"اچھا۔۔۔ لیکن کتنی ہے وہ محبت جو آپ مجھ سے کرتی ہیں' کم یا زیادہ' یا اوسط درجے کی۔"

"اس سوال کا میں کیا جواب دوں؟ محبت کو ناپنے کا کوئی پیمانہ نہیں ہے۔ یہ بات ہم بعد میں بھی کر سکتے ہیں۔ ابھی تم میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چلو۔"

"آپ کے پاس میرے کسی بھی سوال کا جواب نہیں۔ میں نے بچپن میں بے جی کی ہمسائی ماسی چھوماں کی بلی ان سے مانگ کر پال لی تھی۔ وہ خاکستری رنگ کی بھدے جسم والی عام سی بلی تھی۔ وہ بوڑھی اور سست تھی۔ میں اسے جو بھی کرتب سکھانے کی کوشش کرتا' وہ کبھی نہ سیکھ پاتی' اسے مجھ سے کوئی خاص لگاؤ بھی نہیں تھا۔ دودھ پینے کے وقت کے علاوہ وہ مجھ سے دور دور رہتی تھی۔ اس غیر دلچسپ جانور سے مجھے جتنا پیار تھا وہ اس پیار سے کہیں زیادہ تھا جو آپ کو مجھ سے ہے۔ میں نے کسی ایک رات بھی اسے گھر سے باہر بھول کر دروازہ بند نہیں کیا' کسی ایک دن بھی اس کے برتن میں دودھ بھرنا نہیں بھولا' آپ تو مجھے جان بوجھ کر چھوڑ گئی تھیں۔ پھر بھی آپ کہتی ہیں کہ آپ کو مجھ سے محبت ہے' مجھے حیرت ہے آپ کے بیان پر۔"

اس کا سر جھک گیا۔ "عمر! میں نے۔۔۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔ میں واپس تو آئی تا تمہیں لینے' میں تمہیں بھولی تو نہیں تھی۔"

"کوئی صاحب کسی گڑیا کو پانی کے کھلے نل کے نیچے رکھ جائے اور واپس آنے پر امید رکھے کہ وہ اسے اصل حالت میں مل جائے گی' کیا ایسا ممکن ہے؟"

وہ عمر کے پیروں کو دیکھنے لگی' اس کی آنکھوں میں پانی جمع ہونے لگا تھا۔

"آپ نے بے جی کو کبھی پیسے بھجوائے؟ میرے اخراجات برداشت کرنا تو آپ کی ذمہ داری تھی' اس سے تو انکار نہیں کر سکتیں آپ۔"

"ہاں' میں نے بھیجے تھے۔ ایک دفعہ پیسے بھیجے تھے' لیکن انہوں نے واپس بھجوا دیے اور خط میں لکھوایا کہ وہ تمہارا سارا خرچ بخوشی اٹھا رہی ہیں اور انہیں کسی مالی مدد کی ضرورت نہیں۔ اسی خط سے تو مجھے معلوم ہوا کہ تمہارا نام انہوں نے عمر رکھا تھا۔ تم بے شک ان سے پوچھ سکتے ہو۔"

"اٹھارہ سالوں میں بس ایک ہی دفعہ؟ صرف میرا نام جان کر آپ کی تسلی ہو گئی۔ سال میں ایک اسٹیٹمنٹ تو بینک والے بھی اپنے کسٹمرز کو بھجوا دیا کرتے ہیں' آپ سے اٹھارہ خط بھی نہ لکھے گئے؟"

اسے عمر کی آواز میں آنسوؤں کی نمی محسوس ہوئی۔ اس نے ذرا سی نظر اٹھا کر عمر کا چہرہ دیکھا تھا۔ وہ رو رہا تھا۔ چھ فٹ اونچے جوان مرد کو روتے ہوئے دیکھنے کے لیے اس کے قد سے اونچی ہمت درکار تھی۔ پرنیاں کی

نظریں پھر سے اس کے پیروں پر جم گئیں۔
"کچھ سال پہلے بہنی اور بسنت نالوں میں سیلاب آیا تھا۔ شکر گڑھ کے اکثر دیہات اس کی زد میں آئے تھے۔ تب تو آپ کو میری فکر ضرور ہوئی ہوگی۔ میری خیریت کی تصدیق کیسے کروائی تھی آپ نے؟ کچھ تو ضرور کیا ہوگا۔"
"میرا یقین مانو عمر! میں سیلاب کی خبریں سن کر بڑی پریشان ہوئی تھی۔ اخباروں اور ٹیلی ویژن کے ذریعے ساری صورت حال سے باخبر رہی۔ پھر جب معلوم ہوا کہ تمہاری طرف آنے والا سیلاب معمولی نوعیت کا تھا تو مجھے اطمینان ہوا۔"
اس نے عمر کو چھوٹے بچوں کی طرح بلک بلک کر روتے دیکھا۔
"معمولی نوعیت کا تھا؟ آپ کی نظر میں غیر معمولی کیا ہے؟ ہم نالہ بہنی کے کنارے بستے تھے۔ پانی سب سے پہلے ہمارے گاؤں پر چڑھ دوڑا۔ تین دن اور تین راتیں ہم نے ایک ٹیلے پر گزاریں۔ حکیم اجمل کا بیٹا، بہو اور دو پوتیاں ڈوب گئیں۔ [illegible] نے کاٹ لیا۔ ماسی چھوہاں کی [illegible] اور اس کی کچی دیوار کے نیچے آ کر مر گئیں۔ [illegible] کی حویلی جو گاؤں کی سب سے مضبوط عمارت تھی اس کی [illegible] ٹوٹ کر بہہ گئیں۔ [illegible] ملبے کے ڈھیر بن گئے تھے۔ معمولی سے اوپر کا درجہ پانے کے لیے سیلاب کو اور کیا کرنا چاہیے تھا؟"
رونے کے باعث عمر کی آواز گلے میں گھٹ رہی تھی۔
اس نے اپنے رخساروں کو بھیگتے ہوئے محسوس کیا۔ ہچکچاتے ہوئے آگے جھک کر اس نے عمر کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اسے بھول گیا تھا کہ کچھ دیر قبل وہ اس کا ہاتھ جھٹک چکا تھا۔ اس بار بھی عمر نے یہی کیا تھا۔ اپنا ہاتھ پرنیاں کے ہاتھ کے نیچے سے کھینچتے ہوئے وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔
"مجھے اس بات کا دکھ نہیں ہے کہ آپ مجھے باپ کا نام نہ دے سکیں۔ دکھ تو اس بات کا ہے کہ آپ اپنے نام کا لیبل میرے ماتھے پر چپکا گئیں۔ ساری زندگی مجھے آپ کے حوالے سے پکارا گیا۔ کوئی آپ کو گالی دے یا مجھے، بات تو ایک ہی ہے نا۔ میں نے کسی گالی دینے والے کو کبھی پلٹ کر جواب نہیں دیا۔ جواب میں کہنے کو میرے پاس تھا ہی کیا۔ جس شخص کے چھاتے میں سیکڑوں چھید ہوں۔ وہ برستی بارش میں کھلے آسمان تلے کھڑا ہو تو بھیگنے سے بچنے کی امید کیسے رکھ سکتا ہے؟"
پرنیاں کے آنسو اب تواتر سے بہنے لگے تھے۔ اس کا سر کچھ اور جھک گیا۔
"بچپن میں مجھے آپ کو دیکھنے کا بڑا تجسس ہوا کرتا تھا۔ بے جی سے آپ کے قصے سنتے سنتے میں تھکتا نہ تھا۔ جب یہاں آ کر آپ کا چہرہ غور سے دیکھا تو مجھے کراہت [illegible] میرے حلق میں [illegible]"
پرنیاں [illegible]
[illegible] گئی۔
"تمہارے اندر میرے لیے اتنی نفرت ہے؟ میرے بس میں ہوتا تو کبھی نہیں خود سے علیحدہ نہ کرتی۔ میں بہت مجبور تھی۔"
"آپ کی ساری مجبوریوں کا حساب رکھنے میں مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ مجھے تو ان مجبوریوں سے تکلیف ہے، جو اب آپ کو بے قرار رکھتی ہیں، جو آپ کو یہاں سے وہاں بھٹکائے لیے پھرتی ہیں۔"
پرنیاں بالکل سمجھ نہ سکی۔ وہ کیا کہہ رہا تھا۔ اس نے پوچھنا چاہا، مگر آنسوؤں نے اس کی آواز نہ نکلنے دی۔
"آپ مجھے یہاں کیوں لائیں؟ جب آپ میں خود پر قابو پانے کی اہلیت نہیں ہے تو مجھے اس کھیل کا تماشائی بنانے کی کیا ضرورت تھی؟ میرے لیے یہاں رہنا صرف اس صورت میں ممکن تھا کہ میں اندھا اور بہرہ ہوتا لیکن میں کیا کروں، یہ دونوں خوبیاں مجھ میں نہیں ہیں۔ میں جس بھی حال میں رہ رہا تھا آپ مجھے

[illegible] دیتیں، کیوں کیا آپ نے ایسا؟"
اس نے گردن اٹھا کر دھندلی آنکھوں سے عمر کا برہم چہرہ دیکھا۔ "میں بالکل نہیں جانتی تم کیا کہہ رہے ہو۔ آج تم بول ہی پڑے ہو تو کچھ پوشیدہ مت رکھو، جو بھی تمہارے دل میں ہے کہہ ڈالو۔"
"ریاکاری مت کریں، اپنے اعمال کی ذمہ داری تو قبول کریں۔ کم از کم میرے پاس اپنی ماں کے کردار میں فخر کرنے کے لائق کوئی ایک بات تو ہو، حیرت ہے جو مجھے اپنی زبان سے کہتے ہوئے شرم آ رہی ہے، وہ کرتے ہوئے آپ کو شرم نہیں آتی۔"
اس کا منہ کھل گیا۔ وہ کسی دق کی ماری بڑھیا کی طرح ہانپ رہی تھی۔
عمر سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر جا رہا تھا۔ پرنیاں نے [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] اپنے ہاتھ کو جھٹکا دیا اور الماری میں بھرا سارا سامان فرش پر ڈھیر کر دیا۔ وہ پرنیاں کی جمع کی ہوئی ویڈیو کیسٹس تھیں۔ ان کے ساتھ سٹوڈیو کا وہ بت بھی تھا جو بلندی سے گرنے کے سبب کئی ٹکڑوں میں بٹ گیا تھا اور اس کے اندر موجود چیزیں بکھر گئی تھیں۔
پرنیاں [illegible] تھا۔ وہ سیڑھیوں کے پاس [illegible] باورچی خانے میں سے تیل اور ماچس کی ڈبیا اٹھا کر لاتے دیکھا۔ وہ ان چیزوں پر پیٹرول چھڑکتے ہوئے تیز تیز بول رہا تھا۔
"آپ میری ماں ہیں، میں آپ پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتا۔ یہ اللہ کو ناپسند ہے۔ میں خودکشی نہیں کر سکتا، یہ بھی اللہ کو ناپسند ہے۔ میں بس اتنا ہی کر سکتا ہوں۔"
اس نے کین کا تمام پیٹرول ان چیزوں پر انڈیل دیا تھا۔ معاً پرنیاں کے ساکت وجود میں جنبش ہوئی، وہ بھاگتی ہوئی صحن میں آئی تھی۔
"نہیں نہ جلاؤ، تمہیں خدا کا واسطہ، ایسا نہ کرو، میں تمہیں ان کے متعلق سمجھا سکتی ہوں۔"
اس نے عمر کا ہاتھ پکڑ کر ماچس چھیننے کی کوشش کی تھی، مگر اس سے قبل وہ جلتی ہوئی دیا سلائی نیچے پھینک چکا تھا۔ پھر عمر نے ایک ایسا منظر دیکھا جو ناقابل فہم اور انتہائی نفرت انگیز تھا۔ اس کی ماں فرش پر دو زانو بیٹھی اپنے سر کی چادر کی مدد سے بھڑکتی آگ کو بجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس حال میں دیوانہ وار روتے ہوئے وہ کسی جاہل فقیرنی جیسی بدصورت لگ رہی تھی۔ اس کے نقوش اس حد تک بگڑے ہوئے تھے کہ وہ پہچانی نہ جاتی تھی۔
جب آوا دہکانے میں حکیم بیگم سے اندازے کی غلطی ہو جاتی تھی تو برتن ضرورت سے زائد حدت ملنے پر جل کر بدوضع ہو جاتے تھے۔ اس وقت عمر کو وہ عورت ایک ایسا ہی مسخ شدہ برتن دکھائی دیتی تھی۔ اسے تراشنے میں کمہار نے جو محنت کی تھی، وہ سب رائیگاں چلی گئی تھی۔
آگ بجھانے کی جدوجہد میں پرنیاں کے ہاتھ جل گئے تھے۔ عمر نے اسے درد سے چلاتے سنا تھا۔
"آپ میرے [illegible] کے لیے فکرمند تھیں۔ یہ آپ کا جہنم ہے، جو آپ کے سامنے جل رہا ہے۔" وہ ایک جھٹکے سے مڑا اور کمرے میں آ کر اپنے کپڑے اور دیگر سامان بیگ میں رکھنے لگا۔ جب وہ بیگ اٹھائے ہوئے باہر نکلا تو پرنیاں کو ننگے سر اسی جگہ پر بیٹھے ہوئے پایا۔
"میں گاؤں جا رہا ہوں، اپنی کچھ چیزیں لے جا رہا ہوں، جو باقی سامان رہ گیا ہے وہ پھر کسی دن آ کر لے جاؤں گا۔"
پیچھے دیکھے بنا وہ دہلیز پار کر گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ کمرے میں ادھر سے ادھر گھومتے ہوئے مسلسل بڑبڑا رہی تھی۔
"تیرے لیے کچھ مشکل تھا کہ عمر کو مجھ سے نفرت کرنے نہ دیتا، اس کا دل پھیر دیتا۔ میں زندگی میں ایک آخری بار خوش ہونا چاہتی تھی۔ میں جانتی ہوں، مجھے ایسی خواہش کرنے کا حق نہیں ہے، لیکن میں خوش

فہمی میں پڑ گئی تھی۔ میں نے سوچا اب تک تو مجھے معاف کر چکا ہوگا۔ میں سمجھی میں نے اپنے حصے کی سزا کاٹ لی ہے۔ میں کب سے صلیب پر معلق رس رس کر مر رہی ہوں۔ میں کیا رہ گئی ہوں۔ ایک بے روح چمڑے کی پتلی کھوکھلی بالکل خالی کیا تجھے اتنی سزا کافی نہیں لگی۔"

وہ دیواروں کے قریب سے گزرتے ہوئے ان پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔ دوسرے ہاتھ کی مٹھی میں دبی ہوئی چیز پسینے سے بھیگ چکی تھی اور اس کی ہتھیلی میں چبھ رہی تھی۔ اس نے لمحہ بھر رک کر مٹھی کھولتے ہوئے اس چیز کو دیکھا اور لمبی سانس بھرتے ہوئے دوبارہ ٹہلنے لگی۔

"میں نے گناہ کیا، میں مانتی ہوں اور میں ساری زندگی شرمسار رہی۔ پر تو تو خداوند ہے۔ میری غلطی پر درگزر کرنے میں تجھے کیا عار تھی۔ معافی مانگتے مانگتے میرا منہ سوکھ گیا۔ تیری ناراضی پھر بھی دور نہ ہوئی۔ تو نے مجھے اس کے دل سے نکال دیا تو اسے میرے دل میں کیوں رہنے دیا؟ تو نے میری تکلیف کم کیوں نہ کی، اس لیے کہ میں نے نافرمانی کی تھی۔ اگر بچہ ماں سے ہاتھ چھڑا کر بھاگے تو کیا وہ اسے نظر سے اوجھل ہونے دیتی ہے؟ تو نے مجھ سے نظر کیوں ہٹالی ہے؟"

اس نے مٹھی میں دبا ہوا بلیڈ دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں میں پھنسا کر بائیں کلائی پر تیزی سے پھیر دیا۔ اس نے کٹی ہوئی جلد کے سفید کناروں کو دور ہٹتے اور ان میں سے خون ابلتے ہوئے دیکھا۔ اس کے بازو کو غیرارادی جھٹکا لگا تھا۔ اس کا ہاتھ کارنس پر رکھی گھڑی سے ٹکرایا اور گھڑی فرش پر گر گئی۔

اس نے بائیں ہاتھ کی سن ہوتی ہوئی انگلیوں میں بلیڈ پکڑ کر دائیں کلائی کی نسیں بھی کاٹ ڈالیں۔ دونوں بانہیں پہلوؤں میں لٹکاتے ہوئے آنکھیں بند کر کے اس نے دیوار سے ٹیک لگالی تھی۔ اسے درد نہیں ہو رہا تھا، مگر جسم سے توانائی تیزی سے نچڑتی جا رہی تھی۔ جب نقاہت حد سے سوا ہو گئی تو اس نے اوپر کی سمت چہرہ اٹھایا اور بڑے درد سے چلائی۔

"الوئی الوئی لما شبقتنی۔" (اے میرے خدا، اے میرے خدا! تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا۔ بائبل)

☆ ☆ ☆

"گندا، چوہڑا..." حکیم بیگم نے لرزتا ہاتھ اٹھا کر اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا تھا۔

عمر کو یاد نہیں تھا آج سے پہلے کبھی حکیم بیگم نے اس کے تھپڑ مارا ہوا۔ اگر وہ اسے انتہائی عاجز کر دیتا تو زیادہ سے زیادہ وہ اس کا بازو پکڑ کر زور سے جھنجوڑتی اور دو دو گالیاں بھی شدید طیش میں ہونے کے علاوہ کبھی زبان پر نہیں لاتی تھی۔ وہ ہکا بکا رہ گیا۔

"وے کاکا! تیری جیب سے زہر دے تبکے نکلے ہیں، تے میرا لوں لوں ساڑ دیا ہے۔ (تیری زبان سے زہر کے قطرے ٹپکے ہیں اور میرا رواں رواں جل گیا ہے۔) تے تیری ماں میں کوئی عیب ہوتا تو وہ تجھے [illegible] کیسے بن گیا۔ [illegible] ہے۔ (چھپے ہوئے زیور کے لیے [illegible] کو کھنگالنا چور کا کام ہے۔) تو چور کیوں بنا؟ گناہ گاراں دی مغفرت رب نے تیرے حوالے کی، تیہڑا (جو) عیب رب نے کج دیا (چھپا دیا) تو اس کا پردہ اتارنے والا کون ہے؟ اپنی ماں پر تہمت کیوں لگائی تو نے؟ رب کا خوف کہاں چلا گیا تیرے دل سے، میری ساری سکھائی پڑھائی تو نے راکھ کر چھوڑی، ہنی واپس جا کے ہتھ جوڑ کے معافی مانگ اپنی ماں سے، ظلم کیا ہے تو نے، جے اکھاں دیکھی۔"

"بس کر بے جی! یہ سبق بہت پڑھے ہیں میں نے۔" وہ زور سے چلایا تھا۔ "تیری نظر میں، میں اور وہ عورت ایک برابر ہیں۔ دونوں کو تو نے پناہ دی۔ تو میری سگی ہوتی تو میری بات سن کر مجھے سینے سے لگا کر حوصلہ دیتی، پر تجھے تو صرف نیکی کمانے سے مطلب ہے، کوئی گھر سے بھاگی ہوئی عورت ہو یا کوئی لاوارث بچہ۔ تیرا سلوک سب کے ساتھ ایک جیسا ہے۔ تو نے میری

ماں کو پناہ دی۔ وہ تجھے چھوڑ گئی تو نے مجھے پاس رکھ لیا۔ پھر مجھے لاہور بھیج کر تو نے صالحہ اور مزمل کو گھر میں بسا لیا۔ تو اپنے دل کے آگے بے بس ہے، تجھ سے نیکیاں کیے بغیر رہا نہیں جاتا۔ میں تیری ایک نیکی ہوں اور بس۔"

حکیم بیگم کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرا گیا۔ دکھ سے چور آواز میں اس نے پوچھا۔ "میں تیری کوئی سگی نہیں ہوں کاکا؟"

"نہیں، میرا اس پورے جہان میں کوئی سگا نہیں ہے، میں تیرا اپنا خون نہیں ہوں نا، میرے درد پر تجھے ویسی تکلیف نہیں ہوتی جیسی تجھے اپنی سگی اولاد کے درد پر ہوتی ہے۔ باجی آمنہ کے لیے تو کیسے اللہ کے سامنے گڑگڑائی تھی۔ تو نے میرے لیے ویسے دعا کیوں نہ مانگی جیسے تو نے باجی آمنہ کے لیے مانگی؟ تو نے میرے لیے اللہ سے [illegible] اس سے اپنی بات منوانے کا ڈھنگ آتا ہے تجھے تو نے میرے لیے کیوں نہ منوایا اسے؟"

عمر کا گلا رندھ گیا تھا۔

بکائن تلے کھاٹ پر ڈھیر ہوتے ہوئے وہ کروٹ لے کر لیٹ گیا۔

"نہ فکر کر، میں ابھی تھوڑی دیر بعد چلا جاؤں گا۔ تین چار دن سے بخار ہے مجھے، اس لیے سارا جسم دکھ رہا ہے۔ جو اگلی بس نکلنی اڈے سے، اس پر بیٹھ جاؤں گا، اتنی دیر مجھے یہاں رکنے کی اجازت دے دے۔"

اس نے اپنے ماتھے پر ایک کھردری جلد والے ہاتھ کا لمس محسوس کیا۔ حکیم بیگم چارپائی سے چل کر آئی تھی۔ اس کے قدموں کی آہٹ وہ سن ہی نہ پایا تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور ایک طرف کھسکتے ہوئے حکیم بیگم کے بیٹھنے کی جگہ بنائی۔

"تیرا پنڈا گرم نئیں ہے۔ تاپ اتر گیا ہے۔ روٹی لے آؤں تیرے لیے۔ خیر آ کے بیٹھتی ہوں۔"

"مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"آپی (خود ہی) لگ جائے گی۔"

اس کا انکار سنے بغیر وہ کھانا لے آئی اور نوالہ بنا کر ہاتھ اس کے منہ کے قریب کیا۔ وہ ہونٹ بھینچے بیٹھا رہا، لیکن کافی دیر تک وہ کانپتا ہوا ہاتھ اس جگہ سے پیچھے نہ ہٹا تو اس نے آہستگی سے منہ کھولتے ہوئے نوالہ لے لیا۔ پھر وہ سر جھکائے خاموشی سے کھانے لگا۔ حکیم بیگم نے بھی کوئی بات نہ کی۔ جب وہ آفتابے سے عمر کے ہاتھ دھلا رہی تھی تو لجاجت سے بولی۔

"چل معاف کر دے، مجھ سے غلطی ہو گئی، میں تجھے مار بیٹھی، بس غصہ آگیا تھا۔ مسیت (مسجد) والے پیپل سے زیادہ بڈھی ہوں۔ دماغ ہی کم نہیں کرتا چنگی طرح۔"

رعشے کی بیماری نے ہاتھوں کے بعد اس کی گردن کے پٹھوں کو تسخیر کر لیا تھا۔ اس کا سر بلا ارادہ دھیرے دھیرے لرزتا تھا۔ وہ واقعی بہت بوڑھی ہو چکی تھی۔

عمر کئی لمحے ساکن پلکوں سے اسے دیکھتا رہا تھا۔ وہ اس عورت کا کیا لگتا تھا؟ وہ عورت اس کی کیا نہ لگتی تھی؟

وہ منہ پھیر کر مخالف سمت میں دیکھنے لگا۔ اس نے حکیم بیگم کے جسم کے بوجھ سے چارپائی کے بان کو دبتے ہوئے محسوس کیا۔ وہ اس کے پاس بیٹھ گئی تھی۔ پھر اس کا ہاتھ عمر کے گال پر آٹھہرا اور اس کا چہرہ اپنی طرف گھماتے ہوئے وہ بولی "اب ناراضی جانے دے کاکا! تو نے ہور بکواس کرنی ہے تے بے شک دی کر لے، پر منہ تے جندرا (تالا) مار کے نہ بیٹھ۔ تیری چپ سے اندر ڈولتا ہے میرا۔ آمنہ واری مجھ سے کوتاہی ہوئی۔ پتا نہیں اس کی پرورش میں کیا کمی رہ گئی۔ وہ کیا بن گئی ہے۔ رب رسول صلی اللہ علیہ وسلم دا ناں (نام) نہیں سنا کبھی اس کی زبان سے۔"

اس سے قبل حکیم بیگم کی زبان پر کبھی آمنہ کی شکایت نہیں آئی تھی۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا۔

"پیبا! تو میری کھٹی بوٹلی (جمع پونجی) ہے۔ میری کل کمائی، تو نہ ڈول۔ آزمائش تے کھرا ہو جا (آزمائش پر پورا اتر)۔ تیرا دکھ مجھے فنا کر دے گا، میں نہیں سہہ سکتی کاکا، نہیں سہہ سکتی۔ کمہیار (کمہار) اپنے باسنوں کو بازار تک بچانے کے لیے لکھ کھکھیڑ (جتن) کرتا ہے۔

خاص نسل کی مٹی لے کر کٹ پیس کے باریک کرتا ہے۔ اسے گوندھنے سے پہلے اطمینان کرتا ہے کہ کوئی پتھر یا کنکر نہ رہ جائے۔ دھیان لگا کے بھانڈے گھڑتا ہے من موہنیاں شکلاں جو گاہک دی اکھ پے کھب جائیں۔ حساب کتاب آدی بناتا ہے۔ سون بھوروں (ساون بھادوں) چے ہتھ روک رکھتا ہے کہ مینہ کنی نال بھانڈیاں دا نقصان نہ ہو۔ فیروی کئی نقص رہ جاتے ہیں۔ کسی دی گھڑائی ٹھیک نہیں ہوتی۔ کوئی پا (کچا) رہ جاتا ہے۔ کوئی زیادہ پک جاتا ہے۔ جتھے (جہاں) مقدراں کی بات اوتھے (وہاں) ساریاں تدبیراں بے کار۔ خریدنے والے کو بدرنگی ٹھوٹھی بھا جائے رب کی رضا۔ نصیب اگے کسی دی پیش نہیں جاندی۔"

(بیٹا! تو میری عمر بھر کی کمائی ہے۔ تو نہ ڈگمگا۔ آزمائش پر کھرا اتر۔ تیرا دکھ مجھے مار ڈالے گا میں نہیں سہ سکتی۔ کمہار اپنے برتنوں کو بازار تک پہنچانے کے لیے لاکھ جتن کرتا ہے خاص نسل کی مٹی لے کر کوٹ پیس کر باریک کرتا ہے۔ اسے گوندھنے سے پہلے اطمینان کرتا ہے کہ کوئی کنکر پتھر نہ رہ جائے۔ توجہ سے برتن گھڑتا ہے۔ من موہنی شکلوں والے جو گاہک کی آنکھ میں کھب جائیں۔ حساب کتاب خود بناتا ہے۔ ساون بھادوں میں ہاتھ روک لیتا ہے کہ بارشوں سے برتنوں کا نقصان نہ ہو، پھر بھی کئی نقص رہ جاتے ہیں کہ کسی کی گھڑائی ٹھیک نہیں ہوتی۔ کوئی کچا رہ جاتا ہے، کوئی زیادہ پک جاتا ہے۔ جہاں مقدروں کی بات ہے، وہاں ساری تدبیریں بے کار۔ خریدنے والے کو بدشکل بھا جائے، رب کی رضا نصیب کے آگے کسی کا زور نہیں چلتا۔)

"تقدیر سے میں منکر نہیں۔ مانتا ہوں آزمائش اللہ کی جانب سے ہے اور اس کی رضا پہ راضی رہنا چاہیے۔ پر تو نہیں جانتی میں نے کیا سہا ہے۔ میں کہاں تک برداشت کروں اور تجھے پتا ہے اس نے مجھے مذہب بدلنے پر مجبور کیا؟"

اگر وہ امید کر رہا تھا کہ یہ بات سن کر حکیم بیگم اس کی ماں کے خلاف بھڑک جائے گی تو اسے مایوسی ہوئی، وہ ذرا سا مسکرائی تھی۔

"اپنا قد ویکھا ہے تو نے؟ کندھے سے دو گٹھ (بالشت) اونچا ہے۔ تیری ماں غریبنی اکیلی عورت مجبور کر سکتی ہے بھلا؟ کوئی کرن والی گل کر۔"

عمر کو اس موقع پر اس کا مذاق کرنا اچھا نہ لگا۔

"اس نے مجھے ویسے ہی مجبور کیا جیسے تو نے مجبور کر دیا تھا اس کے ساتھ لاہور جانے پر۔"

"مجھ سے تجھے پیار ہے، اس لیے مجبور ہو گیا تھا۔ اس سے بھی پیار کرتا ہے کاکا؟"

"میرے لفظ نہ پکڑیں بے بے۔" اس نے جھلا کر کہا۔ "اس نے مجھ پر بڑا دباؤ ڈالا، مجھے عیسائی عالموں سے ملواتی رہی۔"

"فیر کیا ہو گیا تو مان گیا اس کی بات؟ تیرے دل سے ایک آواز بھی نہ آئی کہ تو مسلمان نہ رہے؟"

اس کا سر خود بخود انکار میں ہل گیا۔

"تے اس ویلے ور کر۔" اس نے اپنا کم کیا تو اپنا کم کر۔ جواب دے۔ صاف بول کہ تجھے منظور نہیں۔ پر اپنی ماں کے لیے دل میں گرہ نہ رکھ۔ تو نے اس کو اپنا دشمن سمجھ لیا ہے۔ تیرے اندر ورم بن گیا۔ تو نے آپی سوچ لیا کہ جو تجھے مسلمان رہنے نہیں دیتی وہ کوئی نیک عورت نہیں ہو سکتی۔ تو نے لیک ڈال دی (لکیر کھینچ دی) کہ وہ بد ہے۔"

"نہیں۔ صرف یہ ہی ایک بات تو نہیں ہے۔" اس نے احتجاج کیا۔ "اس عورت کے ساتھ رہنا ناممکن ہے میں پھر بتاؤں گا تو تجھے غصہ آئے گا۔"

حکیم بیگم نے ٹھنڈا ہوکا بھرا تھا۔ "آٹا ویکھ کے کہتا ہے چٹا دھوڑا ہے، نہ تو جانے نہ چکی دے پڑ جانیں کہ آٹا بنن لئی کنک دے دانے نے کی بھوگیا۔ (آٹا دیکھ کر کہتا ہے یہ تو سفید دھول ہے، نہ تو جانتا ہے نہ چکی کے پاٹ جانتے ہیں کہ آٹے میں ڈھلنے کی خاطر گندم کے دانے کو کیا بھگتنا پڑا۔) ٹوے (اندازے) نہ لگا۔ تجھے کی پتا کس کی کتنی آزمائش ہوئی۔ کسی پہ کیا گزر گئی۔ دعا منگ اپنی ماں کے لیے۔ دلوں منوں ہو کے منگ (صدق دل سے مانگ) سب خیر ہو جائے گی، رب مشکل ٹال دے گا۔"

"جب اللہ نے سارے فیصلے پہلے ہی کر دیے ہیں تو دعا مانگنے کی کیا حاجت ہے، میں کیوں دعا مانگوں وہ میری ہر فرمائش سے واقف ہے، پھر زبان سے کہنے کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے۔"

حکیم بیگم کی آنکھوں میں اسے ناپسندیدگی نظر آئی تھی۔

"شاوا کاکا! بڑی سیانف (سیانی) گل کی ہے تو نے۔"

اس کے طنز نے عمر کو نادم کر دیا۔ "کبھی کبھی میری عقل ہار جاتی ہے، کئی سوال ایسے ہیں جو کسی کلیے سے حل نہیں ہوتے۔"

"ہر سوال کا جواب ڈھونڈے گا تو سوالاں جوگا رہ جائے گا۔ اپنی عقل سے زیادہ نہ سوچا کر، ہر شے دا اک طریقہ مقرر ہے، تے اس طریقے کے مطابق چلنے میں بھلائی ہے۔ [illegible] ماہ (سردی کا مہینہ) میں کھمباں (کھمبیاں) نکل آن؟ سون بھدروں دے دیہاڑ ہوں تے مینہ وسے گا۔ پھر اس ہولی فیر کھمب نکلے گی۔ اج ونجتا ہے میں دعا نہیں منگنا، کل کہے گا میں روٹی دی بری توڑ کے منہ دے اندر کیوں رکھوں، آپی کیوں نہ پیٹ بھر جائے میرا؟ سودائی! منگنا آداب میں شامل ہے۔ مخلوق عاجز ہے خالق دے اگے۔ میرے منہ وچ سواہ پڑے تو اپنے بنان والے دا ادب نہیں کرتا!"

(ہر سوال کا جواب ڈھونڈے گا تو سوالوں کا ہی ہو کے رہ جائے گا، اپنی عقل سے زیادہ نہ سوچا کر۔ ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے۔ اسی وقت کے ساتھ چلنے میں بھلائی ہے۔ کبھی ایسا ہوا کہ سردی کے مہینے میں کھمبیاں نکل آئیں؟ ساون بھادوں کے دن ہوں گے تو مینہ برسے گا، حبس ہو گا، پھر کھمبی نکلے گی۔ آج تو کہتا ہے، میں دعا نہیں مانگتا کل کہے گا، میں روٹی کا نوالہ توڑ کر منہ میں کیوں رکھوں خود پیٹ کیوں نہیں بھر جائے میرا؟ پگلے! مانگنا آداب میں شامل ہے۔ مخلوق عاجز ہے، خالق کے آگے۔ میرے منہ میں خاک پڑے، تو اپنے بنانے والے کا ادب نہیں کرتا؟)

عمر نے شدید جھنجلاہٹ محسوس کرتے ہوئے پہلو بدلا تھا۔

"میں اس عورت کے لیے کیا مانگوں، میرے دعا کرنے سے اس کی زندگی میں کیا بہتری آ سکتی ہے۔ میں کوئی ولی تو نہیں ہوں، جو ایک ناممکن چیز مانگوں۔"

"جو ہر ناممکن کو ممکن کر سکتا ہے اس کا نام ہی اللہ ہے۔ تو ہاتھ اٹھا تو سہی، جھولی اڈتے سہی۔ (جھولی پھیلا تو سہی) یقین کرنا سیکھ، شک اور وسوسے کو نزدیک نہ آنے دے۔ یہ تیرے دشمن ہیں، یہ دعا کو بے اثر کر دیتے ہیں۔ دعا فرشتے کے پر کی طرح کوری اور چٹی ہونی چاہیے۔ شک کا ہلکا سا شائبہ بھی نہ ہو اس میں۔"

حکیم بیگم کھاٹ کے پائے پر ہاتھ سے وزن ڈالتے ہوئے اٹھ گئی اور جاتے ہوئے بے تاثر لہجے میں کہنے لگی۔

"اج رات اتھے (ادھر) رہ۔ آرام کر، کل تیری طبیعت بھلی ہو جائے تے لاہور چلے جانا، آوے کی تپش سخت سہی، پر اس کے بنا اک چھپنی (ہنڈی وغیرہ کا ڈھکن) بھی نہیں بن سکتی۔ گارے تے پکے ہوئے برتن کا فرق سمجھ۔"

اگلے روز عصر کی نماز کے دوران اس کا دھیان بار بار بھٹک رہا تھا۔ اس کا ذہن مسلسل مسجد سے باہر کی دنیا میں اٹکا ہوا تھا۔ حکیم بیگم نے پھر اسے جانے کو نہیں کہا تھا۔ اس کے باوجود وہ جانتا تھا کہ اسے جانا ہی پڑے گا۔ بھلے اس کی مرضی ہو یا نہ ہو۔

امام صاحب نے "السلام علیکم ورحمتہ اللہ" کی صدا دی تو وہ چونک گیا۔ آخری رکعت تمام ہو گئی تھی اور اپنے تئیں وہ ابھی دوسری رکعت کے قعدہ میں تھا۔

"اللہ کے گھر میں بھی مجھے سکون نہیں تو پھر دنیا میں ایسی کون سی جگہ بچتی ہے جہاں جا کر میرا اضطراب تھم جائے۔"

وہ ذہنی پراگندگی کی انتہا پر تھا۔ دعا کے لیے ہاتھ پھیلاتے ہوئے تصور میں آپا کا وجود آ گیا تو شاید حکیم

بیگم کی باتوں کا اثر تھا کہ عمر نے اس کی خاطر دعا کرنے کی نیت کی۔ بہت دیر تک وہ کوئی موزوں الفاظ تلاش کرتا رہا لیکن اسے کچھ نہ سوجھا۔

"اس کے لیے بھلا میں کیا مانگ سکتا ہوں' میرے دعا کرنے سے کیا ہوگا؟ وہ بدل جائے گی یا اس کے لیے میرا دل بدل جائے گا؟ یہ تو عام انسانوں سے اوپر کے درجے کی باتیں کرتی ہے۔ اس کی اپنی ہی فلاسفی ہے۔ دلیل اور منطق کو وہ مانتی ہی نہیں۔ میں اس کی طرح دعا نہیں مانگ سکتا۔ جب کوئی بدلاؤ آنا ممکن ہی نہیں تو میں کیوں دعا کروں۔"

اس کے ہاتھ بے جان ہو کر ہوا میں تیر گئے۔ اس نے محراب کے اوپر نصب گھڑیال میں وقت دیکھا تھا۔ لاہور جانے والی بس کے اڈے سے نکلنے میں تقریباً" آدھا گھنٹہ باقی تھا۔ گھر آکر اس نے حکیم بیگم سے اجازت لی اور لاری اڈے کی جانب چل دیا۔

☼ ☼ ☼

بارہا اطلاعی گھنٹی بجانے پر جب آپا کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا تو وہ تشویش میں گھر گیا۔ دروازہ اندر سے بند تھا تو صاف ظاہر تھا کہ آپا گھر میں ہی تھی۔ شاید وہ سو رہی ہوں' لیکن آپا اتنی جلدی سونے کی عادی نہ تھی اور ایسی گہری نیند تو وہ کبھی نہ سوتی تھی اور ساری بتیاں کیوں بجھی ہوئی تھیں؟

سناٹا اور اندھیرا یکجا ہو جائیں تو کتنے معنی خیز اور پُرہول ہو جاتے ہیں۔

وہ ہتھیلیوں سے دروازہ پیٹنے لگا۔ پھر بدحواسی میں بند کواڑوں کو اندر کے رخ دھکیلنے لگا۔ وہ بلند آواز میں آپا کو پکار رہا تھا۔

"دروازہ کھولیں آپا! میں کب سے باہر کھڑا ہوں کیا آپ کو دستک کی آواز سنائی نہیں دے رہی۔ دروازہ کھول دیں آپا' آپا۔"

پھر اس نے سوچا کہ غالباً" آپا غسل خانے میں ہوگی۔ تب ہی دروازہ کھلنے میں اتنی تاخیر ہو رہی تھی اور بھلا کیا وجہ ہو سکتی تھی۔ یہ فرض کرکے اس نے دروازہ کھٹکھٹانا بند کر دیا اور انتظار کرنے لگا۔

بہت وقت بیت جانے پر بھی جب گھر میں چھایا ہوا سکون نہیں ٹوٹا تو اس کی تشویش اندیشوں میں بدلنے لگی۔ چند مزید آوازیں دینے کے بعد وہ الٹے قدموں پیچھے ہٹتے ہوئے دیوار سے دور ہو گیا اور پھر تیزی سے دوڑتے ہوئے جب دیوار کے نزدیک پہنچا تو ٹھوکر مارنے کے انداز میں ایک پاؤں دیوار پر مارا' اس کی مدد سے جسم کا بوجھ اوپر دھکیلا اور منڈیر پر ہاتھ جما دیے۔ نو فٹ اونچی دیوار سے جست لگا کر وہ صحن میں اتر گیا تھا۔ گاڑھی تاریکی میں اندھوں کی طرح ٹٹولتے ہوئے وہ برآمدے میں آیا۔ صحن اور برآمدے کی بتیاں جلائیں اور بے قراری سے آپا کے کمرے کی طرف نگاہ اٹھائی' دروازہ نصف سے زائد کھلا ہوا تھا۔

"کیا آپ سو رہی ہیں؟ سب ٹھیک تو ہے نا؟ آپ جواب کیوں نہیں دیتیں؟"

کمرے کی جانب اٹھتے ہوئے اس کے قدم جانے کیوں اتنے وزنی ہو گئے تھے۔ چلتے ہوئے وہ پاؤں گھسیٹ رہا تھا۔ کمرے کی بتی روشن کرنے پر جس پہلی چیز پر اس کی نظر پڑی وہ آپ کے پاؤں کا تلوا تھا جو اتنا سفید تھا کہ سنگ مرمر کا ٹکڑا معلوم ہوتا تھا' پھر اسے خون کے چھینٹے دکھائی دیے تھے۔ اس کے اعضا بھربھری ریت میں ڈھل گئے۔ بلب کی روشنی اسے ناکافی محسوس ہونے لگی تھی۔

آپا کارنس کے نیچے دیوار کی جڑ میں آڑی لیٹی تھی اور جابجا منجمد لہو کے لوتھڑے دیوار اور فرش سے چپکے تھے۔ آپا کا چہرہ جو انتہائی زرد تھا اور بعض جگہوں پر نیلگوں ہو رہا تھا چھت کی سمت اٹھا ہوا تھا۔

عمر نے اسے آواز دینا چاہی اور گھگھیا کر رہ گیا۔

وہ جانتا تھا کہ ایسی رنگت والے چہروں کو آوازوں سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ جب گاؤں کے بہشتی کے بیٹے کا بازو گھاس کترنے والے ٹوکے میں آکر کٹ گیا تھا تو اس کا چہرہ بھی ایسا ہی دکھائی دیتا تھا۔ اس کی ماں اور بہنیں کھاٹ کے گرد جمع ہو کر کیسے گلے پھاڑ کر لاتے پکارتی تھیں۔ ان کی چیخوں سے سننے والوں کے کانوں

کے پردے پھٹنے جاتے تھے۔ مگر اس نیلاہٹ زدہ پیلے پڑتے والے لڑکے پر ذرا بھی تو اثر نہ ہوا تھا۔

یہ سب جانتے ہوئے بھی عمر نے آپا کو جھنجوڑنا شروع کر دیا۔ ایسے موقعوں پر نبض محسوس کی جاتی ہے' دھڑکن اور سانس کی آمدورفت پر دھیان دیا جاتا ہے۔ اگر اس کے حواس قائم ہوتے تو شاید ان میں سے کوئی بات اسے سجھائی دے جاتی۔ وہ تو اتنا تعین بھی نہ کر پا رہا تھا کہ آپا کے بدن پر زخم کہاں کہاں آئے تھے۔

پھر جانے کیسے اسے ریسکیو سروس والوں کا خیال آگیا۔ کیلی فون پر گھر کا پتا لکھواتے ہوئے اس نے آپریٹر سے جلدی ایمبولینس بھجوانے کی التجا کی تھی۔ آپا کے پاس فرش پر بیٹھ کر وہ ایمبولینس کا انتظار کرنے لگا۔

اپنی پوری زندگی میں [illegible] ٹائم پیس پڑا تھا جو عموماً کارنس پر دھرا رہتا تھا۔

اسے فون کیے ہوئے اندازاً" پانچ منٹ گزر چکے تھے۔ اضطراری کیفیت میں ہاتھ بڑھا کر اس نے ٹائم پیس اٹھالیا تھا۔ اس کا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا اور سوئیاں ساکت تھیں۔ شاید وہ کارنس سے نیچے گرا تھا اور دھچکے کی وجہ سے بند ہو گیا تھا۔

اسے واپس زمین پر رکھتے ہوئے عمر کی نظریں دوبارہ رکی ہوئی سوئیوں میں الجھ گئی تھیں۔ چار بج کر چھ منٹ کا وقت اس گھڑی میں تھما ہوا تھا۔ اس کی سانس رک گئی۔

چند گھنٹوں قبل عین اسی وقت اس نے آپا کے لیے دعا کرنے کا ارادہ ترک کیا تھا۔ تب مسجد کے گھڑیال میں بالکل یہ ہی وقت تھا۔ اسے لگا وہ خون آپا کے جسم سے نہیں اس کے اپنے جسم سے بہا تھا۔ اس سرد کمرے میں جہاں موسم کی خنکی کے ساتھ موت کی ٹھنڈک بھی تھی' وہ پسینے میں نہایا ہوا تھا۔

یہ تصور کرنا مشکل نہیں تھا کہ ٹائم پیس آپا کا ہاتھ لگنے سے گرا ہوگا اور شاید ایسا تب ہوا ہوگا جب اس پر جان نکلنے کی تکلیف طاری ہوئی ہوگی۔

تو کیا اس کی دعا آپا کا مقدر بدل سکتی تھی؟

اگر وہ اللہ سے آپا کے لیے عافیت مانگتا تو کیا وہ دے دیتا؟

کیا اسے یہ منظر دیکھنے کو نہ ملتا جو وہ اب دیکھ رہا تھا؟

حکیم بیگم نے بیس سال آمنہ کی اولاد کے لیے دعا مانگی تھی اور ایک پل بھی بے یقین نہ ہوئی تھی کہ اس کی دعا قبول نہ ہوگی اور وہ بیس سیکنڈ بھی شک میں مبتلا ہوئے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ اسے تو ہاتھ اٹھانے سے قبل ہی اپنی دعا کے رد ہو جانے کا یقین تھا۔

آپا کے ٹھنڈے اور اکڑے ہوئے خون آلود ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر وہ خلا میں گھورنے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

رات گئے گرانٹ گھر آیا تو صوفیہ ابھی جاگ رہی تھی۔ فرش پر بچھے گدیلے پر کہنی کے بل نیم دراز وہ خود فراموشی کے عالم میں تھی۔ دروازہ کھلنے کی آہٹ اور گرانٹ کے قدموں کی چاپ نے بھی اسے چونکایا نہیں۔ اس کے سامنے ایک پلیٹ ڈھکی ہوئی رکھی تھی۔

گرانٹ نے کوٹ اتار کر صوفے پر پھینکتے ہوئے صوفیہ اور اس کے قریب رکھی پلیٹ کو ایک نظر دیکھا تھا۔

"اب تک تمہیں سو جانا چاہیے تھا۔ دوپہر تک آنکھ نہیں کھلتی تمہاری۔ اپنی زندگی میں تھوڑی باقاعدگی لاؤ' کیوں جاگ رہی ہو؟"

"نیند نہیں آرہی' تمہارے پاس سلیپنگ پلز ہیں تو مجھے دے دو' کئی راتوں سے مجھے بالکل نیند نہیں آئی۔" صوفیہ نے یوں ہی لیٹے لیٹے کہا۔

"ہرگز نہیں' یہ تمہاری عمر ہے سلیپنگ پلز لینے کی' ایک بار ان خرافات میں پڑ جاؤ تو جان چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔ میں نے کتنی بار منع کیا ہے کہ سارا سارا دن ٹی وی پر الم غلم پروگرام مت دیکھا کرو' یہ میڈیا

والے نوجوانوں میں مایوسی اور ذہنی انتشار بانٹ رہے ہیں، تم پر میری کسی بات کا اثر کیوں نہیں ہوتا؟ چلو اٹھو یہاں سے، جاکر اپنے بستر پر لیٹو اور سونے کی کوشش کرو۔" گرانٹ نے کوٹ کی طرح ٹائی بھی صوفے پر اچھال دی تھی۔

"اور تم اس وقت کیوں کھا رہی ہو؟" اس کی توجہ ان چھوٹی پلیٹ پر مرکوز ہوگئی۔

"کھانے کی صرف ایک ہی وجہ ہوتی ہے جو تمہیں بھی معلوم ہے۔" صوفیہ نے پلیٹ اٹھا کر کچن کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

"تمہارے کسی کام کا کوئی معمول ہو تو تم پر یوں قنوطیت نہ چھائی رہا کرے، تمہارے شب و روز شدید بدنظمی میں گزر رہے ہیں۔ ٹھہرو ذرا ایک منٹ۔" اسے ٹوکری میں پلیٹ انڈیلتے دیکھ کر گرانٹ تیزی سے اس کے پیچھے آیا۔

"نہیں، تم پورک تو نہیں کھانے والی تھیں؟ میرے آنے پر تم نے کھانا ضائع کیوں کر دیا جبکہ تم کہہ رہی ہو کہ تمہیں بھوک لگی ہے۔" وہ ٹوکری اٹھا کر اس کے مشمولات کا بغور جائزہ لینے لگا۔

"مجھے ایسا محسوس ہوا تھا کہ مجھے بھوک لگی ہے۔"

"تو پھر کھایا کیوں نہیں؟"

"میری بھوک کھانے بنا کر ہی ختم ہوگئی۔ شاید مجھے بھوک لگی ہی نہیں، بس بھوک کا احساس ہوا تھا۔" صوفیہ نے ٹوکری اس سے لے کر نیچے رکھ دی۔ "میں پورک نہیں کھاتی، میں کسی بھی طرح کا گوشت نہیں کھاتی، تم خوب جانتے ہو میں ویجی ٹیرین ہوں۔"

گرانٹ کی آنکھوں میں خالی پن تیرنے لگا، وہ ہتھیلی سے ماتھے کی جلد کو رگڑ رہا تھا۔ "ہاں یہ بات تو مجھے معلوم ہے۔ جانے کیوں ذہن سے نکل گئی۔ ان دنوں میں بہت تھکا تھکا سا رہتا ہوں۔ میرے دماغ میں سوئیاں سی چبھتی ہیں۔ مجھے کیا ہو رہا ہے؟ آج صبح مجھے یہ یاد نہیں آ رہا تھا کہ میں اپنے کمرے میں ہوں یا.... پتا نہیں.... کچھ عجیب سی بات اٹکی تھی سوچ میں۔ کیا سوچ رہا تھا میں کہ رائٹنگ ٹیبل میرے بستر کے

دائیں طرف رکھی ہوئی ہے یا بائیں طرف اور [illegible] نہیں رہا تھا۔ شاید یہی بات تھی یا کسی اور [illegible] الجھ گیا تھا۔"

کچن سے باہر آتے ہوئے وہ گویا اپنے آپ سے مخاطب تھا پھر اس کی نظر صوفیہ پر پڑی جو سنک میں پلیٹ دھو رہی تھی تو بولا۔

"آج میں پولیس اسٹیشن گیا تھا حالانکہ مجھے بتا دیا گیا تھا کہ اس معاملے میں تمہاری شمولیت خارج از امکان قرار دی جا چکی ہے، پھر بھی میری تسلی نہیں ہوئی۔ میں خود ان لوگوں سے مل کر اطمینان کرنا چاہتا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ اتنی بڑی مصیبت ٹل گئی۔ ایک موقع پر تو مجھے یقین ہو چلا تھا کہ وہ تمہیں ملوث کر کے چھوڑیں گے اور وہ ایسا کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتے اگر خدا انہیں روک نہ دیتا۔ میں نے [illegible] [illegible] کر لی [illegible] ہم کیسی الجھن میں مبتلا ہو جاتے۔"

صوفیہ کو اس بات پر ایک نامعلوم سی ہی اختیار تحریر نہ [illegible] گرانٹ کی [illegible] ہو سکتی تھی۔ اس نے خود کوشش نہ کی ہوتی تو آج اس کا حال بھی میبل سے مختلف نہ ہوتا، لیکن اگر اس نے جھوٹ نہ بولا ہوتا اور سب ماجرا من و عن بیان کر دیا ہوتا تو کیا پھر بھی میبل اس مصیبت میں پھنستا؟ اس کی حالت تو اس مکھی جیسی تھی جو مکڑی کے جالے میں الجھنے پر یہ نہیں جانتی کہ اسے پھڑپھڑانے سے رہائی ملے گی یا ساکن رہنے سے۔

وہ جو کر چکی تھی اسے لوٹانا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ وہ میبل کے لیے مشکل میں کیوں پڑی ہے؟

اس نے سر جھٹکتے ہوئے گرانٹ کی آواز پر توجہ دینے کی کوشش کی۔

"آئندہ تمہیں بہت محتاط رہنا ہوگا۔ یہ ٹھیک ہے کہ میبل کی معذوری اور تنہائی کی وجہ سے تمہیں اس سے ہمدردی رہی ہوگی لیکن کون جانتا تھا کہ وہ اپنے اندر کس شر کو چھپائے پھر رہا تھا۔ اس لڑکی کی جگہ تم

[illegible] ہو سکتی تھیں۔ وہ تمہیں بھی قتل کر سکتا تھا۔ ایسا [illegible] طریقہ نہیں کہ تم لوگوں [illegible] ان سے [illegible] جاتے ہیں۔"

"تمہاری خوش قسمتی ہے گرانٹ! کہ ایسا کوئی طریقہ نہیں ہے ورنہ میرے اندر چھپے ہوئے شر کو جان کر تم پچھتاتے کہ میں میبل کے ہاتھوں قتل کیوں نہ ہوئی۔" اس نے گرانٹ کا [illegible] دیکھتے ہوئے سوچا تھا۔

اب وہ صوفے پر بیٹھ کر جوتوں کے تسمے ڈھیلے کر رہا تھا۔

صوفیہ نے دھلی ہوئی پلیٹ کیبنٹ میں رکھی، جہاں سے گلاس نکال کر نل سے پانی بھر کر پیا اور خالی گلاس کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ عقب میں اسے گرانٹ کے بوٹ کی آواز مسلسل سنائی دیتی رہی۔ وہ اس کی بے توجہی پر ذرا بھی غور نہیں کر رہا تھا۔ اندر سے وہ ایک [illegible] شرلے کر آئی تو گرانٹ [illegible] [illegible] بیٹھا [illegible]

"[illegible] نہیں [illegible] گے۔ تم مجھے چڑانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ جب میں بات کر رہا ہوں تو چلنے پھرنے سے گریز کیا کرو۔"

وہ خاموشی سے میز کے دوسری طرف کاؤچ پر بیٹھ گئی اور بروشر کو دیکھنے لگی۔

"ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ میبل نے سب کو معصومیت کا کیسا [illegible] رکھا تھا۔ [illegible] ایسے جرائم کرتا رہا ہو۔ [illegible] قرین قیاس نہیں لگتا۔

واٹس جیسے علاقے میں جہاں نسلی تعصب کو لوگوں نے ایک عام رواج کی طرح اپنا رکھا ہے ایک کالے آدمی کے ہاتھوں سفید فام لڑکی کا قتل۔ یوں سمجھو کہ میبل نے کھڑکھڑاتے سانپوں کی باہی میں ہاتھ گھسیڑ دیا ہے۔ جانے کیلی فورنیا میں سزائے موت کا کیا طریقہ رائج ہے۔ میں نے کبھی دھیان نہیں دیا۔ برقی کرسی یا پھر زہر کا انجکشن ہی ہوگا زیادہ تر ریاستوں میں تو یہی ہو رہا ہے۔ تمہیں پتا ہی ہوگا کہ وہ لڑکی ایک

گینگسٹر کی رکن تھی۔ ایسے لوگ بہت بارسوخ ہوتے ہیں۔ میں نے خبر سنی ہے کہ اس کیس کو لے کر نسلی فسادات شروع ہونے کا اندیشہ ہے۔"

گرانٹ نے بولتے ہوئے جو نامیز پر رکھ دیا تھا۔

یہ سب اسے معلوم تھا اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا اور بروشر گرانٹ کی جانب بڑھا دیا۔

"کیا ہے یہ؟" وہ اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔

"یہ ایک بڑا پارلر ہے۔ میں یہاں ملازمت کرنا چاہتی ہوں بطور ویٹرس۔ تنخواہ معقول ہے اور کام کے اوقات بھی زیادہ برے نہیں۔"

گرانٹ نے اسے گھور کر دیکھا اور بروشر کو میز پر پٹخ دیا۔

"تمہیں اس گھر کے اندر سکون سے رہتے ہوئے کیا تکلیف ہوتی ہے۔ میں اپنی خراب صحت کے باوجود اتنے جتن کیوں کرتا ہوں؟ صرف اس لیے کہ تمہیں باہر کی دنیا سے بچائے رکھوں۔ میرا صبر آزمانے کے نت نئے طریقے ایجاد نہ کیا کرو۔ اس ویٹرس کا یونیفارم دیکھا ہے تم نے؟ ٹینک ٹاپ اور رنز شارٹس۔ آدھے سے زیادہ جسم ڈھکا ہوا نہیں ہے۔"

اس نے بروشر اٹھا کر صوفیہ کی آنکھوں کے قریب کیا جس کے ایک کونے میں خوبصورت مسکراہٹ اور دلکش ٹانگوں والی لڑکی پزا کی ٹرے اٹھائے کھڑی تھی۔

"خدا ایسا حلیہ پسند کرتا ہے کیا؟ یہ پزا پارلر کسی بروتھل سے کم نہیں۔ گاہکوں کو بہلانے کے لیے انہوں نے اپنی لڑکیوں کی وضع قطع ایسی بنا رکھی ہے۔ کسی کو پزا کھلانے کے لیے آدھا ننگا ہونے کی کیا تک ہے؟ بتاؤ مجھے۔" وہ مشتعل ہو گیا۔

"یہ موسم گرما کا یونیفارم ہے۔ میں صرف مارچ تک وہاں کام کروں گی میرا وقت آسانی سے گزر جائے گا۔ اب میں اسکول بھی تو نہیں جاتی۔"

"موسم کا اس بات سے کوئی لینا دینا نہیں ہے سارا مسئلہ تو ماحول کا ہے۔ تم وہاں بدتہذیب مردوں کو شراب پیش کیا کرو گی۔ تمہاری عقل کو کیا ہوا ہے۔ میں اس بارے میں ایک لفظ نہیں سنوں گا۔"

گرانٹ کے اشتعال میں اضافہ ہوا تھا۔

"لیکن وہ ایک بڑا پارلر ہے کوئی بار تو نہیں۔"

"کون سا ایسا پارلر ہے جہاں بیئر اور وائن مہیا نہیں ہوتی۔ کیا ان میں الکوحل نہیں ہوتا۔" اس نے میز پر زور سے ہاتھ مارا۔ "مجھے تو تم پر بھی اعتبار نہیں کہ آزادی ملنے پر تم وہ سب نہیں کر گزرو گی جس سے میں نے اب تک تمہیں روک رکھا ہے۔ میں جانتا نہیں کیا کہ تمہاری عمر کی لڑکیوں کی رگوں میں خون کی جگہ شر بہتا ہے۔ ایسی راہیں تمہیں شیطان دکھا رہا ہے۔ اس کی آواز پر کان نہ دھرو۔"

لہجے کی سختی سے صوفیہ پر کوئی اثر نہ ڈالا۔

"تم اس تعارفی کتابچے کو پڑھ کر فیصلہ کرو کہ شرائط اور ضوابط کتنے مناسب اور قابل قبول ہیں۔ میں ایک دو روز میں وہاں انٹرویو دینے جاؤں گی۔"

گرانٹ نے بروشر کو دو لخت کر کے ہوا میں اچھال دیا۔

"میرے ساتھ بحث نہ کرو۔" مجھے اور غصہ مت دلاؤ۔ ورنہ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میں تمہیں کھڑے کھڑے اس گھر سے بے دخل کرنے کا اختیار رکھتا ہوں اور کوئی بھی میرے اس اقدام کی مخالفت نہیں کر سکتا۔ تمہاری ماں کے مرنے پر وصیت کی رو سے مجھے یہ اپارٹمنٹ ملا ہوتا تو تمہیں کورٹ سے رجوع کرنے پر شاید کچھ مل جاتا لیکن وہ اپنی زندگی میں اسے میرے نام کر گئی تھی۔ میں ایک لمحے میں تمہیں سڑک پر پہنچا دوں گا۔" اس نے انگلی اٹھاتے ہوئے تنبیہہ کی۔

صوفیہ نے زیر لب الیا کو گالی دی تھی ایسے کتنے ہی احسانات وہ اس پر کر گئی تھی۔

"میں نے تمہارا آزار کیوں پالا ہوا ہے۔ صرف اس وجہ سے کہ میں خدا کے سامنے سرخرو ہو سکوں۔ ورنہ مجھے تم سے تل برابر دلچسپی نہیں بلکہ میں تم سے بیزار ہوں۔ پاک بازی کے سوا ایسی کیا خوبی ہے تم میں جو تم خدا کی نظر میں پسندیدہ ٹھہرو۔ تمہارے اندر ہر وہ برائی موجود ہے جو جہنم کا دروازہ کھولنے کے لیے درکار ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ تمہارے ... برائیاں کرنے کے مواقع نہیں ہیں۔ عذاب کا صرف نام سنا ہے۔ جب وہ تم پر وارد ہو گا تو تم جان لو گی کہ وہ کس قدر بھیانک ہے۔ پھر تمہارا پچھتانا کسی کام نہیں آئے گا۔"

گرانٹ کی باتیں کبھی کبھی اسے بہت محظوظ کرتی تھیں۔ جو شخص عذاب کی زندہ تجسیم تھا وہ کس بیرے پرائے عذاب سے محفوظ رہنے کے گر سمجھا رہا تھا۔

اطلاعی گھنٹی کی آواز گونجی تو گرانٹ متعجب نظروں سے دروازے کو دیکھنے لگا۔

"اس وقت کون آ سکتا ہے؟ ٹھہرو! میں دیکھتا ہوں۔" وہ دروازے کی سمت چلا۔

گرانٹ کی ڈری ہوئی چیخ سن کر صوفیہ نے بے اختیار گردن گھمائی۔ تب اسے وہ دو لوگ نظر آئے تھے جو گرانٹ کو زبردستی دھکیلتے ہوئے اندر گھس آئے تھے۔ ان [illegible] میں آنکھوں اور ہونٹوں کے سوا ان کا چہرہ مخفی تھا۔ ان میں سے ایک کے پاس گن تھی جو اس کے ہاتھ میں تھی اور دوسرا شناخت کرنے سے لیس تھا۔

شعوری سطح پر شدید خطرے کو بھانپنے میں اسے چند گھڑیاں لگی تھیں۔ گن بردار نے گرانٹ کو فرش پر گرا کر بے بس کر دیا تھا جبکہ دوسرا آدمی صوفیہ کی جانب بڑھ رہا تھا اور وہ جواب تک بے حس و حرکت تھی، اچانک مڑی اور استطاعت کی آخری حد تک بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں داخل ہو گئی، دروازہ ایک دھماکے سے بند کرتے ہوئے اسے مقفل کیا اور اسی سرعت سے بھاگ کر باتھ روم کا دروازہ بھی بند کر دیا باتھ روم کا دوسرا دروازہ گرانٹ کے کمرے میں کھلتا تھا اگر وہ اپنی طرف کا دروازہ کھلا رہنے دیتی تو وہ لوگ باتھ روم سے گزر کر اس تک پہنچ سکتے تھے۔ دونوں دروازوں سے دور ہٹ کر وہ دیوار سے چمٹ گئی تھی۔

گرانٹ کے چلانے اور گالیاں دینے کی آواز اس کے کانوں تک آ رہی تھیں البتہ آنے والوں میں سے کوئی بھی اب تک ایک لفظ نہ بولا تھا۔ پھر اس کے

کمرے کا دروازہ دھڑ دھڑایا جانے لگا۔

کچھ لمحوں کے وقفے سے باتھ روم کے دروازے پر بھی چوٹیں پڑنے لگیں۔ وہ سمٹ کر انتہائی کونے میں دبک گئی۔

گرانٹ کی چیخ و پکار اب معدوم ہو چکی تھی۔ نہ جانے اس کا کیا حشر ہوا تھا۔ حیرت کی بات تھی کہ وہ دونوں کچھ بھی بولتے نہ تھے۔ حتیٰ کہ اسے دروازہ کھولنے پر مجبور کرنے کے لیے بھی منہ سے کوئی آواز نہ نکالتے تھے۔ دروازوں کو لگنے والے دھکوں کی شدت بڑھتی جا رہی تھی۔ کسی بھی لمحے وہ لوگ اندر آنے والے تھے۔ سن ہوتے دماغ کے ساتھ وہ اس صورت حال سے بچ نکلنے کا کوئی طریقہ سوچنے لگی۔

اس کا سیل فون کمرے میں تھا۔ اس کے پاس پولیس کو اطلاع کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا اور شاید پولیس کے آنے تک وہ لوگ اپنا کام ختم کر چکے ہوں گے۔ اس کے کمرے کی کھڑکی باہر کے رخ بنی ہوئی تھی لیکن اس کے راستے باہر جانا ممکن نہ تھا۔ وہ کچھ بھی کر لیتی چوکھٹ میں گڑے کانچ کے ٹکڑوں اور کیلوں سے زخم کھانے سے محفوظ نہیں رہ سکتی تھی۔ ماضی میں دو تین مرتبہ اس نے میٹرس اور صوفے کی گدی وغیرہ کھڑکی میں رکھ کر باہر جانے کی کوشش کی تھی لیکن لمبی نوکیلی میخوں نے آسانی سے میٹرس کو پھاڑ دیا تھا۔

چوکھٹ کی چوڑائی زیادہ ہونے کی بنا پر وہ پھلانگ بھی نہ سکتی تھی۔

باتھ روم کا دروازہ اکھڑنے کے قریب تھا۔ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ وہ مزید ٹھوکریں سہارنے کے قابل نہیں تھا۔ وہ آنے والے وقت کے تصور سے کانپ رہی تھی۔

عین آخری لمحوں میں اسے ایک ترکیب سوجھی تھی۔ اس ترکیب کے کامیاب ہونے کے امکانات مخدوش تھے لیکن چارہ ہی کوئی نہ تھا۔

کمرے میں چھپنے کی صرف ایک ہی جگہ تھی۔ اس کے بستر کا نچلا خلا۔ ظاہری بات تھی کہ وہ لوگ سب سے پہلے بستر کے نیچے ہی دیکھتے لیکن اگر کسی طور وہ انہیں یقین دلا دیتی کہ وہ کمرے میں موجود نہیں تھی تو امید تھی کہ وہ بستر کے اندر اسے تلاش کرنے کی زحمت نہ اٹھاتے۔

صرف وہ اور گرانٹ واقف تھے کہ کھڑکی کے راستے فرار ہونا ناممکن تھا۔ دروازوں پر زور آزمانے والے اس حقیقت سے لاعلم تھے۔ ان کی یہی لاعلمی صوفیہ کے بچاؤ کی راہ نکال سکتی تھی۔ اس نے ایک گہری سانس بھری اور جھک کر دوڑتی ہوئی بنا آہٹ کیے کھڑکی کے نزدیک چلی گئی۔

کھڑکی کا کانچ والا فریم اوپر دھکیل کر اپنا سویٹر چوکھٹ کے کونے میں [illegible] کر کے رکھ دیا اور [illegible] میں اپنا اسکارف اتار کر [illegible] کے پتوں میں اسی جگہ لٹکا دیا کہ وہ دور سے دیکھنے پر بھی آسانی سے نظر آ جائے۔ پھر وہ فرش پر لیٹتے ہوئے بستر کے نیچے رینگ گئی تھی۔ بستر اور فرش کے درمیان [illegible] سے [illegible] کی مانند [illegible] وہ بمشکل خود کو بستر کے نیچے [illegible] پائی تھی کہ اس نے ان کو اندر آتے سنا۔

وہ دم سادھے لیٹی رہی۔ فرش پر چلتے ان کے جوتے اسے دکھائی دے رہے تھے۔ [illegible] ربڑ سول والے نرم جوتے پہن رکھے تھے اور ان کے قدموں کی [illegible] آہٹیں ابھر رہی تھیں۔ ان میں سے ایک بستر کی سمت آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بال بیٹ فرش پر گھسٹ رہا تھا جس کے سرے پر خون لگا ہوا تھا۔

اس بارے میں سوچنے کی ہرگز ضرورت نہ تھی کہ وہ خون کس کا تھا۔ وہ چلتا ہوا انتہائی نزدیک آ گیا۔ صوفیہ کو جو موہوم سی امید تھی وہ دم توڑنے لگی۔ شاید انہوں نے کھڑکی پر دھیان ہی نہیں دیا تھا اور کسی بھی پل وہ بستر کے نیچے جھانکنے والے تھے۔

”وہ کھڑکی سے باہر کود گئی ہے۔ میں نے کہا بھی تھا کہ ہمیں عقب سے مکان کا جائزہ لے لینا چاہیے۔“ ان میں سے ایک بولا اور صوفیہ کو معلوم ہو گیا۔ اب تک وہ خاموش کیوں تھے۔ (باقی آئندہ)

چلو کچھ ایسا کرتے ہیں
تمہیں ہم یاد کرتے ہیں
دل ناشاد کو کچھ اور ہم
برباد کرتے ہیں
تمہیں آواز دیتے ہیں تمہیں واپس بلاتے ہیں
کسی دیرینہ رستے سے تمہیں ہم ڈھونڈ
لاتے ہیں
جواب تک کہہ نہیں پائے
وہ سب کچھ آج کہتے ہیں
ذرا سن لو یہ ہم اقرار کرتے ہیں
دل ہمیں میں پنہاں ہو تم ہی سے پیار
کرتے ہیں
کہیں ایسا نہ ہو کہ راستہ اندھیر ہو جائے
نہ پھر سے دیر ہو جائے
نہ پھر سے دیر ہو جائے

فاطمہ نجیب

بازیٔ عشق کی پوچھ نہ بات
جیت کی جیت ہے مات کی مات

دکھ دکھاؤ اس آنکھ کا دیکھ
چپ کی چپ اور بات کی بات

پانی کا تو بہانہ ہے
آگ لگاتی ہے برسات

[illegible]
اس کی سیدھی سادی بات

تل اس کو کون سمجھے
ہنس مکھ آنکھیں کومل گات

جینے والے جی ہی لیں گے
اب نہ ملو گے اچھی بات

ہجر میں پہلی نگاہ کا ذکر
کب یاد آئی کب کی بات

فراق گورکھپوری

یہ جو وقت ہے میرے شہر پر

یہ جو وقت ہے میرے شہر پر کئی موسموں سے رکا ہوا
اسے اذن دے کہ سفر کرے
اسے حکم دے کہ یہ چل پڑے میرے آسمان سے دور ہو
کوئی چاند چہرہ کشا کرے، کوئی آفتاب ظہور ہو
کہ نواح چشم خیال میں وہ جو خواب تھے وہ دھواں ہوئے
وہ ہوا کے [illegible]
کوئی وقت ہے جسے دیکھتے میری آنکھ برف سی ہو گئی
وہ عبارت ہوس دل کسی ربط سے نہیں آشنا
کہ جو روشنی تھی کتاب میں، وہی حرف حرف سی ہو گئی
کوئی گردباد اٹھے نہیں، کسی زلزلے کی نمود ہو
یہ جو بست ہے [illegible] کوئی معجزہ کہ یہ بود ہو
میری آنکھ کو یہ جو رات ہے میری عمر کی اسے ٹال دے
میرے دشت ریگ ملال کو کسی خوش خبر کا غزال دے
یہ فلک پہ جتنے نجوم ہیں، تیرے حکم کے ہیں منتظر
وہ جو صبح نو کا نقیب ہو، میری سمت اس کو اچھال دے

امجد اسلام امجد

تو نے رکھا نہیں خیال مرا
ورنہ ہوتا نہ ایسا حال مرا

روح بھی تھک چکی مری آخر
جسم پہلے ہی تھا نڈھال مرا

میں مخاطب ہوں ایک عالم سے
صرف تجھ سے نہیں سوال مرا

تیری خواہش تری طلب کے بغیر
بیت جائے گا یہ بھی سال مرا

رمزی آثم

خبریں و بریں

غزل ثوبان

ریشماں کا فخر

معروف گلوکارہ ریشماں اپنی گائیکی کے سبب پاکستان اور بیرون ملک یکساں مقبول ہیں۔ ریشماں نے اپنے فنی سفر کا آغاز ریڈیو پاکستان سے کیا۔ اس وقت ان کی عمر صرف سترہ برس تھی۔ ریڈیو کے بعد ریشماں نے ٹی وی کا رخ کیا۔ ان کے گائے ہوئے لوک گیتوں نے انہیں شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ سرحد پار ان کی مقبولیت میں اس وقت اضافہ ہوا جب ان کے ایک پنجابی گیت "اکھیاں نوں رہن دے اکھیاں دے کول کول" کو معروف بھارتی گلوکارہ لتا منگیشکر نے راج کپور کی فلم "بوبی" کے لیے اردو میں گایا۔ اتنی شہرت پانے کے باوجود ریشماں سادہ فطرت رکھتی ہیں۔ شہرت حاصل کرنے کے بعد اکثر دیکھا گیا ہے کہ لوگ اپنے ماضی اور نام و نسب کو بڑھا چڑھا کے بیان کرتے ہیں مگر سادہ مزاج ریشماں کو اپنے خانہ بدوش خاندان سے تعلق رکھنے پر آج بھی فخر ہے۔ انہوں نے اپنی خاندانی نسبت سے اپنی جڑیں قائم رکھی ہیں۔ انہوں نے اپنی شادی کے لیے ایک خانہ بدوش خاندان کا انتخاب کیا تھا اور اب اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کی شادیاں بھی خانہ بدوش گھرانوں میں کی ہیں۔

علی ظفر اور کترینا کیف کی بڑھتی ہوئی دوستی

علی ظفر اور کترینا کیف ان دنوں بھارتی فلم "میرے برادر کی دلہن" کی شوٹنگ میں مصروف ہیں۔ جہاں شوٹنگ کے ساتھ ساتھ ان کی دوستی بھی پروان چڑھ رہی ہے۔ علی ظفر اور کترینا کیف کی دوستی کا آغاز اس وقت ہوا۔ جب شوٹنگ کے دوران کترینا کو حادثہ پیش آیا تو علی نے ان کی جان بچائی۔ اس کوشش میں علی کے جسم پر جو زخم آئے وہ کترینا کے دل کو زخمی کر گئے۔ یوں دونوں میں دوستی کا رشتہ استوار ہو گیا۔ فلم کی شوٹنگ کے دوران ملنے والے فارغ لمحات دونوں ایک دوسرے کی قربت میں گزارتے۔ یہ بات صرف یہیں تک محدود نہیں رہی۔ باوثوق ذرائع کے مطابق کترینا اکثر علی ظفر کے اپارٹمنٹ میں بھی آتے جاتے دیکھی گئی ہیں۔

ثانیہ مرزا اور شعیب ملک کی شادی کے بعد ریا مرزا اور شعیب اختر، سشمیتا سین اور وسیم اکرم کی دوستیوں کے چرچوں نے بھارتیوں کے دلوں پر کیا کم چرکے لگائے تھے کہ اب یہ ایک اور نقصان آ پڑا۔ یقیناً اس وقت ان کے دلوں پر بجلیاں گر رہی ہوں گی کیونکہ وہ اپنی فلموں میں پاکستانی مسلمان لڑکیوں کو ہیروئن اور ہندو لڑکوں کو بطور ہیرو پیش کرتے رہے ہیں جبکہ حقیقت اس کے برعکس رونما ہو رہی ہے۔ [illegible] علی ظفر [illegible]

[illegible]

اداکارہ میرا کے سابق منیجر تصور شاہ نے انکشاف کیا ہے کہ میرا اور عتیق الرحمٰن کی شادی کی خبر جعلی تھی۔ تصور شاہ کے مطابق وہ خود اس شادی کے گواہ ہیں۔ تصور شاہ نے میرا پر ٹیکس چوری کا الزام بھی لگایا ہے۔ میرا نے تصور شاہ کو کئی ماہ سے تنخواہ نہیں دی تھی تو اس پر اختلافات کے بعد تصور شاہ نے نہ صرف میرا کی ملازمت کو خیرباد کہہ دیا بلکہ اس کے وہ تمام راز بھی افشا کر دیے جو اب تک ان کے سینے میں دفن تھے۔ ٹیکس چوری کے الزامات کی چھان بین تو متعلقہ محکمے کی ذمہ داری ہے مگر تصور شاہ کا بیان اس قدر غلط بھی نہیں لگتا کہ یہ سب کارگزاریاں ہماری اکثر اداکاراؤں کا وتیرہ رہی ہیں ـــــ کروڑوں روپے کا ٹیکس بچانے اور عتیق الرحمٰن سے چھٹکارا حاصل کرنے کے بعد میرا ان دنوں ایک نجی چینل کی مدد سے "نئے شوہر" کی تلاش میں ہیں۔ ان انکشافات کے بعد ہم سوچ رہے ہیں کہ مقامی نجی چینل پر جاری اس پروگرام کا نام بدل کر یوں رکھ دینا چاہیے "کون بنے گا میرا کا کروڑپتی"

زیب رحمٰن کے آنسو

اداکارہ زیب رحمٰن ماضی میں خاصی معروف اداکارہ رہی ہیں۔ ایک طویل عرصے کی غیر حاضری کے بعد انہوں نے شعیب منصور کی فلم "بول" میں کام کیا

ہے۔ انہوں نے "بول" کی شوٹنگ کے دوران رونما ہونے والا ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ وہ کہتی ہیں۔

"فلم "بول" کی شوٹنگ کے دوران مجھے مستقل رونے دھونے کی اداکاری کرنی پڑی، اس کے لیے میری آنکھوں میں اس قدر گلیسرین ڈالا گیا کہ ایک ماہ کے بعد میرے آنسو ہی خشک ہو گئے۔ پھر گلیسرین ڈالنے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔"

☼ ☼ ☼

یہ بیان کالمانہ

آئیے! آپ کو ایک نہایت ہی عزیز اور عالم عرب دوست کا ہمارے لیڈروں کے بارے میں تجزیہ بیان کرتا ہوں۔ یہ پاکستانی معاملات پر ماہر ہیں اور ہمارے ملک، عوام اور لیڈروں کو پاکستانی عوام کی اکثریت سے زیادہ جانتے ہیں۔

ایک روز میں نے ان سے دریافت کیا کہ ان کا ہمارے حکمرانوں کے بارے میں کیا خیال ہے۔

میرا سوال سن کر مسکرائے اور کہا۔

"آپ کے اس سوال نے مجھے اپنے علاقے کے ایک نہایت خوب صورت عام منظر کی یاد دلا دی ہے۔ ریگستان میں اونٹوں کی قطار جا رہی ہے۔ ایک کے پیچھے ایک۔ بہت ہی خوب صورت قافلہ۔ سب سے پچھلے اونٹ کی نکیل اگلے اونٹ کی دم سے بندھی ہوئی ہے اور اس کی نکیل اس سے اگلے اونٹ کی دم سے۔ اس طرح یہ سلسلہ جاری ہے مگر جب میں اس سے اگلے اونٹ کے پاس جاتا ہوں تو تعجب اور حیرت کا شکار ہو جاتا ہوں کہ اس کی نکیل ایک گدھے کی دم سے بندھی ہوئی ہے اور وہ ان کا لیڈر اور رہنما ہے۔"

انہوں نے کہا۔ "مجھے آپ کے ہاں ہمیشہ یہ ہی خوب صورت منظر نظر آتا ہے۔"

(ڈاکٹر عبدالقدیر خان سحر ہونے تک)

ہم نے تمسخر اڑایا کہ یہ سب تو مذہبی دیوانگی ہے

میرے اللہ نے [illegible] کے سبب [illegible] میں اسی طرح انسانوں کے [illegible] انسانوں [illegible] عذاب مسلط کیا۔ مارنے والا بھی سیکولر اور مرنے والا بھی سیکولر، مارنے والا بھی مولوی کو گالی دینے والا، مرنے والا بھی مولوی کی تضحیک کرنے والا۔

(حرف راز۔ اوریا مقبول جان)

کچھ ادھر اُدھر سے

مشرف کی جگہ کوئی خواجہ سرا ہوتا تو امریکا کے سامنے ڈٹ جاتا۔ امریکا کا ساتھ دینے سے ہمارے ملک میں تباہی آئی ہے۔ مشرف کو عوام سے پوچھنا چاہیے تھا لیکن اس میں پوچھنے والا جذبہ ہی نہیں تھا۔ مشرف تو خواجہ سراؤں سے بھی گیا گزرا ثابت ہوا۔

(شی میل کی صدر الماس بوبی)

امریکہ کسی قیمت پر نواز شریف کو اقتدار میں نہیں دیکھنا چاہتا۔ (وکی لیکس کی رپورٹ)

ملک [illegible] میں [illegible] بنا [illegible] قیادت اسے بچا سکتی ہے۔ (بلوچ رہنما طلال بگٹی)

بریگیڈیئر علی نے دہشت گردی کے خلاف امریکی جنگ لڑنے پر مشرف سے اختلاف کیا تھا جس کی وجہ سے پرویز مشرف نے ان کی ترقی روک دی تھی اور وہ بریگیڈیئر سے میجر جنرل نہیں بن سکے۔ (عمر چیمہ)

صدر مشرف 2008ء میں دوبارہ اسمبلی توڑنا چاہتے تھے لیکن امریکا کو ڈر تھا کہ اس طرح نواز شریف کی مقبولیت بڑھ جائے گی۔ (وکی لیکس)

نعیم بخاری نے چیف جسٹس کے خلاف جو خط لکھا۔ ان کا موقف بالکل درست تھا۔ میں نے نعیم بخاری سے براہ راست رابطہ نہیں رکھا لیکن ان کی بیوی کو فون کر کے کہتی تھی "نعیم کا موقف بالکل درست ہے۔" (نعیم بخاری کی سابقہ بیوی طاہرہ سید)

روشن حرف وہ سارے

سویٹ ساز

اور ریکارڈ کروانے کے لیے تو مت پوچھیں، مجھے کتنے پاپڑ بیلنے پڑے۔ جی ہاں! میں احمد فراز کی غزل کی بات کر رہی ہوں، جو سلمیٰ آغا نے گائی اور میں دن میں دو یا تین بار ضرور سنتی ہوں۔

ہم خواب بیچنے ___ سر بازار آ گئے
یہ سوچ کر کہ غم کے خریدار آ گئے
آواز دے کے چھپ گئی ہر بار زندگی
ہم ایسے سادہ دل تھے کہ ہر بار آ گئے
ہم کج ادا چراغ تھے جب بھی ہوا چلی
گھروں کو چھوڑ کر سر دیوار آ گئے
سورج کی دوستی پر جنہیں ناز تھا فراز
وہ بھی زیر سایہ دیوار آ گئے

کلاسیکی شاعری میں مجھے زاہد فخری کی یہ غزل بے انتہا پسند ہے۔

اسے اپنی فردا کی فکر تھی، وہ جو میرا واقف حال تھا
وہ جو اس کی صبح عروج تھی، وہ ہی میرا وقت زوال تھا
میرا درد وہ کیسے جانتا، میری بات وہ کیسے مانتا
وہ تو خود فنا کے سفر میں تھا، اسے روکنا بھی محال تھا
کہاں جاؤ گے مجھے چھوڑ کر میں یہ پوچھ پوچھ کر تھک گیا
وہ جواب مجھ کو نہ دے سکا، وہ تو خود سراپا سوال تھا
وہ جو اس کے سامنے آ گیا، وہ ہی روشنی میں نہا گیا
عجب اس کی ہیبت حسن تھی، عجب اس کا رنگ جمال تھا
دم واپسی اسے کیا ہوا، نہ وہ روشنی نہ وہ تازگی
وہ ستارا کیسے بکھر گیا، وہ تو خود آپ اپنی مثال تھا
وہ ملا تو صدیوں کے بعد بھی میرے لب پہ کوئی گلہ نہ تھا
اسے میری چپ نے رلا دیا، جسے گفتگو میں کمال تھا
میرے ساتھ لگ کے وہ رو دیا، مجھے فخری وہ اتنا کہہ سکا
جسے جانتا تھا میں زندگی وہ تو صرف وہم و خیال تھا

میرا نام سویٹ ہے اور میرا تعلق عمر کوٹ شہر کے قریبی گاؤں رد حل والی سے ہے۔

پہلے سوال پر تو جی، ہم ریحانہ اور امبر گل کی طرح بالکل بھی مصروف نہیں ہوتے ویلے ہی رہتے ہیں (یہ امی کا خیال ہے) پھر ہم نے سوچا، اگر امبر گل لکھ سکتی ہیں تو ہم کیوں نہیں۔ یقین کریں فاطمہ جی! آپ نے یہ نیا سلسلہ شروع کر کے ہمارا سیروں خون بڑھا دیا۔

1۔ اب آتے ہیں سوالوں کی طرف تو دو شعر ایسے ہیں جو ہر وقت میرے لبوں پر رہتے ہیں۔ وہ یہ ہیں۔ پہلا محسن نقوی کا ہے۔

خوشبو میرے بدن سے خود آ کر لپٹ گئی
محسن یہ کس دیار سے میں نے گزر کیا

اور دوسرا ناصر کاظمی کا ہے۔

بیٹھ کر [illegible] محفل میں ناصر
ہم [illegible]

2۔ میری [illegible] شاعر [illegible] اور ان کا [illegible] شعر رضیہ کی توسط سب سے پہلے [illegible] بنا دینا۔

کبھی اس طور سے ہنسنا دنیا کو رلا دینا
کبھی اس رنگ سے رونا کہ خود پر مسکرا دینا
میں تیری دسترس چاہوں مجھے ایسی دعا دینا
مجھے اچھا لگے محسن اسے [illegible]

3۔ تیسرے سوال پر تو آپ نے [illegible] ہم ایسے خوش [illegible] کہاں [illegible] شعر ہی پڑھ ڈالے۔ (حسرت ہی رہی) اور فاطمہ جی! آپ نے یہ سوال پوچھ کر ہمارے زخموں پر نمک پاشی کی بلکہ انہیں ادھیڑ کر رکھ دیا۔ خیر، ایسے بھی گئے گزرے نہیں ہم (بقول اپنے) ایک شعر ہے، جو رضیہ ہمیشہ مجھے سناتی رہتی ہے۔

نہ وہ آنکھ ہی تیری آنکھ تھی نہ وہ خواب ہی تیرا خواب تھا
دل منتظر تو پھر کس لیے تیرا جاگنا اسے بھول جا
وہ بساط جاں ہی الٹ گیا وہ جو راستے سے پلٹ گیا
اسے پکارنے سے حصول کیا اسے مت بلا اسے بھول جا

4۔ میں نے یہ غزل ریڈیو پر بھی سنی اور ٹی وی پر بھی

ماڈل اور ٹی وی فنکارہ

باتیں نیہا سے

شاہین رشید

1 "اصلی نام؟"
"سائرہ شبیر۔"

2 "پیار کا نام؟"
"سارہ۔"

3 "تاریخ پیدائش اور شہر؟"
"اپریل/لاہور۔"

4 "قد/ستارہ"
"5فٹ8انچ/ARIES۔"

5 "تعلیمی قابلیت؟"
"گریجویشن پھر انٹیریئر ڈیکوریشن کے کئی کورسز میں نے کیے ہوئے ہیں؟"

6 "بہن بھائی / آپ کا نمبر؟"
"ہم تین بہنیں ہیں اور ایک بھائی ہے میرا نمبر ... ہے بھائی پھسوتا ہے۔"

7 "شادی کب ہوئی؟"
"شادی ہوئی اور پھر ختم ہوگئی۔ میرا ایک بیٹا ہے جو کہ ساڑھے تین سال کا ہے۔"

8 "شوبز میں متعارف کرانے کا سہرا؟"
"شایان ملک۔"

9 "وہ پروگرام جو وجہ شہرت بنا؟"
"کاجل" "آزر کی آئے گی بارات اور میری ماڈلنگ نے۔"

10 "پہلی کمائی؟"
"کمرشل کیا تھا "تبت بسنت" کا جس کے مجھے کافی پیسے ملے تھے۔"

11 "زندگی میں کس چیز کے لیے وقت نکالنا مشکل ہے؟"
"رشتے داروں سے ملنے کے لیے۔"

12 "آپ کے لیے کون جان دے سکتا ہے؟"
"میری ماں۔"

13 "اگر دعا سے کوئی شخص مل سکتا تو کس کو مانگتیں؟"
"کسی شخص کو نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ سے سکون مانگتی۔"

14 "کوئی ایسا شخص جس نے آپ کی زندگی کو بدل دیا ہو؟"
"جس شخص سے میری شادی ہوئی اس کی وجہ سے میری زندگی بالکل بدل گئی اور پھر جب میرا بیٹا ہوا تو اس نے بھی میری زندگی کو بدل دیا۔"

15 "اگر بازار سے خوشیاں ملتیں تو کون سی خوشی خریدتیں؟"
"بازار سے خوشی مل ہی نہیں سکتی کبھی بھی نہیں۔"

16 "جب آپ پہلی مرتبہ نیا پین استعمال کرتی ہیں تو کیا لکھتی ہیں؟"
"بسم اللہ۔"

17 "اپنے موبائل سے سب سے زیادہ کالز اور ایس ایم ایس کس کو کرتی ہیں؟"
"کالز کام کے لیے آتی ہوں جس سے بھی ہو اور ایس ایم ایس کرنے سے تو میری جان جاتی ہے۔"

18 "زندگی کی کوئی ایسی غلطی جو آپ دہرانا چاہتی ہیں؟"
(قہقہہ) "غلطی دہرائی نہیں جاتی غلطی سے تو انسان سیکھتا ہے۔"

19 [illegible]
"[illegible]"

20 "[illegible] آپ [illegible]"
"نہیں کبھی نہیں۔ اتنی دور کی نہیں سوچتی۔"

21 "کبھی غصے میں کھانا پینا چھوڑا؟"
"ارے میں تو غصے میں زیادہ کھاتی ہوں۔"

22 "موڈ خراب ہو تو ٹھیک کیسے ہوتا ہے؟"
"لانگ ڈرائیو پہ چلی جاتی ہوں۔"

23 "[illegible] لڑکیاں یا لڑکے؟"
"کوئی بھی نہیں مجھے کسی پر اعتبار نہیں ہے۔"

24 "ستاروں پر یقین ہے یا ہاتھ کی لکیروں پر؟"
"کسی پر بھی یقین نہیں ہے سوائے اللہ کے۔"

25 "کیا دعا سے قسمت بدل سکتی ہے؟"
"بالکل بدل سکتی ہے اگر آپ دل سے دعا مانگیں تو۔"

26 "کیا محبت ایک بار ہوتی ہے؟"
"مجھے تو ایک ہی بار ہوئی تھی۔"

27 "اپنی شخصیت میں کیا چیز بدلنا چاہتی ہیں؟"
"میں نیگیٹو سوچتی ہوں۔ اسے بدلنا چاہتی ہوں۔"

28 "کس سے فائدہ اٹھاتی ہو۔ اے ٹی ایم کارڈ سے یا کریڈٹ کارڈ سے؟"
"کریڈٹ کارڈ استعمال نہیں کرتی 'یہ زندگی کا سب سے بڑا عذاب ہوتا ہے۔"

29 "کھانا کہاں پسند کرتی ہیں ڈائننگ ٹیبل پہ یا چٹائی پہ؟"
"منحصر ہے اس بات پر کہ کھانے میں کیا ہے۔ ویسے پابندی نہیں ہے۔ جہاں موڈ بنا کھالیا۔"

30 "حکومت سے لائف ٹائم کیا سہولت مفت لینا چاہیں گی 'پیٹرول 'فون یا تعلیم؟"
"میڈیکل 'اگر ہم لوگوں کو میڈیکل کی سہولت مل جائے تو عوام کو بہت بڑا ریلیف مل جائے گا۔"

31 "کس خواہش کے پورا ہونے تک اپنی زندگی کی دعا مانگتی ہیں؟"
"میرے بیٹے کو اللہ تعالیٰ بہت قابل پائلٹ بنا دے۔"

32 "ایک سوال جو خدا سے [illegible] کرتی ہو؟"
"کہ میں نے کسی کے ساتھ برائی نہیں کی 'میرے ساتھ ہی برائیاں ہوا۔"

33 "ایک رومینٹک سین جو کئی بار کیا ہوا؟"
"ہاں دلہن کئی بار بنی ہوں ..... اور تو ایسا کچھ نہیں ہوا۔"

34 "کبھی چھٹی حس ایکٹو ہوئی؟"
"اس کے ایکٹو نہ ہونے کی وجہ سے ہی تو زندگی میں نقصان اٹھائے ہیں۔"

35 "اگر سب کو پتہ چل جائے کہ آج (خدانخواستہ) آپ کی زندگی کا آخری دن ہے تو سب سے پہلے کون ملنے آئے گا؟"
"میری ماں اور بیٹے کے علاوہ کوئی بھی نہیں آئے گا۔"

36 "کس قسم کی تقریبات میں جانے سے گھبراتی ہیں؟"
"شادیوں میں۔"

37 "گھر آکر پہلی خواہش کیا ہوتی ہے؟"

"کہ میں اپنے بیٹے کو گلے لگاؤں۔"

38 "ایک بات جس کا آپ ہمیشہ خیال رکھتی ہیں؟"

"کہ اپنی پریشانی گھر والوں پر ظاہر نہ کروں۔"

39 "موت سے ڈر لگتا ہے؟"

"موت سے ڈر نہیں لگتا' بس ڈرتی ہوں تو اس بات سے کہ میرے بعد میرے بیٹے کا کیا ہوگا۔"

40 "اگر پاور میں آجائیں تو کیا کریں گی؟"

"یہ جو سڑکوں پر ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں فقیر ہیں اور جنہوں نے اپنے اڈے بنالیے ہیں ان سب کے اڈوں کو ختم کردوں گی۔"

41 "کہاں جانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتی ہیں؟"

"لانگ ڈرائیو پر۔"

42 "چوری کرنے کا موقع ملے تو؟"

"کیوں ملے' خوامخواہ ملے' اللہ نہ کرے۔"

43 "لائٹ چلی جانے پر بے ساختہ منہ سے کیا نکلتا ہے؟"

"اللہ خیر کرے' خاص طور پر رات کے وقت۔"

44 "ڈرائیونگ کے وقت کون سی میوزک سنتی ہیں؟"

"کوئی خاص چوائس نہیں ہے' جو سی ڈی لگی ہوتی ہے وہی آن کردیتی ہوں۔"

45 "کوئی چیز جو وقت سے پہلے مل گئی ہو؟"

"شہرت۔"

46 "لوگ آپ سے ملتے ہیں تو پہلا جملہ کیا بولتے ہیں؟"

"آپ کی مسکراہٹ بہت اچھی ہے۔"

47 "سائنس کی بہترین ایجاد؟"

"موبائل فون۔"

48 "صبح اٹھتے ہی کسے دیکھنے کی خواہش ہوتی ہے؟"

"اپنے بیٹے کو۔"

49 "کس پہ چیخنے چلانے کو دل چاہتا ہے؟"

"نہیں میں چیخنے والی لڑکی نہیں ہوں۔"

50 "پاکستان کے بارے میں کیا سوچتی ہیں؟"

"بہت تکلیف ہوتی ہے آج کل کے حالات دیکھ کر۔"

51 "آپ کی زندگی عام لوگوں سے کتنی مختلف ہے؟"

"میری زندگی عام لوگوں جیسی ہی ہے۔ میں گھر میں ماسی نہیں رکھتی۔ کار خود ڈرائیو کرتی ہوں۔ گھر کے اور گھر کے باہر کے سارے کام خود کرتی ہوں۔"

52 "کبھی رشوت دے کر کام کروایا؟"

"کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی۔"

53 "کن چیزوں کے بھول جانے پر دوبارہ گھر آتی ہیں؟"

"موبائل فون اور کار کی چابی۔"

54 "دوسرے ملک جا کر کیا باتیں نوٹ کرتی ہیں؟"

"کہ ہمارے ملک میں سب کچھ ہے' پھر بھی ہم اس کی قدر نہیں کرتے۔"

55 "اپنے لیے سب سے قیمتی چیز کیا خریدی؟"

"کوئی خاص نہیں' کبھی کبھی برانڈڈ گلاسز لے لیتی ہوں۔"

56 "آپ کی کون سی عادت گھر والوں کو پسند نہیں؟"

"گھر والوں کو ٹائم نہ دینا۔"

57 "کیا آپ وقت کی پابندی کرتی ہیں؟"

"بہت زیادہ۔"

58 "بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ کیا کیا چیزیں رکھتی ہیں؟"

"اوپر نہیں رکھتی بلکہ دراز میں چیزیں رکھتی ہوں جیسے موبائل' چابی اور دیگر ضروری چیزیں رکھتی ہوں۔"

59 "ناشتے میں کیا کھانا پسند کرتی ہیں؟"

"براؤن بریڈ اور جوس وغیرہ۔"

60 "بیگ میں کیا کیا چیزیں لازمی رکھتی ہیں؟"

"موبائل' ایک لوشن' پرفیوم اور سن گلاسز تو لازمی ہوتے ہیں۔"

61 "اپنی کن باتوں پر کنٹرول نہیں ہے؟"

"جلدی فری ہو جاتی ہوں' جیسے میں انہیں مدتوں سے جانتی ہوں۔"

62 "اگر دنیا میں آنے سے پہلے اللہ چوائس دیتا کہ مرد کا روپ چاہیے یا عورت کا تو؟"

"مجھے فخر ہے کہ اللہ نے مجھے ایک مضبوط عورت بنا کر بھیجا ہے اور کوئی چوائس نہ رکھتی۔"

63 "جسمانی ساخت میں کیا کمی محسوس کرتی ہیں؟"

"نہیں کوئی نہیں۔ ایک دم فٹ ہوں۔"

64 "آپ کی کوئی انوکھی خواہش؟"

"کبھی کبھی آدھی رات کو دل چاہتا ہے آئس کریم کھانے کو۔"

65 "زندگی میں کیا کمی محسوس ہوتی ہے؟"

"کیا' بین بہت محسوس ہوتا ہے۔"

66 "فقیر کو کم سے کم کتنے دیتی ہیں؟"

"پانچ روپے سے کم نہیں دیتی۔"

67 "غصہ کب آتا ہے؟"

"ان بچوں پر جو سگنل پہ کھڑے ہو کر گاڑیوں کی ونڈ اسکرین صاف کر رہے ہوتے ہیں۔"

68 "گھر والوں کی کس بات [illegible]"

"[illegible]"

69 "[illegible] پیار [illegible] ہوتا ہے [illegible]"

"نادانی ہوتی ہے۔۔۔ لیکن اس پیار [illegible] آپ بھول نہیں سکتے۔"

70 "کن چیزوں پر بہت خرچ کرتی ہیں؟"

"گھر کی ڈیکوریشن پہ۔"

71 "نصیحت جو بری لگتی ہے؟"

"وہ نصیحت جس میں ضد کا پہلو ہو کہ آپ کو یہ کرنا ہی ہے۔"

72 "[illegible]"

"بری تو یہ کہ نکمٹو سوتی ہوں اور اچھی عادت یہ کہ سب سے پیار سے ملتی ہوں۔"

73 "دن کا کون سا پہر اچھا لگتا ہے؟"

"رات کا۔"

74 "دن کے کس حصے میں اپنے آپ کو تروتازہ محسوس کرتی ہیں؟"

"صبح فجر کے وقت۔"

75 "اپنے چہرے کے خدوخال میں کیا پسند ہے؟"

"آنکھیں۔"

76 "گھر کے کس کونے میں سکون محسوس ہوتا ہے؟"

"چھت پہ۔"

77 "شدید بھوک میں آپ کی کیفیت؟"

"مجھ سے برداشت نہیں ہوتا' بیٹے کے لنچ بکس سے بھی کچھ مل جائے تو کھا لیتی ہوں۔"

78 "پسندیدہ سیاست دان؟"

"کیا کوئی سنجیدہ سیاست دان ہے ہمارے یہاں؟"

79 "کوئی گہری نیند سے اٹھا دے تو؟"

"میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو نیند سے اچانک اٹھ کر ناراض ہو جاتے ہیں۔"

80 "پہلی ملاقات میں شخصیت میں کس چیز کا جائزہ لیتی ہیں؟"

"چپل' کپڑے' بات کرنے کا اسٹائل۔"

81 "آئینہ دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟"

"اللہ نے اتنی اچھی شکل دی۔ پھر اس بے وقوف نے مجھے کیوں چھوڑا۔"

82 "کن کھانوں کو دیکھ کر بے قرار ہو جاتی ہیں؟"

"تمبریاں۔"

83 "جھوٹ کب بولتی ہیں؟"

"اماں کے سامنے بولتی ہوں [illegible] کہ پریشان ہو۔ تو میں کہتی ہوں [illegible]"

85 "آپ کی کس بات [illegible] ہیں؟"

"کہ نہایت اسٹرانگ [illegible]"

86 "پیسہ کس شکل میں [illegible]"

"بینک میں رکھتی ہوں۔"

87 "شوبز کی سب سے [illegible]"

"جب تک آپ کا نام ہے' سب آپ کے ہیں۔"

88 "صبح اٹھتے ہی کیا خیال آتا ہے؟"

"بیٹے کو پیار کروں اور اپنی [illegible] کام۔"

89 "اگر آپ کی شہرت زوال آجائے تو؟"

"تو میں سمجھوں گی کہ اس فیلڈ میں میری روزی نہیں لکھی۔"

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

کرسپی بینگن

اجزا :

بینگن	2عدد
نمک	حسب ذائقہ
چاول پسے ہوئے	2چائے کے چمچے
آٹا	2چائے کے چمچے
پسی سرخ مرچ	1/2چائے کا چمچ
چاٹ مسالہ	ذائقہ کے لیے
تیل/گھی	تلنے کے لیے

ترکیب :

بینگن کو گول سلائس کی شکل میں کاٹ لیں اور نمک لگا کر ایک طرف رکھ دیں۔ تمام اشیاء کو اچھی طرح ایک ساتھ ملا لیں اور تھوڑا سا پانی ڈال کر اچھی طرح مکس کریں فرائی پین میں تیل/گھی گرم کریں اور بینگن کے سلائس کو اس آمیزہ میں ڈبو کر گولڈن براؤن ہونے تک تل لیں۔

چاٹ مسالہ چھڑک کر پیش کریں۔

آٹے کے لڈو

اجزا :

آٹا	1/2کلو
چینی	ایک کپ
اخروٹ	1/2کپ
سفید تل	1کپ
سبز الائچی	6عدد
گھی	2کپ
بادام، پستے	حسب مرضی

ترکیب :

بادام اور اخروٹ پیس لیں۔ سفید تل کو سنہرا ہونے تک بھون لیں۔ الائچیاں آدھی چینی کے ساتھ پیس لیں ایک برتن میں گھی گرم کریں اس میں شکر اور الائچی کا آمیزہ اور آٹا ڈال کر خوب اچھی طرح بھونیں، 5منٹ تک پکائیں پھر چولہے سے اتار لیں۔

تھوڑا ٹھنڈا ہو جائے تو اس میں باقی چینی ڈال کر اچھی طرح ملائیں اور چھوٹے چھوٹے لڈو بنا لیں لڈو کے اوپر بھنے ہوئے تل لگا کر پیش کریں۔

پالک پنیر

اجزا :

چکن کیوب	1عدد20گرام
پالک	ایک کلو دھو کر باریک کاٹ لیں

کاٹیج پنیر	ایک پیکٹ (کیوبز بنالیں)
کٹی کالی مرچ	ایک چائے کا چمچہ
مارجرین	ایک کھانے کا چمچہ
کوکنگ آئل	دو کھانے کے چمچے
لہسن	دو عدد باریک کٹے ہوئے

ترکیب :

1 سب سے پہلے پالک کو اچھی طرح سے دھو کر باریک کاٹ لیں اور دس منٹ کے لیے بھگو دیں اور چٹکی بھر ہلدی ڈال دیں۔ اس سے پالک کی کڑواہٹ نکل جاتی ہے۔

2 پالک کا پانی نکال کر اس کو اپنے ہی پانی میں ابال کر خشک کرلیں اور پیس لیں۔

3 کاٹیج پنیر کے کیوبز بنا کر تھوڑے سے پانی میں بھگو دیں اس میں چٹکی بھر ہلدی ڈال دیں۔ اس سے ان میں چکنائی آجاتی ہے۔

4 ایک دیگچی میں مارجرین اور ایک چمچہ تیل ڈال کر گرم کریں پھر لہسن ڈال کر گولڈن براؤن کرلیں۔ پسی ہوئی پالک ڈال کر تھوڑا سا بھون لیں۔

5 تھوڑے سے پانی کو گرم کریں پھر کنور چکن کیوب ڈال کر گھول لیں۔ جب کیوب گھل جائے تو پالک میں ڈال دیں۔ اب کیوبز کاٹیج ... نکال کر الگ فرائی پین میں کم آئل میں فرائی کرکے پالک کے اوپر ڈال دیں۔

6 کالی مرچ ڈال کر پیش کردیں۔

مرغ پلاؤ پالک پوری کے ساتھ

اجزا :

کنور چکن کیوب	دو عدد
چنے	250 گرام (ابلے ہوئے)
پیاز	ایک ڈلی
ٹماٹر	ایک عدد
لال مرچ	ایک چمچہ
ہلدی	ایک چوتھائی چمچہ
دھنیا	ایک چوتھائی چمچہ
تیل	75ml
پانی	300ml

پالک پوری :

کنور چکن کیوب	ایک پیکٹ (ایک پیالی پانی میں مکس کردیں)
پالک	آدھی گڈی
آٹا	دو پیالی
تیل	تین کھانے کے چمچے
تیل	تلنے کے لیے (حسب ضرورت)

ترکیب :

1 پیاز براؤن کرکے لال مرچ ہلدی دھنیا ڈال کر ٹماٹر ڈال دیں اور بھون لیں۔

2 بھون کر ہلکا سا پانی ڈال کر کنور چکن کیوب ڈال دیں اور ہلکا سا پکا کر چنے ڈال دیں۔ تھوڑا سا پکائیں اور پھر پانی ڈال کر 5 منٹ پکائیں۔

3 مزیدار مرغ چنا تیار ہے

آٹا گوندھنے کے لیے :

1 پالک کو ابال کر باریک پیس لیں۔

2 آٹے میں تیل، پالک ملا کر چکن کیوب کے پانی سے آٹا گوندھ لیں۔ پھر چھوٹے چھوٹے پیڑے بنا کر بیل لیں۔

3 اور گرم تیل میں تل لیں۔

عدنان

نفسیاتی و ذہنی الجھنیں

کیا آپ لوگوں کو پسند کرتے ہیں۔
ان کے اعتماد ان کے خلوص ان کی قربت کے خواہاں ہیں؟
اگر آپ لوگوں کو پسند نہیں کرتے اور تنہائی کی زندگی گزارنا چاہتے ہیں تو آپ ذہنی طور پر بیمار ہیں۔ تنہائی سب سے بڑی بیماری ہے۔
اس بیماری کا علاج آپ کے اپنے ہاتھوں میں ہے۔
ذرا خود کو بدل دیکھیے اور صحت مند زندگی گزاریے کہ خوشیاں اور مسرتیں آپ کی بے تابی سے منتظر ہیں۔
آپ عمر کے کسی دور میں ہوں، کتنے ہی امیر یا غریب ہوں، کامیاب ہوں یا ناکام۔
آپ کو ایسے رفیق اور ہمدم کی ضرورت ہے۔ جس سے آپ پورے اعتماد اور بھروسے سے سب کچھ کہہ سکیں۔
خواہ وہ بڑی بات ہو یا چھوٹی۔
دل کی بات کہہ دینے سے آدھا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔

☼ ☼ ☼

اپنی ذات پر اعتماد، کسی کام کو توجہ سے کرنا اور کامیابی کے ساتھ کرنا، خود اعتمادی ہے۔ خود اعتمادی ایک ایسی ذہنی کیفیت کا نام ہے کہ ایک بار اپنے آپ کو، اپنے کردار کو جان لیں۔ خود کو جان لینے کا نام خود اعتمادی ہے۔ بلکہ جو لوگ اپنے آپ کو جاننے کی کوشش نہیں کرتے۔ نفسیاتی اور اعصابی بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔
اپنی صلاحیتوں کو جانتے ہوئے ان کو بروئے کار نہ لانا خود اعتمادی کے لیے زہر قاتل ہے۔
جن کاموں میں بزرگوں، دوستوں، عالموں (عالموں سے مراد یہ عامل کامل اور پروفیسرز اور عطائی نہیں) کی ضرورت ہو ان سے مشورے نہ کرنا۔ یا کسی سے پوچھتے اور سیکھتے ہوئے، جھجکنا بھی خود اعتمادی کے لیے رکاوٹ ہے۔
قدرت نے ہر انسان کو کچھ نہ کچھ دیا ہے۔
ہر آدمی میں کچھ نہ کچھ بننے کی صلاحیت ہوتی ہے۔
لیکن یہ نہیں ہے کہ آدمی "ڈاکٹر، پائلٹ یا انجینئر بن جائے۔ بلکہ بے شمار دوسرے کام ہیں جن میں آپ اپنے جوہر دکھا سکتے ہیں۔
جو کام آپ بہتر طور پر انجام دے سکتے ہیں، ان میں اپنے جوہر دکھائیں۔ زندگی میں سیکھنا بہت ضروری ہے۔
ذہنی سکون اور قلبی اطمینان کے لیے ضروری ہے کہ دوسروں کی نقل چھوڑ دیں۔
خود اعتمادی پر آپ کو پورا پورا حق ہے۔ آپ اس حق کو استعمال کریں۔ تاکہ ایک باعمل اور مکمل انسان کے طور پر اپنی زندگی گزار سکیں۔

☼ ☼ ☼

اختر

س : میں نے انٹر پاس کیا ہے۔ مذہب کی اچھی سوجھ بوجھ ہے۔ میرا شمار چار سال پہلے خوب صورت، ذہین لڑکیوں میں ہوتا تھا۔ سوچا تھا پڑھ لکھ کر اچھی جاب کروں گی۔ دنیاوی تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم بھی حاصل کر رہی تھی۔ پانچوں وقت کی نماز باقاعدگی سے پڑھتی تھی۔ چوتھائی قرآن مجھے زبانی یاد ہو گیا تھا۔ گھر کی صفائی ستھرائی سجاوٹ سے بھی بہت دلچسپی تھی۔ لوگوں سے ملنا جلنا، میلاد کی محفلوں میں شرکت کرنا نعتیں پڑھنا بہت اچھا لگتا تھا، پھر نا نہیں کیا ہوا کہ اب میری صحت تباہ ہو چکی ہے۔ سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہوں۔ بال اڑ گئے ہیں۔ بظاہر کوئی بیماری بھی نہیں ہے۔ سارا دن کمرے میں پڑی رہتی ہوں، تصور اور خیالوں میں۔ بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوتی ہوں۔ خود سے بلند آواز میں باتیں کرتی ہوں۔ دس گھنٹوں میں سے آٹھ گھنٹے خیالی دنیا میں خود سے باتیں کرتے گزارتی ہوں اور باقی کے چودہ گھنٹے سو کر گزارتی ہوں۔
ہر روز عزم کرتی ہوں کہ آج کچھ کروں گی لیکن کچھ نہیں کر پاتی۔ خیالوں اور تصور سے نکلوں گی تو کچھ کروں گی۔
ج : ذہین اور باصلاحیت لوگ عموماً" بہت زیادہ حساس بھی ہوتے ہیں۔ آپ کے ساتھ بھی یہی مسئلہ ہے۔ قدرت نے ذہانت بھی دی اور صلاحیت بھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ غیر معمولی حساسیت بھی۔ آپ بہت کچھ کرنا چاہتی تھیں۔ کچھ بننا چاہتی ہیں۔ عزت، شہرت، نام کی تمنا تھی۔ یہ خواہش، آرزو، تمنا غلط نہیں ہے لیکن آپ کی خواہش تھی کہ سب کچھ ایک دم مل جائے۔ اس خواہش نے اس قدر غلبہ کیا کہ آپ نے تصورات کی دنیا میں پناہ لے لی اور یہ بہت پہلے ہی۔ اگر فوری طور پر گھر والے توجہ دے لیتے تو اس کا علاج بہت آسان تھا۔ اب بھی دیر نہیں ہوئی۔ آپ کو کھرا ڈپریشن ہے اور اس کا علاج سائیکاٹرسٹ ہی کر سکتا ہے۔ آپ نے اپنے شہر کا نام نہیں لکھا۔ اگر شہر میں کوئی بہتر ڈاکٹر ہے تو اس سے علاج کرائیں۔ ان شاء اللہ بہتری محسوس ہو گی۔
جتنا ممکن ہو لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم کا ورد کریں۔

ص۔ ا۔ لاہور

جو کچھ ہوا، اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں تھا اور یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اس سے کوئی خرابی واقع ہوئی یا نہیں۔ بہتر یہی ہے کہ آپ جو کچھ ہوا، اسے کبھی بھول کر بھی زبان پر نہ لائیں اور اللہ پر بھروسا کر کے پورے یقین و اعتماد کے ساتھ نئی زندگی میں قدم رکھیں۔ ان شاء اللہ اللہ تعالیٰ آپ کے لیے اچھا کرے گا۔

منزہ

آپ نے جس بات کے لیے مشورہ مانگا ہے اور جو حالات لکھے ہیں ان کی روشنی میں آپ کو خوش نصیب ترین لڑکی سمجھتا ہوں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ زندگی میں آسائشوں کی فراہمی اور فراغت کی وجہ سے آپ کے پاس سوچنے کے لیے بہت وقت ہے۔ اصل میں آپ کو وقت کاٹنا مشکل لگ رہا ہے۔ ورنہ کام کرنے والے کو ایسی بیکار سوچوں کی فرصت کہاں ہوتی ہے اور اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں کی طرف دھیان دینے کا وقت کہاں ملتا ہے۔ میرا مشورہ یہ ہے آپ فارغ وقت میں کوئی مشغلہ اپنائیں۔ اچھی کتابیں پڑھیں۔ گھر کے کام میں دلچسپی لیں۔ اپنے بھائیوں کو پڑھائیں۔ یہ بیکار کی سوچیں اپنے ذہن سے نکال دیں اور ہاں ممکن ہو تو ملازمین کے بچوں کو اور گلی محلے کے بچوں کو تعلیم دیں۔ اس طرح آپ کی مصروفیات بھی بڑھ جائیں گی اور بے پناہ خوشیاں بھی آپ کے حصے میں آتی چلی جائیں گی۔

★

(اسپیشل بیوٹی بکس)

ناہید کمال ۔۔۔ ملتان

س : میرے بال بہت گھنے تھے مگر ایک سال سے گرنے شروع ہو گئے ہیں۔ انہیں روکنے کا طریقہ بتائیے؟

ج : گرتے ہوئے بالوں کو روکنے کے لیے ہفتے میں ایک بار ایک انڈا توڑ کر اس کی سفیدی اور زردی کو اچھی طرح پھینٹ کر سر میں مل لیجیے اور پندرہ منٹ بعد نیم گرم پانی سے دھو لیے۔ سر کے بالوں میں گرم پانی ہرگز نہیں ڈالنا چاہیے۔ بال ہمیشہ سائے میں خشک کرنے چاہئیں۔ غسل کے بعد کسی بڑ[illegible] بالوں کا [illegible]

پر[illegible]

دس [illegible]

لگیں تو بالوں کی جڑوں میں ناریل یا سرسوں کا تیل لگائیں' سوہنی ہیئر آئل بھی مفید ہے پھر کم از کم دس منٹ اچھی طرح کنگھی کریں۔ کبھی آگے سے پیچھے کبھی دائیں سے بائیں ہر بار بالوں کی جڑوں سے بالوں کے آخری حصے تک تاکہ تیل اور بالوں کی جڑوں کا قدرتی تیل پھیل جائے اس سے بال مضبوط اور چمک دار ہوتے ہیں دو باتیں یاد رکھیے۔

1 : بہت گیلے بالوں کو کنگھی کبھی نہ کریں خصوصاً اگر آپ نے گرم پانی سے سر دھویا ہو۔

2 : بالوں میں ہر روز کم از کم دن میں دو بار کنگھی کیجیے اس سے بالوں کی جڑیں مضبوط ہوں گی گرنے بند ہو جائیں گے۔

سیما ناز ۔۔۔ لاہور

س : میری عمر [illegible] میں سال ہے لیکن آنکھوں کے نیچے جھریاں پڑ گئی ہیں۔ میں نے مساج کر کے بھی دیکھ [illegible] نہیں ہوتا بلکہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ [illegible] ہو گیا ہے۔

ج : آنکھوں کے گرد جھریاں پڑنے کے دو سبب ہو سکتے ہیں اول یہ کہ آپ کی صحت ٹھیک نہیں ہے اور معدہ خراب رہتا ہے اس صورت میں آپ کسی ڈاکٹر سے مشورہ کریں اور اس کے مشورے پر عمل کریں۔ دوسری صورت ممکن ہے یہ ہو کہ آپ پوری نیند نہیں سوتیں اور دھوپ میں چشمے کے بغیر چلتی ہیں۔ آنکھوں کے قریب کی جلد بے حد نازک ہوتی ہے۔ اور اسی لیے بہت توجہ چاہتی ہے۔

رات سونے سے پہلے آنکھوں کے گرد بادام یا زیتون کا تیل ضرور لگائیں اور مساج ہلکے ہاتھوں سے کریں۔ گھر سے نکلتے وقت دھوپ کا چشمہ لگائیں [illegible] شلجم' پالک اور پھلوں کا استعمال زیادہ [illegible] لیے مفید ہیں۔